ہمزاد کی واپسی

شمیم نوید

اب میرے مرنے میں صرف آٹھ دن باقی ہیں۔ میں تمہیں اپنی سرگزشت اس لیے نہیں سنا رہا کہ تم مجھ سے ہمدردی کرو۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں گا' اگر تم مجھے اس آخری وقت میں کچھ نفرت ہی دے سکو۔ میں اس عذاب میں مرنا نہیں چاہتا کہ مجھ سے نفرت بھی نہیں کی گئی۔ تو سنو کہ میرے چہرے اور بقیہ جسم میں تضاد کیوں ہے؟ یہ دراصل عمروں کا فرق ہے۔ میرے چہرے کی عمر اس وقت تقریباً" ایک سو تیس سال ہے جب کہ بقیہ جسم کی عمر پچیس سال۔ لوگ تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ شیخ کرامت' چاٹگام کا ایک امیر ترین شخص ہے' یعنی میں! جو کینسر میں مبتلا ہو کر بستر مرگ پر پڑا ہے' لیکن حقیقت یہ نہیں۔ مجھے جاننے کے لیے تمہیں میرے ماضی میں سفر کرنا پڑے گا۔

میں نے جب ہوش سنبھالا تو خود کو یتیم پایا۔ میری پرورش اس وقت میرے ضعیف نانا اور نانی کر رہے تھے۔ میرے نانا نے مجھے درس و تدریس کی طرف مائل کیا کیوں کہ ان کا ذریعہ معاش بھی یہی تھا۔ نانا کے انتقال کے بعد میری گزر بسر کا دارومدار درس و تدریس پر تھا' لیکن یہ آمدنی انتہائی قلیل تھی۔ میں اب بیس سال کا جوان تھا۔ میرے دل میں اچھی زندگی گزارنے کی امنگ تھی۔ میں اپنی زندگی سے قطعی غیر مطمئن تھا۔ ایک شام میں بیزار سا بیٹھا اپنے حالات پر غور کر رہا تھا کہ میری نظر گھر میں مدتوں سے پڑی ہوئی پرانی بوسیدہ کتابوں پر پڑ گئی ایک کتاب میں نے یوں ہی اٹھالی اور پڑھنے لگا۔ وہ ایک قلمی نسخہ تھا' زبان فارسی تھی جس سے میں بہ خوبی واقف تھا۔ میں پڑھنے لگا۔ تحریر کچھ یوں تھی کہ ہر ذی روح کے دو جسم ہوتے ہیں' ایک مرئی' دوسرا غیر مرئی' ایک کثیف دوسرا لطیف' ایک مادی دوسرا روحانی ..... میری دلچسپی قلمی نسخے میں بڑھتی گئی۔ اس میں روحانی جسم کا نام "ہمزاد" تحریر تھا جس کے بارے میں لکھا تھا اسے قابو میں کیا جا سکتا ہے' اور جس کے قبضے میں ہمزاد آجائے وہ دنیا کا خوش نصیب آدمی ہو سکتا ہے۔ اس میں جسم لطیف یا ہمزاد کی صفات کے بارے میں بھی تحریر تھا' مثلاً" پلک

جھپکتے ہی ہمزاد دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا کر واپس آسکتا ہے' پہاڑوں کی بلندیوں اور سمندر کی گہرائیوں کی خبر لا سکتا ہے۔ بڑی سے بڑی وزنی شے جسے سینکڑوں آدمی مل کر نہیں اٹھا سکتے' اسے ہمزاد اکیلا کہیں سے بھی اٹھا کر لا سکتا ہے۔ وہ مشکل سے مشکل مسائل حل کر سکتا ہے۔ سخت اور مہلک بیماریوں کے علاج تجویز کر سکتا ہے۔ مستقبل میں جو کچھ ہونے والا ہے' ہمزاد اس سے آگاہ کر سکتا ہے۔ ہمزاد مدفون خزانوں کے راز بتا سکتا ہے اور گم شدہ لوگوں کا سراغ بھی لگا سکتا ہے۔ وہ لوہے اور پتھر کی دیواروں میں سے گزر سکتا ہے اور خطرناک سے خطرناک جانوروں کو ٹھکانے لگا سکتا ہے۔ ہمزاد' دیوہیکل سے دیوہیکل شخص یا اشخاص کو چشم زدن میں زیر کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ لاتعداد پُراسرار قوتوں کا مالک ہے۔

ہمزاد کی لاتعداد اور پُراسرار قوتوں کے بارے میں پڑھ پڑھ کر میں خوابوں کی دنیا میں کھو گیا۔ قلمی نسخے میں لکھا تھا کہ ہمزاد کو قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ اسی وقت میں نے فیصلہ کیا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہمزاد کو قابو میں کرنے کا عمل کروں گا۔ ہمزاد کو قابو میں کرنے کے لیے متعدد عمل بھی قلمی نسخے میں درج تھے' تمام احتیاطیں اور طریق عمل بھی موجود تھا۔ عمل کی مدت چالیس دن تھی۔ اس کے ساتھ درج شرائط ایسی تھیں کہ مجھے بچوں کو پڑھانا ترک کرنا پڑا۔ میرے پاس بہت ہی کم پیسے جمع تھے جن سے میں نے یہ انتظام کیا کہ عمل کے دوران میں کھانے پینے کی پریشانی نہ ہو۔ پھر میں نے اپنے لیے ایک عمل کا انتخاب کیا اور عمل شروع کر دیا' لیکن عمل کے دوران میں مجھے عجیب' عجیب واقعات سے سابقہ پڑا اور میں اپنا عمل اکیس دن سے زیادہ جاری نہ رکھ سکا۔ میں نے دوبارہ عمل شروع کیا' مگر اس مرتبہ بھی ناکام رہا۔ میں طے کر چکا تھا کہ ہر حال میں اپنے ہمزاد کو بس میں کروں گا اس لیے تیسری مرتبہ عمل شروع کر دیا۔ دس دن سکون سے گزر گئے' مگر گیارہویں دن سے پھر وہی سب کچھ شروع ہو گیا' طرح طرح کی ڈراؤنی آوازیں' ہیبت ناک مناظر دل ہلا دینے والا شور' چیخیں' کراہیں اور سسکیاں! لیکن اب میں فیصلہ کر چکا تھا کہ کسی قیمت پر عمل کے دوران میں ان باتوں سے خوف زدہ نہیں ہوں گا۔ اس مرتبہ میں نے چالیس دن پورے کر لیے۔ میں نے چالیسویں دن جیسے ہی عمل ختم کیا' مجھے حویلی کے دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ کوئی مسافر تھا جو اسٹیشن کا راستہ پوچھ رہا تھا۔ میں نے اسے راستہ بتا دیا۔ اس نے جانے سے پہلے اجازت چاہی۔ میں نے کہا کہ جاؤ' اب کیا ہے! اس نے اسی طرح تین مرتبہ پوچھا کہ جاؤں' مجھے اجازت ہے؟ میں جھنجلا گیا اور بلند آواز میں کہا کہ ہاں جاؤ! میری طرف سے تمہیں جانے کی اجازت ہے۔

"اچھا تو اب میں چلتا ہوں' اب مجھے نہ بلانا!" یہ کہہ کر اس نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور پھر دوسرے ہی لمحے غائب ہو گیا۔

وہ ہو بہو میرا ہم شکل تھا' میرا ہمزاد! تو وہ اس بار بھی جل دے گیا! میری اجازت سے چلا گیا! میں بہت ملول ہوا' چیخا چلایا' مگر بے سود! دور دور تک اس کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ مجھے آخری فریب دینے میں بھی کامیاب رہا تھا۔ اب میرے سامنے پھر وہی پیسوں کا مسئلہ تھا' چالیس دن کے کھانے پینے کا انتظام یا مکمل تباہی اور رسوائی!

میں جس حویلی میں رہتا تھا' وہ بہت وسیع و عریض تھی۔ پرانے وقتوں کی اس حویلی کا آدھا حصّہ زمانے اور وقت کی دستبرد سے اب تک محفوظ تھا۔ آدھے حصّے میں میرا قیام تھا اور آدھا حصّہ شکستہ حالت میں بلکہ ملبے کی صورت میں پڑا تھا۔ میرے ذہن میں ترکیب آگئی۔ میں نے ایک ٹھیکیدار سے بات کر کے سارے ملبے کا سودا بہت سستے داموں کر ڈالا۔ اب میرے پاس پیسے آگئے تھے۔ میں نے سب سے پہلے اپنے کھانے پینے کا انتظام کیا اور اسی رات سے عمل بھی شروع کر دیا۔ میں اس عمل کے دوران میں پوری طرح چوکنّا تھا۔ بالآخر میں نے عمل کی مدت پوری کر لی۔ میں ابھی عمل پورا کر کے سویا ہی تھا کہ ملبا اٹھانے والے مزدوروں نے مجھے جگا دیا۔ وہ ایسا حیرت انگیز اور سمجھ میں نہ آنے والا واقعہ تھا۔ مزدوروں کو ملبا اٹھاتے ہوئے ایک بنیاد میں تقریباً دس فٹ نیچے کانسی کا ایک چراغ جلتا ہوا ملا تھا۔ میں' مزدوروں کے ساتھ وہاں پہنچا اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ یہ وہی چراغ تھا جس کی مدد سے میں عمل کر رہا تھا۔ میں نے وہ چراغ بنیاد سے اٹھا لیا اور آیت الکرسی پڑھ کر پھونک ماری' چراغ بجھ گیا۔ وہ چراغ اپنے ساتھ لے آیا۔

مزدور اس واقعے سے اتنے خوف زدہ ہوئے کہ کام چھوڑ کر بھاگ گئے۔ رات ہوئی تو میں نے اس چراغ کو گھس کر دیکھا' مگر کچھ نہ ہوا۔ تنگ آ کر میں نے اسے تکیے کے نیچے رکھا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور میں نے سوچا کہ اب مزید عمل نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ مقررہ وقت گزرنے کے باوجود میں اپنے ہمزاد کو بس میں نہیں کر سکا تھا' لیکن اسی رات مجھے وہ سب کچھ مل گیا جس کے لیے اتنی مصیبتیں برداشت کی تھیں۔ میں اپنے ہمزاد سے ہم کلام تھا اور اس سے شرائط طے کر رہا تھا۔

"تم نے کتنی مدت کے لیے مجھے اپنے قابو میں کیا؟" میرے ہمزاد نے سوال کیا۔

میں نے خوب سوچ سمجھ کر جواب دیا۔ "سو سال کے لیے۔"

اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک روح ہے اس لیے اگر ناپاکی کی حالت میں اسے طلب کیا

گیا تو نہ آسکے گا کیوں کہ روح پاک ہوتی ہے۔ جب بھی اسے بلایا جائے ہمیشہ پاک ہونا ضروری ہے۔

پھر اس نے میری اور میں نے اس کی شرائط مان لیں۔

اس رات کے بعد میری زندگی بدل گئی۔ میں یکسر بدل گیا۔ روپے پیسے کی میرے پاس کمی نہ رہی۔ میں نے چند ہی دنوں میں کھنڈر جیسی حویلی کی جگہ محل تعمیر کرا لیا۔ میرے تعلقات بھی اب کافی وسیع ہو گئے تھے۔ میرا شمار شہر کے معززین میں ہونے لگا۔ لوگ اس بات سے بھی آگاہ ہو گئے کہ میرے پاس کچھ نادیدہ اور پُراسرار قوتیں ہیں۔ وہ میرے معتقد ہوتے گئے۔ میں نے اب تک ایک فٹن بھی خرید لی تھی۔

ایک شام میں اپنی فٹن میں سیر کر کے واپس ہو رہا تھا کہ ایک گھر کے دریچے پر میری نظر پڑی۔ وہ لڑکی اتنی ہی حسین تھی کہ اسے ایک نظر دیکھ کر اس پر جان و دل قربان کیے جا سکتے تھے۔ میں اسے دیکھ کر بے تاب ہو گیا۔ اپنی محل نما حویلی میں پہنچ کر میں رات گئے تک اسی کے تصور میں کھویا رہا۔ ہمزاد سے میری یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ اس نے کہا کہ اے شیخ! اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے لیے اسی وقت اس لڑکی کو لا سکتا ہوں۔

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں! میں راضی ہو گیا۔ ہمزاد نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس لڑکی پر اپنی اصلیت ظاہر نہ کروں۔ اس کا نام رضیہ تھا۔ ہمزاد اسے سوتے ہوئے اٹھا لایا۔ میں نے اس پر خود کو کسی اور دنیا کا فرد ظاہر کیا۔ وہ کچھ یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں میری آرزوؤں کی تکمیل بن گئی۔ صبح دَم میں نے غسل کر کے ہمزاد کو طلب کیا اور رضیہ کو اس کے گھر بھیج دیا، اس وعدہ پر کہ آئندہ رات اسے پھر بلاؤں گا۔ اس نے میری کہانی، اپنے گھر والوں کو بھی سنائی کہ میں عالم ارواح کا ایک شہزادہ ہوں۔ اس کہانی پر کسی نے یقین نہیں کیا، مگر دوسری رات وہ پھر میری حویلی میں تھی۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ ایک روز مجھے معلوم ہوا۔ رضیہ ماں بننے والی ہے۔

کچھ دن بعد ہمزاد نے مجھ سے کہا۔ ”ضروری تو نہیں یہی شہر ہو۔ یہاں رضیہ کی نظر آپ پر پڑ سکتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم کسی بھی شہر سے چاند کے ٹکڑے لا سکتے ہو۔ میں بہر حال تنہا نہیں رہ سکتا۔“

اسی رات ہمزاد، میرٹھ کے نواب صاحب کی لڑکی کو اٹھا لایا۔ اس کی عمر یہ مشکل تیرہ سال تھی۔ وہ مجھے رضیہ سے بھی زیادہ پسند آئی اس لیے میں نے اس کے احتجاج کی بھی پروا نہ

کی۔ صبح اسے میرٹھ بھیج کر میں نے ہمزاد سے اس کی کیفیت منگائی۔ اس لڑکی نے اپنے گھر پہنچ کر ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ لڑکی کو حکیموں نے دیکھا اور اس کے بیان کی تصدیق کر دی۔ پھر عاملوں کو طلب کیا گیا کیوں کہ واقعہ پُراسرار تھا کہ بند دروازوں سے لڑکی کس طرح اٹھا لی گئی اور پھر کیسے اسے واپس پہنچا دیا گیا؟ عاملوں نے اس لڑکی کے گرد حصار کھینچ دیا۔ دوسری رات ہمزاد خالی ہاتھ واپس آیا تو میں اس لڑکی نرگس کے لیے بہت مضطرب تھا۔ ہمزاد نے بتایا کہ نرگس حصار میں ہے جس سے اسے نہیں نکالا جا سکتا۔ میں بہت تڑپا، مگر مجبوری تھی۔

صبح ہوئی تو پھر میں نے ہمزاد کو میرٹھ بھیجا تاکہ تازہ حالات سے آگاہ رہوں۔ نواب صاحب کے طبیب خاص اور عاملوں نے صبح ہوتے ہی نرگس سے پوچھا۔ ”رات تو کوئی نہیں آیا۔“

”ہاں وہ آیا تھا۔“ نرگس نے جواب دیا۔ ”مگر حصار کے باہر ہی سے اشارے کر کے مجھے بلا رہا تھا۔ وہ قریب نہیں آیا اور میں ہدایت کے مطابق حصار سے نہیں نکلی۔“

نواب صاحب یہ سن کر چراغ پا ہو گئے اور بولے۔ نرگس کو آخر کب تک اس طرح حصار میں بٹھا کر رکھا جائے گا؟“

طبیب خاص نے انہیں نرمی سے سمجھایا۔ ”حضور والا! عاملوں کا کہنا یہ ہے کہ وہ بھی کوئی عامل ہے جو گناہ کے راستے پر پڑ گیا ہے۔ وہ نرگس کو اپنے ہمزاد کے ذریعے اٹھوا لیتا ہے۔ سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ ہے کہاں؟ مگر یہ جاننے کے لیے نرگس کو پھر ایک بار اس کے پاس جانا پڑے گا۔“

یہ سن کر نواب صاحب پہلے تو بہت خفا ہوئے، مگر پھر راضی ہو گئے۔ نرگس کی اطراف سے عاملوں کا کھینچا ہوا حصار اٹھوا لیا گیا۔ طبیب نے نرگس سے تخلیے میں بات کی اور بہت دیر تک کچھ سمجھاتا رہا۔ میں اس بات سے بے خبر ہی رہا کہ یہ جال مجھے پھانسنے کے لیے بچھایا جا رہا تھا۔ عشق میں عقل گم ہو جاتی ہے اور یہی معاملہ میرے ساتھ تھا ورنہ نرگس کو مزید طلب نہ کرتا۔

میں نے جب سنا کہ نرگس حصار میں نہیں تو اسی رات سے بلوا لیا۔ اس نے جانے کیسے میرے شیطان کو برداشت کیا! بہر حال صبح پاک ہو کر جب میں اسے رخصت کرنے والا تھا اس نے مجھ سے ایک خواہش کا اظہار کیا۔ ”اے شہزادے! مجھے اپنی دنیا کی کوئی عمدہ چیز کھلاؤ۔“

نرگس کو بھی میں نے وہی کہانی سنائی تھی جو پہلے رضیہ کو سنا چکا تھا اس لیے اس نے مجھے شہزادے کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

بدایوں میں ظاہر ہے پیڑوں سے عمدہ کیا چیز ہو سکتی تھی۔ وہاں کے سے پیڑے سارے ہندوستان میں نہیں بنتے تھے۔ میں نے ہمزاد سے فوراً" پیڑے منگوائے جو کچھ اس نے کھانے اور کچھ مجھے کھلائے۔ اس کے بعد وہ بولی۔ "اب مجھے میرے گھر پہنچا دو۔" آج اس کا رویہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید اب وہ راہ پر آ گئی ہے' مگر بعد میں یہ خوش فہمی ہی ثابت ہوئی۔

پھر ہمزاد اسے لے گیا اور میں سو گیا۔ دوپہر کو میں سو کر اٹھا تو ہمزاد نے مجھے عجیب اطلاعات دیں۔ نرگس کے گھر پہنچتے ہی طبیب خاص اس سے ملنے آیا اور کچھ طلب کیا۔ نرگس نے مٹھی کھول دی۔ اس کے ہاتھ میں پیڑا تھا۔ اس وقت وہاں نواب صاحب بھی موجود تھے۔ حکیم نے فوراً" کہا۔ "وہ شخص بدایوں میں ہے۔"

نواب صاحب نے یہ سنتے ہی اپنے چند عاملوں اور خاص آدمیوں کو بدایوں روانہ کر دیا کہ وہاں جا کر سراغ لگائیں' کیا وہاں کوئی عامل ہے؟

میں یہ جان کر متفکر ہو گیا' مگر اس کے باوجود مجھے اپنی قوت کا اتنا نشہ تھا کہ محتاط رویہ اختیار نہیں کیا۔ شاید مجھے کچھ زیادہ ہی گھمنڈ ہو گیا تھا کہ میرے قبضے میں بہت بڑی طاقت ہے جسے کسی طرح زیر نہیں کیا جا سکتا۔ میں جب چاہوں ہر کام کر سکتا ہوں۔

وہ لوگ اسی دن بدایوں پہنچ گئے اور انہیں بہت جلد میرے بارے میں معلوم ہو گیا۔ وہ یہ اطلاعات لے کر میرٹھ واپس ہو گئے۔ نواب صاحب نے فوراً" اعلیٰ افسران سے رجوع کیا کہ مجھے حراست میں لے لیا جائے مگر بدایوں میرا وطن تھا جہاں ہر شخص مجھ سے مرعوب اور میرا معتقد تھا۔ شہر کوتوال اور پولیس کے بڑے بڑے ہندوستانی اور انگیز افسران مجھ سے اتنے متاثر تھے کہ انہوں نے دارالحکومت کو لکھ دیا۔ "ہم نے پوری تحقیق کر لی ہے کہ شیخ کرامت کے بارے میں درالحکومت کو غلط اطلاعات دی گئی ہیں۔ وہ شہر کے معززین میں سے ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔ جب نواب صاحب کو معلوم ہوا تو وہ بہت بگڑے کہ میرا کچھ نہیں بگڑا۔ ان کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ انہوں نے اس مرتبہ حکومت کے بڑے بڑے لوگوں پر دباؤ ڈالا کہ کسی طرح مجھے گرفتار کر لیا جائے۔ اس کے بعد پھر دارالحکومت سے بدایوں کے افسران کو تاکید کی گئی کہ ہم خود معاملے کی تحقیق کے لیے ایک کمیشن بھیج رہے ہیں اس لیے کہ یہ معاملہ میرٹھ کے نواب صاحب کا ہے جنہیں انگریزی سرکار بہرحال خوش رکھنا چاہتی ہے۔ یہ کمیشن بدایوں پہنچ کر تحقیقات کرے گا۔ اس کے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا جائے۔

ادھر نواب صاحب نے عاملوں سے بھی مشورہ کیا۔ جنہوں نے بتایا کہ میرے پاس یقیناً

ہمزاد کی قوت ہے جسے زیر کرنا' ان کے بس میں نہیں اور نہ ہی کوئی کسی ایسے شخص کا کچھ بگاڑ سکتا ہے جس کے قبضے میں ہمزاد ہو اس لیے کہ ہمزاد سینکڑوں ہزاروں افراد' پر بھاری ہے۔ ہاں ایک صورت ممکن ہے کہ اس شخص کو کسی طرح ناپاک ہونے کی حالت میں قتل کر دیا جائے اس لیے کہ اس حالت میں وہ ہمزاد سے مدد حاصل نہیں کر سکے گا۔

نواب صاحب کو یہ تجویز پسند آئی۔ انہوں نے اسی وقت اپنے پروردہ غنڈوں کو طلب کیا اور ان کے سپرد یہ کام کیا کہ بدایوں جا کر مجھے قتل کر دیں' لیکن اس وقت جب میں ناپاک ہوں۔ وہ غنڈے تعداد میں پندرہ بیس تھے۔ طے یہ ہوا کہ صبح یہ سب چند عاملوں کے ہمراہ بدایوں روانہ ہو جائیں گے اور کل رات ہی مجھے قتل کر دیا جائے گا۔

میں نواب صاحب کے گنڈوں کا منتظر تھا کہ وہ کب آئیں اور میں انہیں مزہ چکھاؤں' لیکن اس سے پہلے حکومت کا بھیجا ہوا کمیشن' بدایوں پہنچ گیا۔ اس کمیشن کا سربراہ جان ولیم عام انگریزوں کی طرح توہم پرست نہیں تھا۔ اس نے آتے ہیں میری گرفتاری کے احکام جاری کر دیے۔ میں نے ہمزاد کے ذریعے اس کمیشن اور اس کے ارکان کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر لیں تھیں۔ شہر کے تقریباً" تمام اعلیٰ حکام یا تو میرے مرید تھے یا معتقد نتیجہ یہ کہ جان ولیم تو میری جان کا دشمن' مگر کوتوال شہر اور ایس پی میرے ہم نوا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جان ولیم میرا غصہ ان پر اتارے اور انہیں کچھ نقصان پہنچا دے اس لیے بے چون و چرا کوتوالی پہنچ گیا۔ وہاں میں جان ولیم کی موجودگی تک حوالات میں رہا اور اس کے جاتے ہی کوتوال کے کمرے میں آ گیا۔ ہم سب نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھایا۔ اسی وقت مجھے ایک شرارت سوجھی اور میں نے ہمزاد کو حکم دیا کہ جان ولیم اور اس کے ساتھی پیٹر پر کھانا اور نیند حرام کر دی جائے۔ یہی ہوا بھی۔ جان ولیم اور پیٹر دونوں' ہمزاد کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنے۔ جب بھی ان کے سامنے کھانا چنا گیا' ہمزاد نے پلیٹیں ان کے کپڑوں پر الٹ دیں۔ شام کو جان ولیم بھوکا پیاسا کوتوالی آیا۔ تو ایس پی کو بتا چکا تھا کہ اقبال جرم کرانے کے لیے مجھ پر تشدد کرے گا۔ اس نے آتے ہی موٹے ہونٹ چمڑے کے کوڑے لانے کا حکم دیا اور مجھے کوتوالی کے صحن میں نیم کے درخت سے بندھوا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر کوڑے برساتا' کوڑے خود اس پر اور اس کے ساتھی پیٹر پر برسنے لگے۔ یہ صرف میں ہی دیکھ سکتا تھا کہ انہیں کوڑے مارنے والا ہمزاد ہے۔ آخر کار وہ دونوں' کوڑوں کی مار سے بچنے کے لیے کوتوالی سے بھاگ نکلے۔ میں نے وہ رات کوتوالی میں گزاری۔ جیسا کہ میں نے ہمزاد کو حکم دیا تھا کہ ولیم اور پیٹر پر نیند بھی حرام کر دی جائے' ہمزاد نے اس پر بھی عمل کیا' مگر بڑے دلچسپ انداز میں۔ ہمزاد رات بھر انہیں طرح طرح سے تنگ

کرتا رہا اور یہ واقعہ خود ایس پی نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا جو صبح آکر اس نے کوتوال کو بھی سنایا۔

آج ولیم کے نام دارالحکومت سے ایک خط بھی آیا تھا۔ اسے سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ مجھے بلا تاخیر گرفتار کر کے جیل بھی دیا جائے۔ ولیم کوتوالی پہنچا تو فوراً یہ خط اسے دے دیا گیا۔ مجھے پھر حوالات میں جانا پڑا اس لیے نہ تو میں وہ خط دیکھ سکتا تھا اور نہ یہ کہ ولیم اس وقت کیا لکھ رہا تھا۔ سب کچھ مجھے ہمزاد نے بتایا۔ غالباً جان ولیم مجھے جیل بھیجنے کا آرڈر لکھنا چاہتا تھا، مگر ہمزاد نے اس کا قلم پکڑ لیا۔ پھر اسی صبح لوگوں نے دیکھا کہ میری پراسرار قوتوں کے سامنے جان ولیم ایسے بااختیار، خود سر اور ضدی شخص نے سپر ڈال دی۔ مجھے خود جان ولیم کے حکم پر رہا کر دیا گیا۔

جب رات ہوئی تو میرا شیطان پھر جاگ اٹھا کیونکہ گزشتہ شب خالی گزری تھی۔ ہمزاد نے میری حیوانی جبلّت کا سامان فراہم کر دیا۔ پھر صبح قریب تھی کہ میرے دروازے پر موت نے دستک دی۔

میں جھنجلا گیا۔ اس وقت میرے ذہن میں دور دور تک یہ خیال نہ تھا کہ اس شہر میں میرے کچھ اور دشمن بھی پہنچ چکے ہیں جو میری جان کے درپے ہیں اور انہیں میرے قتل کا حکم دیا گیا ہے۔ میں غصے میں اٹھا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ وہاں میں نے واقعی اپنی موت کو منتظر پایا۔ نواب صاحب کے بھیجے ہوئے غنڈے میری طرف لپکے۔ میں نے ہمزاد کو پکارا مگر بے سود۔ میں اس وقت پاک نہیں تھا۔ اور مجھے یہ احساس ہو گیا تھا۔ یہ خیال ذہن میں آتے میں آنگن میں رکھی گھڑونچی کی طرف بھاگا، لیکن غنڈے پہلے ہی سے ہوشیار تھے۔ انہوں نے تمام گھڑے توڑ کر پانی بہا دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ فیصلہ کرتا۔ ان میں سے ایک نے مجھ پر حملہ کر دیا مگر میں گرتے گرتے سنبھلا اور ایک ٹوٹتے ہوئے گڑھے کا پانی اپنے سر پر ڈال لیا، پانی اتنا کم تھا کہ بہ مشکل میرے سر، چہرے اور گردن ہی کو بھگو سکا۔ اسی وقت کسی کی تلوار کام کر گئی۔ میرا سر کٹ کر زمین پر گرا اور گرتے ہی فضا میں بلند ہوتا چلا گیا۔ میرا کٹا سر جو پاک ہو چکا تھا، ہمزاد نے شہر سے دور ایک ویران خانقاہ میں پہنچا دیا۔ یہ جان کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ میں اب بھی زندہ تھا۔ ہمزاد نے بتایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اپنے جسم لطیف، یعنی ہمزاد کو قبضے میں کر رکھا ہے۔ جب تک جسم لطیف میں زندگی ہے، مادی جسم بھی نہیں مر سکتا، مگر اب میرا بقیہ جسم چھن جانے کی وجہ سے ہمزاد بھی بے بس ہو گیا تھا۔ اس کی بہت سی قوتیں وقتی طور پر مفلوج ہو گئی تھیں۔ ہمزاد نے مجھے بتایا کہ اس کی یہ قوتیں اس وقت تک واپس نہیں مل

سکتیں جب تک میں کوئی اور جسم حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ ہمزاد کی رائے یہ تھی کہ اب تک جن لڑکیوں سے میرے تعلقات رہے ہیں ان میں رضیہ مجھ سے سچی محبت کرتی ہے۔ رضیہ نے اسی لیے شادی سے بھی انکار کر دیا تھا اور میرے بچے کو پال رہی تھی کہ نواب صاحب کے غنڈوں نے میرے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ ہمزاد کی اطلاع کے مطابق رضیہ 'اختر' نامی جس لڑکے سے منسوب تھی، ہمزاد کا خیال تھا کہ رضیہ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتی ہے نیا جسم حاصل کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ نواب صاحب کے غنڈوں نے میرے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ ہمزاد کی اطلاع کے مطابق رضیہ 'اختر' نامی جس لڑکے سے منسوب تھی، وہ اب بھی رضیہ کی چشم عنایت کا طلب گار تھا اور اس نے بھی شادی نہیں کی تھی۔ ہمزاد کا خیال تھا کہ اگر رضیہ 'اختر' کے قتل پر آمادہ ہو جائے تو اختر کے جسم کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام بہت کٹھن تھا مگر اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔

ہمزاد جب پہلی رات مجھے خانقاہ سے رضیہ کی حویلی میں لے گیا تو وہ میرا کٹا ہوا سر دیکھتے ہی چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی، لیکن پھر میں تیسری رات رضیہ سے اظہار مدعا بیان کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اسے ایک اور کہانی سنائی۔ میں بغیر جسم کے بھی زندہ ہوں، یہ عجیب و غریب اور ناقابل یقین منظر دیکھ کر اور کچھ میری محبت سے مجبور ہو کر وہ اس خطرناک کام پر آمادہ ہو گئی۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے میں بہت خوش تھا کہ ایک بار پھر زندگی کی نعمتوں سے مالا مال ہو جاؤں گا۔

مجھے کچھ یہ احساس بھی تھا کہ رضیہ بہرحال ایک عورت ہے، کہیں ڈر نہ جائے اور اپنا فیصلہ بدل نہ دے۔ میں اسی لیے ہر شب اس سے ملتا رہا۔ ایک شب رضیہ سے طویل گفتگو کے سبب مجھے واپسی میں دیر ہو گئی۔ ہمزاد نے مجھے کئی بار مشورہ دیا تھا کہ صبح قریب ہے، نکل چلیں، مگر دیر ہو گئی۔ واپسی میں خانقاہ کی طرف لوٹتے ہوئے بستی کے لوگوں نے میرے سر کو فضا میں پرواز کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ شہر میں کھلبلی مچ گئی۔ ہمزاد یہ صورت حال دیکھ کر میرے سر کو ناقابل قیاس بلندیوں تک لے گیا اور میں جلد ہی لوگوں کی نظروں میں اوجھل ہو گیا جو آسمان کی طرف منہ اٹھائے تصویر حیرت بنے ہوئے تھے۔ اس اچانک ذہنی جھٹکے نے میرے حواس کو معطل کر دیا۔ اتنی اونچی پرواز میں نے کبھی نہیں کی تھی۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں نے خود کو اپنے عارضی مسکن خانقہ میں پایا۔ ہمزاد نے مجھے بتایا کہ لوگوں نے مجھے شناخت کر لیا ہے اور اب شہر بھر میں میرا ہی چرچا ہے۔ میرے معتقدین خوش ہیں اور دشمن ہراساں۔ میں سخت پریشان ہو گیا کیوں کہ ان حالات میں رضیہ پر بھی یہ راز فاش ہو سکتا تھا میں شیخ کرامت ہوں نہ کہ کسی دوسری دنیا کا باسی۔ کیے کرائے پر پانی پھرنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ رضیہ سے اب میری بجائے ہمزاد ملے، اسے بھٹکنے نہ دے اور اختر کے قتل میں مدد کرے۔ پھر ہمزاد میرے ہی حکم پر رضیہ کے پاس چلا گیا۔ ہمزاد سے جدائی کے سبب حالات سے میرا باخبر رہنا ممکن نہیں تھا۔ ہمزاد نے یہ مشکل بھی آسان کر دی اور مجھے ایک ایسی پُراسرار قوت بخش دی کہ جس کی مدد سے میں میلوں دور رہ کر بھی سب کچھ دیکھ اور سن سکتا تھا، اس کے علاوہ ہمزاد سے بھی ہم کلام ہو سکتا تھا۔

ہمزاد، رضیہ کے پاس پہنچا تو وہ اسے شیخ کرامت ہی سمجھی۔ وہ سمجھی تھی کہ مجھی سے مخاطب ہے۔ ہمزاد کے وجود سے وہ قطعی لاعلم تھی۔ میں جب چاہتا ہمزاد سے بات کر لیتا۔ ہمزاد مجھے جواب دیتا مگر رضیہ نہ سن پاتی۔ میرے عشق میں گرفتار ہو کر رضیہ جن اذیت ناک حالات کا شکار تھی، یہ اندازہ مجھے اب ہوا۔ رضیہ کے گھر والے کنوارپنے ہی میں اس کے ماں بن جانے پر اس سے شدید نفرت کرتے تھے کیوں کہ وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے تھے۔ ہمزاد اسے تسلیاں دیتا رہا کہ اختر کا جسم ملتے ہی میں اسے اپنی دنیا میں لے جاؤں گا۔ رضیہ کا منگیتر اختر پڑوس ہی میں رہتا تھا۔ اب ان دونوں کو ملانے کا مسئلہ تھا۔ دونوں گھرانوں میں سخت ناچاقی ہو چکی تھی لیکن اس مسئلے کو خود رضیہ نے حل کر دیا۔ رضیہ نے حویلی کے پچھواڑے والے باغ میں اختر سے ملنا شروع کر دیا۔ وہ ہر شب اختر سے جھوٹا عشق جتاتی۔ ہر چند کہ یہ ڈراما میرے ہی اشاروں پر کھیلا جا رہا تھا مگر اختر اور رضیہ کو ساتھ دیکھ کر مجھے شک ہوتا کہ رضیہ اپنے وعدے سے پھر نہ جائے۔ ایک رات رضیہ کی ماں نے ان دونوں کو اکٹھے دیکھ لیا اور خوش ہو گئی۔ اس نے دونوں خاندانوں کے دوبارہ ملاپ کے لیے راہ ہموار کی اور رضیہ کی شادی اختر سے طے کر دی۔ پانی اب سر سے اونچا ہو رہا تھا اور اختر کا فوری قتل ضروری ہو گیا تھا۔ ہمزاد نے رضیہ کو قتل پر اکسانا شروع کر دیا۔ پھر رضیہ کو اس نے ایک پھول دیا کہ ملاقات کے دوران میں وہ اس پھول کو سنگھا دے جب اختر بے ہوش ہو جائے تو پھر اس کی گردن پر خنجر پھیر دے۔ لمحہ لمحہ گنتے آخر وہ رات بھی آ گئی۔ ہمزاد مجھے بھی وہاں لے گیا تاکہ دوسرا جسم مل جائے۔ اب میں بہ ذات خود اس غار میں موجود تھا جسے اب تک اپنی چشم تصور کی قوت سے دیکھتا رہا تھا۔ ہمزاد نے میرا سر، ایک پیڑ کی دو شاخوں کے درمیان رکھ دیا تھا۔ برابر ہی وہ کنج تھا جس میں رضیہ اور اختر مصروف راز و نیاز تھے۔

جب دیر ہو گئی تو ہمزاد نے رضیہ کو مخاطب کیا۔ "رضیہ اور وقت مت ضائع کرو! اسے زیادہ باتوں میں نہ الجھاؤ۔" ہمزاد کی آواز صرف میں اور رضیہ ہی سن سکتی تھی۔

رضیہ نے فوراً ہی اختر کو ہمزاد کا دیا ہوا پھول سنگھا دیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

فوراً ہی رضیہ کے ہاتھ میں خنجر نظر آیا، جسے اس نے اختر کی گردن پر رکھ کر تیزی سے پھیرنا شروع کر دیا۔

پھر جیسے ہی اختر کا سر کٹ کر گرا، ہمزاد نے میرا سر، شاخوں کے درمیان سے اٹھایا اور نیچے کنج کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا کٹا ہوا سر دیکھ کر رضیہ کی چیخ نکل گئی۔ اب وہ بالکل پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ اسی لمحے ایک جھٹکے کے ساتھ میرا کٹا ہوا سر، اختر کی گردن سے مل گیا۔ اسی وقت تیز تیز سیٹیاں بجنے اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ وقت ضائع کیے بغیر ہمزاد نے مجھے اٹھایا اور فضا میں بلند ہوتا چلا گیا۔ رضیہ چیختی ہی رہ گئی۔

فضا میں بلند ہوتے ہی میں نے پولیس والوں کو دیکھ لیا تھا۔ ہمزاد مجھے لے کر پھر اسی قدیم ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر ہمزاد نے مجھے سلا دیا۔ میں جاگا تو رضیہ کا خیال آیا۔ میں نے ہمزاد کی عطا کردہ قوت کی مدد سے اسے تلاش کر لیا۔ میری چشم تصور نے اسے حوالات میں دیکھا اور میں سب کچھ سمجھ گیا۔ رضیہ اختر کے قتل میں ماخوذ تھی۔ حالات جاننے کے لیے میری تصور کی قوت بدایوں کے گلی کوچوں میں بھٹکتی رہی۔ لوگوں کی گفتگو سن کر مجھے معلوم ہوا کہ جس رات اختر کا قتل ہوا، اس کا دوست عابد بھی ایک قریبی کنج میں موجود تھا جو اپنے دوست کی محبوبہ کو دیکھنا چاہتا تھا اور اس میں خود اختر کی مرضی بھی شامل تھی۔ حالات اتنی تیزی سے پیش آئے کہ عابد اپنے دوست کو قتل ہونے سے نہ بچا سکا۔ لیکن اس نے فوراً پولیس کو مطلع کر دیا۔ رضیہ کی چیخیں سن کر اس کے اور اختر کے گھر والے بھی پولیس کے ساتھ ہی باغ میں پہنچ گئے جہاں انہیں صرف اختر کا کٹا ہوا سر ہی مل سکا۔ رضیہ نے حالات سے گھبرا کر پولیس کو میرے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیا جو میں نے اسے اپنے متعلق بتایا تھا اور یہ بھی بتا دیا کہ میں نے اسے کس طرح قتل پر آمادہ کیا! پولیس کے لیے یہ واقعہ حیرت انگیز تھا اور شہر والے بھی گومگو کے عالم میں تھے۔ میری حالت یہ تھی کہ مجھے اختر کے جسم سے مکمل رابطہ قائم کرنے کے لیے اکیس دن کی ضرورت تھی۔ ان اکیس دن سے پہلے میں اور ہمزاد رضیہ کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ جس دن رضیہ عدالت میں پیش ہوئی میں سترہ دن پورے کر چکا تھا۔ قتل کا عینی شاہد عابد موجود تھا اور دوسرے لوگ بھی جنہوں نے بعد میں رضیہ کے ہاتھ میں خون آلود خنجر دیکھا تھا۔ ان حالات میں رضیہ کو پھانسی کی سزا کا حکم ہو جانے میں کوئی کسر نہ تھی۔ میں، رضیہ کے مقدمے کی ساری کارروائی دیکھ اور سن رہا تھا، اس وقت میرے بس میں صرف یہی تھا۔ آخر کارروائی ختم ہوئی۔ آئندہ تاریخ فیصلے کی تھی۔ تاریخ آئندہ ہفتے کی پڑی اور میں خوش ہو گیا۔ بقیہ چار دن سخت عذاب اور انتظار میں گزرے۔ پوری طرح صحت یاب ہونے کے بعد اب

میرے لیے یہ مسئلہ تھا کہ میں' بدایوں میں کس طرح رہوں؟ ہمزاد کے مشورے پر میں نے جلد ہی اپنے وطن کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا' لیکن رضیہ کی رہائی سے پہلے میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔

جس دن رضیہ کے مقدمے کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا' ہمزاد میرے حکم پر صبح ہی کچہری پہنچ گیا۔ عدالت بھری ہوئی تھی۔ ہر شخص فیصلہ سننے کا منتظر تھا۔ جج نے قلم اٹھایا۔ میں اپنی چشم تصور سے خانقاہ میں آنکھیں بند کیے یہ سب دیکھتا رہا۔ اچانک مجھے جج کی کرسی کے پیچھے ہمزاد نظر آیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب کیا ہونے والا ہے! جج پر ہمزاد پوری طرح مسلط ہو چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا اور پھر خود اپنے لکھے کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ ہمزاد نے اس کی حیرت پر قابو پاتے ہوئے اسے فیصلہ سنانے پر مجبور کر دیا۔ جج کی آواز قطعی سپاٹ اور بے تاثر تھی۔ اس نے رضیہ کو باعزت طور پر رہا کر دیا تھا اور دلیل یہ دی کہ رضیہ کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے جو اس کے عجیب بیان سے ظاہر ہے اور اختر کا قتل بھی اسی کا نتیجہ تھا۔

فیصلہ مختصر ہونے کے باوجود جامع تھا۔ رضیہ بچ گئی۔ بدایوں میں وہ میری آخری رات تھی جو میں نے رضیہ کی حویلی میں گزاری۔ میں نے رضیہ کو یقین دلا دیا تھا کہ چند دن کے لیے اپنی دنیا میں واپس جانے پر مجبور ہوں' چند دن بعد آ کر اسے ہمیشہ کے لیے اپنی دنیا میں لے جاؤں گا۔

صبح سے پہلے میں خانقاہ لوٹ آیا اور غسل کر کے میرٹھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ روانگی کے وقت ہمزاد نے مجھے احتیاطاً" بے ہوش کر دیا تاکہ اونچی پرواز کے وقت میرے حواس پر برا اثر نہ پڑے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک کنویں کی منڈیر پر لیٹے ہوئے پایا۔ یہ میرٹھ کا ایک قریبی گاؤں تھا جہاں سے مجھے میرٹھ پہنچنا تھا۔ فضا میں پرواز کرتے ہوئے ہمزاد نے مجھے کچھ فاصلے ہی پر اتار دیا تھا۔ چند منٹ بعد ہی ہم شہر میں داخل ہو گئے۔ وہ رات میں نے ایک سرائے میں بسر کی۔ صبح ہوتے ہی ہمزاد نے میری جیبیں روپوں سے بھر دیں تاکہ قیام کا مسئلہ حل ہو جائے۔ میں نے بیگم پل کے علاقے میں ایک مکان خرید لیا۔ نواب صاحب کی کوٹھی بھی اسی علاقے میں تھی اور میرے مکان سے اس کا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ اسی دن ہمزاد نے مکان کو اعلیٰ درجے کے سامان سے آراستہ کر دیا۔ میں نے مصلحتاً اپنا نام وہاں رشید یار جنگ ظاہر کیا تھا۔ پڑوسیوں پر میرا یہی تاثر قائم ہوا تھا کہ میرا تعلق نوابین کے خاندان سے ہے۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر مجھے نواب صاحب کا خیال آیا۔ انھی سے انتقام لینے کی خاطر میں نے میرٹھ کا رخ کیا تھا ورنہ کہیں بھی چلا جاتا۔ ان کی خبر لینے میں نے ہمزاد کو روانہ کیا اور اپنے تصور کی قوت سے اسے دیکھتا رہا۔ ہمزاد ایک بڑی سی حویلی میں داخل ہو گیا جس کی شان و

شوکت میری بدایوں والی حویلی سے کم نہیں تھی۔ پھر وہ ایک بڑے کمرے میں پہنچا جہاں میز پر ایک ضعیف شخص اور ایک نوجوان لڑکا شراب پینے میں مصروف تھا۔ ہمزاد سے مجھے معلوم ہوا کہ یہی ضعیف شخص میرٹھ کا نواب ہے اور یہ لڑکا اس کا منظور نظر ہے۔ ہمزاد نے کام دکھایا۔ ایک مرتبہ جب وہ لڑکا شراب کا گلاس نواب صاحب کے ہونٹوں کی طرف بڑھا رہا تھا تو ایک دم اس نے ساری شراب ہی نواب صاحب کے منہ پر پھینک دی۔ نواب صاحب' لڑکے پر سخت برہم ہو کر اٹھ کر کھڑے ہوئے حالانکہ یہ کارنامہ ہمزاد کا تھا۔ نواب صاحب کھڑے ہوئے تو ہمزاد نے اس کے پیروں کے نیچے بچھا ہوا قالین کھینچ لیا۔ وہ چیختے ہوئے منہ کے بل گر پڑے۔ پورا گھر وہاں جمع ہو گیا۔ نرگس کو بھی اتنے دن بعد دیکھ کر مجھے مسرت ہوئی۔ نواب صاحب کا منظور نظر اس ہنگامے میں غائب ہو گیا۔ نواب صاحب زخمی ہو گئے۔ اب میں نے ہمزاد کو واپس بلا لیا اور اس سے نواب کے غنڈوں کے بارے میں پوچھا جنھوں نے اچانک حملہ کر کے مجھے بدایوں میں قتل کیا تھا۔ ہمزاد نے کہا کہ آپ چاہیں تو میں آج ہی رات ان سب کو قتل کر دوں گا مگر میں نے اسے روک دیا۔ میں سب کو تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا' وہ بھی باری باری! ہمزاد نے مجھ سے کہا کہ آپ بھی ساتھ چلیں۔ آپ کو کرنا کچھ نہیں ہے مگر صرف قاتلوں کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہے۔ میں راضی ہو گیا۔

ہمزاد مجھے دہلی بازار کے ایک تاڑی خانے میں لے گیا۔ وہاں اس نے ایک شخص کیطرف اشارہ کر کے بتایا کہ آپ کے قاتلوں میں سے ایک یہ ہے۔ پھر اس کا جو حشر ہوا۔ وہ بہت ہولناک تھا۔ لکڑی کے جن کندوں پر بیٹھ کر وہ لوگ تاڑی پی رہے تھے' ان میں سے کچھ خالی تھے۔ تاڑی پینے والوں نے معاً" ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ لکڑی کی ایک کندی دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں بلند ہوئی اور اس قاتل کے سر پر پڑی۔ پھر تو کندی اس وقت تک نہیں رکی جب تک قاتل کے سر کا بھرتا نہ بن گیا۔ اس بھیانک قتل نے میرے اعصاب پر بھی برا اثر ڈالا اور میں فوراً" ہی ہمزاد کو لے کر اپنی حویلی کی طرف لوٹ گیا۔ ابھی میں اپنی قیام گاہ سے کچھ دور ہی تھا کہ ایک مکان کے دروازے پر ایک برقع پوش لڑکی کو نقاب الٹے دیکھا جو کسی نوجوان کو الوداع کہہ رہی تھی۔ اس کی ایک ہی جھلک مجھے پاگل بنا گئی۔ وہ چلی گئی' مگر میں بت بنا وہیں کھڑا رہا۔ ہمزاد نے مجھے ٹوکا تو میں حواس میں آیا۔ حویلی پہنچ کر میں نے ہمزاد سے اس فتنہ قیامت کے بارے میں معلوم کیا۔ ہمزاد نے بتایا کہ وہ نواب صاحب کے طبیب خاص کی بیٹی مہ پارہ ہے۔ طبیب خاص کا میں پہلے ہی دشمن تھا' میرے قتل کی سازش میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آج رات مہ پارہ میرے پاس ہو گی۔ رات گئے ہمزاد اسے اٹھا لایا' لیکن

جیسے ہی میں اُس کے قریب گیا' وہ خود بہ خود اٹھ بیٹھی اور بولی۔ آج تک کوئی میری مرضی کے بغیر مجھے ہاتھ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ تم نے میری مرضی کے خلاف مجھے اٹھوایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں خود تمہاری مردانہ وجاہت دیکھ کر کچھ نہ کہتی' لیکن اب یہ ناممکن ہے۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی اثر نہ لیا۔

وہ مجھے اپنی طرف دیکھ کر ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "میں کہتی ہوں' رک جاؤ! جو شعبدے تمہیں آتے ہیں' میں بھی ان سے واقف ہوں۔" پھر بھی میں نہ رکا تو اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے' آؤ! تمہیں میری قوت کا اندازہ ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر خود اس نے میری طرف ہاتھ بڑھادیا۔ "تو پکڑو میرا ہاتھ!"

اب مجھے بھی اس کی دیدہ دلیری پر غصہ آگیا اور میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو اپنی طرف کھینچنا چاہا۔ جیسے ہی میرا ہاتھ' اس کے ہاتھ سے مس ہوا مجھے بہت زور کا جھٹکا لگا جیسے میں نے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔

وہ مجھے زمین پر گرتے دیکھ کر زور سے ہنسی۔ "بس ختم ہو گئی مردانگی! میں جا رہی ہوں' اگر روک سکتے ہو تو روکو۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

اسی وقت میں زور سے چیخ اٹھا۔ "ہمزاد!...... ہمزاد!"

ہمزاد میرے حکم پر مہ پارہ کے پیچھے لپکا' لیکن جب وہ لوٹا تو اکیلا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مہ پارہ کے پاس کچھ ایسی ناقابل فہم قوتیں ہیں جن کے بل بوتے پر اس نے کچھ دیر کے لیے مجھے بھی معطل کر دیا۔ وہ قوتیں ہمزاد کے پاس بھی نہیں تھیں۔ ان قوتوں کی تفصیل جاننے کے لیے ہمزاد کو تین دن درکار تھے۔ میری عزت نفس کو مہ پارہ نے جو ٹھیس پہنچائی تھی' اس نے مجھے اندر سے پاش پاش کر دیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہمزاد کے باوجود میں بے بس تھا۔ ستم یہ کہ اس بے عزتی کا انتقام لینا بھی فی الحال میری دسترس سے باہر تھا۔ اس وقت میری شکست خوردہ انا کوئی مشغلہ چاہتی تھی۔ اس کے لیے نواب صاحب کے ایک غنڈے کو منتخب کیا۔ وہ بھی میرے قاتلوں میں شامل تھا۔ ہمزاد کے ہمراہ میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ غنڈے کے پاس اس وقت ایک حسین و بے باک طوائف موجود تھی۔ اس حسین طوائف کو دیکھ کر میرے اندر چھپا ہوا برا آدمی مچلنے لگا۔ غنڈے کو قتل کرنے کے بعد میں اس شانتی نامی طوائف کو اپنی حویلی میں اٹھوا لایا۔ اس کی بے باکی مجھے بہت پسند آئی۔ صبح ہوتے ہی میں نے اسے ہمزاد کے ذریعے اس کے ٹھکانے؟ دہلی بازار میں پہنچا دیا۔ اسی صبح میں نے ہمزاد کو مہ پارہ کی پُراسرار قوتوں کے بارے میں تفصیل جاننے کے لیے تین دن کی مہلت دے دی۔ دن بھر سو کر شام

ہوتے ہی میرٹھ کے بازار حسن دہلی بازار میں پہنچ گیا۔ اپنے تصور کی قوت سے میں نے شانتی کو تلاش کیا اور اس کے کوٹھے پر چڑھ گیا۔ میں نے شانتی کی "مائی جی" سے بات کر کے شانتی کو صرف اپنا پابند کر لیا۔ وہ رات میں نے امینہ بائی کے کوٹھے پر شانتی کے ساتھ گزاری۔

دوسرے دن جب میں رات بھر کی تھکن سے نڈھال اپنی حویلی میں سو رہا تھا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اپنے تصوّر کی قوت کو بروئے کار لا کر معلوم کیا کہ حویلی کے دروازے پر ایک باریش شخص' پولیس کے ہمراہ موجود ہے مجھے یاد آیا کہ صبح دہلی بازار سے لوٹتے ہوئے بھی یہی باریش شخص مجھے دیکھ ٹھٹکا تھا۔ میں خطرہ محسوس کر کے حویلی کے پچھلے دروازے سے فرار ہو گیا۔ اب پھر میری منزل دہلی بازار تھی۔ میں شانتی کے پاس خود کو پولیس کی دسترس سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے اپنی پُراسرار قوتوں کے ذریعے یہ معلوم کر لیا کہ وہ باریش شخص' نواب صاحب کے انہی عاملوں میں سے تھا جو مجھے بدایوں میں دیکھ چکے تھے۔ مجھ پر سب کچھ روشن ہو گیا۔ میں نے اپنے تصوّر اور قوت سماعت سے نواب صاحب' طبیب خاص اور عاملوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔ دراصل جب نواب صاحب کو اپنے باریش عامل سے یہ معلوم ہوا کہ میں زندہ ہوں تو انہوں نے پولیس حکام سے رجوع کر کے مجھے گرفتار کرانا چاہا' مگر میں خوش قسمتی سے بچ نکلا۔ ہمزاد کے لوٹنے میں ابھی دو دن باقی تھے اس سے پہلے میں' نواب صاحب کے عاملوں کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتا تھا۔

یہ تین دن مجھے تین صدیاں محسوس ہوئے تھے اور ہمزاد لوٹ آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ گذشتہ رات ہی واپس آچکا تھا۔ صبح ہونے تک وہ میرے تمام دشمنوں کو ٹھکانے لگاتا رہا تھا۔ اب ان میں سے کوئی زندہ نہیں تھا۔ مجھے اب نرگس کے سوا میرٹھ میں کوئی پہچاننے والا نہیں تھا جس سے فی الحال مجھے کوئی خطرہ نہ تھا۔ میں ہمزاد کے ساتھ شانتی کے کوٹھے سے اپنی حویلی میں آگیا۔ میں' مہ پارہ کی پُراسرار قوت کے بارے میں سب کچھ جاننے کے لیے بے چین تھا۔ ہمزاد سے یہ سن کر میرا خون کھول اٹھا کہ مہ پارہ سے ٹکر نہ لی جائے تو بہتر ہے۔ ہمزاد کا کہنا تھا کہ یہ میری اور اس کی سلامتی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ لڑکیاں اور بھی مل سکتی تھیں مگر یہ مسئلہ میری عزت نفس کا تھا۔ ذلیل اور بزدل بن کر زندہ رہنے سے میرے نزدیک مر جانا کہیں بہتر تھا۔ میں نے ہمزاد کے مشورے کو رد کر دیا اور اس سے وہ تفصیلات معلوم کیں جو اب تک اس نے حاصل کی تھیں۔

پھر ہمزاد نے مجھے جو کچھ بتایا' وہ پُراسرار اور عجیب ہونے کے علاوہ تشویش ناک بھی تھا کہ بظاہر معمولی سی لڑکی نظر آنے والی مہ پارہ میں اتنی پُراسرار قوتیں موجود ہیں۔ ہمزاد سے مجھ

جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ تھا۔

میرٹھ کے نواب صاحب کے طبیب خاص کا نام ارشاد احمد خان ہے اور اسی کی بیٹی مہ پارہ تھی۔ ایام جوانی میں ارشاد احمد خان نے بڑے نواب کے ساتھ افریقہ کا سفر کیا تھا۔ اسی سفر کے دوان میں اس نے ایک افریقی ساحرہ سے شادی کرلی تھی اور اسے ہندوستان لے آیا تھا۔ مہ پارہ جوان ہوئی تو اس کی ساحرہ ماں مر گئی، مگر اپنی موت سے پہلے اپنی تمام پُراسرار قوتیں مہ پارہ کو سونپ گئی جن کے بل بوتے پر مہ پارہ ہمیشہ جوان بھی رہ سکتی تھی۔ ان قوتوں کو برقرار رکھنے کی خاطر مہ پارہ کو ہر سال چند مخصوص راتوں میں کچھ عمل کرنا پڑتا تھا۔ اب اس عمل میں صرف سات دن باقی رہ گئے تھے۔ ہمزاد کا کہنا تھا کہ اگر کسی طرح وہ عمل کے دوران میں مہ پارہ کی توجہ ہٹانے میں کامیاب ہو گیا تو اس پر قابو پانا ممکن ہو جائے گا۔ اسی عرصے میں مہ پارہ نے اپنی پراسرار قوت کے ذریعے تنبیہہ کی تھی کہ میں اس سے ٹکرانے کی کوشش نہ کروں اور خیریت چاہتا ہوں تو یہ شہر چھوڑ کر چلا جاؤں۔ مہ پارہ کوئی باکردار لڑکی نہیں تھی، مگر اسے مجھ سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ وہ کسی قیمت پر میرے سامنے جھکنے پر آمادہ نہ تھی بلکہ اب تو وہ مجھے شہر چھوڑنے کی دھمکی دے رہی تھی۔ میں اسے نیچا دکھانے کے درپے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمزاد کی تاکید کے باوجود میں اس خطرناک، پُراسرار لڑکی سے ٹکر لینا چاہتا تھا۔ ہمزاد نے مجھے یقین دلایا کہ وہ پوری کوشش کرے گا کہ مہ پارہ اپنا عمل پورا نہ کر سکے۔ ہمزاد کی بات سن کر جیسے مجھ میں زندگی آ گئی۔ "مجھے تم پر ناز ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں تو زیادہ صحیح ہے کہ مجھے خود پر ناز ہے اس لیے کہ تم میرا ہی تو جسم لطیف ہو۔ تم مجھ سے جدا کب ہو۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ مہ پارہ نے مجھے صرف دھمکی دی ہے اس سلسلے میں وہ کوئی عملی قدم نہیں اٹھائے گی، لیکن یہ میری بھول تھی۔ جلد ہی مجھے اس کی طرف سے کچھ اذیتیں برداشت کرنا پڑیں۔ ہمزاد بھی مجھے ان اذیتوں سے بہ مشکل بچا سکا۔ مہ پارہ چاہتی تھی کہ میں اس کا شہر چھوڑ کر چلا جاؤں، لیکن میں اپنی یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ ایک لڑکی کے مقابلے میں بھاگ جاؤں۔ میں ہمزاد پر بہت بگڑا، لیکن وہ بہ دستور یہی کہتا رہا کہ ایک ہفتہ گزرنے سے پہلے کچھ نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف مہ پارہ مجھے ایک دن کے لیے بھی اپنے شہر میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر ہمزاد کے مشورے پر میں نے یہ چال چلی کہ مہ پارہ سے چکنی چپڑی باتیں کر کے اس سے ایک ہفتے کی مہلت لے لی۔

مہ پارہ نے مجھ پر اسی دوران میں ایک اور ضرب لگائی تھی کہ حسین اور میری پسند شانتی کو مجھ سے چھین کر میرٹھ کے نواب صاحب کی داشتہ بنوا دیا تھا۔ میں نے نواب صاحب

ے انتقام لینے کے لیے ان کی بیٹی نرگس کو اپنا ہدف بنا رکھا تھا۔ ایک شب، تیسرے پہر کے قریب نرگس میری حویلی سے نکل کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئی اور اس نے باپ کو سب کچھ بتا دیا۔ نواب صاحب نے پولیس کو اطلاع کر دی۔ یہ الگ بات کہ ہمزاد کے ہوتے میری گرفتاری ممکن نہ تھی ہمزاد نے ان پانچوں پولیس والوں کو ہلاک کر دیا اور مجھے دیلی بازر کی اس سرائے میں لے جا کر ٹھہرایا جہاں میں نے میرٹھ آ کر پہلی رات گزاری تھی۔ دوسرے دن میں نے عبدالجبار نامی ایک شخص سے اس کا مکان خرید لیا۔ عبدالجبار جوئے کا دھنی تھا۔ اس نے اپنی ساری دولت جوئے میں برباد کر دی تھی۔ مکان بیچ کر اسے جو رقم حاصل ہوئی، اسے بھی جوئے میں ہار گیا۔ اگر میں اس کی مدد نہ کرتا تو اس کی حالت بہت خستہ ہو جاتی۔ میں نے اسے اس عمل کے بارے میں بتایا جس کے ذریعے وہ اپنے ہمزاد کو حاصل کر سکتا تھا۔ دراصل یہ تدبیر مجھے میرے ہمزاد نے سمجھائی تھی کہ اگر دو ہمزاد مل جائیں تو مہ پارہ سے بہ آسانی ٹکر لے سکتے ہیں۔ دراصل ہمزاد نے مجھ سے سات دن کی جو مہلت لی تھی، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ہمزاد کوشش کے باوجود مہ پارہ کے عمل میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکا تھا۔ اس کے بعد مہ پارہ کی طرف سے کچھ ایسے شدید حربے آزمائے گئے کہ جان بچانا مشکل ہو گئی۔ مجبوراً میں میرٹھ سے بھاگ کھڑا ہوا، لیکن اب مہ پارہ مجھے آسانی سے نہیں نکلنے دینا چاہتی تھی۔ میں جس ٹرین میں بیٹھ کر فرار ہو رہا تھا، اسے ایک اسٹیشن پر روک لیا گیا اور پولیس نے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ معلوم ہوا کہ پولیس کو کسی مجرم کی تلاش تھی۔ پولیس اب اس بات کی منتظر تھی کہ میرٹھ سے ایک اعلی افسر وہاں آ کر اس مجرم کو شناخت کرے جو اس ٹرین میں بیٹھ کر فرار ہو رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجرم میں ہی ہو سکتا ہوں اور یہ ساری شرارت مہ پارہ کی ہے۔

ہمزاد میرے ساتھ تھا اس لیے مجھے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی اور میں پولیس سے جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہمزاد نے مجھے ایک تحصیل "کول" میں پہنچا دیا۔ یہی وہ تحصیل تھی جو بعد میں علی گڑھ شہر بنی۔ میں نے اس چھوٹی سی بستی کی ایک سرائے میں قیام کیا اور بستر پر لیٹ کر اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ مہ پارہ سے ذلت آمیز شکست میرے ضمیر کو کچوکے لگا رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، کیا نہ کروں! دن اسی سوچ بچار میں گزرا۔ جب رات ہوئی تو میری روح کا بوجھ اور بڑھ گیا۔ ان سب باتوں سے ذہنی قرار حاصل کرنے کے لیے میں نے ہمزاد سے کسی حسین سہارے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے میری آرزو پوری کر دی۔ اچانک پولیس نے سرائے پر چھاپا مارا اور دروازہ توڑ کر میرے کمرے میں گھس آئی۔ یہ شرارت بھی مہ پارہ کی تھی۔ میں اس وقت پاک نہیں تھا اس لیے ہمزاد کو اپنی مدد کے

لے نہیں بلا سکا۔ پولیس مجھے گرفتار کر کے لے گئی۔ میرے ماضی کے جرائم رنگ لا کر رہے پولیس جو میری ناک میں رہا کرتی تھی، مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ کر کھل کھیلی۔ ان لوگوں نے مجھے مارا پیٹا، پھر ایک دن حوالات میں رکھ کر دوسرے دن جیل بھیج دیا۔ کیوں کہ میرا مقدمہ عدالت میں پیش کرنے سے پہلے وہ اچھی طرح اپنی تیاریاں مکمل کر لینا چاہتے تھے۔ جیلر کو بتا دیا گیا تھا کہ میں بہت خطرناک مجرم ہوں اس لیے مجھے جیل میں سخت اذیتیں پہنچائی گئیں۔ میں اس وقت بے بس تھا، کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر مجھے غسل کرنے کا موقع مل جاتا تو پاک ہو جانے کے بعد ہمزاد کو طلب کر سکتا تھا۔ یہ موقع مجھے کئی دن بعد ملا۔ نہاتے ہی میں نے ہمزاد کو طلب کیا۔ میں جیل کے کارندوں سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ ہمزاد نے میرے اشارے پر ایک ڈنڈے سے ان کی پٹائی شروع کر دی۔ قیدی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ ایک ڈنڈا فضا میں خود بہ خود حرکت کر رہا ہے اور کارندوں کی پٹائی ہو رہی تھی۔ شور و غل کی آوازیں سن کر جیلر بھی وہاں پہنچ گیا اور پھر میرے ایما پر اس کی پٹائی شروع ہو گئی۔ جب مدد کے لیے چلاتے چلاتے اس کا حلق خشک ہو گیا تو میں نے اس پر تشدد رکوا دیا، پھر اس کا مزاج پوچھا۔ یہ واقعہ اتنا پُراسرار تھا کہ جیلر میرے قدموں پر گر پڑا۔ اس نے مجھے کوئی پہنچا ہوا ولی سمجھ لیا تھا۔ تمام قیدی بھی یہی سمجھ رہے تھے چنانچہ اس روز کے بعد سے میں جیل میں نوابوں کی سی زندگی گزارنے لگا۔

اگر میں چاہتا تو ہمزاد کی مدد سے فرار ہو سکتا تھا۔ لیکن فی الحال میرٹھ کا رخ کرنا میرے لیے خطرناک ثابت ہوتا۔ میں چاہتا تھا کہ عبدالجبار کو بھی وہیں جیل میں بلواؤں اور اس "گوشہ عافیت" میں اس سے ہمزاد کو قابو کرنے کا عمل کرواؤں۔ میرے ہمزاد نے ایسا چکر چلایا کہ عبدالجبار کے ہاتھوں ایک انگریز کا قتل کروا دیا۔ اس سنگین جرم میں عبدالجبار کو کول کی جیل آنا پڑا۔ وہ مجھے جیل میں دیکھ کر حیران رہ گیا، لیکن میں نے اسے مطمئن کر دیا۔

جیلر اب میرا بندہ بے دام تھا۔ میرے اشارے پر اس نے جیل کا ایک کمرا عبدالجبار کے لیے صاف کرا دیا۔ میں چاہتا تھا کہ جبار اس کمرے میں بیٹھ کر ہمزاد کو قابو میں کرنے کا عمل کرے۔ میں نے جبار کو اچھی طرح بتا دیا کہ اس عمل کے دوران میں اسے خوف ناک واقعات سے دوچار ہونا پڑے گا، لیکن وہ خوفزدہ ہوئے بغیر اپنا عمل جاری رکھے۔ اس کے بعد میں نے اسے بتانا شروع کیا کہ وہ اپنے ہمزاد کو کس طرح قابو کر سکتا ہے!

پھر جبار نے اپنے ہمزاد کو قابو کرنے کا عمل شروع کر دیا۔ عمل کے دوران میں اگر میرا ہمزاد اس کی مدد نہ کر رہا ہوتا تو وہ کبھی کا عمل ترک کر چکا ہوتا۔ عمل مکمل ہونے سے ایک رات قبل میں یہ جان کر گھبرا گیا کہ مہ پارہ نے جبار پر اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے نہایت شدید حملہ

کیا، لیکن میرے ہمزاد نے اسے کسی طرح بچا لیا۔ مہ پارہ میری طرف سے غافل نہ تھی اور میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ ہمزاد سے مجھے معلوم ہوا کہ مہ پارہ میرے پورے منصوبے سے واقف ہو چکی ہے کہ میں یہ سب تیاری اس سے انتقام لینے کے لیے کر رہا ہوں۔ اسی دن مہ پارہ نے ایک اور حملہ کیا۔ یہ حملہ پہلے سے بھی شدید تھا۔

واقعہ یہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف جو قوم پرست خفیہ تنظیمیں کام کر رہی تھیں اس کے ایک رکن نے گرفتار ہونے کے بعد سربراہ کے طور پر میرا نام لیا تھا۔ مہ پارہ نے تنظیم کے اس رکن کو اپنے سحر میں لے کر نہ صرف میرا بلکہ جبار کا نام بھی اس کی زبان سے ادا کرا دیا۔ مہ پارہ کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح اعلیٰ حکام فوراً ہماری طرف متوجہ ہوں اور ہمیں جیل سے نکال کر ملٹری کی نگرانی میں وہاں سے لے جایا جائے جب کہ جبار کا عمل پورا ہونے کے لیے ہمیں ایک دن رات جیل میں رہنا ضروری تھا۔

کچھ بڑے انگریز افسران، ملٹری کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ "کول" کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ فکر کی بات یہ تھی کہ عمل کے دوران میں ہمزاد کا جبار کے پاس رہنا ضروری تھا۔ میں نے کافی سوچ بچار کے بعد ایک تجویز پر عمل کیا۔ جیلر جو میرا مرید تھا، میں نے اسے آمادہ کیا کہ وہ صبح سے پہلے کسی بھی صورت میں ہمیں، ملٹری کے حوالے نہ کرے اور وہی ہوا بھی! جیلر میری خاطر ملٹری سے ٹکرا گیا۔ صبح تک جیل کی پولیس اور ملٹری میں سخت تصادم ہوا۔ اس معرکے میں خود جیلر بھی مارا گیا، مگر اس نے ملٹری کی سخت فائرنگ کے باوجود آخر دم تک وفاداری کا ثبوت دیا۔ میں اپنے منصوبے میں کامیاب ہوا۔ جبار نے ہمزاد کا عمل پورا کر لیا۔ میں اور جبار اپنے اپنے ہمزادوں کے ہمراہ جیل سے فرار ہو گئے، لیکن ہمیں نہایت سخت حالات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ پھر بھی ہم کسی طرح "کول" سے نکل کر اکبر آباد پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جو اب آگرہ کہلاتا ہے۔

جبار جسمانی اور ذہنی طور پر پوری طرح صحت یاب تھا اب وہ پوری طرح مہ پارہ کے ساتھ معرکے میں میرا حکم بجا لانے کو تیار تھا۔

پھر جس دن میں، جبار کے ساتھ میرٹھ روانہ ہونے والا تھا، اپنے تصور کی قوت کو کام میں لا کر مہ پارہ کو دیکھا اور پھر اسے مخاطب کیا۔ "ہم آ رہے ہیں اور آنے سے پہلے تمہیں آگاہ کر رہے ہیں۔ اگر تم ہمیں روک سکتی ہو تو روکو!"

اسی رات میں نے ہمزاد کو طلب کر کے میرٹھ چلنے کا اظہار کیا۔ ہمزاد نے مشورہ دیا کہ جبار کے اور میرے میرٹھ پہنچنے سے قبل وہ خود ایک مرتبہ جبار کے ہمزاد کو اپنے ساتھ لے کر

وہاں کا جائزہ لینا چاہتا ہے کہ مہ پارہ نے وہاں کیا حفاظتی اقدامات کیے ہیں اور انہیں کس طرح ناکارہ بنایا جاسکتا ہے! پھر جبار نے میرے ایما پر اپنے ہمزاد کو حکم دیا کہ میرے ہمزاد کے ساتھ پوری معاونت کرے۔ اس کے بعد دونوں ہمزاد میرٹھ روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد جب میں ایک مرتبہ ٹہلتے ٹہلتے پلٹا تو میں نے جبّار کے ہاتھ میں خنجر دیکھا۔ اس کے ارادے خطرناک نظر آ رہے تھے۔ میرے لیے یہ امر تعجب خیز تھا' لیکن میں بغیر وقت ضائع کیے جبّار پر جھپٹ پڑا۔ اس نے بھی اپنی حفاظت کی۔ خنجر اب اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ ہم دونوں آپس میں گتھ گئے۔ یہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ میں نے جبّار کو مار مار کر تقریباً" نیم بے ہوش کر دیا۔ اسی حالت میں جب میں اس کا گلا گھونٹنے والا تھا کہ میرا ہمزاد آگیا۔ اس نے مجھے فوراً ایسا کرنے سے روک دیا۔ ہمزاد نے مجھے بتایا کہ یہ بھی مہ پارہ کی ایک چال تھی۔ اس نے مجھے اور جبار کو اپنی پراسرار قوتوں کے سحر میں لے کر فریب نظر میں مبتلا کر دیا تھا تاکہ اس طرح دونوں میں سے کوئی ایک ختم ہو جائے۔ پھر کوئی ایک شخص اس کا کچھ نہ بگاڑ پاتا کیوں کہ صرف ایک ہمزاد کے ذریعے اس کا مقابلہ کرنا' ممکن نہیں۔ ہمزاد کی بات کا ثبوت یہ تھا کہ اس وقت تلاش بسیار کے باوجود کمرے میں وہ خنجر نہیں ملا جو میں نے جبّار کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔

اس کے بعد مسلسل ایک گھنٹے کی نگہداشت سے جبّار اس قابل ہو سکا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ تقریباً" آدھی رات گزر چکی تھی۔ جب ہم میرٹھ کے لیے روانہ ہوئے۔ پھر ہم بہت جلد میرٹھ پہنچ گئے۔ اب ہمیں وقتی طور پر کسی ٹھکانے کی تلاش تھی۔ ہم نے خیر نگر دروازے تک پہنچ کر جبار کے ایک دوست کے گھر پناہ لے لی' لیکن کچھ دیر بعد ہی ہمیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ مہ پارہ نے ہمیں وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا تھا۔ اگر ہمیں اس کمرے سے نکلنے میں تھوڑی سی دیر بھی ہو جاتی جس میں آرام کرنے لیٹے تھے تو کمرے کی چھت اور دیواریں ہم پر آ رہتیں۔ وہاں سے فرار ہو کر ہم خیر نگر دروازے ہی میں خود جبّار کے اپنے مکان میں پناہ گزیں ہو گئے۔ مہ پارہ برابر ہمارے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اس کا مقصد تھا کہ ہم میرٹھ پہنچ کر سکوں کا ایک سانس بھی نہ لے سکیں۔ اس مرتبہ معلوم ہوا کہ ملٹری نے خیر نگر دروازے کو چاروں طرف سے گھیر کر ہماری گرفتاری کا سامان کر لیا ہے۔ مہ پارہ اب اپنی پُراسرار قوتوں سے دوسرے کام لے رہی تھی اس لیے کہ وہ بہ راہ راست ہم پر حملہ کرنے کی اہل نہیں رہی تھی۔

جب مجھے ہوش آیا تو ہمزاد سے معلوم ہوا کہ آج دن بھر ہم دونوں بے ہوش رہے اور دونوں ہمزاد ہمیں جگہ جگہ لیے پھرے کیوں کہ پولیس اور ملٹری تلاش میں تھی۔ اب ہم

دونوں اپنی بیگم پل والی حویلی میں تھے۔

پھر اسی رات میں جبّار کو حویلی میں چھوڑ کر دونوں ہمزادوں کو ہمراہ مہ پارہ سے دو بہ دو مقابلہ کرنے لیے اس کی حویلی میں پہنچ گیا۔ مہ پارہ کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ ہمزاد اندر کمرے کے کواڑوں میں تحلیل ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ ایک شور کے ساتھ کھلا اور میں تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی مہ پارہ ایک دم مسہری سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے کندن ایسے سرخ و سفید چہرے پر میری نظر نہیں ٹھہر رہی تھی۔ اچانک میری اور اس کی نظریں ملیں اور میں نے کہا۔ "میں آگیا ہوں مہ پارہ' میں آگیا ہوں!"

"تو پھر یقین کر لوں کہ تمہاری موت ہی تمہیں یہاں گھسیٹ لائی ہے۔" مہ پارہ کا فقرہ پورا ہوا تھا کہ اچانک کمرا نہایت تیز قسم کی روشنی سے بھر گیا جیسے رات کے وقت سورج نکل آیا ہو۔ میں نے گھبرا کر اپنی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

میرے اور مہ پارہ کے ٹکراؤ کا یہ ایک خوف ناک آغاز تھا۔ پُراسرار قوتیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو چکی تھیں۔ اس مقابلے میں مجھے پھر ایک بار مہ پارہ سے شکست کھانا پڑی۔ اس معرکے میں خاصی بلندی سے گر کر میں اپنی ایک ٹانگ بھی توڑ بیٹھا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک آرام دہ بستر پر دراز تھا اور ہمزاد میرے پاس موجود تھا۔ یہ قیصر گنج والی حویلی تھی۔ ہمزاد نے مجھے بتایا کہ مہ پارہ نے اپنی پراسرار قوتوں سے کام لے کر جبار کو گرفتار کرا دیا ہے اور خود میرٹھ سے فرار ہو گئی ہے۔ وہ معرکہ اتنا ہی خطرناک تھا کہ جیت جانے کے باوجود بھی مہ پارہ بری طرح دہشت زدہ ہو گئی تھی۔ اس نے اب کہاں کا رخ کیا تھا' یہ بات ہمزاد کو معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ اب سب سے پہلے میرے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح جبّار کو ملٹری کی حراست سے آزاد کراؤں۔ یہ کام ہمزاد کے لیے کچھ ایسا مشکل نہ تھا۔ جبّار کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ بھی میری طرح پاک نہیں تھا اور اسی حالت میں مہ پارہ کی شہ پر ملٹری نے اس پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ میں خود بھی ایک مرتبہ ایسے حالات سے گزر چکا تھا اس لیے جبّار کی مجبوری سمجھ گیا۔ وہ اس حالت میں ہمزاد کو اپنی مدد کے لیے نہیں بلا سکتا تھا۔

پھر میرے ہی ہمزاد نے جبّار کو ملٹری سے نجات دلائی۔ اس دوران میں میرا ہمزاد یہ معلوم کر چکا تھا کہ مہ پارہ' میرٹھ سے فرار ہو کر کہاں گئی تھی۔ میرے ہمزاد کی اطلاع کے مطابق مہ پارہ' کلکتہ میں تھی۔ نتیجتہً" میں نے بھی کلکتہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میرٹھ سے کلکتہ روانگی کے لیے ہم نے رات کا وقت مقرر کیا۔ میں دنیا کے کسی بھی کونے میں مہ پارہ کو چین سے رہنے دینا نہیں چاہتا تھا۔ جزوی طور پر میں اس پر غالب آچکا تھا۔ اس نے مجھے اپنا شہر چھوڑنے کی دھمکی دی تھی، مگر خود فرار ہونے پر مجبور ہو گئی تھی۔ میں اسے اپنی کامیابی ہی سمجھ سکتا تھا۔ روانگی سے قبل شام کے وقت ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ میں اپنی زخمی ٹانگ کے باعث جبّار کا سہارا لیے ہوئے غسل خانے سے نکل رہا تھا کہ کھڑکی سے ایک سنسناتا ہوا خنجر اندر آیا اور سامنے والے دروازے میں پیوست ہو گیا۔ اس خنجر کے ساتھ ایک کاغذ بھی تھا جس پر تحریر عبارت میرے ہی لیے تھی۔ مجھے پیغام بھیجنے والی ایک ملک گیر خفیہ تنظیم تھی جو انگریزوں کے ناپاک وجود کو ہندوستان کی سرزمین سے مٹا دینا چاہتی تھی۔ خط میں اس بات کا اظہار کیا گیا تھا کہ تنظیم کو میری مافوق الفطرت قوتوں کا علم ہے اس لیے وہ لوگ ملک و قوم کے نام پر مجھے تنظیم میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ پیغام میں یہ بھی درج تھا کہ اگر میں اس پر آمادہ ہو جاؤں تو اس خنجر کا دوبارہ اس چوکھٹ پر پیوست کر دوں۔ بعد میں کسی وقت وہ خود ہی مجھ سے رابطہ قائم کر لیتے۔

میں انگریزوں سے نفرت کرتا تھا اسی لیے ان لوگوں کا ساتھ دینے پر راضی ہو گیا۔ میں نے وہ خنجر دوبارہ اسی چوکھٹ میں پیوست کر دیا۔

اسی رات ہم کلکتہ روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر مہ پارہ سے میرا ایک اور معرکہ ہوا۔ فیصلہ کن اور سخت معرکے میں بالآخر ہمیں فتح حاصل ہوئی۔ ہم نے مہ پارہ کو قید کر لیا۔ وہ مغرور اور سرکش عورت اب اتنی پژمردہ نظر آ رہی تھی جیسے اس کی پوری شخصیت ٹوٹ پھوٹ کر منتشر ہو گئی ہے اس کے باوجود اس کے حسن کی حشر سامانیاں وہی تھیں۔ اسے دیکھ کر میرے جسم میں شعلے سے بھڑک اٹھے۔ ہجر کے طویل اور تھکا دینے والے لمحات اب ختم ہونے والے تھے اور میرا فراق، وصل آشنا ہونے کو تھا، لیکن عین وقت پر بڑی عجیب اور نازک صورت حال سامنے آ گئی۔ جبّار نے مہ پارہ پر اپنا حق جتایا اور خم ٹھونک کر میرے مقابلے پر آ گیا۔ اس نے واضح الفاظ میں مجھ سے کہا کہ مہ پارہ اس کی کوششوں کے نتیجے میں زیر دام آئی ہے اور وہ کسی بھی قیمت پر مجھے اس کے قریب نہیں جانے دے گا۔

جبّار کی بات سن کر میں آگ بگولہ ہو گیا۔ میں تیزی سے اپنے ہمزاد کی طرف متوجہ ہوا تاکہ اسے جبار کی دھجیاں اڑانے کا حکم دوں۔

پھر اس سے پہلے کہ میں ہمزاد کو کوئی حکم دے سکتا، مجھے اس کی سرد آواز سنائی دی جس نے میری تن بدن میں آگ لگا دی۔ ہمزاد کہہ رہا تھا۔ "جبّار صحیح کہتا ہے۔ اسے واقعی مہ پارہ سے عشق ہے۔ آپ کو اس کے حق میں دست بردار ہو جانا چاہیے۔"

"میں نے اس سلسلے میں تم سے کوئی مشورہ نہیں کیا!" میں نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس احسان فراموش کی دھجیاں بکھیر دو!"

"آپ غلطی پر ہیں۔" مجھے ہمزاد کی آواز میں حکم عدولی کا عنصر نظر آیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ہمزاد بھی سرکشی پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی میرے کسی حکم کو ماننے سے اجتناب نہیں کیا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ جبّار میری بے بسی پر مسکرا رہا تھا۔

میری قوتّ برداشت جواب دے گئی۔ میں ہمزاد پر برس پڑا۔ "میں تم سے جو کچھ کہہ رہا ہوں کرو! تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ صحیح اور غلط کا فیصلہ کرو!"

"مگر میں اس پر مجبور ہوں۔" ہمزاد نے جواب دیا۔

"تمہیں کس نے مجبور کیا ہے؟" میں نے اپنے غصّے پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

"میری صداقت نے!" ہمزاد بولا۔

"بکو مت!" مجھے اب ہمزاد پر بھی شدّت سے غصہ آ گیا تھا۔ اسی وقت جبّار کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھ سے مخاطب تھی۔ "میں اب تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ میرے اور تمہارے راستے اب مختلف ہو چکے ہیں۔ میں اسی وقت یہ جگہ چھوڑ رہا ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم مہ پارہ کو حاصل نہیں کر سکو گے اور تمہارے ناآسودہ خواہشوں کی کبھی تکمیل نہ ہو سکے گی۔ وہ میری ہے اور میری رہے گی کیوں کہ تمہارے اور میرے جذبات میں بنیادی طور پر بڑا فرق ہے۔ تم ہوس کے غلام ہو اور میں بندہ عشق! عشق کی قوت افضل ہوتی ہے۔ تمہارے مقابلے میں میرا جذبہ صادق؟"

میں گویا پتھر سا بنا ہو اس احسان فراموش کی باتیں سنتا رہا۔ میں نے سوٹ کیس اٹھا کر اسے فلیٹ سے جاتے ہوئے بھی دیکھا۔ یوں جیسے یہ سب کچھ حقیقت نہ ہو، کوئی تکلیف دہ خواب ہو۔ میں نے خود کو اتنا بے بس اور لاچار کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

جبّار چلا گیا تو میں ایک دم چیخ اٹھا۔ "ہمزاد! اب تم بھی دفع ہو جاؤ!"

ہمزاد جواب تک میرے سامنے مودب کھڑا ہوا تھا، میرا یہ فقرہ سنتے ہی غائب ہو گیا۔

میری دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ ہمزاد ہی میرے لیے سب کچھ اور آج اسی نے پہلی مرتبہ میرا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ میرے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ بات اور کیا ہو سکتی تھی! اچانک منزل میرے بہت قریب آ کر دور ہو گئی تھی، اتنی دور جس کا میں نے کبھی تصور بھی

نہیں کیا تھا۔ سب کچھ بس اچانک اور دیکھتے دیکھتے ہو گیا تھا۔ بار بار مہ پارہ کا چہرہ میری آنکھوں میں گھومتا اور تلملا کر رہ جاتا۔

میں جانے کب تک اندر ہی اندر سلگتا رہا اور پھر میرا ہمزاد بغیر بلائے خود حاضر ہو گیا۔ میں اس پر بہت برہم ہوا تو اس نے صورت حال کی وضاحت کی پہلے اس نے جو کچھ کہا تھا اور جس طرح جبّار کی حمایت کی تھی، وہ محض جبّار کو سنانے کے لیے تھا۔ معاملہ دراصل یہ تھا کہ دو ہمزاد آپس میں نہیں ٹکرا سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ بڑا بھیانک نکلتا۔ اس طرح وہ دونوں پُراسرار قوّتیں جو برابر کی تھیں، آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتیں۔ دونوں ہمزاد ختم ہو جاتے۔ یہی نہیں بلکہ اس معرکہ آرائی میں جبّار کو اور مجھے، دونوں کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتے۔ میرے ہمزاد نے اسی لیے معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے فی الحال پسپائی اختیار کر لی تھی۔

ان حالات میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں اپنی آخری فتح کا جشن نہیں منا سکا۔ میری اور جبّار کی چپقلش سے فائدہ اٹھا کر مہ پارہ خود کشی کرنے میں کامیاب ہو گئی اور میں ہاتھ ملتا رہ گیا۔ مہ پارہ نے اپنی جان کی قربانی پیش کر کے اپنی انا کو بچا لیا۔ وہ میرے سامنے نہیں جھکی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مہ پارہ واقعی عظیم عورت تھی۔ یہ اس کی عظمت ہی تھی کہ میرے سامنے جھکنے پر اس نے موت کو ترجیح دی۔

اس دوران میں میری پُراسرار قوّتوں کا شہرہ ہو چکا تھا۔ پولیس اور حکومت کے دوسرے ادارے میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ چند باتوں کی وجہ سے انگریز حکومت کو مجھ پر یہ شبہہ ہو چکا تھا کہ میں کسی حرّیت پسند تنظیم سے تعلق رکھتا ہوں حالانکہ حقیقت یہ نہیں تھی۔ اس زمانے آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ میری شہرت سن کر ہی تحریک آزادی کے سرکردہ لوگوں کو مجھ سے دلچسپی ہو گئی تھی اور کسی طرح انہوں نے میرا سراغ لگا کر مجھ سے رابطہ بھی قائم کر لیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں اپنی پُراسرار قوّتوں کو بروئے کار لا کر انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے میں ان کی مدد کروں۔ میں اس کے لیے تیار تھا کیوں کہ اب مہ پارہ کا معاملہ بھی ختم ہو چکا تھا۔

پھر مجھے معلوم ہوا کہ جبّار، انگریزوں سے جا ملا ہے۔ یہ اطلاع مجھے اپنے ہمزاد سے ملی تھی۔ مجھے اب اپنی زندگی ویران سی محسوس ہونے لگی تھی شاید میں سچ مچ مہ پارہ کو چاہنے لگا اور اس کے بغیر مجھے اپنی زندگی بے کیف محسوس ہو رہی تھی

انگریزوں نے جبّار کے ہمزاد کی قوت سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ وہ آزادی کے متوالوں کو پکڑ کر جیلوں میں ٹھونس رہے تھے اور تشدّد کا بازار گرم تھا۔ اس صورت حال

میرے جذبات و احساسات کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ میں سوچنے لگا کہ زندگی کا مقصد صرف عیش کوشی ہی تو نہیں۔ میں نے ہمزاد کو حکم دیا کہ وہ تحریک آزادی کے متوالوں کو انگریزوں کی قید سے نجات دلائے۔

ہمزاد نے میرے حکم کی تعمیل کی اور اس کام کی تکمیل پر مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میری روح کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔

اسی رات کو ایک نامعلوم ہستی مجھ سے ملنے میری قیام گاہ پر آئی۔ اس نے اپنا آدھا چہرہ کپڑے سے چھپا رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی صرف آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں، روشن اور چمکیلی آنکھیں!

میں سمجھ چکا تھا آنے والے کا تعلق اسی خفیہ تنظیم سے ہے جس کا خط مجھے کچھ دن پہلے ملا تھا۔ نووارد کے سر پر سبز عمامہ تھا جس کی نشان دہی اس خط میں کر دی گئی تھی جو اس تنظیم کی طرف سے مجھے لکھا گیا تھا۔ اس کے اندر آتے ہی ہمزاد نے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ کنڈی لگانے سے جو آواز پیدا ہوئی اس نے اجنبی کو چونکا دیا۔ اس نے ایک دم پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے حیرت کے سائے نظر آئے اور پھر دوسرے ہی لمحے تیزی سے اس کا ہاتھ اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس میں گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں تیز چمکیلا خنجر تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اسے یقیناً کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہمزاد کا وجود اس کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔ وہ بڑے چوکنّا انداز میں اپنی بڑی بڑی روشن آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں بات مزید بگڑ نہ جائے، اسے مخاطب کیا۔ "اجنبی! یہاں تمہیں کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ تم اس وقت شیخ کرامت کے روبہ رو ہو۔ یہاں اس وقت میرے سوا اور کوئی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں آنے سے پہلے میرے بارے میں تمہیں سب کچھ بتا دیا گیا ہو گا۔ دروازے کے خود بہ خود بند ہو جانے پر حیران ہونے یا کسی قسم کی غلط فہمی کو دل میں جگہ دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ میری پُراسرار قوّتوں کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ تمہارے مزید اطمینان کے لیے یہ بتا دوں کہ ہر حال میں تم لوگوں کا ساتھ دینے پر راضی ہوں۔ میں تمہارے حق میں فیصلہ کر چکا ہوں۔"

شاید چند لمحے اجنبی نے کچھ سوچا اور پھر اپنا خنجر لباس میں کہیں چھپا لیا۔ غالباً اس نے میرے لہجے کی صداقت کو محسوس کر لیا تھا۔

میں نے اپنی مسہری کے قریب رکھی ہوئی ایک آرام کرسی کی طرف اشارہ کر کے

اجنبی سے وہاں بیٹھنے کو کہا۔

وہ نپے تلے قدم رکھتا ہوا آگے بڑھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ ابھی تک نہ تو اس نے مجھے مخاطب کیا تھا اور نہ ہی میری کسی بات کا جواب دیا تھا مجھے اس کے اس رویے سے کچھ الجھن سی محسوس ہو رہی تھی، مگر میں نے اظہار نہیں کیا اور منتظر رہا کہ وہ خود ہی کچھ بولے۔

کچھ بولنے سے پہلے اچانک اس نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے محسوس ہوا کہ ایک بجلی سی کوند گئی وہ میرے لیے ایک ذہنی جھٹکا ہی تھا۔ میں نے کئی بار پلکیں جھپکائیں کہ شاید میری بصارت مجھے دھوکا دے رہی ہو۔ میرے لیے یہ ایک قطعی غیر متوقع بات تھی کہ اپنے سامنے ایک حسین ترین لڑکی کو دیکھوں گا۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ وہ چہرہ اتنا ہی حسین اور دل کش تھا کہ کچھ دیر کے لیے میں اس کے خدوخال میں کھو گیا۔ اجلی رنگت کالی چمکیلی نشیلی سی آنکھیں، ہونٹ گلاب کی سی پنکھڑیاں، رخساروں کی سفیدی میں ہلکی ہلکی سرخی گھلی ہوئی! چوڑی پیشانی پر سبز عمامہ اس طرح بندھا ہوا تھا جیسے کسی دلھن کے سر پر سہرا سجا ہو۔ بڑی بڑی آنکھوں پر لانبی سیاہ پلکیں، ستواں ناک، بال عمامے میں چھپے ہوئے جن کا میں پر خفیف سا گڑھا جیسے نرم سبک روپانی میں بھنور پڑ جائے۔ گلابی ہونٹوں سے جھانکتی ہوئی سفید دانتوں کی کے قطار جیسے سچے موتی ہوں اور ابرو جی سے دو کمانیں کھنچی ہوں۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ میرے ذہن میں عورت کے حسن پر لکھے جانے والے فارسی اور اردو کے نہ جانے کتنے شعر گونج گئے۔ آج بھی وہ چہرہ، آنکھوں میں گھوم جاتا ہے تو یادوں میں چراغ سے جلنے لگتے ہیں۔

میں جانے کب تک اس کیفیت میں گم رہتا کہ میری سماعت میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔ اس آواز کی جھنکار، لوچ اور ٹھنڈک میں نے اپنی رُوح میں اترتی محسوس کی۔ "شیخ! تمھیں مبارک ہو کہ تم نے سچائی کے حق میں فیصلہ دیا۔ ہم تمھیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ اب تم اکیلے نہیں رہے تمہارے ساتھ اب سرفروشوں کی جان بازوں کا وہ قافلہ ہے جو وفا کرتا اور وفا نبھانا جانتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں کبھی مایوس نہیں کرو گے۔"

"وفا کرنا اور وفا نبھانا!" میں جیسے خواب کے سے عالم میں بولا۔ "کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"ہاں!" اس نے پر اعتماد آواز میں کہا۔ "یہ ابھی صرف الفاظ ہیں، مگر جب یہ الفاظ تمہارا تجربہ بنیں گے تو تمہیں خود بہ خود ــ ان کی صداقت پر یقین آ جائے گا۔"

میری نظریں اس چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ اس چہرے پر ایک عجیب سی

معصومیت اور تقدس تھا۔ ایسا تقدس میں نے اس سے پہلے کسی عورت کے چہرے پر نہیں دیکھا تھا، حسن اور تقدس! ایسا تقدس جس میں پاکیزگی اور طہارت تھی جس کے روبہ رو عام سطحی اور سفلی جذبات نہ جانے کہاں کھو جاتے ہیں! حسن اور تقدس کے اس امتزاج کے سامنے کوئی منہ زور جذبہ سر نہیں ابھارتا۔ میں نے اس لمحے اپنے اندر گھٹیا اور جذبات کو گہری نیند سوتے ہوئے محسوس کیا۔ یہ تجربہ میرے لیے قطعی نیا تھا۔ رعب حسن اور خود فراموشی کے احساس نے میری پلکیں جھک گویں۔ اس کا نام کیا تھا؟ مجاہدوں کی خفیہ تنظیم سے اس کا کیا تعلق تھا؟ وہ ان میں کس طرح اور کیوں شامل ہوئی؟ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ مجھے تو اس وقت یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں ہے۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں اس کے لیے اپنائیت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا جیسے وہ میری اپنی ہو، جیسے اس کے سارے دکھ سکھ مجھے معلوم ہوں، جیسے میں اسکے دکھوں میں برابر کا شریک ہوں اور جیسے میں اس کے عشق میں مبتلا ہوں۔ بالکل روائتی عاشقوں کی طرح جو اپنے محبوب کی ایک ادا پر جان نثار کر دیتے ہیں۔ عشق کی پاکیزگی جن کے دلوں سے ہوس کو مٹا دیتی ہے، جن کی زندگی کا مقصد صرف عشق اور عشق ہوتا ہے، جو سراپا تسلیم و رضا ہوتے ہیں، جو صرف عشق کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں، مٹنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور فنا ہو جانے کے لیے زندہ رہتے ہیں۔

میری محویت پھر ٹوٹ گئی۔ وہ مجھ سے ہم کلام تھی۔ "میں آج تمھیں صرف یہ اطلاع دینے آئیں ہوں کہ کل اسی وقت پھر آؤں گی تمہیں کل میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

کہاں چلنا ہو گا؟ یہ اس نے نہیں بتایا۔ پھر وہ بہار کا جھونکا اس طرح گذر گیا کہ میں دیر تک اس کی خوشبو کی آہٹیں اپنے در دل پر محسوس کرتا رہا۔

پھر دوسری شب آئی اور مجھے اس غارت گر ہوش کا نام معلوم ہوا۔ اس کا نام ناہید تھا۔ وہ تحریک آزادی کی ایک اہم رکن تھی۔ اسی کے ساتھ میں، مجاہدین کی خفیہ تنظیم کے اڈے پر پہنچا۔ وہاں میری ملاقات مجاہدین کے امیر سے ہوئی۔ اس کا اصل نام جو کچھ بھی رہا ہو لیکن تنظیم کے لوگ اسے امیر عبدالرحمٰن کے نام سے پکارتے تھے۔ دراصل تنظیم کے ہر فرد کا ایک فرضی نام بھی تھا۔ آپس میں وہ لوگ ایک دوسرے کو انہیں فرضی ناموں سے پکارتے تھے۔ ناہید کا فرضی نام ملکہ تھا۔ میرا نام ظل الرحمٰن رکھا گیا۔ میں نے اس خفیہ اڈے میں اپنے خون سے ایک عہد نامے پر دستخط کیے۔ اس طرح میں نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ عہدہ کیا کہ ہمیشہ تنظیم کا وفادار رہوں گا۔

مجاہدین کی تنظیم پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ بعض اہم شہروں میں اس کی سرگرمیاں بڑے جوش و خروش سے جاری تھیں۔ صوبہ و سرحد میں تنظیم کا امیر بابو جان تھا۔ مجھے تنظیم ہی کے ایک کام کے سلسلے میں سرحد پار جا کر اس سے ملاقات کرنا پڑی۔ صوبہ سرحد میں "ملکا" ایک چھوٹی سی جگہ تھی۔ ملکا کی بیشتر آبادی، تنظیم میں شامل تھی۔ میرے بعد ناہید بھی ایک کام سے وہاں پہنچ گئی۔ اس کی آمد سے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری رُوح کا کوئی خلا پر ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ لڑکی ناہید میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ ناہید کا معاملہ ان تمام لڑکیوں سے مختلف تھا جن سے اب تک میرے تعلقات رہ چکے تھے۔ میں غالباً" ناہید سے سچی محبت کرنے لگا تھا، لیکن اس کے رعب حُسن کے باعث مجھے یہ ہمت نہ ہو سکی کہ اپنا دل چیر کر اس کے حضور میں پیش کر دوں۔

دوسری طرف جبّار، انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ وہ ضمیر فروش اپنے ہمزاد کی طاقت کام میں لال کر مجاہدین کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک روز جب میں اور ناہید ایک چٹان پر بیٹھے ہوئے تنظیم کی سرگرمیوں کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے تو میرا ہمزاد ظاہر ہوا۔ اس نے بتایا کہ جبّار کے ہمزاد نے انگریزوں کو تمام تر صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ ہندوستان کے گورنر جنرل اور وائسرائے لارڈ ایلیجن جو اطلاع دے دی گئی ہے کہ ملکا میں انگریزوں کے خلاف جنگی تیاریاں پورے زور شور سے جاری ہیں۔ وائسرائے نے یہ اطلاع پا کر انگیرز فوجوں کو ملکا پر زبردست حملے کا حکم دے دیا تھا۔ عنقریب انگریز فوجیں، ملکا پر حملہ کرنے والی ہیں۔ ہمزاد سے یہ خبر پا کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ملکا کی پوری آبادی خون میں ڈوب چکی ہو۔

مجھے بدحواس دیکھ کر ناہید بھی گھبرا گئی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ کوئی اہم خبر آئی ہے جس سے میں سراسیمہ ہو گیا ہوں۔ بہ مشکل میں نے ناہید کو حالات سے آگاہ کیا۔ وہ سانس روکے میری ایک ایک بات کو توجہ سے سنتی رہی۔ میں بات ختم کر چکا تھا مگر ابھی تک وہ گم صم بیٹھی تھی جیسے وہ بھی اس پاس بکھری ہوئی چٹانوں کا ایک حصہ ہو۔ پھر ایک دم وہ تیزی سے اٹھی جیسے اس میں زندگی لوٹ آئی ہو۔ میں نے دیکھا کہ لمحہ بہ لمحہ اس کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔ "معاً" میں نے اس کی آواز سنی بالکل بدلی ہوئی سی آواز! اس آواز میں طوفان ایسا جوش خروش تھا۔ "ہم اپنے خون کے آخری قطرے تک انگریزوں کا مقابلہ کریں گے شیخ!" اس کی آواز بلند اور تیز تھی۔ "تم دیکھو گے شیخ کہ ہمارا لہو ہماری ایڑیوں پر نہیں، ہمارے پنجوں پر گرے گا!" اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ہمیں وقت ضائع

نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں اسی وقت یہ اطلاع امیر تک پہنچا دینا چاہئے۔"

پھر ہم دونوں، مجاہدین کے امیر بابو جان کو یہ اطلاع دینے پہنچے۔ بابو جان اپنی قیام گاہ پر نہیں تھے۔ ناہید انہیں ڈھونڈنے چلی گئی۔ میں وہیں رک گیا۔ اسی وقت مجھے ہمزاد کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھ سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وائسرائے لارڈ ایلیجن نے یہ احکام صادر کیے ہیں کہ انگریز افسران، جبّار کو لے کر فوراً" اس کے پاس پہنچیں۔ دراصل لارڈ ایلیجن چاہتا تھا کہ وہ اپنے مخصوص انداز فکر کے مطابق جبّار کی پُراسرار قوتوں کو مجاہدین کے خلاف استعمال کرے۔ اس موقع پر ضروری تھا کہ میر [illegible] کہ اس اہم معاملے میں اُلجھا ہوا تھا اس لیے چاہتا تھا کہ میں چھوٹے موٹے مسائل کے سلسلے میں اسے طلب نہ کروں۔ اگر کبھی اسے خود یہ محسوس ہوا کہ میں کسی بہت بڑے خطرے سے دوچار ہو گیا ہوں تو وہ خود ہی میری مدد کو پہنچ جائے گا۔

میں نے بہ رضا رغبت ہمزاد کو جانے کی اجازت دے دی کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہمزاد کے جاتے ہی تنظیم کا ایک فرد قائم خان، ملکہ کو ڈھونڈتا ہوا وہاں آ پہنچا۔ قائم خان، تنظیم کا ایک اہم رکن تھا، مگر مجھے اس سے کچھ چڑ سی ہو گئی تھی کیوں کہ وہ ناہید میں بے حد دلچسپی لیتا تھا۔ ناہید بھی مجھ سے کئی بار اس کی بہادری کی تعریف کر چکی تھی۔ اپنی محبوبہ سے کسی اور کا ذکر کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر بھلا میں کیسے یہ بات قبول کر لیتا! اس نے مجھ سے ناہید کے بارے میں پوچھا تو میں نے خشک لہجے میں جواب دیا کہ ناہید، امیر بابو جان کی تلاش میں گئی ہے۔

اس پر قائم خان نے مجھے بتایا کہ میری بابو جان اور تنظیم کے تمام سالار، اس وقت مولوی شریف اللہ کے مکان پر جمع ہیں اور کسی اہم معاملے پر صلاح مشورہ کیا جا رہا ہے۔ قائم خان نے خیال ظاہر کیا کہ اب تک ناہید امیر بابو جان کی تلاش میں وہاں پہنچ چکی ہو گی۔ قائم خان نے مجھ سے بھی وہیں چلنے کو کہا۔

میں، قائم خان کے ساتھ مولوی شریف اللہ کے مکان پر پہنچ گیا ناہید وہاں موجود تھی۔

مجھے وہاں جا کر یہ معلوم ہوا کہ دراصل امیر بابو جان کو تنظیم کے جاسوسوں کے ذریعے اس بات کی اطلاع مل چکی تھی کہ انگریز فوجوں کی پُراسرار نقل و حرکت شروع ہو گئی ہے۔ وہ یہ اندازہ لگانا چاہتے تھے کہ آخر اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟

اس موقع پر میں اٹھ کھڑا ہوا کیوں کہ ان کے سوال کا جواب میرے پاس موجود تھا۔ سب نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ پھر مجھے ہمزاد کے ذریعے جو کچھ معلوم ہوا تھا، میں نے

تفصیل کے ساتھ انھیں بتا دیا۔ وہ سب سناٹے میں آ گئے۔ فیصلہ ہوا کہ فوری طور شہزادہ مبارک شاہ کو اس صورت حال سے آگاہ کر دیا جائے۔ پیغامبری کا یہ فرض ناہید اور قائم شاہ کے سپرد کیا گیا تو میرے دل میں جلن سی ہونے لگی۔ دراصل میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ ان دونوں کو تنہائی کا موقع ملے۔ میں نے امیر بابو جان سے ان دونوں کے ساتھ جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انھوں نے مجھے اجازت دے دی۔ تین گھوڑے کچھ ہی دیر بعد تھانہ کی طرف روانہ ہو گئے جہاں شہزادہ مبارک شاہ تھا۔

مجھے گھڑ سواری سیکھے ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے' لیکن اپنے گھوڑے کو ان کے ساتھ برق رفتاری سے دوڑاتا رہا۔ میں کسی طرح بھی ان دونوں سے پیچھے رہنا مناسب نہیں سمجھ رہا تھا۔ میری یہی کوشش مصیبت کا پیش خیمہ بن گئی۔ میری کسی بے تکی حرکت سے گھوڑا بدک گیا اور میں اسے قابو نہ کر سکا۔ وہ اس بلا رفتاری سے دوڑا کہ ناہید اور قائم خان کے گھوڑے بہت پیچھے رہ گئے۔ میرا گھوڑا دوڑتا ہوا کسی دیوانے کی طرح انگریزوں کی حدود میں داخل ہو گیا۔ پھر وہاں مجھے گھیر کر حراست میں لے لیا گیا۔

انگریز کو یقین تھا کہ میرا تعلق باغیوں ہی سے ہو گا۔ اس نے مجھ سے معلومات حاصل کرنے کے لیے تشدد کا روح فرسا کھیل شروع کر دیا۔ مجھ پر کوڑے برسائے گئے اور سوالات کی بوچھاڑ کر دی گئی' لیکن میں نے تو جیسے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔

اس موقع پر میں نے دانستہ اپنے ہمزاد کو نہیں بلایا' یہ سوچ کر کہ اس وقت وہ نہ جانے کتنے اہم معاملے سے نمٹ رہا ہو۔ میں نے چوبیس گھنٹے بڑی اذیت میں گزارے۔

اگلی رات کو جب میں خیمے کی ننگی زمین پر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہوا تھا تو اچانک ساری فضا بندوقوں کے دھماکوں سے گونج اٹھی۔ مجاہدین نے انگریزی کیمپ پر شب خون مارا تھا۔ مجاہدین کے اس حملے اور دستے میں ناہید اور قائم خان بھی تھے۔ وہ دونوں مجھے وہاں سے نکال لے گئے۔ امیر بابو جان کے مکان پر لے جا کر میری مرہم پٹی کی گئی۔ ناہید نے مجھے بتایا کہ غنودگی کے عالم میں اس نے میری آواز سنی تھی۔ میں نے ہی اسے بتایا تھا کہ قریبی انگریزی کیمپ پر شب خون مارنا ضروری ہے۔

میں سمجھ گیا کہ وہ ہمزاد کی آواز ہو گی۔ اس نے مجھے انگریزوں کی قید سے نکالنے کے لیے ایسا کیا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ صورت حال ایسی تھی کہ ہمزاد براہ راست میری مدد کے لیے نہیں آ سکتا تھا۔

کچھ ہی دن میں ناہید کی نگہداشت میں میرے زخم تیزی سے مندمل ہو گئے۔ اس

دوران میں انگریزی فوج کی سرگرمیوں کے بارے میں خوف ناک اطلاعات ملتی رہیں۔ مجاہدین بھی تیاری میں مشغول تھے۔ چھوٹی موٹی جھڑپیں بھی جاری تھیں اور ایک آدھ بڑی جھڑپ بھی ہو چکی تھی۔ انگریزی فوجوں کی قیادت جنرل چیمبرلین کر رہا تھا۔ وہ سفاک اور مسلم دشمن شخص تھا۔ ایک جنگ میں چند مجاہدین اس کے ہاتھ لگ گئے تو اس نے خود انھیں بڑی خوف ناک اذیتیں دے کر ہلاک کیا۔

ناہید اس اطلاع پر چراغ پا ہو گئی۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ اپنے ساتھیوں کا انتقام ضرور لے گی۔ میں اب پوری طرح صحت یاب ہو چکا تھا اس لیے موجودہ مہم میں اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گیا۔ ناہید نے امیر بابو جان کو کچھ نہیں بتایا اور مجھے لے کر اس پہاڑی مورچے کی طرف روانہ ہو گئی جہاں ہمارے جاسوسوں کی اطلاعات کے مطابق جنرل چیمبرلین کا خیمہ لگا ہوا تھا۔ انگریز جنرل کا خیمہ ایک ایسی چٹان پر تھا جو چاروں طرف سے ڈھلوان اور کھردری تھی۔ رات کی تاریکی میں اس چٹان پر چڑھتے ہوئے خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ میری ایک ٹانگ بھی بیکار تھی۔ مہ پارہ سے مقابلے کے دوران میں مجھے جسمانی طور پر یہ نقصان برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس کے باوجود بھی میں جوش کے عالم میں ناہید کے ساتھ چٹان پر چڑھتا رہا' لیکن برا ہو بد قسمتی کا کہ ایک پتھر اپنی جگہ سے سرک گیا جسے پکڑ کر میں اوپر چڑھ رہا تھا۔ پتھر کے سرکتے ہی میں اپنا جسمانی توازن کھو بیٹھا۔ میرے منہ سے غیر ارادی طور پر چیخ نکل گئی۔ پھر میں پتھروں سے ٹکراتا ہوا تیزی سے کھردری چٹان پر لڑھکنے لگا۔

مجھے ہوش آیا تو صبح کا اجالا پھیل چکا تھا اور میں ایک غار کی پتھریلی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ پہلے تو مجھے حیرت ہوئی کہ اس غار میں کیسے آ گیا' لیکن پھر یہ بات ذہن میں آ گئی کہ ہمزاد کے سوا کسی اور کا کام نہیں ہو سکتا۔ وہی مجھے یہاں لایا ہو گا اور انگریزوں کی قید میں نہ جانے دیا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ میری چیخ سن کر انگریز فوجی دوڑ پڑے ہوں گے۔ خدا جانے ناہید پر کیا گزری ہو؟ اس خیال نے مجھے بے چین کر دیا اور میں ناہید کے بارے میں جاننے کے لیے مضطرب ہو گیا۔ پھر بھی میں نے ہمزاد کو طلب نہیں کیا اور اپنے تصوّر کی قوت آزمائی۔ آنکھیں بند کرتے ہی میں نے ناہید کا تصوّر کیا اور ناہید کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ وہ کچھ ایسے حالات میں گرفتار تھی کہ میرا خون کھول اٹھا۔ اس کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے جو ستر پوشی کے لیے کافی نہیں تھے اور جبّار اسے ہوس ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں کے قریب ہی ایک انگریز فوجی افسر بھی موجود تھا۔ فوجی افسر' جبّار سے کہہ رہا تھا کہ اس لڑکی کی زبان کھلوانے کے لیے اس پر تشدّد کیا جائے۔ انگریز جنرل چیمبرلین کے خیمے تک پہنچنے کی کوشش کا مطلب بھی نے

سمجھ لیا تھا۔

"یہ ابھی سب کچھ بتا دے گی، مگر اس کے لیے تنہائی ضروری ہے۔" جبّار نے انگریز افسر سے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔" انگریز فوجی افسر نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر خیمے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی جبّار لپک کر ناہید کے پاس پہنچا اور دست درازی شروع کر دی۔ ناہید کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اس نے جبّار کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ رسیوں کی گرفت میں تھی اس لیے کچھ اور اس کے بس میں نہ تھا۔ میرے لیے بھی یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر فوراً اپنے ہمزاد کو پکارا۔

ہمزاد حاضر ہو گیا تو میں نے اسے حکم دیا۔ "بلا تاخیر ناہید کو جبار کے چنگل سے نکال لاؤ!"

میرا ہمزاد فوراً انگریزوں کے کیمپ میں جا پہنچا اور پھر وہ جبّار کو بے ہوش کر کے ناہید کو وہاں سے اٹھا لایا۔ ناہید کو بھی اس نے بے ہوش کر دینا مناسب سمجھا تھا۔

"ناہید کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی تم ہم دونوں کو ملکا پہنچا دو۔" میں نے اپنے ہمزاد کو دوسرا حکم دیا۔ ہمزاد نے اس حکم کی تعمیل میں دیر نہ کی۔

پھر ناہید ہوش میں آئی تو ہم ملکا پہنچ چکے تھے۔ میں نے ناہید کو بتایا کہ تمہیں جبّار کے چنگل سے نکالنے کے لیے مجھے اپنی پُراسرار قوتیں استعمال کرنا پڑی تھیں۔

امیر بابو جان نے تمام حالات و واقعات جاننے کے بعد ناہید کو سخت سست کہا اس لیے کہ وہ ان کی اجازت کے بغیر اتنی خطرناک مہم پر روانہ ہو گئی تھی۔

ناہید نے امیر سے معافی مانگ لی کہ یہ قدم جذباتی تھا اور جذبات میں عقل گم ہو جاتی ہے۔ جب امیر بابو جان کمرے سے چلے گئے تو ہم دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ رہ رہ کر میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم رہا تھا جب میں نے ناہید کو جبّار کے سامنے بے بس دیکھا تھا۔ اس وقت ناہید کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے، وہی منظر مجھے یاد آ رہا تھا، مجھے جھنجوڑ رہا تھا۔ میرے اندر کا شیطان جاگنے لگا تھا۔ ناہید کے حسن کا تقدّس اس منظر نے پامال کر دیا تھا۔ پرانے شیخ کرامت کی شیطانی روح جیسے ایک طویل نیند سے بیدار ہو رہی تھی۔

میں نے اسی عالم کیف میں دو ایک ایسی حرکتیں کیں کہ ناہید کو مجھ پر غصّہ آ گیا۔ وہ کمرے سے چلی گئی۔ غنیمت یہ ہوا کہ اس نے میری ان باتوں کا تذکرہ امیر بابو جان سے نہیں کیا۔ میں اب ناہید کو حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ دن میں نے بڑی بے چینی سے گزارا۔

تنظیم کے ارکان مجھ سے ملنے کے لیے آتے جاتے رہے، لیکن ناہید پھر نہ آئی۔

رات کو ناہید، امیر بابو جان کے ساتھ میرے کمرے میں آئی اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر اپنے بستر پر دراز ہو گئی۔ امیر بابو جان بھی عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ ہم تینوں ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ امیر بابو جان گہری نیند سو گئے ہیں تو میں نے اپنے ہمزاد کو طلب کیا میں نے اسے حکم دیا کہ وہ ناہید کو بے ہوش کر دے۔ میں جانتا تھا کہ وہ مغرور سرکش لڑکی بہ قید ہوش و حواس کبھی مجھے قریب نہیں آنے دے گی۔ جب ہمزاد نے اسے بے ہوش کر دیا تو میں چپکے سے اس کے بستر کی طرف بڑھ گیا۔

پھر میں اپنے بستر پر لیٹا تھا کہ اچانک فضا دھمکوں سے گونج اٹھی۔ امیر بابو جان نے آنکھ کھلتے ہی لالٹین کی لو تیز کر دی۔ جب ان کی نظر مجھ پر پر اور بے ہوش ناہید پر پڑی تو وہ سکتے میں رہ گئے۔ ان کے تصوّر میں نہیں آ سکتا تھا کہ وہ کوئی ایسا منظر دیکھیں گے۔

دفعتہً ایک شخص یہ چیختا ہوا کمرے میں داخل ہوا کہ انگریزوں نے حملہ کر دیا۔

وہ شخص قائم خان تھا۔ میں نہایت تیزی سے اٹھا اور اپنی بیساکھیاں اٹھا کر کھڑکی کے راستے اس مکان کے پچھواڑے کود گیا۔

اسی وقت امیر بابو جان کی کڑکتی ہوئی آواز سنائی۔ "اسے پکڑو!"

میں اپنی بیساکھیاں ٹیکتا ہوا تیزی سے ایک طرف بھاگ نکلا۔ قائم خان میرے تعاقب میں آ رہا تھا۔ میری مشکل یہ تھی کہ میں اپنی موجودہ حالت میں ہمزاد کو اپنی مدد کے لیے نہیں بلا سکتا تھا۔ میری منزل اسی لیے ایک قریبی چشمہ تھی۔ میں کسے نہ کسی طرح اپنی جان پر کھیل کر قائم خان کے ہاتھ لگے بغیر اس چشمے تک پہنچ گیا اور فوراً پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اب میں اس قابل ہو گیا تھا کہ ہمزاد کو طلب کر سکوں۔

پھر اس سے پہلے کہ قائم خان مجھ پر گولی چلاتا، ہمزاد نے میرے حکم پر اس کے ہاتھ سے بندوق چھین لی، پھر اسے بے ہوش کر دیا۔ پھر وہ فوراً ہی مجھے وہاں سے لے اڑا۔

دھماکے اب زیادہ زور و شور سے سنائی دینے لگے تھے۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ انگریزوں میں اور مجاہدین میں باقاعدہ ٹھن گئی تھی۔

ہمزاد نے مجھے ایک غار میں پہنچا دیا اور بتایا کہ یہ علاقہ انگریزی حدود میں ہے۔ میں نڈھال ہو چکا تھا اس لیے فوراً ہی لیٹ گیا۔ میں جانتا تھا کہ ناہید کے واقعے کے بعد اب امیر مجاہدین کے درمیان واپس جانا، ممکن نہیں رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اچانک ہی اب ان لوگوں سے

میری دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ اب میں صرف جبّار سے انتقام لینا چاہتا تھا جس کی وجہ سے میں مہ پارہ کو حاصل نہیں کر سکا تھا۔ اسی کی وجہ سے مجھے اتنی پریشانیاں اٹھانا پڑی تھیں۔

میں نے جب اپنے اس خیال کا اظہار اپنے ہمزاد سے کیا تو اس نے بھی میری تائید کی اور کہا۔ ”آپ قطعی صحیح سوچ رہے ہیں۔ میں نے تو آپ سے پہلے بھی کہا تھا۔ کئی موقع بھی ایسے آئے تھے کہ اسے آسانی سے ختم کیا جا سکتا تھا‘ مگر آپ نے خود ہی وہ مواقع کھو دیے۔“

اب کوئی ایسا موقع نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس رات میں ایک عرصے کے بعد بہت سکون کی نیند سویا۔ ہمزاد کو میں نے اپنی حفاظت کے خیال سے رخصت نہیں کیا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ اسی غار میں تھا۔ گذشتہ تجربوں نے مجھے اتنا سبق تو دے ہی دیا تھا کہ دشمن کو بھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ جس طرح میں ’جبّار کے بارے میں منتقمانہ منصوبے بنا رہا تھا‘ ممکن تھا کہ وہ بھی مجھے زک دینے کا موقع ڈھونڈ رہا ہو۔ بہرحال میں ’ہمزاد کی موجودگی میں ہر قسم کے خطرے سے بے نیاز تھا۔

بہت دن بعد بے فکری کی نید آئی تھی۔ اگر ہمزاد مجھے بیدار نہ کرتا تو میں نہ جانے کب تک اور کتنی دیر سوتا رہتا۔ وقتی طور پر جاگ اٹھنے سے کچھ جھنجلاہٹ ہوئی ‘مگر یہ سوچ کر میں چپ رہا کہ ہمزاد نے مجھے بے سبب نہ جگایا ہو گا۔ میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ایک اور خطرہ آپ کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔“ ہمزاد نے میری سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔ ”اس خطرے سے قبل از وقت آپ کو آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ میں نے اسی لیے آپ کو بیدار کیا ہے۔“

پھر میرے استفسار پر ہمزاد نے مجھے اس خطرے کی نوعیت سے آگاہ کیا تو کچھ دیر کو میں متفکر ہو گیا۔ اس خطرے کا سدباب ضروری تھا۔

ہمزاد سے مجھے معلوم ہوا کہ میرے فرار ہونے کے بعد ناہید کو ہوش میں لانے کی بہت کوشش کی گئی ‘لیکن رات کو وہ ہوش میں نہ آ سکی۔ وہ ہوش میں آتی بھی کیسے جب کہ ہمزاد نے اسے صبح تک کے لیے بے ہوش کیا تھا۔ صبح ہوش میں آ کر جب اسے اپنی حالت کا اندازہ ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ گذشتہ رات میں نے اس کے ساتھ کیا ستم ڈھائے ہیں تو وہ شدتِ جذبات اور غصے کی انتہا میں تقریباً“ نیم پاگل سی ہو گئی۔ تنظیم کے تمام ہی افراد کو میرے فرار اور ناہید کے ساتھ زیادتی کا علم ہو چکا تھا۔ ناہید کی حالت دیکھ کر ان کا خون کھول اٹھا۔ انگریزوں سے برسرپیکار ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے چند خاص اور خطرناک آدمی مجھے تلاش کرنے کے لیے آس پاس کے علاقوں میں بھیج دیے۔ وہ لوگ اب تک مجھے تلاش کر رہے تھے۔ انہیں امیر بابو جان نے حکم دیا تھا کہ مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں۔

تنظیم کے ان افراد کا مجھ تک پہنچنا اول تو ناممکن تھا‘ اگر وہ کسی طرح مجھ تک پہنچ بھی جاتے تو ہمزاد کی موجودگی میں میرا کچھ نہ بگاڑ پاتے۔ اصل خطرہ اس سے مختلف تھا۔ وہ خطرہ یہ تھا کہ امیر بابو جان نے میری تلاش اور میری پُراسرار قوتوں سے نمٹنے کے لیے ایک تارک الدنیا بزرگ کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ وہ تارک الدنیا شخص‘ ملکاہی کی قریبی پہاڑیوں میں سکونت پزیر تھا۔ ہمزاد نے مجھے بتایا کہ اس شخص کے پاس کچھ ایسی قوتیں ہیں جن کے ذریعے نہ صرف وہ میرا سراغ لگا سکتا ہے بلکہ چاہے تو تنظیم کے افراد کی معاونت کر کے میرے لیے مشکلات بھی کھڑی کر سکتا ہے۔

میرا ہمزاد اس شخص سے ٹکراتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ میں نے ہمزاد سے کچھ ایسا بندوبست کرنے کو کہا کہ جب تک جبّار کو سزا نہ دے دی جائے‘ ہمیں بزرگ سے نہ الجھنا پڑے۔

میرے لیے کھانے کا بندوبست کرنے کے بعد ہمزاد‘ ملکا روانہ ہو گیا تاکہ تارک الدنیا بزرگ کی قوتوں کا اندازہ لگا سکے۔ شام کو وہ لوٹ آیا اور اس نے بتایا کہ بزرگ نے چالیس گھنٹے کا ایک چلہ کھینچ رکھا ہے۔ چلہ پورا ہونے کے بعد وہ امیر بابو جان کو نہ صرف آپ کے بارے میں تفصیل سے سب کچھ بتا دے گا بلکہ بہ ذات خود مقابلے پر آ جائے گا۔

اس چلہ کشی کی وجہ سے بہرحال دو راتوں کی مہلت مل گئی تھی اور میں اس عرصے میں ہمزاد کے ذریعے جبّار سے نمٹ سکتا تھا۔ پھر مجھے یہ موقع اسی رات مل گیا۔ جبّار جاگ جاگ کر تھک چکا تھا کیوں کہ اسے میری طرف سے اسے خطرہ لاحق تھا۔ اسے یہ گمان تھا کہ میں سوتے میں اس پر حملہ کر دوں گا۔ اس نے اپنے ہمزاد سے نجات پانے کے لیے ایک خوب صورت سہارا ڈھونڈ لیا۔ اس عالم میں وہ اپنے ہمزاد کو طلب نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ میں نے اپنے ہمزاد سے جبّار کو اٹھوا لیا۔

جبّار اس ویرانے میں پہنچ کر گھبرا گیا۔ اب وہ بے سپر تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں پہنچ گیا ہے! لیکن جب اس نے میری آواز سنی تو سمجھ گیا کہ انجام قریب ہے۔ وہ بہت رویا‘ بہت گڑگڑایا‘ لیکن مجھے اس پر رحم نہ آیا۔ میرے اشارے پر ہمزاد نے اسے ایک اونچی چٹان سے نیچے گرا دیا۔ اس پر پتھر برسائے گئے۔ سخت کھردرے پتھریلے راستوں پر اس کے لہولہان جسم کو گھسیٹا گیا۔ پہاڑیاں اس کی دل دوز چیخوں سے گونجتی رہیں۔ رات پھر اسے

سخت عذابوں سے گزرنا پڑا۔ دن گزرنے کے بعد رات کو پھر ہی خوف ناک کھیل دہرایا گیا۔ پھر میں نے جان بہ لب جبّار کو ایک دور دراز مقام پر پھنکوا دیا۔ میرے انتقام کی آگ سرد ہو چکی تھی، لیکن اب میں خود کو بہت تھکا ہوا اور نڈھال محسوس کر رہا تھا۔ آخر میں سو گیا، لیکن مجھے زیادہ دیر سونا نصیب نہ ہوا۔

اچانک میری آنکھ کھلی تو میں خوف سے کانپ کر رہ گیا۔ بے شمار سانپ میرے جسم کو بری طرح جکڑے ہوئے تھے اور ایک چمکیلا ہیولا میری نظروں کے سامنے تھا۔ میں اسے دیکھ کر سکتے میں رہ گیا کیوں کہ مہ پارہ تھی، مہ پارہ کی روح! اس نے مجھ سے باتیں کیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بدنصیب ناہید کی مدد کرے گی، لیکن مجھے مرنے نہیں دے گی اور زندگی بھر اس طرح تڑپاتی رہے گی جس طرح میں دو راتوں تک جبار کو تڑپاتا رہا تھا۔ میں نے چیخ کر ہمزاد کو بلانا چاہا لیکن وہ نہیں آیا۔ مہ پارہ نے بتایا کہ اس کی روح کی حیرت انگیز قوتوں کے مقابل آنا ہمزاد کے بس کی بات نہیں۔ مہ پارہ مجھے دھمکیاں دے کر چلی گئی اور وہ سانپ بھی میرے جسم سے الگ ہو کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے!

مہ پارہ کی روح کے جاتے ہی ہمزاد میرے پاس آ گیا۔ اس نے مجھے تسلّی تشفی دی اور کہا کہ کسی نہ کسی طرح مہ پارہ کی روح سے نمٹ لیا جائے گا۔

اگلے روز میں، ہمزاد کی مدد سے ایک اور غار میں منتقل ہو گیا، لیکن اس سے مجھے کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا۔ مہ پارہ اور تارک الدنیا بزرگ کی قوتیں ناہید کی مدد کر رہی تھیں۔ وہ برہنہ تلوار لیے اس غار میں داخل ہوئی جہاں میرا قیام تھا۔ پھر وہ وحشیوں کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑی۔ اس وقت مہ پارہ کی روح کا چمکیلا، روشن ہیولا بھی غار میں موجود تھا۔

ناہید کی تلوار کا پہلا وار میں نے بیساکھی پر روک تو لیا مگر ضرب اتنی شدید تھی کہ بیساکھی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ تلوار پھر چلی۔ میں اس خون خوار لڑکی کے سامنے خود کو قطعی بے بس محسوس کر رہا تھا جو مجھ سے انتقام لے رہی تھی۔ مہ پارہ کی روح وہاں موجود تھی اس لیے میرا ہمزاد بھی میری مدد کو نہیں آ سکتا تھا۔

موت سامنے نظر آ رہی ہو تو آدمی کی قوت مدافعت بڑھ جاتی ہے میں نے وہ خطرناک وار بھی ایک طرف لڑھک کر رائگاں کر دیا، مگر ناہید کے جسم میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس وقت خود کو بہت ہراساں اور خوف زدہ محسوس کیا، لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہونے کے باوجود میں نے جس پھرتی اور مستعدی کا ثبوت دے رہا تھا، وہ یقیناً میری ہمت تھی ورنہ اس صورت حال سے کوئی دوسرا شخص دوچار ہوتا تو کبھی کا ہاتھ پیر چھوڑ

چکا ہوتا۔ موت کے خوف نے میرے سارے حواس بیدار کر دیے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ میں، ناہید کے ایک زبردست وار سے بچنے کے لیے تیزی سے ایک طرف سرکا تھا، لیکن میرا دایاں بازو زخمی ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ میں نے زخمی ہو کر ایک بار پھر سنبھلنا چاہا اور میں اسی کشمکش میں ایک بار اٹھ کر منہ کے بل گرا۔ میں اس غار کی دیوار میں ابھرے ہوئے ایک پتھر سے ٹکرایا۔ ممکن ہے کہ میں کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش میں کامیاب ہو جاتا مگر اس وقت مہ پارہ کے زہریلے قہقہے نے میری ساری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ غفلت کے یہ صرف چند لمحے تھے اور انہیں لمحوں میں مجھ پر قیامت گزر گئی۔ تلوار کے ایک بھرپور وار نے میری گردن اڑا دی تھی۔

اس لمحے جب میں نے تلوار کی ضرب اپنی گردن پر محسوس کی تھی تو سوچا تھا کہ مہ پارہ اپنے عہد سے پھر گئی ہے اور میں قتل کر دیا گیا ہوں۔ میرے لیے موت کا یہ دوسرا تجربہ تھا۔ میں ایک بار بدایوں میں بھی موت کے اس تجربے سے گزر چکا تھا جب میرٹھ کے نواب صاحب کے غنڈوں نے مجھے قتل کر دیا تھا۔ تکلیف و اذیت کی انتہا نے مجھے زیادہ نہ سوچنے دیا اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ میرا آخری احساس یہ تھا کہ میں موت سے ہم کنار ہو رہا ہوں۔

تیز ہواؤں کی سنسناہٹ، گہرا اندھیرا اور میرا متحرک وجود مجھے بہت دیر تک یاد ہی نہ آ سکا کہ میں کون ہوں! اور کہاں جا رہا ہوں! پھر رفتہ رفتہ میری یادوں کے دریچے کھلنے لگے۔ مجھے قتل کر دیا گیا تھا۔ میں نے سوچا اور اس احساس کے ساتھ ہی اپنے اندر خوف کی ایک لہر محسوس کی۔ کیا فرشتے مجھے لے کر آسمانوں کی طرف جا رہے ہیں؟

ہاں ایسا ہی ہے! میرے نیم غنودہ ذہن نے جواب دیا۔ مجھے اپنی تمام زندگی کے گناہ و ثواب یاد آنے لگے۔ مجھے عالم برزخ میں رکھا جائے گا اور پھر میری روح پر عذاب مسلط کر دیے جائیں گے۔ میں نے دنیا میں رہ کر بڑی گنہگار زندگی گزاری تھی۔ عذابوں کے خوف سے میں کانپ اٹھا، مجھ پر دہشت سی طاری ہو گئی اور میرا ذہن پھر اندھیروں میں بھٹک گیا۔

ہوش آیا تو میں نے عالم برزخ کی بجائے خود کو ایک، جانے پہچانے ماحول میں پایا۔ ہمزاد مجھے بدایوں لے آیا تھا۔ میں ایک بار پھر اسی ویران خانقاہ میں تھا جہاں کبھی ایک عرصے رہا تھا۔ تاریخ اپنے آپ کو ایک بار پھر دہرا رہی تھی۔ اس مرتبہ بھی مجھے اپنے لیے ایک جسم کی ضرورت تھی۔

اس مرتبہ بھی میں نے جسم حاصل کرنے کے لیے رضیہ کو آلہ کار بنایا۔ ہمزاد نے جو

معلومات حاصل کی تھیں، ان کے مطابق رضیہ کی شادی ہونے والی تھی۔ رضیہ سے شادی کرنے والا نوجوان دراصل ایک بردہ فروش گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ گروہ رضیہ کو کہیں اور لے جا کر بیچنا چاہتا تھا۔ ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح رضیہ کے باپ کو بے وقوف بنا کر اسے رضیہ کی شادی پر آمادہ کر لیا تھا۔ بالآخر یہ شادی ہو بھی گئی۔ لیکن رضیہ کو پہلے ہی سے میرا ہمزاد اپنی مٹھی میں لے چکا تھا۔ شب عروسی کی مہکتی ہوئی فضا میں رضیہ نے اس نوجوان کے سر کو اس کے تن سے جدا کر دیا۔ پھر ہمزاد نے میرا سر، اس کے جسم سے جوڑ دیا۔ کسی دوسرے جسم سے میرے سر کا جڑنا اتنا اذیت ناک عمل تھا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو ہمزاد نے بتایا کہ بردہ فروش رضیہ کو اڑا لے جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ انہوں نے رضیہ کو کلکتہ لے جا کر ایک طوائف ممتاز بائی کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔

میں نے فوری طور پر کلکتہ جانے کا فیصلہ کر لیا، مگر چالیس دن پورے ہونے سے پہلے یہ ممکن نہ ہوا۔ میرے سر کو نئے جسم سے رابطہ پیدا کرنے میں اتنا وقت بہر حال لگنا تھا۔ چالیس دن بڑے عذاب میں گزرے اور پھر میں نے غسل صحت کیا۔ اسی روز، ہمزاد کے ساتھ کلکتہ پہنچ گیا تاکہ رضیہ کو اس عذاب ناک ماحول سے نجات دلا سکوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے دل میں رضیہ کی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اسے اور اپنے بچے کو جو ناجائز تھا، ایک شان دار زندگی سے آشنا کراؤں۔

ہمزاد نے مجھے بتایا کہ ممتاز بائی کی لاکھ کوششوں کے باوجود رضیہ اس مکروہ زندگی کو اپنانے پر تیار نہیں ہوئی تھی۔ رضیہ کو اپنی دانست میں راہ راست پر لانے کے لیے ممتاز بائی نے ایک شخص دلال بزجی کی خدمات حاصل کی تھیں۔ بزجی کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ اپنی پراسرار اور حیرت انگیز قوتوں سے کام لے کر لڑکی کو رام کر سکتا ہے میں ممتاز بائی کے کوٹھے جانے کے لیے بہو بازار ٹھیک اس وقت پہنچا جب دلال بزجی کی فٹن وہاں آ کر رکی۔

نیا جسم حاصل کرنے کے بعد خود پر میرا اعتماد بڑھ گیا تھا۔ میں نے اس لیے بہو بازار میں پہنچ کر اپنے ہمزاد کو رخصت کر دیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے ہمزاد سے ممتاز بائی کے کوٹھے کا معلوم کر لیا تھا۔ ہمزاد نے مجھے جس عمارت کا پتا بتایا تھا، میں اسی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسی دوران میں میری نظر دلال بزجی پر پڑی تھی۔ وہ اپنی فٹن سے اتر کر عجیب و غریب ملبوس والے نوجوانوں کے حلقے میں آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ سوچ کر میرے تمام حواس بیدار ہو گئے کہ مجھے آئندہ جس شخص کی پُراسرار قوتوں کا سامنا کرنا ہے، وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر موجود ہے۔

دلال بزجی اپنی فٹن سے اتر کر رکا نہیں تھا۔ چاروں نوجوان اس کے گرد حلقہ بنائے اسے لیے ایک طرف بڑھ رہے تھے۔ پیادہ رو پر بھیڑ تو پہلے ہی کافی تھی، لیکن اب اس میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ اسی بھیڑ کے درمیان سے دلال بزجی اور اس کے ساتھی گزر رہے تھے۔ وہ عمارت ابھی دور تھی جس کی ہمزاد نے نشان دہی کی تھی۔ یہ تو میرے علم میں آ ہی چکا تھا کہ دلال بزجی کی منزل، ممتاز بائی کا کوٹھا ہے تو پھر وہ پہلے ہی فٹن سے کیوں اتر گیا اور اس نے وہاں سے پیدل جاتا کیوں پسند کیا؟ میں نے اس سلسلے میں صرف اتنا قیاس کیا کہ دلال بزجی نمائش پسند شخص ہے۔

میں نے چاہا تو یہ تھا کہ دلال بزجی سے پہلے ممتاز بائی کے کوٹھے تک پہنچ جاؤں تاکہ اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی رضیہ کو لے اڑوں، مگر میں قبل از وقت نہیں پہنچ سکا تھا۔ دلال بزجی اور اس کے ساتھیوں کی چال میں ایک عجیب سا بہاؤ تھا۔ میں انہی کے پیچھے چل رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ زمین پر نہ چل رہے ہوں بلکہ فضا میں بہے جا رہے ہوں۔ وہ سبھی، کھڑاؤں پہنے ہوئے تھے، لیکن کھڑاؤں کی آواز نہیں آ رہی تھی۔

دلال بزجی اور میں، دونوں آگے پیچھے ممتاز بائی کے کوٹھے پر پہنچے۔ حالانکہ اس روز دلال بزجی وہاں مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو تھا اور اس کی موجودگی میں ہر خاص و عام کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی تاہم مجھے داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔ اندر پہنچ کر تھوڑی دیر بعد میں نے رضیہ کو محو رقص دیکھا۔ اس کے پاؤں سر تال سے پوری طرح ہم آہنگ تھے اور جسم قیامت خیز انداز میں لچک رہا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بجلیاں کوند رہی ہوں۔ ذرا سی دیر میں مجھے اس بات کا احساس ہو گیا کہ رضیہ کی یہ تمام حرکات لاشعوری ہیں اور وہ دلال بزجی کے اشاروں پر رقص کر رہی ہے۔ بنگال کا وہ ساحر یقیناً ایک صاحب کمال شخص تھا۔

پھر جب میں نے اپنے ہمزاد کو طلب کیا تو بزجی کو بھی احساس ہو گیا کہ میرے قبضے میں بھی کچھ پُراسرار قوتیں ہیں۔ اس نے ہوشیاری سے کام لے کر مجھے اپنی باتوں میں الجھا لیا اور اس کے گرگے اس دوران میں عقبی دروازے سے رضیہ کو لے اڑے۔ ہمزاد وہاں بھی آڑے آیا۔ رضیہ کو ان لوگوں کے چنگل سے چھڑانے کے بعد اس نے مجھے وہیں چھوڑا اور خود رضیہ کو لے کر ذکریہ اسٹریٹ فلیٹ کی جانب چل دیا جہاں میرا قیام تھا۔

ممتاز بائی کے کوٹھے سے نیچے اترتے ہی میں نے وہاں سے فرار ہونا چاہا، مگر اجنبی گلی کوچوں میں راستہ بھول گیا۔ اسی دوران میں ایک شخص میرے قریب آ کر ٹھٹک گیا اور مجھے فضل الرحمٰن کہہ کر مخاطب کیا۔ شناسائی ظاہر کرنے کی غرض سے اس نے مجھے اپنا نام بھی بتایا۔

میں ایک پل میں سمجھ گیا کہ اس شخص کا تعلق تحریک آزادی کی خفیہ تنظیم سے ہے۔ جس کا رکن میں بھی رہ چکا تھا۔ اس سے پیچھا چھڑانے کی واحد ترکیب یہی تھی کہ میں لاتعلقی ظاہر کروں۔ میرے انجان بننے پر وہ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھتا' اس گلی میں تیز سیٹیوں کی آواز گونجنے لگی۔ تنظیم کا رکن امین اللہ ایک جانب بھاگ اٹھا' حالانکہ مجھے اب اپنی راہ لینا چاہئے تھی' مگر میں بوکھلا گیا اور خود بھی امین اللہ کے پیچھے بھاگتا چلا گیا۔ امین اللہ تو آگے جا کر غائب ہو گیا مگر مجھے فرار ہونے کی کوئی راہ نہ ملی۔ سپاہیوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ میں نے ایک مکان کے کھلے دروازے میں چھلانگ لگا دی اور بہ مشکل ان سپاہیوں کی گرفت میں آنے سے بچا جو یقیناً مجھے بھی امین اللہ کا ساتھی سمجھ رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں اس مکان کی چھت پر پہنچ کر اور وہاں سے بہ آسانی دوسری چھتوں سے گزر کر فرار ہو جاؤں گا مگر ابھی میں چھت کے کنارے پہنچا ہی تھا کہ میرے پیچھے آنے والے سپاہی' مکان کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے جسے میں بند کر آیا تھا۔ سپاہیوں نے مجھ پر فائرنگ شروع کر دی۔ اس جاں گسل مرحلے میں ہمزاد کو بھی طلب کر سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر میں نے اسے وقت طلب کر لیا تو وہ رضیہ کو منزل مقصود تک پہنچانے سے قاصر رہے گا۔ میرے طلب کرنے پر وہ رضیہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر چلا آتا اور اس دوران بزجی کے گرگے ایک بار پھر رضیہ کو لے اڑتے۔ میں زیادہ دیر سپاہیوں سے مقابلہ نہ کر سکا اور بے ہوش ہو گیا۔

آنکھ کھلنے پر میں نے اپنے سامنے ہمزاد کو پایا۔ وہ میری طرف سے غافل نہیں رہا تھا اس لیے مجھے معیبت میں گرفتار دیکھ کر فوراً" دوڑ پڑا مگر اس کا نتیجہ وہی نکلا جس سے میں بچنا چاہتا تھا۔ رضیہ اس کے ہاتھ سے نکل کر دلال بزجی کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔

میرے استفسار پر ہمزاد نے بتایا کہ دلال بزجی' رضیہ کو اپنی عبادت گاہ لے گیا ہے جہاں کوئی بھی غیر مادی وجود داخل نہیں ہو سکتا۔ میں نے وہاں جانے کی ضد کی تو ہمزاد نے مجھے کچھ غیر معمولی قوتیں عطا کیں۔ دلال بزجی کی عبادت گاہ' دریائے ہگلی کے کنارے تھی۔ ہمزاد نے مجھے وہاں پہنچا دیا۔ اس کھنڈر ایسی عمارت میں داخل ہوتے ہی مجھے رضیہ کی اعصاب شکن چیخ سنائی دی۔ میں آواز کی سمت لپکا' مگر میری راہ میں دلال بزجی کا فسوں حائل ہو گیا۔ شراب و شباب نے میرے قدم اس طرح تھام لیے کہ میں وہیں کا ہو رہا۔

پورے ایک ہفتے کی سرشاری کے بعد جب میری آنکھیں کھلیں تو میں نے رضیہ کو اپنے قدموں میں پایا۔ رضیہ کی حالت سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ اس پر کیا کچھ گذر چکی ہے! میں اپنی عقل اور ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جانے پر ماتم کرتا ہوا رضیہ کو کسی لاشے کی طرح اپنے

ہاتھوں پر اٹھائے وہاں سے باہر آ گیا۔ ذکریا اسٹریٹ والے فلیٹ میں آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ رضیہ اس وقت دلال بزجی کی پُراسرار قوتوں کے زیر اثر تھی۔ وہ اپنے اوپر کیے جانے والے ستم سے لاعلم تھی۔ اس کی سرگذشت سننے کے بعد میرا خون کھول اٹھا اور میں نے دلال بزجی سے انتقام لینے کی ٹھانی میرا ارادہ تھا کہ جس طرح اس نے میری عزت پر حملہ کیا تھا اس طرح میں بھی اسے بے عزت کروں۔ ہمزاد سے میرے علم میں یہ بات آئی کہ بزجی ایک دن بعد کلکتہ کے ایک بڑے ہوٹل پرنس گرانڈ میں اپنے کمالات دکھانے والا ہے۔ دلال بزجی کا ارادہ ہے کہ وہ وہاں سے رائے بہادر جسونت لال کی حسین لڑکی سروجنی کو غائب کر دے گا۔ میں نے دلال بزجی سے اس تقریب میں نمٹنے کا فیصلہ کیا۔

تقریب میں شریک ہونے کے لیے میں نے ایک نواب دلاور جنگ کی جگہ لے لی۔ جب میں گرانڈ ہوٹل پہنچا تو وہاں تحریک آزادی کے مجاہد امین اللہ کو سے دوبارہ مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ مجھے اچھی طرح پہچان چکا ہے اور اس بات کی تصدیق کر چکا ہے کہ میں ہی ظل الرحمن ہوں۔ امین اللہ کا اصرار تھا کہ میں یہ تقریب چھوڑ کر سیدھا اپنے فلیٹ پر پہنچوں جہاں تنظیم کے امیر عبدالرحمن میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس کی باتوں سے میں نے سمجھ لیا کہ سرحدی علاقے سے یہ اطلاع بنگال نہیں پہنچی کہ میں ایک گل کھلا کر تنظیم سے الگ ہو چکا ہوں۔ یوں بھی اب مجھے تنظیم سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی اس لیے میں نے امین اللہ ٹال دیا۔ امین اللہ نے پھر اس پر اصرار کیا کہ اگر میں امیر عبدالرحمن سے نہ ملنا چاہوں تو نہ ملوں گا مگر اس ہوٹل سے چلا جاؤں۔ میں نے اس کی بات درخورہ اعتنانہ سمجھا۔ اور میں ہال میں آ بیٹھا

پروگرام شروع ہوا اور دلال بزجی بڑا پراسرار ثابت ہوا۔ اس نے پے در پے لوگوں کو حیرت انگیز کرتب دکھائے۔ اس نے جو کچھ کیا میرے لیے بھی غیر متوقع تھا۔ اسی دوران میں' میں نے فیصلہ کیا کہ اب اسے مزید کرتب بازی نہیں کرنے دوں گا اور ہمزاد کی مدد سے اس کا سارا منصوبہ چوپٹ کر دوں گا۔

تیسرا کرتب ابھی شروع نہیں ہوا تھا کہ ایک زبردست دھماکا ہوا اور اگلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے جسموں کے چیتھڑے اڑ گئے۔ ان میں شہر کے معززین بھی شامل تھے اور بنگال کا انگریز گورنر بھی!

میں صرف اتنا سمجھ سکا کہ اس دھماکے کا تعلق امین اللہ سے ہے شاید اسی لیے وہ مجھے وہاں سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ آناً فاناً" میں وہاں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انتظامیہ نے ہال کے سارے

دروازے بند کرادیے۔ دھماکا ہونے کے بعد کوئی شخص بھی باہر جانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ میں نے گھبرا کر اسٹیج کی طرف دیکھا۔ دلال بزجی نہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔

میں عجیب تذبذب کا شکار تھا۔ ہال کے دروازے فوراً" بند کردیے گئے تھے اس لیے مجھے یقین تھا کہ امین اللہ بنگال کے گورنر اور اس کے حواریوں پر بم پھینکنے کے بعد فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ہر چند کہ وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا، مگر مجھے اس کی طرف سے فکر لاحق تھی۔ حالات بالکل غیر متوقع طور پر بدل گئے تھے اور خود میرے لیے بھی فرار ہونا ایک مسئلہ تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب ایک ایک مہمان کی تلاشی لی جائے گی اور میرے لیے اپنی شخصیت چھپانا ایک مسئلہ ہو جائے گا۔ میری جیب میں ہزہائی نس نواب دلاور جنگ بہادر کا دعوت نامہ تھا۔ نواب دلاور جنگ جو بھی رہا ہو، اس سے اعلیٰ انگریز حکام کا واقف ہونا لازمی تھا اور تمام ہی اعلیٰ حکام وہاں موجود تھے۔

"افسران کے سوا تمام معزز برطانوی شہریوں کو یہاں سے بغیر روک ٹوک جانے کی اجازت ہے۔" میں نے ایک انگریز افسر کو اسٹیج پر دیکھا جس نے یہ اعلان کیا تھا کیوں کہ اس تقریب میں انگریزوں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ اس نے یہ الفاظ انگریزی زبان ہی میں ادا کیے تھے۔

اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ انگریزوں کو ہر قسم کے شبہے سے بالاتر سمجھا گیا تھا اور یہاں صرف ہندوستانیوں کو روکا جانے والا تھا کیوں کہ وہ ایک غلام قوم کے افراد تھے۔ میں انگریزوں کے تعصب پر کھول اٹھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً" ایک چوتھائی ہال خالی ہو گیا۔ اب ہال میں صرف انگریز افسران اور ہندوستانی باشندے رہ گئے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ ان میں سے کسی نے انگریزوں کے اس متعصبانہ رویے پر صدائے احتجاج بلند نہیں کی تھی حالانکہ اس ہال میں جو لوگ موجود تھے، وہ معمولی حیثیت کے مالک نہیں تھے۔

اگلی صف کے ارد گرد ایک دائرے کی شکل میں انگریز افسران مستعد کھڑے تھے اور اس صف کے پیچھے والی دو صفوں کو بھی انہوں نے خالی کرا لیا تھا۔ ہال کے تمام دروازے ابھی تک بہ دستور بند تھے۔ صدر دروازے پر مسلح پہریداروں کا ہجوم تھا جن میں اکثریت انگریزوں کی تھی۔ ان کی بندوقوں کی نالیں، ہال میں موجود لوگوں کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

نہ جانے کیوں مجھے خود سے زیادہ امین اللہ کا فکر تھی۔ مجھے تو بہرحال ہمزاد کی پُراسرار قوتوں کی مدد حاصل تھی، لیکن امین اللہ قطعی بے سہارا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ امین اللہ بھی میری طرح کسی کا دعوت نامہ لے اڑا ہو گا اور جب دعوت ناموں کی جانچ پڑتال ہو گئی تو وہ بہت

آسانی کے ساتھ دھر لیا جائے گا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ میری طرح دوسرے لوگوں نے بھی اسے اگلی صف کی طرف کوئی چیز پھینکتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ یہ صورت حال اور بھی خطرناک تھی۔

میں انہی خیالوں میں کھویا تھا کہ ایک دم اچھل پڑا۔ میری آنکھوں نے ایسا ہی منظر دیکھا تھا۔ اسٹیج پر اس وقت دلال بزجی اور اس کے چیلے نظر آ رہے تھے، مگر میرے چونک اٹھنے کا سبب وہ لوگ نہیں تھے امین اللہ تھا جسے وہ سب جکڑے ہوئے تھے۔

"یہ اسٹیج کے پچھلے دروازے سے بھاگنے کی کوشش میں تھا، مگر میں نے اسے عین موقع پر پکڑ لیا۔" دلال بزجی کی آواز ہال میں گونجی۔

دلال بزجی کی آواز سنتے ہی کئی انگریز افسران، اسٹیج کی طرف لپکے۔

"میری پُراسرار قوتیں کہتی ہیں کہ گورنر اور ان کے مہمانوں کا قاتل یہی ہے۔" دلال بزجی کی آواز پھر سنائی دی۔

"یہی ہے!..... یہی ہے!" ہال میں موجود افراد میں سے کئی چیخے۔

میرے خیال میں یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے امین اللہ کو بم پھینکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ امین اللہ نے فرار ہونے کے لیے یقیناً ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ اگر دلال بزجی آڑے نہ آگیا ہوتا تو وہ فرار ہو جاتا۔ اب انگریز افسران اسٹیج پر پہنچ چکے تھے۔

"قاتل نے تنہا یہ کارنامہ انجام نہیں دیا۔ یہاں اسی ہال میں اس کا ایک اور ساتھی موجود ہے۔"

"دلال بزجی کی آواز سن کر میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس کی آواز کے ساتھ ہی تمام ہال میں سناٹا چھا گیا۔ اب خاموش رہنے کا وقت گزر چکا تھا۔ مجھے اپنے بچاؤ کے لیے فوری طور پر کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ دلال بزجی مجھے پھنسوانے کے چکر میں ہے۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر ہمزاد کو طلب کر لیا۔

اسی وقت دلال بزجی چیخ اٹھا۔ "اس کا ساتھی وہ رہا!" اس کی انگلی میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

اتنے لوگوں کے ہجوم میں مجھے ایک دم پہچان لیا جانا، ممکن نہیں تھا۔ اس بات کو شاید دلال بزجی نے بھی فوراً" ہی محسوس کر لیا کہ اس قدر فاصلے سے اشارہ کرنا بے سود ہے۔ شاید یہی سوچ کر وہ میری نشان دہی کے لیے انگریز افسران کے ساتھ اسٹیج سے اترنے لگا۔ وہ بھی سیڑھیاں اتر کر ایک قدم ہی بڑھا ہو گا کہ تمام ہال اچانک تاریکی میں ڈوب گیا اور اس کے ساتھ

ہی ایسا معلوم ہوا جیسے ہال کے تمام دروازے خود بہ خود کھل گئے ہوں۔

"دوڑو! پکڑو!..... بھاگو! خبردار کوئی ہال سے باہر نہیں نکلے گا!" شور بلند ہوتا رہا۔ میں نے اپنے دائیں ہاتھ پر ایک نادیدہ گرفت محسوس کی۔

"نکل چلیے!" ہمزاد کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

اندھیرے میں لوگ ایک دوسرے سے الجھے ہوئے چیخ رہے تھے۔ چیخ پکار' بھاگ دوڑ' شور' ہنگامہ! میں بہت جلد ہال سے نکل کر مختلف راہداریوں سے گزرتا ہوا ہوٹل کے عقبی دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ میری کار اس چھوٹی سی گلی میں پہلے ہی سے موجود تھی اور میرا ڈرائیور رحمت خان اسٹیئرنگ پر مستعد بیٹھا تھا۔ میں نے بغیر کچھ کہے سنے جلد سے کار کا دروازہ کھولا اور اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ میرے ہمزاد نے فرار کے لیے ساری راہیں ہموار کی تھیں۔

میں اس ہنگامے کے دوران میں دلال برجی سے انتقام لینے کا بھول ہی چکا تھا' مگر ہمزاد نہیں بھولا تھا۔ کار کی پچھلی نشست پر دلال برجی کی محبوبہ سروجنی نیم بے ہوشی کی حالت میں موجود تھی۔ ہمزاد نے اتنے کم وقت میں جو کارنامہ انجام دیا تھا' وہ یقیناً قابل ستائش تھا۔ ہال کی روشنیاں گل کرنا' ہال کے تمام دروازے کھول دینا' سروجنی تک پہنچ کر اسے اغوا کرنا اور پھر اسے میری کار میں منتقل کرکے مجھ تک پہنچنے میں اس نے چند لمحے صرف کیے تھے۔ ہمزاد کی یہ تیز رفتاری میرے لیے پہلا تجربہ تھی۔ ہرچند کے میرے علم میں پہلے سے تھا کہ ہمزاد کی پُراسرار قوتوں میں سے ایک قوت یہ بھی ہے کہ وہ نہایت مختصر وقت میں بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہے' لیکن اس واقعے سے قبل مجھے اس نوعیت کا کوئی عملی تجربہ نہیں تھا۔ ہمزاد کی اطلاع کے مطابق برجی اس بات سے واقف ہوچکا تھا کہ میں سرجنی کو لے اڑا ہوں۔

"تو گویا میں جیت گیا! میں نے اس سے انتقام لے لیا!" میری آواز خوشی سے کانپنے لگی۔

پھر میں نے ہمزاد کو اپنے فلیٹ پر پہنچ کر رخصت کیا۔ رخصت ہونے سے پہلے ہمزاد نے کچھ کہنا چاہا' مگر یہ لمحے کچھ اور ہی تقاضا کر رہے تھے۔ میں نے ہمزاد کی ایک نہ سنی۔ ہمزاد میرے حکم سے کس طرح سرتابی کرسکتا تھا' وہ چلا گیا۔ سروجنی سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔

میں نے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کیا اور پھر جب وہ ہوش میں آگئی تو اسے دھمکی دی اور وہ اس دھمکی میں آگئی۔

کچھ دیر بعد معاً میری سماعت سے ایک گونج دار آواز ٹکرائی "دروازہ کھولو!..... کھولو دروازہ!"

پہلے دو مرتبہ مجھے تقریباً ایسی ہی صورت حال سے سابقہ پڑ چکا تھا اس لیے میں نے غسل کرنے میں دیر نہ کی اور اس دوران میں فلیٹ کا دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھولنے والی سروجنی تھی۔ میں ابھی تک غسل خانے میں تھا اور باہر قدموں کی آواز گونج رہی تھی۔ میں نے ہمزاد کو طلب کرلیا اور اس نے فوراً صورت حال کو سنبھال لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمزاد نے میرا جیتا جاگتا روپ اختیار کرکے ان لوگوں کو اپنے تعاقب میں لگالیا تھا اور انہیں اس جگہ سے بہت دور چھوڑ آیا تھا۔ سروجنی ان لوگوں کے جاتے ہی سراسیمہ ہو کر وہاں سے فرار ہو گئی تھی

وہاں داخل ہونے والے پولیس فورس سے تعلق رکھتے تھے اور مجھ تک دلال برجی کے اشارے پر پہنچے تھے۔ اس خیال کے پیش نظر کہ پولیس دوبارہ وہاں نہ آجائے' میں نے رضیہ کو ساتھ لیا اور ہمزاد کے ہمراہ اس جگہ کو چھوڑ دیا۔ اب میرا ٹھکانا ایک ہوٹل میں تھا۔

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ان واقعات کے پیچھے دلال برجی کا ہاتھ تھا' مجھے تشویش ہوئی کہ وہ پھر کوئی ہنگامہ کھڑا نہ کرے۔ میری موجودہ پناہ گاہ سے واقف ہوتے اسے کیا دیر لگتی! میں نے اپنے وسوسوں سے ہمزاد کو آگاہ کیا تو اس نے بتایا کہ دلال برجی مجھ سے اس قدر ہراساں ہے کہ اس نے اپنی پُراسرار عبادت گاہ میں پناہ لے لی ہے۔ میں نے اپنے غم و غصے کا اظہار کیا تو ہمزاد نے ایک دن کی مہلت چاہی۔ اب میں' دلال برجی کے وجود کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

اس اطمینان کے بعد کہ دلال برجی اب فوری طور پر کوئی وار نہیں کرے گا' میں سو گیا۔ رضیہ بھی میرے ساتھ تھی۔ اسی دوران میں میری غفلت سے فائدہ اٹھا کر دلال برجی نے مجھ پر اپنا جادو آزمایا نیند میں مجھ پر سیاہ بلیوں نے حملہ کردیا۔ میں اس وقت پاک نہیں تھا اس لیے ہمزاد کو بلانے سے قاصر رہا۔ بلیوں نے پے در پے حملوں کی بنا پر مجھے محسوس ہوا جیسے اب میری زندگی کا چراغ بجھنے والا تھا۔ شاید موت مجھے آلیتی — مگر رضیہ کی چیخوں سے ہوٹل کے افراد کی توجہ اس جانب مبذول کی اور یوں مجھے ان بلاؤں سے چھٹکارا نصیب ہوا۔

غسل کرکے میں نے ہمزاد کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ فوراً دلال برجی کی پُراسرار قوتوں کو اور خود اسے نیست و نابود کردے۔ روانگی سے قبل ہمزاد نے میرے گرد ایک تیز چمکیلا حصار قائم کردیا تاکہ میں دلال برجی کے حملوں سے محفوظ رہ سکوں۔ ہمزاد نے مجھے یہ بھی بتایا

کی کہ میں کسی سے اس قدر قریب نہ ہوں کہ کوئی دوسرا اس حصار کی زد میں آ جائے۔ اس حصار میں داخل ہونے والے اجسام زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔

ہمزاد کے جاتے ہی میں نے اپنی چشم تصور وا کی اور دلال بزجی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار تھے اور آس پاس نازنینوں کا ہجوم تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کایا پلٹی اور اس کی سحر کاریاں پرزہ پرزہ ہوتی نظر آئیں۔ دلال بزجی نے کسی نادیدہ قوت کو آواز دے کر اپنے وجود کو سمیٹنا چاہا، مگر کچھ بھی ممکن نہ ہوا۔ اس کی پُراسرار عبادت گاہ "آنا" فانا" ملبے کا ڈھیر بن گئی۔ دلال بزجی وہاں سے چیختا ہوا بھاگا۔ اس دوران میں ہمزاد کو سخت ترین کرب اور اذیت سے دوچار ہونا پڑا۔ میں نے اسے طلب کرنا چاہا تو وہ میرے آنے سے بھی قاصر رہا۔ میرے حکم پر وہ بنگال کے اس ساحر سے ٹکرا گیا تھا۔ جس سے ٹکرانا اپنے وجود کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ اس نے شاید اسی لیے مہلت مانگی تھی، مگر حالات کچھ اس طرح پیش آئے کہ میں نے اسے مہلت نہیں دی۔ شاید دلال بزجی سے مقابلہ کرتے ہوئے اس کی قوتیں مفلوج ہو گئی تھیں۔

چونکہ میرے گرد ایک حفاظتی چمکیلا غبار قائم تھا اس لیے میں اس رات رضیہ سے الگ رہا اور دور سویا، لیکن یہ احتیاط کام نہ آئی۔ نہ جانے کب رضیہ لاعلمی کے سبب میرے قریب آئی اور ایک ہولناک چیخ مار کر کوئلے میں تبدیل ہو گئی۔

رضیہ کی چیخ سن کر متعدد افراد میرے کمرے کے باہر جمع ہو گئے۔ پھر ذرا دیر بعد دلال بزجی چند پولیس افسران کو اپنے ساتھ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ وہ خبیث ابھی تک زندہ تھا حالانکہ ہمزاد نے اس کے محفوظ قلعے کو مسمار کر دیا تھا۔ پولیس نے مجھے گرفتار کرنا چاہا، مگر کوئی بھی اس حصار میں قدم نہ رکھ سکا۔ کئی پولیس والے میرے قریب آئے، مگر ان کے جسم کوئلہ بن گئے۔ پھر مجھ پر فائرنگ کی گئی، مگر لاحاصل! کوئی بھی گولی میرے جسم کو نہ چھو سکی۔

پھر میں رضیہ کی لاش کو اپنے ہاتھوں سے اٹھائے قبرستان پہنچا۔ اس کی لاش خود میں نے اپنے ہاتھوں سے دفن کی اور پھر وہیں بیٹھ کر اس کی یاد میں آنسو بہاتا رہا۔ اس کی جدائی کا احساس میرے لیے جان لیوا تھا۔ وہ میری محبت تھی اور مجھی پر قربان ہو گئی تھی۔

مجھے اسی حالت میں پڑے پڑے دیر ہو گئی، پھر ہمزاد کا خیال آیا۔ اپنے تصور کی قوت کام میں لا کر میں نے اسے دیکھا اور باتیں کیں اس نے مجھے بتایا کہ میں آج رات تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔ یہ جان کر میرے دل کو سکون ہوا۔

وہ رات میں نے قبرستان ہی میں گزاری۔ صبح میں وہاں سے لوٹ رہا تھا تو ہمزاد آ گیا۔ وہ اب قطعی ٹھیک تھا۔ میں نے فوری طور پر ہمزاد کو دلال بزجی کی خبر لینے بھیجا۔ ہمزاد نے بتایا

کہ وہ اپنی ٹالی گنج والی کوٹھی میں ہے اور رات کے وقت اس پر حملہ ممکن ہے۔

اندھیرا پھیلتے ہی میں، ہمزاد کے ساتھ ٹالی گنج پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر دلال بزجی نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے کسی دشمن نے اس طرح میرے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ میری انا کو بڑی تقویت ہوئی اور میں نے اس کی جان بخشی کر دی۔ پھر دلال بزجی کی ضد اور خوشامد پر میں نے اس کی حویلی میں رہنا قبول کر لیا۔ دلال بزجی میری حسن پسند فطرت سے واقف تھا۔ اس نے میری خدمت مدارات میں کمی نہ کی۔ اب مجھے اس کے لیے اپنے ہمزاد سے مدد لینے کی ضرورت نہیں رہی۔ شاہد و شراب کی ہم جلیسی نے سب کچھ بھلا دیا۔ دلال بزجی نے کلکتہ کی اعلیٰ سوسائٹی میں مجھے اپنا گرو کہہ کر متعارف کرایا تھا۔ ایک بار پھر میرا وہی سنہری دور لوٹ آیا جو بدایوں میں تھا۔ میں، ہمزاد کے ذریعے لوگوں کی عجیب خواہشات پوری کر کے ان کی عقلیں دنگ کر دیتا تھا۔ اسی دوران میں ایک عجیب واقعہ ہوا کہ ہمزاد میرے طلب کرنے کے باوجود کافی دیر تک نہیں آیا۔ یہ پہلا موقع تھا۔ میں اس تاخیر کی وجہ سے ہمزاد پر برس پڑا۔ میں نے اس کی ایک نہ سنی۔ پھر چند دن بعد ایسا ہی ایک اور حادثہ ہوا۔ ہمزاد سے یہ معلوم کر کے میں سخت فکرمند ہو گیا کہ کوئی پُراسرار ہستی میرے اور ہمزاد کے درمیان رابطے کو منقطع کر دینا چاہتی ہے۔ میرے حکم پر ہمزاد نے اس پراسرار ہستی کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور بتایا کہ اس ہستی کا نام دلال بزجی ہے۔ یہ جان کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اسی وقت میں، ہمزاد کی تنبیہہ کے باوجود دلال بزجی کے کمرے کی طرف دوڑا۔

دلال بزجی مجھے وہاں اپنا منتظر ملا۔ مجھے دیکھ کر اس نے خود کو اپنی پُراسرار قوتوں کے ذریعے ختم کر لیا اور اب یقینی موت کے سوا مفر کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

اس کے بعد میں کلکتے کو خیرباد کہہ دیا اور ہمزاد کے ذریعے دہلی جا پہنچا۔ میں نے دہلی میں ایک نئے نام سے نئی زندگی کا آغاز کیا۔ جلد ہی میرے ارد گرد عقیدت مندوں کا ہجوم ہو گیا۔ اب میں اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ ہمزاد کے ذریعے میں نے اپنے بیٹے کے بارے میں معلومات حاصل کیں جو رضیہ سے تھا۔ اس کا نام سخاوت تھا اور وہ بدایوں میں برے حالات کا شکار تھا۔ میرے ہوتے میری اولاد کسمپرسی کی زندگی بسر کرے اور مشکل میں گرفتار ہو یہ میرے لیے باعث شرم تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے ایک اور اطلاع نے مضطرب کر دیا۔ وہ اطلاع یہ تھی کہ میرٹھ کے نواب صاحب کی لڑکی نرگس بھی میرے بچے کی ماں بن چکی تھی اور ایسا ہونے سے نواب صاحب نے میرٹھ سے دور بدایوں میں ایک غریب شخص کو دولت سے مالا مال کر کے نرگس کو قبول کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ نرگس میری بیٹی دردانہ کی ماں بن چکی تھی، مگر بہ ظاہر

باپ وہی شخص تھا جس سے نواب صاحب نے نرگس کی شادی کی تھی۔ ان واقعات کو برسوں گزر چکے تھے اور اب میرے دونوں بچے سخاوت اور دردانہ جوان ہو چکے تھے۔ لاعلمی کے سبب سخاوت، دردانہ کے قریب ہوتا گیا۔ یہ صورت حال میرے لیے ظاہر ہے کہ ناقابل برداشت تھی، میں فوراً" بدایوں پہنچا اور خود کو سخاوت کے باپ کا ایک مخلص دوست بتا کر سخاوت کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ دردانہ کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ دردانہ اس کی سوتیلی بہن ہے۔ میں نے سخاوت کو دولت سے نواز دیا تھا کہ وہ اپنی زندگی خوش حالی کے ساتھ گزار سکے۔ اس معاملے سے نمٹ کر میں پھر دہلی لوٹ آیا اور دہلی کے شب روز نے مجھے اپنا لیا۔

وقت تیز رفتاری سے گزرتا رہا۔ سال پر سال بیتے، یہاں تک کہ مجھے معلوم ہوا، میرا بیٹا سخاوت ساٹھ سال کی عمر پا کر طبعی موت مر گیا۔ اس سے پہلے میں نے میرٹھ کے نواب صاحب، نرگس اور رضیہ کے والدین کے انتقال کی خبریں بھی سن لیں تھیں، مگر سخاوت کی موت سے مجھے سخت صدمہ ہوا۔ اب میری عمر ستانوے سال ہو چکی تھی اور جسم بھی بوڑھا ہو چلا تھا۔ اب میرا خیال تھا کہ میں یہ جسم تبدیل کر دوں۔ پھر انہیں دنوں ایک رات میری روح کانپ اٹھی۔ میرے سامنے مہ پارہ کی روح تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اب ہمیشہ کے لیے اس دنیا کو چھوڑ کر جانے والی ہے، مگر اس سے پہلے وہ مجھ سے آخری انتقام لینا چاہتی ہے۔ اس اچانک اور نئی افتاد نے مجھے سخت پریشان کر دیا۔ میں 'مہ پارہ کی روح کو تو بھول ہی گیا تھا۔

آخر وہ مجھ پر کیا نیا وار کرے گی؟ میں دیر تک سوچتا رہا اور اس رات ایک لمحے کو بھی نہ سو سکا۔ میں نے ہمزاد کے ذریعے یہ چاہا کہ مہ پارہ کے متوقع انتقام کے بارے میں کچھ جان لوں، مگر ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی مہ پارہ کے معاملے میں ہمزاد کو ناکامی ہوئی۔ ہمزاد کی ناکامی کے بعد میں نے خود کو حالات کے سپرد کر دیا اور سوچا کہ اب جو بھی ہو سو تقدیر! اس ذہنی کشمکش سے نجات پانے کے بعد مجھے اپنے بوڑھے جسم کا خیال آیا۔ اب میں اپنی خواہشات کی تکمیل میں کوتاہی کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ نتیجتہ" میں ایک بار تبدیلی جسم کے لیے بے چین ہو گیا۔ اس کے لیے میں نے اپنے ایک نوجوان مرید کو منتخب کیا۔ ہر شام میری نشست گاہ میں ضرورت مندوں اور میرے مریدوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ تبدیلی جسم کے لیے پورے چالیس دن کی تنہائی ضروری تھی۔ سو میں نے اپنے معتقدوں اور مریدوں سے ایک چلہ کھینچنے کا بہانہ کیا اور قطب مینار کے قریبی کھنڈرات میں جا پہنچا۔ رات کا وقت تھا۔ ہمزاد میرے نوجوان مرید عنائیت کو وہاں اٹھا لایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں خود اپنے قتل پر راضی ہوا تھا۔ اس کے بغیر نیا جسم اپنانا

ناممکن تھا۔ مجھے قتل کرنے کی ذمہ داری ہمزاد نے سنبھال لی۔ اس نے پہلے عنائیت کی گردن اس کے تن سے جدا کی، پھر میری طرف پلٹا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار اور خون آلود خنجر تھا۔ میں اس کے کہنے پر تن کر بیٹھا ہوا تھا۔

"سنبھلیے!" ہمزاد نے کہا۔

میں نے چاہا کہ ہمزاد کو کچھ دیر رکنے کے لیے کہوں، مگر میرے الفاظ ہونٹوں سے ادا نہ ہوں کے کیوں کہ اس سے پہلے ہی ہمزاد کا ہاتھ اپنا کام کر چکا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دہکتی ہوئی انگیٹھی میری گردن پر الٹ دی گئی ہو۔ اس کے بعد دوسرے ہی لمحے میرا سر جسم سے جدا ہو گیا۔ اور عنائیت کے تڑپتے ہوئے جسم سے جا لگا۔ گردن کی پچھلی ہڈی پر مجھے بھرپور ضرب کا احساس ہوا اور پھر میں اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکا۔ انتہائی تکلیف اور اذیت نے مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔

وہ چالیس دن گزر گئے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں نے پھر اپنی محفل سجالی۔ اب میری جھکی ہوئی کمر سیدھی ہو چکی تھی اور میرا جسم جوان تھا۔ میرے مرید اسے بھی میری کرامت سمجھے۔ نیا جسم حاصل کرنے کے بعد جیسے مہ پارہ کا انتقام میرے ذہن سے نکل گیا۔ اب ہر شب میرے لیے نئی تھی۔ میرا عہد جوانی جیسے ایک بار پھر لوٹ آیا تھا۔

انہیں دنوں کا ذکر ہے کہ میں نے اپنے مریدوں سے ایک شخص گھنشیام داس کا نام سنا۔ اس کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ ایک عرصہ افریقہ میں رہ کر آیا ہے۔ وہ شخص نہ صرف افریقہ کے پراسرار علوم کا عالم ہے بلکہ اس کے پاس کچھ پراسرار قوتیں بھی ہیں۔ پورے دہلی میں ان دنوں اس کا شہرہ تھا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے سامنے کسی دوسرے کا چراغ جلتے نہیں دیکھ سکتا۔ دہلی میں ایک طویل عرصے سے صرف میرا طوطی بول رہا تھا۔ میری شہرت و عزت میں حصے دار بننے والا یقیناً میرا دوست نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس کے اتنے تذکرے سنے کہ اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی اور ساتھ ہی یہ خواہش بھی کہ اس کے پاس کیا پُراسرار قوتیں ہیں اور وہ کتنے پانی میں ہے! میں چاہتا تھا کہ لوگوں کے ذہن سے اس کا بھوت اتار دیا جائے، کسی مظاہرے کے دوران میں اس کی پُراسرار قوتوں کو ہمزاد کے ذریعے ناکارہ بنا کر اسے لوگوں کے سامنے ذلیل کیا جا سکتا تھا۔ یہ وہ دن تھے جب مطالبہ پاکستان زور پکڑتا جا رہا تھا۔ ہندوستان کو انگریز کی غلامی سے نجات ملنے والی تھی۔ صدیوں پرانے رشتے کم زور پڑتے جا رہے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کا شیرازہ مسلم لیگ کے منطقی استدلال کے سامنے نہ ٹھہر سکا تھا۔ اس کے نتیجے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مسابقت اور مقابلے کی سی فضا پیدا ہو گئی

تھی۔

دہلی کے ہندوؤں نے گھنشیام داس کو سر آنکھوں پر بٹھالیا تھا۔ ہندو مسلمانوں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کرنے کے لیے مجھے بھی دبی دبی زبان میں برابھلا کہنے لگے تھے اور یہ بھی کہ میں 'گھنشیام داس کے سامنے نہ ٹھہر سکوں گا۔ دوسری طرف مسلمانوں کو مجھ پر اندھا اعتماد تھا۔ وہ ردِ عمل میں میری تعریف کرتے تھے اور زمین آسمان کے قلابے ملاتے تھے۔

ایک دن میں نے سنا کہ گھنشیام داس ایک بڑے مجمع کے سامنے اپنی پُراسرار قوّتوں کا مظاہرہ کرنے والا ہے۔ اس کی شہرت و عزّت کو خاک میں ملانے کا یہ سنہری موقع تھا۔ مقررہ دن میں اپنے مریدوں کے ساتھ رام لیلا گراؤنڈ پہنچ گیا۔ جہاں گھنشیام داس اپنی پُراسرار قوّتوں کا مظاہرہ کرنے آیا تھا۔

گھنشیام داس نے کئی نظری کرتب دکھا کر لوگوں سے زبردست خراج تحسین وصول کیا۔ آخر میں اس نے مختصری تقریر میں اپنے آخری کرتب کا ذکر کیا۔ اس نے مجمع سے خطاب کیا۔ "آپ لوگوں میں سے صرف نو نوجوان 'اسٹیج پر آجائیں۔ میں انہیں تلواریں دوں گا۔ وہ سب نوجوان بلا روک ٹوک جب میں اشارہ کروں تو مجھ پر تلواروں سے حملہ کردیں۔ میں خالی ہاتھ رہوں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ تلواریں میرے جسم سے گزرتی رہیں گی 'مگر میرا جسم اپنی جگہ سلامت رہے گا۔" پھر وہ خاموش ہو گیا اور نوجوانوں کی اسٹیج پر آمد کا انتظار کرنے لگا۔

"دیکھیے 'اس نے اپنی موت کو خود آواز دے لی۔" ہمزاد نے سرگوشی کی 'پھر بتایا۔

"اس کے پاس پُراسرار قوّتیں یقیناً ہیں مگر میں ان پر قابو پا سکتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد مطلوبہ نوجوان اسٹیج پر پہنچ گئے گھنشیام نے ایک سیاہ بکس کھول کر تلواریں نکالیں اور ان نوجوانوں میں تقسیم کردیں۔ پھر اسی کے ایماء پر نوجوانوں نے وہ تلواریں مجمع میں پہنچ کر لوگوں کو دکھائیں کہ وہ تیز دھار اور اصلی ہیں۔ نوجوان پھر اسٹیج پر آگئے تو گھنشیام ان کے درمیان میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ جیسے ہی میں ہاتھ کا اشارہ کروں 'مجھ پر بہ یک وقت حملہ کردیا جائے۔

میں نے دیکھا گھنشیام داس ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بدبدایا اور پھر اس نے ہاتھ سے حملے کا اشارہ کیا۔ بہ یک وقت نو تلواریں بلند ہوئیں اور پھر گھنشیام داس کی دل دوز چیخ سنائی دی۔ اس کا جسم 'اسٹیج پر پڑا بری طرح تڑپ رہا تھا۔ تلواروں کی دھار واقعی بہت تیز تھی۔ اس کا جسم سخت مجروح ہو چکا تھا۔ آدھی گردن کٹ گئی تھی 'ایک شانے میں تلوار اتر کر اسے جسم سے جدا کرچکی تھی۔ سر کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ جسم پر جگہ جگہ گہرے زخم

تھے۔ پھر اس کی روح جسم کا ساتھ چھوڑ گئی۔ کچھ لوگوں نے اسٹیج پر پہنچ کر گھنشیام داس کی موت کا اعلان کیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ گھنشیام داس جو منتر پڑھ رہا تھا 'شاید کسی سبب ادھورا رہ گیا ہو گا۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسٹیج پر آگیا۔ کسی نے بھی مجھے نہیں روکا۔ میں ان کے لیے نیا نہیں تھا۔ ہندو مجھے "بزرگ صاحب" کہتے تھے۔

میں نے وہ سارے کرتب دہرائے جو گھنشیام داس دکھا چکا تھا اور پھر وہ کرتب بھی کہ نوجوانوں نے مجھ پر تلواروں سے حملہ کیا۔ اس سے پہلے ہمزاد میرے جسم کے گرد ایک نادیدہ حصار کھینچ چکا تھا۔ تلواریں برستی رہیں 'مگر میں اپنی جگہ خاموش کھڑا رہا۔ لوگ حیرت اور خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ اس کے بعد میں نے لوگوں سے آخری کمال دکھانے کا دعویٰ کیا۔ میں نے مجمع کے قریب کھڑے ہوئے پولیس کے ٹرکوں میں سوار سپاہیوں کو مخاطب کیا کہ وہ ایک ٹرک کو اسٹیج کے قریب لے آئیں۔ میں نے کہا۔ "میں اس پورے وزنی ٹرک کو اپنے ہاتھ کی ایک انگلی پر اٹھالوں گا۔"

سپاہی 'ٹرک قریب لا کر اس سے اترنے لگے تو میں نے انہیں اترنے سے روک دیا۔ میں نے پھر ٹرک کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ساتھ ہی ہمزاد کو اشارہ کیا۔ میں نے ٹرک کا ایک حصّہ گرفت میں لیا اور لوگوں نے دیکھا کہ ٹرک 'زمین سے اٹھ کر اسٹیج پر آگیا۔ پھر ہمزاد نے اپنے نادیدہ ہاتھ آگے کیے اور ٹرک بظاہر میرے ہاتھ کے اشارے پر فضا میں بلند ہونے لگا۔ ٹرک پر بیٹھے ہوئے سپاہی حیرت اور خوشی سے چیخنے لگے۔ ٹرک میرے سر سے بلند ہو کر فضا میں معلق ہو گیا۔ اب پورا ٹرک میرے شہادت کی انگلی پر تھا۔

مجھے پھر ایک اور دور کی سوجھی۔ میں اس حالت میں مجمع سے مخاطب ہوا۔ "اب میں اس ٹرک کو انگلی پر نچاؤں گا۔"

لوگ جوش میں تالیاں بجانے لگے۔ پھر ہو ٹرک 'میری انگلی پر گھومنے لگا۔ صرف میں ہی یہ محسوس کر سکتا تھا کہ میری انگلی پر قطعی دباؤ یا وزن نہیں۔ ٹرک کا سارا وزن ہمزاد سنبھالے ہوئے تھا۔ پھر جب میں نے ہمزاد کو اشارہ کیا کہ اب ٹرک کو آہستہ آہستہ نیچے اتار لے تو اسی دوران میں وہ ہول ناک واقعہ رونما ہو گیا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے دونوں ہاتھوں پر ہزاروں من بوجھ آپڑا ہو 'جیسے میری دونوں کلائیاں اور بازو ٹوٹ گئے ہوں۔ میری قوّت برداشت جواب دے گئی۔ میں تیزی سے ایک طرف ہٹا اور گرتے ہی ہوش کھو بیٹھا۔

مختصر یہ کہ اس حادثے میں میرے دونوں ہاتھ جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے اور اس کی ذمہ

دار مہ پارہ تھی۔ اس نے عین وقت پر ہمزاد کی قوتیں سلب کرلی تھیں۔ حادثے کے فوراً" بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں نے مہ پارہ کی روح کو اپنے قریب دیکھا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

"میں آج تمہاری دنیا سے ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔ میں نے تم سے اپنا آخری انتقام لے لیا اور یہ انتقام عجیب نوعیت کا ہے۔ یہ انتقام میری غیر موجودگی میں بھی اس وقت تک جاری رہے گا جب تک تم مر نہیں جاتے۔ آج میں نے انتقام کی ابتدا کردی ہے۔ جب تک تم زندہ رہو گے 'اپاہجوں اور محتاجوں کی زندگی بسر کرو گے۔ تمہاری روح کو سکون نہ مل سکے گا۔ تم مسلسل جسمانی اذیت میں مبتلا رکھے جاؤ گے۔ اس کے لیے مجھے اب تمہاری دنیا میں آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں اپنا کام کرچکی ہوں۔ تم نے ایک ہفتے قبل جو نیا جسم اپنایا تھا' میں نے اسے مفلوج کردیا۔ اب تم جو نیا جسم بھی اپناؤ گے کسی نہ کسی طور پر مفلوج ہوتا رہے گا۔ اب اجازت دو! تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ مجھ ایسا ذہین اور بہادر دشمن نصیب ہوا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی مہ پارہ کا ہیولا غائب ہوگیا۔"

پھر مجھے میرے مرید بہت جلد گھر لے آئے۔ اس رات لاعلمی کے سبب' میں گھنشیام داس کی نوجوان بیٹی وملا کے سحر کا شکار ہوگیا۔ اس نے مجھ سے اپنے باپ کی موت کا بڑا بھیانک انتقام لیا۔ ناپاک ہونے کے سبب ہمزاد میری کوئی مدد نہ کرسکا۔ وہ مجھے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتی تھی' مگر چند ہی دن بعد تقدیر نے میرا ساتھ دیا۔ میں جس تہ خانے میں قید تھا جو وملا کے ظلم و ستم کا نشانہ بنا ہوا تھا' اس کے ایک دریچے سے بارش کا پانی اندر آگیا۔ تہ خانے میں پانی بھر گیا اور میں اس پانی میں لوٹنے لگا۔ میرا تمام جسم پانی میں شرابور ہوگیا۔ پھر میں نے پاک ہوتے ہی ہمزاد کو طلب کرلیا۔ ہمزاد مجھے اس جہنم سے نکال لایا۔

تیسرے دن ہمزاد نے وملا کی پُراسرار قوتوں کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیں۔ وہ دہلی سے فرار ہوکر متھرا پہنچ گئی۔

دن تیزی سے گزرتے رہے اور میرے ذہن سے وملا کا خیال محو ہوتا گیا۔ اب میں اپنے ہاتھوں کی محرومی کے احساس سے بے چین رہنے لگا۔ بالآخر میں نے ہمزاد سے خواہش کی کہ اس مفلوج جسم سے نجات حاصل کرلی جائے۔ ہمزاد کو میری رائے سے اتفاق نہیں تھا' مگر وہ میرے حکم سے مجبور ہوگیا۔

پھر ایک بار میں قطب مینار کے کھنڈرات میں پہنچ گیا' مگر ابھی نیا جسم حاصل کیے مجھے صرف گیارہ دن ہوئے تھے کہ وملا وار کرگئی۔ وہ میری طرف سے غافل نہ تھی۔ پولیس نے دو قتل کرنے کے الزام میں مجھے گرفتار کرلیا۔ دونوں لاشیں' پولیس کو ان کھنڈرات سے مل

گئیں' مگر ایک لاش کا صرف سر ہی مل سکا۔ چالیس دن پورے ہونے سے پہلے میں قطعی بے بس تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے سزائے موت سنادی گئی۔ چالیس دن پورے ہونے سے نو دن پہلے میری تقدیر کا فیصلہ سنادیا گیا تھا۔ چالیس دن پورے ہونے سے صرف ایک دن پہلے مجھے پھانسی دی جانے والی تھی۔ ایک دولت مند مرید میرا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ میرے اشارے پر اس نے اپیل دائر کردی اور یوں مجھے مہلت مل گئی ورنہ اپیل میں کوئی جان نہیں تھی۔

چالیس دن پورے ہوگئے اور میں نے جیل ہی میں غسل صحت کیا۔ پھر اسی رات ہمزاد مجھے جیل سے نکال کر متھرا لے گیا جہاں وملا نے پناہ لی تھی۔ اسے میں نے بے خبری میں چھاپ لیا۔ اس نے اپنی شکست قبول کرلی اور اسی کے ساتھ زندگی بھر کے لیے میرا ساتھ نبھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔

کسی حسین لڑکی نے آج تک مجھ سے یہ خواہش نہیں کی تھی۔ میں نے اس شرط پر اس کی درخواست قبول کرلی کہ وہ مسلمان ہوجائے' دوم یہ کہ میں اس کی ساری پُراسرار قوتیں سلب کرلوں گا۔ اس نے یہ شرائط قبول کرلیں۔ دوسرے دن صبح تک ہمزاد نے ایک حصار کھینچ کر اس کی قوتیں سلب کرلیں۔

اب پاکستان بن چکا تھا۔ اس کے قیام کو چند روز ہوئے تھے۔ پورے ہندوستان میں ہندو مسلم فساد پھوٹ پڑے تھے۔ میں نے سوچا' کیوں نہ پاکستان چلا جاؤں! اس طرح میں پولیس کی دسترس سے بھی بچ سکتا تھا۔ یوں بھی اب ہندوستان میں میرا کون تھا!

میں نے ہمزاد اور وِملا کو اپنے ارادے سے باخبر کردیا۔ وملا کی خواہش تھی کہ مشرقی پاکستان چلا جائے۔ بنگال ایک بار پھر مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ میں نے وملا کی بات مان لی۔ ہمزاد نے مجھے اور وملا کو ڈھاکہ پہنچادیا جہاں صدر گھاٹ کے علاقے میں مجھے ایک مکان مل گیا۔ وہاں پہنچتے ہیں وملا مسلمان ہوگئی اور میں نے اس کا نام جمیلہ رکھا۔ پھر میں نے اس سے نکاح پڑھوا لیا۔ شادی کی رات ہی میں ایک ہول ناک حادثے کا شکار ہوگیا۔ میں زینے سے لڑھک گیا۔ اس حادثے میں بھی مہ پارہ کا ہاتھ تھا۔ اس نے مجھے میری دونوں ٹانگوں سے محروم کردیا۔ دوسری شب ایک اور حادثہ رونما ہوا۔ وملا نے مجھے سوتے ہوئے قتل کرنے کی کوشش کی' مگر ہمزاد چوکنا تھا۔ اس نے وملا کا کام تمام کردیا اور مجھے بچالیا۔ پھر اس نے وملا کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا۔ عورت کی ذات سے میرا اعتبار اٹھ گیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اب کسی عورت کی مستقل رفاقت کا خواب نہیں دیکھوں گا۔

میں کچھ ہی دن میں اپنے مفلوج جسم سے بیزار ہوگیا اور ایک پڑوسی نوجوان محمد ہاشم کو

قتل کرا کے اس کا جسم حاصل کر لیا۔ چالیس دن سکون سے گزر گئے نئے جسم سے میرا پورا رابطہ قائم ہو گیا۔ اس کے بعد ڈھاکہ سے بھی میرا جی اچاٹ ہو گیا۔ اس بار میری منزل چاٹگام تھی۔ یہاں آ کر میں نے اپنی آمدنی کے ذرائع ظاہر کرنے کے لیے تجارت شروع کر دی۔ طویل عرصے کے بعد یہاں آ کر میں نے اپنا بچھڑا ہوا نام اپنا لیا۔ لوگ مجھے شیخ کرامت ہی کے نام سے پکارنے لگے۔

چاٹگام پہنچ کر بہت دنوں تک مجھے کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ پورا سال گزر گیا۔ شاید مہ پارہ اپنا انتقام پورا کر چکی ہے' میں سوچنے لگا۔ دن گزرتے رہے' یہاں تک کہ اب سے پانچ سال پہلے اچانک میرے سینے میں شدید درد اٹھا۔ صبح ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے بتایا کہ مجھے معدے کا سرطان ہے۔ واپسی میں مجھے مہ پارہ کا زہریلا قہقہہ سنائی دیا اور میں تڑپ کر رہ گیا۔ آخر وہ اپنے انتقام سے باز نہیں آئی تھی۔

ہمزاد کے مشورے پر میں اسپتال میں داخل ہو گیا۔ چند روز بعد ہمزاد نے مجھے ایک روح فرسا خبر سنائی۔ "آپ اب سے دس دن بعد مجھے آزاد کرنے کے پابند ہیں۔ آپ نے مجھے سو سال کے لیے قابو میں کیا تھا جو پورے ہونے والے ہیں۔" ہمزاد نے مجھے کچھ ہی دیر میں سب کچھ یاد دلا دیا۔

"تو پھر کیا میں تمہارے بغیر زندہ رہوں گا؟" میں نے کہا۔ ابھی تک مجھے حالات کی سنگینی کا احساس نہیں ہوا تھا کہ ہمزاد کی آزادی کا مطلب کتنا بھیانک ہے!

"کاش آپ میرے بغیر زندہ رہ سکتے!" ہمزاد کی آواز بھرا گئی۔

"کیوں؟..... کیوں؟..... آخر ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"اس لیے کہ میرے آزاد ہوتے ہی آپ کے سر اور بقیہ جسم کا رابطہ منقطع ہو جائے گا کیوں کہ یہ رابطہ میری ہی وجہ سے اب تک قائم ہے۔" ہمزاد نے جواب دیا۔

ہمزاد کی بات سن کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اپنی موت کو اتنے قریب محسوس نہیں کیا تھا۔

اب..... اب میری زندگی کے وہ دس دن بھی گزر چکے ہیں۔ ہمزاد میرے سرہانے کھڑا ہے۔ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ سورج ڈوبنے کا منتظر ہے اور مجھ میں سما جانے کے لیے بے تاب ہے کیوں کہ وہ میرے ہی جسم کا حصّہ ہے۔ میں نے پہلے سمجھا تھا کہ وہ آزاد ہو کر مجھ سے رخصت ہو جائے گا مگر یہ میری بھول تھی۔ اب سے چند لمحوں بعد وہ میرے جسم میں پناہ حاصل کر کے ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سو جائے گا۔

اپنی ہنگامہ خیز و حیرت انگیز زندگی میں موت کو میں نے جتنے قریب دیکھا اور محسوس کیا ہے' شاید ہی کسی اور نے دیکھا اور محسوس کیا ہو۔ خود عملی طور پر بھی میں کئی بار قتل ہوا ہوں' نادانستگی میں بھی اور دانستہ بھی! چند لمحے انسانی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہی چند لمحے اکثر اوقات موت اور زندگی کے درمیان فصل ہوتے ہیں۔ میں زندگی کی آخری سرحد تک آ پہنچا تھا اور میرے پاس صرف چند لمحے تھے۔

آج سے ٹھیک ایک سو سال پہلے جب میں نے ہمزاد کو قابو میں کیا تھا تو اس کے اور میرے مابین دیگر شرائط کے علاوہ ایک اہم شرط اور طے ہوئی تھی۔ وہ شرط تھی مدّت کے بارے میں ہمزاد نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ میں اسے کتنی مدّت کے لیے قابو میں کر رہا ہوں؟ اس وقت مجھے اس اچانک اور غیر متوقع سوال کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور میرے منہ سے نکلا۔ "سو سال۔"

میں نے سوچا تھا کہ زیادہ سے زیادہ بھی زندہ رہا تو یہ مدت مرے لیے کافی رہے گی۔ کاش مجھے خبر ہوتی کہ عرصہ گاہ حیات میں سو سال کوئی معنی نہیں رکھتے! کاش میں جانتا کہ اس سوال کا جواب دے کر اپنی زندگی کی حد مقرر کر رہا ہوں! کاش میرے علم میں یہ ہوتا کہ جتنے عرصے ہمزاد میرے قابو میں رہے گا' میں زندہ رہوں گا۔

زندگی کی خواہش آخری لمحوں تک انسان سے منہ نہیں موڑتی۔ سو میں بھی جینے کی خواہش میں مر رہا تھا۔

پورے ایک سو سال کی رفاقت معمولی نہیں ہوتی۔ ہمزاد قدم قدم میرے ساتھ رہا تھا اور اب اس کی جدائی کا لمحہ قریب آ رہا تھا۔ میں بھی فنا کی گود میں سونے والا تھا اور وہ بھی! میں نے بڑی حسرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ابھی سے موت کی زردی پھیل گئی تھی۔ مجھے اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اسے میری اور اپنی موت کا گہرا صدمہ تھا۔

پھر مجھے نہیں معلوم کہ زندگی کے ان آخری لحات میں کیسے میرے ذہن میں وہ بات آئی اور میں نے کس طرح ہمزاد سے اس کا اظہار کر دیا۔

ہمزاد میری بات سن کر چونک اٹھا اور بولا۔ "مگر دوبارہ مجھے تسخیر کرنے کے لیے چالیس دن کا عمل ضروری ہے اور..... اور اب..... اب صرف چند لمحے رہ گئے ہیں۔ آپ مجھے دوبارہ قابو میں کرنے کا عمل کس طرح پورا کر سکتے ہیں! مگر..... مگر....." وہ کچھ کہتے کہتے کسی سوچ میں کھو گیا

"مگر کیا؟ جلدی کہو! سورج ڈوبنے والا ہے۔" میں نے بے تابی سے کہا۔

"آپ کو شدید جسمانی اذیت اور کرب سے گزرنا پڑے گا۔" وہ بڑی تیزی سے بتانے لگا۔ "میرے لیے صرف اتنا ممکن ہے کہ میں ان لمحات سے فائدہ اٹھا کر ایک مخصوص مدت کے لیے آپ کے سر اور بقیہ جسم کا رابطہ منقطع نہ ہونے دوں۔ ایسی صورت میں خود مجھے کرب سے گزرنا پڑے گا۔ ممکن ہے میرے بعد یہ رابطہ کمزور پڑ جائے اور آپ کی گردن جہاں سے جوڑی گئی ہے۔ وہاں سے خون رسنے لگے، لیکن یہ اذیت آپ کو برداش کرنا پڑے گی۔ میری اور اپنی زندگی کی خاطر! آپ کو ہر لمحہ یہ محسوس ہو گا جیسے آپ کے گلے پر خنجر پھیرا جا رہا ہو، لیکن اس کے باوجود کسی سبب عمل پورا نہ ہو سکا تو...... تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا! میری اور آپ کی موت یقینی ہو جائے گی۔"

"مجھے منظور ہے! سب کچھ منظور ہے!" زندگی کی نوید پا کر میں تقریباً چیخ اٹھا۔

"پھر ایک بار یہ بتا دوں کہ وہ اذیت اتنی شدید ہو گی کہ آپ خود زندگی پر موت کو ترجیح دینے لگیں گے۔" ہمزاد نے گویا مجھے آخری بار سمجھایا۔

"نہیں! تم دیکھنا کہ میں زندگی کی خاطر ہر اذیت سے گذر جاؤں گا!" میں پر اعتماد لہجے میں بولا۔

"پھر آپ کو آج ہی رات سے عمل شروع کرنا ہو گا۔" ہمزاد نے بتایا

"ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔" جواباً میں نے کہا۔

ہمزاد نے کھڑکی سے باہر ڈوبتے سورج کو دیکھا اور پھر تیزی سے مجھ پر جھک گیا۔ وہ میری گردن پر ہر طرف آہستہ آہستہ اپنے نادیدہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ مجھے اس لمحے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے وجود میں ٹھنڈک سی اتر رہی ہو۔

چند ہی لمحے بعد میرے جسم پر رعشہ سا طاری ہو گیا اور پھر بے ہوشی سی مسلط ہونے لگی۔ وہ ٹھنڈک میرے لیے قابل برداشت تھی جو میری ہڈیوں تک اتری جا رہی تھی اور میرا سارا جسم سردی سے اکڑ رہا تھا۔ میں نے اس عالم میں ہمزاد کی آواز سنی۔ "خدا حافظ! کاش آپ مجھے دوبارہ قابو میں کر سکیں!"

ان لفاظ کے ساتھ ہی اس کی آواز معدوم ہو گئی۔ وہ جا چکا تھا۔ اچانک میں نے سردی کے بعد اپنے جسم میں شدید گرمی محسوس کی۔ سورج اب ڈوب چکا تھا اور یہ احساس میرے لیے بڑا خوش گوار تھا کہ میں ابھی زندہ ہوں اور مزید زندہ رہنے کے لیے میرے پاس ایک موقع اور ہے۔

میں اپنی عمر کا ایک حصّہ بسر کر چکا تھا اور گویا اب ایک نئی زندگی میں قدم رکھنے والا تھا۔ اس زندگی کے صرف چالیس دن یقینی تھے، اس کے بعد کیا ہوتا، کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں چند لمحے ہی خیالوں کی دنیا میں رہ سکا کیوں کہ معاً میرے جسم کی گرمی ناقابل برداشت ہونے لگی۔ اس کے ساتھ گردن میں شدید تکلیف شروع ہو گئی جیسے کوئی زخم تڑخ اٹھا ہو۔ میں نے اپنی گردن پر نمی محسوس کی تو بے اختیار میرا ہاتھ وہاں پہنچ کر رک گیا۔

میں نے نم حصّے کو چھوا اور پھر اپنی انگلیوں کو دیکھا تو دہشت زدہ سا ہو گیا حالانکہ ہمزاد نے مجھے پہلے ہی اس خطرے سے آگاہ کر چکا تھا۔ میرے انگلیوں پر خون لگا ہوا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ مدت ختم ہوتے ہی میرے سر اور جسم کے درمیان رابطہ کمزور پڑ چکا ہے اور گردن سے خون رسنے لگا ہے۔ مجھے چالیس دن اسی اذیت میں گزارنا تھے شاید اس سے بھی زیادہ اذیت میں! جس کے متعلق ہمزاد نے مجھے بتایا تھا۔

لحہ بہ لمحہ اذیت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی کند خنجر سے میری گردن کاٹ رہا ہو۔ تکلیف برداشت کرنے کے لیے میں نے نچلا ہونٹ اپنے دانتوں میں دبا لیا۔

اسی وقت اسپتال کا ڈاکٹر انوار الحق ادھر آتا دکھائی دیا۔ وہ حسب معمول شام کے راؤنڈ پر نکلا تھا۔ میری حالت چونکہ تشویش ناک تھی اس لیے وہ پہلے میرے ہی پاس آتا تھا۔ میں نے اپنی گردن سے رستے ہوئے خون کو چھپانے کے لیے چادر اوپر تک کھینچ لی۔

ڈاکٹر نے میرے بستر کے قریب پہنچ کر چارٹ دیکھا، پھر میری مزاج پرسی کی اور بولا۔

"اس وقت آپ شاید شدید تکلیف میں ہیں جس کا اظہار آپ کے چہرے سے بھی ہو رہا ہے۔ کیا بات ہے؟ کیا پھر سینے میں درد اٹھ رہا ہے؟"

"نن...... نہیں ڈاکٹر صاحب!...... میں ٹھیک...... بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے اپنی تکلیف پر قابو پاتے ہوئے بہ مشکل مسکرانا چاہا۔

"میں جانتا ہوں شیخ صاحب، آپ بڑی ہمت اور حوصلے کے آدمی ہیں۔" ڈاکٹر خوش اخلاقی سے بولا۔ "آپ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو...... تو معاف کیجیے۔ صاف گوئی کو کہ اب تک چل بسا ہوتا۔ آپ کی قوّت ارادی حیرت انگیز ہے۔ پچیس سالہ پریکٹیس میں میری نظر سے آپ جیسا مریض نہیں گزرا۔ آپ کی بیماری آخری مرحلے میں ہے اور میں...... میں اپنی سی کوشش کر رہا ہوں کہ آپ خطرے کی حدود سے نکل آئیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو اسے میں اپنی نہیں آپ کی کامیابی تصوّر کروں گا، آپ کی قوت ارادی کا کمال! اور یہ میری زندگی کا پہلا

کیس ہو گا۔"

ڈاکٹر کہے جا رہا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ اب تک میرے زندہ رہنے میں میری قوت ارادی کو کوئی دخل نہیں تھا بلکہ یہ ہمزاد کی وجہ سے تھا۔

معاً" میرے منہ سے کراہ نکل گئی تو ڈاکٹر نے کہا۔ "ذرا چادر ہٹائیے! میں دیکھتا ہوں۔" یہ کہتے ہی اس نے خود چادر ہٹا دی۔ اس نے اچانک ایسا کیا تھا اس لیے میں کچھ نہ کر سکا۔ چادر ہٹتے ہی اس نے نظر میری گردن پر پڑی اور وہ ایک دم چونک کر ٹھٹک گیا۔ "یہ.... یہ آپ کی گردن پر کیا ہوا؟ خون!..... خون رس رہا ہے۔ کیا یہاں کوئی پرانا زخم تھا؟"

"جج.... جی ہاں۔" میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

"شاید وہی زخم دوبارہ کھلنے لگا۔" اس نے کہا اور پھر وہاں کچھ ہی دیر میں نرسوں، کمپاؤنڈروں اور دوسرے ڈاکٹروں کا ہجوم ہو گیا۔ میں بہرحال کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔

ڈاکٹر انوار الحق کے خیال میں وہ زخم بہت ہی خطرناک تھا جو میری گردن کی چاروں طرف تھا۔ اس معمے کو کوئی ڈاکٹر حل نہ کر سکا۔ ہاں انہوں نے اتنا ضرور کیا کہ گردن میں دوا لگانے کے بعد بینڈیج کر دی تاکہ خون رسنا بند ہو جائے۔

بینڈیج کے بعد ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔ "ضروری ہے کہ میں آپ کو بے ہوشی کا انجکشن دے دوں تاکہ آپ اس اذیت سے بچ سکیں۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب!" میں نے انکار کر دیا۔ "اتنا ہی کافی ہے۔ اب میں قدرے سکون محسوس کر رہا ہوں کیوں کہ آپ نے دواؤں سے گردن کے زخمی حصے کو سن کر دیا ہے۔" اور یہی حقیقت بھی تھی۔ وقتی طور پر میں اس اذیت سے نجات پا چکا تھا۔

"مگر چند گھنٹے بعد دواؤں کا اثر ختم ہوتے ہی پھر تکلیف بڑھ جائے گی۔ آپ انجکشن کیوں نہیں لگوا لیتے؟" ڈاکٹر نے مجھے سمجھانا چاہا۔

"اس لیے ڈاکٹر صاحب کہ میں آج ہی رات یہاں سے ڈسچارج ہو کر اپنی کوٹھی جانا چاہتا ہوں۔" میں نے آخر وہ بات کہہ ہی دی جو میرے دل میں تھی۔ میرے پاس صرف چالیس دن تھے جن میں سے ایک دن بھی گنوانے کا مطلب میری یقینی موت تھی۔

"جی ہاں!" میں نے ٹھنڈا سانس لیا اور اصل بات کو چھپانے کی خاطر کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! اگر مرنا ہی مقدر ٹھہرا تو پھر آدمی اپنے گھر ہی میں کیوں نہ مرے اسپتال کے بستر پر کیوں مرے! آپ سے صرف میری اتنی درخواست ہے کہ میرے لیے دو نرسوں اور ایک ڈاکٹر کا بندوبست کر دیں۔ ان کے قیام کا بندوبست میں اپنی کوٹھی میں کرا دوں گا۔ غالباً" مجھے یہ کہنے کی

ضرورت نہیں کہ اخراجات کتنے بھی ہوں، مجھے اس کی پروا نہیں۔"

"شیخ صاحب! کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟" ڈاکٹر کی حیرت ابھی کم نہیں ہوئی تھی۔ "گھر میں وہ طبی سہولتیں ممکن نہیں جو یہاں اسپتال میں ہیں۔ خواہ آپ مستقلاً" کسی ڈاکٹر کو اپنے پاس رکھیں۔ یا نرسیں چوبیس گھنٹے آپ کی دیکھ بھال کریں۔"

"بہرحال میں اسپتال سے جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں اور آپ سے تعاون کا خواستگار ہوں۔" میں نے کہا۔

"مگر آپ تو چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں۔ آپ کو ایمبولینس میں گھر پہنچانا پڑے گا۔ میں اس سلسلے میں کوئی ذمے داری قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک رسک ہے، ایک زندگی کا رسک۔ آپ اپنی ذمے داری پر یہاں سے جا سکتے ہیں کیوں کہ ہم زبردستی آپ کو یہاں نہیں روک سکتے۔ رہا نرسوں اور ڈاکٹر کا معاملہ تو کل تک میں یہ بندوبست کر سکوں گا۔"

"ٹھیک ہے، میں کل تک انتظار کر لوں گا۔" میں نے مطمئن لہجے میں کہا۔

پھر ایک گھنٹے بعد ہی میں اسپتال کی ایمبولینس میں اسد گنج جا رہا تھا۔ وہیں میری کوٹھی تھی جس میں تقریباً" نصف درجن ملازم تھے اور اتنی ہی ملازمائیں۔

مجھے خلاف توقع اسپتال سے گھر آتے دیکھ کر وہ سب گھبرا گئے اور کشاں کشاں مجھے میری خواب گاہ میں پہنچا دیا۔ ان کے چہروں سے میں نے اندازہ لگایا کہ شاید وہ سمجھ رہے تھے۔ مجھے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ میں اسی لیے گھر آ گیا ہوں۔

میری ساری ملازمائیں حسن بنگال کا جیتا جاگتا شاہکار تھیں، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، گھنی زلفیں اور چھریرے جسم! انہیں زیر دام لانے کے لیے مجھے پراسرار قوت کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ مکمل آرام و آسائش اور ہر طرح کی کھلی آزادی نے انہیں میری کنیزیں بنا دیا تھا۔ دولت میں بھی اپنی ایک قوت ہوتی ہے اور وہ سب اسی قوت کے زیر اثر تھیں۔

وہ طرح طرح سے میری خدمت گزاری کرنے لگیں اور میرا جی بہلانے کی کوشش کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

مجھے آج ہی رات سے ہمزاد کا عمل شروع کرنا تھا اسی لیے میں نے انہیں مخصوص ہدایات دے دیں جسے وہ حیرت اور توجہ سے سنتی رہیں۔ ملازماؤں کو ہدایات دیتے ہوئے مجھے اس قلمی نسخے کا خیال آیا جسے میں نے اب تک اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا تھا۔ فارسی زبان میں بہ آسانی بول اور پڑھ سکتا تھا۔ ہمزاد کو قابو میں کرنے کا عمل میں نے اسی سے دیکھا تھا اس قلمی

نسخے میں بہت سے عمل لکھے تھے جن میں رحمانی بھی تھے اور شیطانی بھی۔ میں نے ہمیشہ رحمانی عملیات کو ترجیح دی تھی اس لیے کہ بچپن سے میرے مزاج پر مذہب کا گہرا اثر تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمزاد کو قابو کرنے کے بعد میرا شیطان مجھ پر غالب آگیا تھا اور میں نے نماز بھی ترک کر دی تھی۔ لیکن رحمانی عمل کرنے کے دوران میں مجھے نماز شروع کرنا لازمی تھا۔

"اچھا اب تم لوگ جاؤ' کوئی اور بات کہنا ہوئی تو بلا لوں گا۔" میں نے ملازماؤں سے کہا۔ "ہاں ارشاد علی کو بھیج دینا۔"

ارشاد علی کی حیثیت میرے خادم خاص کی سی تھی۔ وہ فوراً" ہی آگیا۔

"سنو!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "تمھیں دو کمرے مہمانوں کے لیے صاف کرنا ہیں۔ ایک کمرے میں نرسیں رہیں گی' دوسرے میں ڈاکٹر۔ کل یہ لوگ کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ کہ میرے کمرے کے باہر دن اور رات کے وقت بھی کوئی نہ کوئی ملازم موجود رہنا چاہیے جسے میں فوراً" آواز دے کر بلا سکوں۔ آج کے بعد سے کوئی ملازمہ میرے کمرے میں نہیں آئے گی۔ یہ میں نے انھیں بھی سمجھا دیا ہے۔ میں کسی ملاقاتی سے بھی ملنا پسند نہیں کروں گا۔ "خواہ وہ میرا کوئی عزیز دوست یا اس سے کاروباری تعلق ہو۔ بغیر طلب کیے کوئی میرے کمرے میں نہیں آئے گا۔ سمجھ گئے؟"

"جی سرکار ایسا ہی ہو گا۔" اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ مجھے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آرہے تھے کیوں کہ وہ تمام رازہائے درون خانہ سے واقف تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ملازماؤں پر اس قسم کی پابندی نہیں لگائی تھی۔

"اور سنو! کھانا پرہیزی ہو گا۔ گوشت' انڈا اور مچھلی کھانے میں نہیں ہو گی۔ بس تمھیں یہ خیال رکھنا ہے کہ کھانا زود ہضم ہو' سادہ ہو۔" میں نے قلمی نسخے کی وہ ہدایات دہرائیں جو میرے ذہن میں پوری طرح محفوظ تھیں۔ "باقی جو ہدایت ہوئی' میں تمھیں کچھ دیر بعد بلا کر دے دوں گا۔"

"بہتر ہے سرکار!" اس نے ادب سے جھک کر کہا اور پھر میرے ہاتھ کے اشارے کو سمجھ کر وہاں سے چلا گیا۔

معدے میں سرطان ہونے کی وجہ سے یوں بھی میری خوراک نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ میں بہت دن سے پرہیزی کھانا کھا رہا تھا' وہ بھی دواؤں کے بل بوتے پر!

ارشاد علی چلا گیا تو میں آہستہ آہستہ بستر سے اٹھا اور سامنے ہی ایک دیوار سے لگی ہوئی الماری کی طرف بڑھا۔ اس الماری میں میرے ذوق مطالعہ کی تسکین کے لیے بہت سی

اور نایاب کتب موجود تھیں۔ ان میں زیادہ تعداد فارسی زبان کے شعراء کے مجموعوں کی تھی' نظیری' بے دل' حافظ' عمر خیام' مولانا روم اور دوسرے اہم شعراء کا کلام انھی کتابوں کے درمیان وہ قلمی نسخہ بھی تھا۔ میں نے الماری سے وہ قلمی نسخہ نکال لیا' پھر الماری بند کر کے بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ یہی وہ قلمی نسخہ تھا جس کی طفیل میں نے ہمزاد کو قابو کیا تھا اور ایک سو تیس سال کی عمر میں بھی زندہ تھا۔

قلمی نسخے کی ورق گردانی کرتے ہوئے مجھے اب سے سو سال پہلے کے واقعات یاد آرہے تھے جب میں ایک غریب اور مفلوک الحال نوجوان تھا۔ ہمزاد کو قابو میں کرنے کے لیے میں نے کئی بار عمل کیا تھا اور ناکام رہا تھا۔ پھر ایک عمل کامیاب رہا تھا۔ اس وقت تو زندگی نے مجھے مہلت نہ دے تھی کہ ایک مرتبہ ناکام رہوں تو دوبارہ کوئی دوسرا عمل شروع کر دوں' مگر اب یہ صورت حال نہیں تھی مجھے ایک ہی بار میں کامیاب ہونا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ "عمل شمعی" نے مجھے کامیابی سے ہم کنار کیا تھا اور وہ تھا بھی ان عملوں میں سے ایک جو رات کے وقت ہی کیے جاتے ہیں۔ اب میرے سامنے قلمی نسخے کا جو صفحہ کھلا ہوا تھا' وہ چند ہدایات پر مشتمل تھا جو عمل کے دوران میں ضروری تھیں۔ انھیں میں سے کچھ ہدایات میں اپنے ملازموں کو دے بھی چکا تھا۔

لکھا تھا۔ "جو عورت ماں بننے والی ہو' وہ عمل نہ کرے۔"

اس ہدایت کا مجھ سے تعلق نہ تھا۔ میں نے دوسری ہدایت پڑھی۔ جس شخص کا کوئی عضو معطّل ہو' مثلاً" ہاتھ یا پاؤں کٹا ہوا یا بدن میں کوئی نمایاں نقص ہو وہ عمل نہ کرے"۔ میں اس ہدایت پر بھی پورا اترتا تھا۔ میرے ہاتھ پیر سلامت تھے اور کوئی جسمانی عضو کٹا ہوا یا معطّل نہ تھا۔

میں نے تیسری ہدایت پر نظر ڈالی۔ "جس شخص کو کوئی دماغی مرض ہو' مثلاً" سکتہ یا مرگی وغیرہ وہ عمل نہ کرے جب تک کہ پوری طرح صحت مند نہ ہو جائے۔" میں کسی ایسے دماغی عارضے میں مبتلا نہیں تھا۔

پھر چوتھی ہدایت پر نظر پڑتے ہی میں چونک اٹھا۔ "زخمی حالت میں عمل شروع نہیں کرنا چاہیے' خواہ انتہائی معمولی زخم ہو۔"

میں اس شرط پر پورا نہیں اترتا تھا' یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا کیوں کہ میری گردن سے خون رس رہا تھا۔ میری گردن کی اطراف زخم تھا۔ کچھ دیر تک میں اس سناٹے کے عالم میں آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ پھر معاً" میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ میں نے

سوچا کہ یہ جو تمام ہدایات ہیں، پہلی بار ہمزاد کو قابو میں کرنے کے لیے ہیں جب کہ میرا معاملہ قطعی مختلف ہے۔ میں تو اپنے ہمزاد کو دوبارہ مسخر کر رہا ہوں۔ اس سے قطع نظر یہ کہ اس کا علم ہمزاد کو بھی تھا۔ اگر یہ ضروری ہوتا تو وہ مجھ سے اس کا ذکر کرتا۔ اس نے تو یہ بھی بتا دیا تھا کہ میرے سر اور بقیہ جسم کا رابطہ کمزور ہو جائے گا اور گردن جہاں سے جوڑی گئی ہے، وہاں سے خون رسنے لگے گا۔ اگر اس حالت میں عمل کرنا، ممکن نہ ہوتا تو وہ مجھے ایسا کرنے سے روک دیتا۔ پھر یہ گردن کا زخم، فطری نہیں، غیر فطری تھا۔

قلمی نسخے میں ہمزاد کی دوبارہ تسخیر کے بارے میں کچھ بھی درج نہ تھا۔ میں نے البتہ آخری ہدایت پر بھی نظر ڈالی جس کا پہلے ہی بندوبست کر چکا تھا۔ لکھا تھا کہ فعل حیوانی کے عادی کو عمل نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ عمل کے دوران میں اس سے قطعی پرہیز کرنا پڑے گا۔

انہی ہدایات کی ذیل میں کھانے وغیرہ سے متعلق باتیں بھی درج تھیں۔ جو میں ارشاد علی کو بتا چکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہر روز نہانا، سر پر مالش کرنا وغیرہ! رات کا عمل ہو تو دن میں خوب سونا ضروری تھا۔ اونگھنے سے عمل باطل ہو جاتا تھا۔ عمل کے وقت دل میں کسی قسم کا شک یا شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی حفاظت کا پورا بندوبست رکھنا بھی ضروری تھا تاکہ عمل کے وقت کوئی بھی مداخلت نہ کرے۔ میں یہ بندوبست بھی کر چکا تھا۔ اب طلب کیے بغیر کوئی ملازم میری خواب گاہ میں داخل ہونے کی جرأت نہ کرتا۔ ضروریات کی تمام چیزیں عمل کرتے وقت پاس ہونا چاہئیں تاکہ عمل چھوڑ کر اٹھنا نہ پڑے۔ بہتر یہ ہے کہ بدن پر صرف ایک کپڑا ہو۔ ان دنوں میں غصہ اور لڑائی جھگڑا بھی منع تھا۔ زیادہ وقت مطالعے میں گزارنا مفید تھا، وہ بھی ایسی کتابوں کا مطالعہ جو دل میں گداز اور لطافت پیدا کریں، کسی ہیجان میں مبتلا نہ کریں۔ اس کے علاوہ جگہ اور وقت کی پابندی انتہائی ضروری تھی۔

عمل کے لیے ضروری ہدایات پڑھنے اور انہیں ذہن نشین کرنے کے بعد میں نے قلمی نسخے میں وہ صفحہ تلاش کیا جس پر "عمل شمعی" درج تھا۔ اس باب میں بھی ضروری ہدایات درج تھیں جن میں سے بیشتر مجھے زبانی یاد تھیں، پھر بھی توجہ سے پڑھنے لگا کہ کہیں کوئی بات ذہن سے نکل نہ گئی ہو۔ یہ میری زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ ذرا سی کوتاہی مجھے موت کی آغوش میں پہنچا سکتی تھی۔ میں اسی لیے ایک ایک بات پر توجہ دے رہا تھا۔

قلمی نسخے "عمل شمعی" کی ذیل میں لکھا تھا۔ "مٹی کا ایک چراغ جلا کر ایک صاف ستھرے کمرے میں رکھا جائے اور چراغ کی طرف پشت کر کے اول اول بائیس دن، رات بارہ بجے سے دو بجے تک عمل کیا جائے۔ عمل کے دوران میں جب اپنے سائے کی گردن پر نظر

جمائے جمائے تھک جائے تو چھت کی طرف نظر اٹھا کر اپنے سائے کا تصور کرے اور پھر دوبارہ اپنے سائے کی گردن پر نظر جما دے۔ بائیس دن گزر جانے کے بعد رات بارہ بجے سے فجر کی اذان ہونے تک عمل جاری رکھنا تھا۔

ان ابتدائی بائیس دنوں کے متعلق مزید چند ہدایات درج تھیں جن پر مجھے عمل کرنا تھا۔ مجھے سب سے پہلے تو اپنے نام کے اعداد نکالنا تھے جتنے اعداد نکالنا تھے اتنی ہی مرتبہ روز رات کے وقت دو گھنٹے عمل کرنے کے بعد، یعنی رات دو بجے کے بعد مجھے وہ عمل شیشہ سامنے رکھ کر اپنی شکل پر نظر جمائے ہوئے دوبارہ عمل کے الفاظ دہرانا تھے۔ دل میں مجھے یہ رکھنا تھا کہ میرا ہمزاد بہت جلد شیشے سے باہر آ کر میری اطاعت کرے گا۔ عمل کرتے وقت مجھے ایک روٹی پر ذرا سا گھی اور شکر بھی رکھنا تھا۔ بعد میں اس روٹی پر عمل دم کر کے کسی ایسے چوراہے پر اس روٹی رکھنا تھا جو عام گزرگاہ نہ ہو، جہاں سے کم لوگ گزرتے ہوں یا بالکل نہ گزرتے ہوں۔ روٹی، چراہے پر رکھ کر مجھے یہ الفاظ ادا کرنا تھے۔

"اے ہمزاد! یہ تم کھالو!"

اس کے بعد مجھے واپس آ جانا تھا۔ اس دوران میں نہ مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنا تھا اور نہ راستے میں آتے جاتے کسی سے گفتگو کرنا تھا۔ روٹی مجھے صبح ہونے سے پہلے کسی چوراہے پر رکھ آنا تھی۔ مجھے پورے بائیس دن یہ کرنا تھا اور تیسویں دن روٹی نہیں پہنچانا تھی۔ اگر خواب میں یا تحریر سے یا زبانی ہمزاد مجھ سے کہے کہ آج روٹی کیوں نہیں بھیجی؟ تو مجھے سمجھ لینا چاہیے کہ عمل کامیابی کی طرف گام زن ہے۔ ایک دن ناغہ کے بعد چوبیسویں دن سے مجھے پھر روٹی پہنچانا شروع کر دینا تھا۔ اگر ہمزاد زبانی شکایت کرے تو مجھے یہ جواب دینا تھا کہ اب روٹی برابر پہنچائی جائے گی۔ اگر ہمزاد، خواب یا تحریر کے ذریعے استفسار کرے تو جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد مجھے اپنا بقیہ عمل جاری رکھنا تھا، پورے چالیس دن ہونے تک! عمل کے دوران میں مجھے اپنی چاروں طرف ایک حصار بھی کھینچنا تھا اور کسی قیمت پر وقت پورا ہونے سے پہلے حصار کے باہر قدم نہیں رکھنا تھا۔

میں نے آخر میں عمل کے الفاظ بھی دہرا لیے تاکہ ذہن میں تازہ رہیں۔ یہ عمل کیوں کہ روحانی تھا اس لیے عمل کے دوران میں دونوں آیتیں قران کی سورۂ فرقان کی چوالیسویں اور پینتالیسویں آیتیں تھیں۔ سورۂ فرقان، قرآن کے انیسویں پارے میں ہے۔ میں یہاں ان آیتوں کا ترجمہ لکھ رہا ہوں جو میں نے قلمی نسخے میں درج دیکھی تھیں۔ مجھے ان کا ترجمہ نہیں۔ اصل عبارت عربی میں پڑھنا تھا۔ ان دونوں آیتوں کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔

"..... بلکہ تم نے اپنے پروردگار کو نہیں دیکھا کہ وہ سائے کو کس طرح دراز کرتا ہے! اگر وہ چاہتا تو اسے ٹھہرائے رکھتا۔ پھر سورج کو اس کا رہنما بنا دیتا ہے۔ پھر ہم اسے اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔"

دونوں آیتوں کو میں نے ذہن نشین کر لیا جو پہلے سے مجھے تھوڑی بہت یاد تھیں۔ مجھے آج ہی رات سے عمل شروع کرنا تھا اس لیے تمام ضروری اشیاء میں نے اپنی خواب گاہ میں منگوالیں۔ چراغ اور تیل کا بندوبست بھی کر لیا۔ اس کے علاوہ روئی، شکر، گھی اور ایک آئینہ بھی فراہم کر لیا تاکہ عمل کے دوران میں مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ جو ملازم رات کے وقت خواب گاہ کے باہر رہتا تھا، اسے یہ ہدایت کر دی کہ رات دو بجے کے بعد میں اپنی خواب گاہ سے نکل کر کہیں جاؤں گا۔ وہ اس دوران میں مجھ سے کوئی کلام نہ کرے اور اس وقت تک حویلی کے دروازے کھلے رکھے جب تک میں لوٹ نہ آؤں۔ رات کی یہ ڈیوٹی میرے کہے بغیر ارشاد علی نے سنبھال لی جس پر مجھے پورا اعتماد تھا کہ میری ہدایات پر عمل کرے گا۔

وقت دھیمی رفتار سے بہتا رہا اور آخر نصف شب قریب آنے لگی۔ میں نے پاک صاف ہونے کے لیے غسل کیا اور صرف ایک تہ بند ستر پوشی کے لیے باندھ لیا۔ پھر ٹھیک بارہ بجے میں نے چراغ روشن کر دیا اور اس کی طرف سے پشت کر کے زمین پر حصار کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میرا سایہ سامنے والی دیوار پر پڑ رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن پر نگاہ جما کر دونوں آیتوں کا ورد شروع کر دیا۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اپنی گردن میں مجھے سخت تکلیف محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق شاید دوا کا اثر اب ختم ہو رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی آہستہ آہستہ میری گردن پر خنجر پھیر رہا ہے۔ اذیت لحہ بہ لحہ بڑھتی گئی اور میرے منہ سے کراہیں نکلنے لگیں۔ مجھے خوف سا محسوس ہوا کہ کہیں میں بیٹھے بیٹھے گر نہ پڑوں۔ عمل کا ورد اب بھی جاری تھا۔ میں ایک لمحے کو بھی نہیں رکا تھا۔ میں کسی قیمت پر بھی ادھورا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

نظر تھک گئی تو میں نے ہدایت کے مطابق چھت کی طرف دیکھا اور اپنے سائے کا تصور کیا۔ سایہ کچھ منتشر منتشر سا تھا۔ اسی وقت ایک زہریلا قہقہہ مہ پارہ کا تھا۔ قہقہے کے بعد مجھے اس کی آواز بھی سنائی دی۔ "اے شیخ! تم میرے چنگل سے نکلنا چاہتے ہو! مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ تم نے اپنا عمل پورا کر لیا تو پھر میری دسترس سے نکل جاؤ گے کیوں کہ یہ تمہارا نیا جنم ہو گا جس پر مجھے اختیار نہ رہے گا۔ پھر میں تمہیں خواہش کے باوجود کسی مصیبت، آزار میں مبتلا نہ کر سکوں گی۔ میں اسی لیے عالم برزخ سے پھر تمہاری دنیا میں لوٹ آئی ہوں کہ

تمہیں یہ عمل پورا نہ کرنے دوں۔ ہاں میرے انتقام سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے، وہ یہ کہ تم اپنی موت کو قبول کر لو اور میرے پاس آ جاؤ۔"

وہ کہے جا رہی تھی اور اب مجھے اس کا ہیولا بھی اپنے سائے کے ساتھ دیوار پر نظر آ رہا تھا، مگر میرا ورد اب بھی جاری تھی۔ میں جواب میں کچھ کہتا تو میرا عمل ختم ہو جاتا۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ میں کچھ بولوں، مگر ناکام رہی۔

"اچھا تو یوں نہیں مانو گے!" اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ یقیناً" اب وہ مجھ پر کوئی نیا حربہ آزمانے والی تھی جس کے بارے میں مجھے قطعی علم نہیں تھا ورنہ پہلے ہی سے اس کا بھی کوئی توڑ سوچ لیتا۔

اچانک میری خواب گاہ اس کی بھیانک چیخوں سے گونجنے لگی۔ اب تک میرے تجربے میں یہی آیا تھا کہ اس کی آواز، قہقہے اور چیخیں صرف میں ہی سن سکتا تھا، کوئی اور نہیں، مگر اس رات ایسا نہیں ہوا۔ اس کا اندازہ مجھے چند ہی لمحے بعد ہو گیا۔

میں نے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ کمرے میں داخل ہونے والا میرا خادم خاص ارشاد علی تھا جسے میں نے اس کی آواز سے پہچانا کیوں کہ میری نگاہ اپنے سائے پر جمی ہوئی تھی۔ مجھے ارشاد علی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"کیا ہوا سرکار؟ یہ..... یہ کون عورت..... کس کی چیخ تھی؟"

ظاہر ہے کہ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور عمل کا ورد کرتا رہا۔ اس لمحے دیوار جہاں میرا سایہ پڑ رہا تھا اس کے بالکل نیچے مہ پارہ زمین پر دراز نظر آئی۔ اس کے سینے میں دستے تک ایک خنجر پیوست تھا اور سینے سے خون اُبل اُبل کر فرش پر بہہ رہا تھا۔ وہ بری طرح تڑپ رہی تھی اور چیخ بھی رہی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر شاید ارشاد علی کو پہلے تو سکتہ ہو گیا، پھر وہ بھی چیخ اٹھا، میں مجبور تھا، کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس احمق نے کمرے کا دروازہ کھول کر یقیناً" بہت بڑی حماقت کا ثبوت دیا تھا۔

"خون!..... خون! وہ ہذیانی انداز میں چیخے جا رہا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً" میرے سارے ہی ملازم، خواب گاہ میں جمع ہو گئے، مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ مہ پارہ کے تڑپتے ہوئے جسم کے قریب جا سکتا۔ میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ مہ پارہ کی روح نے مجھے اور میرے ملازموں کو فریب نظر میں مبتلا کر دیا ہے۔

معاً" ایک ملازم نے ایک ایسی بات کہی کہ میرا خون کھول اٹھا۔ وہ ارشاد علی سے کہہ

رہا تھا کہ فوراً" پولیس کو مطلع کر دینا چاہیے ورنہ اس لڑکی کے قتل کے الزام میں ہم سب بھی دھر لیے جائیں گے۔

ارشاعلی تذبذب کا شکار تھا کیوں کہ کئی بار کوشش کے باوجود میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ "جب تک سرکار خود حکم نہ دیں ہم پولیس کو کس طرح بلا سکتے ہیں! کیا خبر سرکار اس بات کو پسند بھی کریں یا نہ کریں!

"سرکار تو شاید کوئی عمل کر رہے ہیں۔" ایک ملازم بولا۔ "اور مجھے معلوم ہے کہ عمل کے دوران میں عامل کچھ بولتا نہیں، مگر خدا نے ہمیں تو عقل دی ہے کہ ایسے موقع پر کیا کرنا چاہیے! میرے خیال میں پولیس کو بلانا ضروری ہے۔"

"یہ تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن پولیس آ گئی تو سرکار کو اس سے بات کرنا پڑے گی اور تم خود ہی کہہ چکے ہو کہ عامل، عمل کے دوران میں نہیں بولتا..... پھر خود سرکار نے بھی تو ہدایت دی تھی کہ بغیر طلب کیئے کوئی ان کے کمرے میں نہ آئے۔" ارشاد علی کو عقل آتی جا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ شاید وہ معاملے کو سنبھال لے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

وہی پہلا ملازم جس نے پولیس کو مطلع کرنے کا مشورہ دیا تھا، ایک دم بول اٹھا۔ "تم ہو کس دھیان میں ارشاد علی! یہ ایک لڑکی کے قتل کا معاملہ ہے۔ ہم سب باندھ لیے جائیں گے۔ سرکار تو بڑے آدمی ہیں، لے دے کر چھوٹ جائیں گے، مگر ہمارا کیا بنے گا! نہیں..... ہرگز نہیں! اگر تم پولیس کو اطلاع نہیں دو گے تو میں خود پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔"

دوسرے تین ملازم بھی اس کے ہم نوا بن گئے۔ اس دوران میں مہ پارہ کا جسم تڑپ تڑپ کر ساکت ہو چکا تھا۔

"سنو تو سہی تم لوگ!" ارشاد علی نے انہیں روکنا چاہا۔

"ہاں کہو، کیا بات ہے؟" پہلے ملازم نے ناراضگی کے لہجے میں کہا۔

"اس قتل کی اطلاع صبح بھی تو دی جا سکتی ہے، جب تک سرکار اپنے عمل سے بھی فارغ ہو جائیں گے۔" ارشاد علی نے اسے سمجھایا۔

"بالکل نہیں!" پہلا ملازم سختی سے بولا۔ "پولیس ہم سے پوچھے گی کہ ہم نے رات ہی کو قتل کی اطلاع کیوں نہیں دی؟ پھر وہ ہم پر شک کرے گی کہ ہم بھی قتل میں شریک تھے۔"

ارشاد علی کے سمجھانے بجھانے کا اس ملازم اور اس کے ہم نوا ملازموں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ چاروں کمرے سے چلے گئے اب وہاں ارشاد علی اور ایک ملازم رہ گیا۔ اس عرصے میں چیخ پکار کی آوازیں سن کر میری ملازمائیں بھی دروازے کے باہر آ کھڑی ہوئی تھیں اور اندر کا

منظر دیکھ کر ان کے منہ سے بھی چیخیں نکل گئی تھیں۔ میری ہدایت سے قطع نظر انہوں نے خوف کے سبب خواب گاہ میں قدم نہیں رکھا تھا۔

مجھے پہلے یہ اندازہ نہیں تھا کہ مہ پارہ کی روح اس طرح معاملے کو بگاڑ کر میرے لیے مشکلات پیدا کر دے گی۔ میں اس لیے سخت پریشان تھا، مگر عمل کا ورد اب بھی جاری تھی۔

میرے چار ملازم پولیس اسٹیشن، قتل کی اطلاع دینے جا چکے تھے اور اب کسی بھی وقت پولیس وہاں پہنچ سکتی تھی۔ جس طرح مہ پارہ نے مجھے اور میرے ملازمین کو فریب نظر میں مبتلا کر دیا تھا، اسی طرح وہ پولیس والوں کو بھی فریب نظر کا شکار بنا سکتی تھی۔ ایسی صورت میں پولیس کا سلوک میرے ساتھ کیا ہوتا، یہ ظاہر تھا۔ وہ مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیتے اور پولیس اسٹیشن لے جاتے۔ یوں مجھے اپنا عمل ختم کرنا پڑتا جس کے لیے ضروری تھا کہ میں حصار سے باہر نہ آؤں۔ حصار سے نکلتے ہی میرا عمل باطل ہو جاتا۔

میں نے اس وقت خود کو بہت مجبور اور بے بس محسوس کیا۔ عمل کی پہلی ہی شب مجھ پر بہت گراں گزر رہی تھی۔ میں سمجھ چکا تھا۔ کہ عمل پورا ہونے کے بعد میں، مہ پارہ کے چنگل سے نکل جاؤں گا جیسا کہ اس نے خود کہا تھا، اس نے اسی لیے پہلی ہی رات بھرپور حملہ کیا تھا، ایسا حملہ جس کا کوئی توڑ میرے پاس نہیں تھا۔

عمل شروع کیے ابھی مجھے بہ مشکل پون گھنٹا ہوا تھا۔ ابھی صبح دور تھی۔ صبح کی اذان ہونے سے پہلے میں کسی سے کلام نہیں کر سکتا تھا۔ عمل ترک ہونے کا مطلب میری یقینی موت تھی کیوں کہ ایک دن اس طرح ضائع ہو جاتا اور میں چالیس دن کی مدت میں عمل پورا نہ سکتا۔

ایک طرف تو گردن کی شدید تکلیف، دوسری طرف عمل کا ورد اور تیسری جانب مہ پارہ کا جال! اور میں اس کے پھیلائے ہوئے جال میں پوری طرح پھنس چکا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کروں تو کیا کروں!

مہ پارہ کی لاش اب تک میرے سائے کے قدموں میں پڑی تھی۔ خنجر اسی طرح دستے تک اس کے سینے میں پیوست تھا اور فرش پر خون پھیلا ہوا تھا۔

ارشاد علی کے جی میں جانے کیا آئی کہ وہ میری خواب گاہ سے نکل گیا اور ساتھ ہی ساتھی ملازم کو بھی وہاں سے لے گیا۔ پھر میں نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کرنے کی آواز سنی۔ نہ جانے اس نے کیا سوچا تھا!

ان دونوں ملازمین کے کمرے سے جاتے ہی مہ پارہ کے قہقہے سے ایک بار پھر کمرا گونج

اٹھا۔ لاش غائب ہو گئی اور اس کا ہیولا پھر میرے سائے کے قریب دیوار پر نظر آنے لگا۔ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "شیخ! میری مرضی اور خواہش کے مطابق تمہارا عمل باطل ہونے والا ہے۔ کچھ دیر جاتی ہے کہ پولیس تمہیں یہاں سے گرفتار کر کے لے جائے گی اور اس طرح تم اپنا عمل پورا نہ کر سکو گے۔ دیکھ لو کہ پہلی ہی رات کو میں نے تمہیں شکست دے دی۔ اب پولیس کی آمد کا انتظار کرو' اس کے سوا تمہارے پاس کوئی چارہ نہیں۔ جیسے ہی پولیس تمہاری خواب گاہ میں داخل ہو گئی' میں پھر لاش بن جاؤں گی۔ ہاں ایک شرط ہے۔ اگر تم میری شرط مان لو تو میں اب بھی بگڑے ہوئے حالات پر قابو پا سکتی ہوں۔ جواب دو شیخ کہ کیا تم شرط سننے اور اسے ماننے پر آمادہ ہو؟ اس طرح تم یقینی موت سے بچ جاؤ گے۔"

یہ بھی اس کا فریب تھا۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بعد مجھے عمل کا ورد ترک کرنا پڑتا۔ میں اسی لیے چپ رہا۔

"سنو! میں جانتی ہوں کہ تم اس عالم میں کلام نہیں کر سکتے۔ تو اگر میری شرط سننے اور اس پر عمل کرنے پر تیار ہو تو اپنی گردن اقرار میں ہلا دو' میرے لیے اتنا ہی کافی ہو۔" مہ پارہ نے کہا۔

وہ میری دشمن تھی اور دشمن سے کسی بھلائی کی توقع کرنا حماقت کے سوا کچھ اور نہیں۔ اگر وہ بگڑے ہوئے معاملے کو سنبھالنا ہی چاہتی تو یہ سب ہنگامہ کیوں کھڑا کرتی! یقیناً" وہ اس طرح مجھ پر کوئی نیا حربہ آزمانا چاہتی ہے۔ میں نے عمل کا ورد کرتے ہوئے سوچا اور بدستور خاموش رہا۔ میں نے گردن بھی اقرار میں نہیں ہلائی۔

"میں سمجھ گئی تم مرنا ہی چاہتے ہو ورنہ گردن ہلا کر اقرار کر لیتے!" مہ پارہ کسی ناگن کی طرح پھنکاری۔ "ٹھیک ہے۔ نہ سنو میری شرط اور موت کو گلے لگانے پر تیار ہو جاؤ کہ یہی تمہاری قسمت ہے!"

پھر کچھ دیر وہ خاموش رہی اور میرے بولنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔

معاً" میری سماعت سے بھاری قدموں کی آواز ٹکرائی۔ میں سمجھ گیا کہ پولیس میرے گھر میں داخل ہو چکی ہے۔ مہ پارہ ایک بار پھر لاش بن گئی۔ قدموں کی دھمک دروازے کے قریب آ گئی اور پھر دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔

"دروازہ کھولو!.... پولیس!" کسی نے چیخ کر کہا۔

"اس میں تو باہر سے تالا پڑا ہے۔" باہر ہی سے کسی کی آواز آئی۔

"اس کی چابی کس کے پاس ہے؟" کسی نے سوال کیا۔

"ارشاد علی کے پاس۔" میں نے اپنے ملازم کی آواز سنی۔

"وہ کہاں ہے؟" اور دریافت کیا گیا۔

"ہم اُسے اور رحمت کو یہیں چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ دونوں جانے کہاں غائب ہو گئے' نظر نہیں آ رہے!" ملازم نے جواب دیا۔

"انہیں تلاش کرو' کوٹھی ہی میں کہیں چھپے ہوں گے۔ اس قتل میں وہ بھی ملوّث معلوم ہوتے ہیں۔ اگر وہ کوٹھی میں نہیں ہیں اور فرار ہو چکے ہیں تو یقیناً" مجرم ہیں۔"

کچھ دیر اور گزر گئی۔ اس دوران میں باہر سے پولیس والوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر جو ملازم' ارشاد علی کو تلاش کرنے گئے تھے' انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ ارشاد علی اور رحمت' کوٹھی میں کہیں نہیں ہیں۔

"ایسی صورت میں کمرے کا تالا توڑ کر ہی ہم اندر داخل ہو سکتے ہیں۔" کسی پولیس والے نے مشورہ دیا۔

پھر ذرا دیر بعد ہی قفل پر ضربیں پڑنے کی آوازیں آنے لگیں اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ ارشاد علی نے اپنی سی کوشش کر لی تھی۔ کہ پولیس مجھ تک نہ پہنچ سکے' مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ پولیس' تالا توڑ کر بھی اندر داخل ہو سکتی ہے۔ قفل توڑنے کے لیے جو ضربیں لگائیں جا رہی تھیں۔ وہ ضربیں جیسے براہ راست میری روح پر پڑ رہی تھیں۔ اب کسی بھی لمحے قفل ٹوٹ جاتا اور پھر پولیس اندر آ جاتی۔ اس کے بعد کیا ہوتا؟ یہ سوچنا بھی میرے لیے سوہان روح تھا۔

OO.....O.....OO

مجھے پوری طرح احساس تھا کہ صورت حال بہت سنگین ہو چکی ہے اور میں بے بس ہوں۔ اس خطرناک عورت نے مر کے بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا انتقام واقعی بہت بھیانک تھا۔ کاش میں نے اس کی آرزو نہ کی ہوتی' اس کے حصول کو اپنی آنا کا مسئلہ نہ بنایا ہوتا' مگر اب یہ سب کچھ سوچنا فضول تھا۔ وقت گزر چکا تھا اور گزرا ہوا وقت کبھی واپس نہیں آتا۔ یہ میری زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ اگر کسی طرح مہ پارہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی اور میں ہمزاد کو دوبارہ قابو میں نہ کر پاتا تو میری موت یقینی تھی۔ عمل کا ورد کرتے ہوئے میرے ذہن میں بس یہی ایک سوال بار بار گردش کر رہا تھا کہ اس یقینی موت سے کس طرح بچا جا سکتا ہے؟

میرے نزدیک زندگی کی بساط پر کھیلے جانے والا کھیل کچھ دیر کا تھا۔ دروازے کا قفل توڑنے کے لیے ضربیں لگائی جا رہی تھیں۔ قفل ٹوٹتے ہی پولیس والے میرے کمرے میں داخل ہو جاتے اور پھر مجھے ایک لڑکی کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا۔ ایسی صورت میں مجھے یقیناً حصار سے باہر آنا پڑتا اور یوں میرا عمل ناکام ہو جاتا۔ مہ پارہ نے میرے لیے مفر کی کوئی راہ نہیں چھوڑی تھی۔ پہلے اس نے چیخ کر میرے ملازمین کو وہاں آنے پر مجبور کیا اور پھر ایک مقتول لڑکی کا روپ دھار لیا۔ اب اس کا نتیجہ میرے سامنے تھا۔

پھر وہ لمحہ آ ہی گیا جب پولیس والے' تالا توڑ کر میرے کمرے میں داخل ہو گئے۔ میں نے بھاری قدموں کی آوازیں سنیں جو ابھر کو فوراً ہی معدوم ہو گئیں۔ ہر چند کہ پولیس والے پہلے سے ذہنی طور پر تیار ہوں گے کہ انہیں کمرے میں ایک لاش نظر آئے گی' مگر اس کے باوجود وہ شاید اندر آتے ہی ٹھٹک گئے تھے۔ یوں بھی کمرے کی فضا پُر اسرار تھی۔ میرے عقب میں چراغ روشن تھا اور میرا سایہ سامنے والی دیوار پر پڑ رہا تھا۔ میں بغیر پلک جھپکائے سائے کی گردن پر نظر جمائے ہوئے زیر لب عمل پڑھنے میں مصروف تھا۔ میرے سائے کے قریب ہی

فرش پر مہ پارہ کی لاش پڑی تھی جس کے سینے میں خنجر پیوست تھا۔ اس کے سینے سے اب تک خون بہہ بہہ کر فرش پر پھیل رہا تھا۔ کمرے میں ایک بوجھل سی خاموشی میں پھیلی ہوئی تھی' ایسی خاموشی جو روح پر بوجھ محسوس ہونے لگ

"اسے..... اس لڑکی کو قتل ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔" بالاخر کسی کی آواز نے اس بوجھل خاموشی میں آواز کا پہلا پتھر پھینکا اور جیسے سحر ٹوٹ گیا' زندگی لوٹ آئی۔

شاید ان لوگوں کی تمام تر توجہ لاش نے اپنی طرف مبذول کر لی تھی۔ اسی لیے کسی کو میرا خیال نہیں آیا تھا۔ ان میں سے ایک جو غالباً انسپکٹر تھا' لاش کی طرف بڑھا اور اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ پھر وہ مڑا اور کسی کو مخاطب کیا۔ "کیا تم لوگوں میں سے کسی نے اس لڑکی کو پہلے یہاں دیکھا ہے؟" وہ یقیناً میرے ملازمین سے مخاطب تھا۔ "ادھر آؤ تم لوگ! اس کے چہرے کو غور سے دیکھو۔"

"نہیں صاحب' پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" میرے ایک ملازم کی آواز آئی۔

"تم لوگ قریب تو آؤ نا! یہ لاش تمہیں کھا نہیں جائے گی!" پولیس انسپکٹر کے لہجے میں سختی آ گئی۔

پھر وہ سب شاید ڈرے ڈرے سہمے سہمے آگے بڑھے اور میں نے ان کے قدموں کی چاپ سنی جو انسپکٹر کے قریب آ کر رک گئی۔

"ہاں اب غور سے دیکھو! شاید تمہیں کچھ یاد آ جائے۔" انسپکٹر نے انہیں مخاطب کیا۔

ان سب کا جواب وہی تھا' یعنی یہ کہ لڑکی ان کے لیے قطعی اجنبی ہے۔

"کوئی چادر لاؤ اور اس لاش پر ڈال دو۔" انسپکٹر نے حکم دیا۔

وہ کمرہ میری خواب گاہ تھا۔ انہیں چادر وہیں مل گئی۔ میرے دو ملازم' چادر لیے لاش کے قریب پہنچ گئے۔ انسپکٹر بھی اسی جگہ کھڑا تھا۔ لاش کیوں کہ بالکل، میرے سامنے دیوار کے قریب پڑی ہوئی تھی اس لیے وہ سبھی مجھے واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ ملازموں نے لاش پر چادر ڈال دی اور دوسرے ہی لمحے ان کے منہ سے حیرت زدہ سی چیخیں نکل گئیں۔ مہ پارہ کی لاش پر اسرار طور پر غائب ہو چکی تھی۔ چادر اور فرش کے درمیان کچھ نہ تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ انہوں نے فرش پر چادر بچھا دی ہو۔ لمحہ بھر کو مجھے بھی حیرت ہوئی' مگر فوراً ہی میں اس کی وجہ سمجھ گیا۔ مہ پارہ کی لاش کا کوئی مادی وجود نہیں تھا۔ وہ سب کچھ فریب نظر تھا۔

"یہ..... یہ..... لا..... لاش..... کاں..... کہاں غائب ہو گئی!" انسپکٹر ہکلانے لگا۔ "ابھی..... ابھی تو..... یاں..... یہاں تھی۔"

"صا...... صاحب! یہ...... یہ کوئی پُراسرار چکر لگ رہا ہے۔ وہ...... وہ ادھر...... ادھر دیکھیں۔ یہ شاید کوئی عمل کر رہے ہیں۔" کسی سپاہی نے اپنے انسپکٹر کی توجہ میری طرف مبذول کرانا چاہی غالباً اس نے عملیات کے بارے میں کچھ سنا ہو گا۔

انسپکٹر قدم قدم چلتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔ یقیناً وہ اس سلسلے میں مجھ سے کچھ استفسار کرنا چاہتا تھا۔ میں بہ دستور عمل پڑھنے میں مصروف تھا۔

"سنئے جناب!" انسپکٹر نے مجھے مخاطب کیا اور مزید ایک قدم میری طرف بڑھایا۔ اب وہ میرے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے اسے چیخ کر گرتے ہوئے دیکھا۔ سپاہی اس کی طرف دوڑے اور پھر اسے اٹھانے لگے۔

"کیا ہوا صاحب؟...... کیا ہوا؟" کسی سپاہی نے اپنے افسر سے پوچھا۔

"مجھے یوں...... یوں لگا جیسے کسی نے...... کسی نادیدہ قوت نے پیچھے دھکیل دیا ہو اور...... میں گر گیا۔" انسپکٹر فرش سے اٹھتے ہوئے خوف زدہ سی آواز میں کہنے لگا۔ "یہ...... یہ واقعی کوئی پراسرار معاملہ معلوم ہوتا ہے۔"

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ نادانستگی میں انسپکٹر میرے گرد کھینچے ہوئے نادیدہ حصار سے ٹکرا گیا تھا۔

"میرا تو مشورہ ہے صاحب کہ یہاں سے چلے جائیں، کہیں ہم لوگ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔" یہ آواز اس سپاہی کی تھی جس نے انسپکٹر کو میری طرف متوجہ کیا تھا۔

"ہاں تم...... تم ٹھیک کہتے ہو، مگر ان سے پوچھ گچھ......"

"اس وقت یہ کچھ نہیں بولیں گے۔" سپاہی نے انسپکٹر کی بات کاٹ دی۔ "میں نے ایک مولوی صاحب سے سنا تھا کہ عمل کرتے ہوئے عامل کسی سے بات نہیں کرتا۔ اگر آپ پوچھ گچھ ضروری ہی سمجھتے ہیں تو یہ کام کل صبح بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہاں پوچھ گچھ ضروری ہے کیوں کہ بہر حال یہ ایک لڑکی کے قتل کا معاملہ ہے۔" انسپکٹر معنی خیز لہجے میں بولا۔ غالباً اس نے یہ سوچا ہو گا کہ کچھ اور نہیں تو مجھ سے رقم تو اینٹھ ہی لے گا۔ دوبارہ وہاں خود آنے کو اس نے شاید اپنی شان کے خلاف سمجھا اسی لیے میرے ملازمین سے بولا۔ "انہیں کل صبح تھانے بھیج دینا۔" اس کے لہجے میں پولیس والوں کی سی سختی تھی۔

"ٹھیک ہے جناب! ضرور ضرور۔" میرے ایک ملازم نے جواب دیا۔

پھر کچھ ہی دیر بعد کمرا خالی ہو گیا۔ پولیس والوں کے ساتھ ساتھ میرے ملازم بھی وہاں

سے کھسک لیے اور جاتے جاتے کمرے کا دروازہ بھیڑ گئے تھے۔ انہوں نے کمرے میں جو پُراسرار منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس کے بعد شاید ان میں اتنی قوت نہیں تھی کہ وہاں ٹھہر سکتے۔

ان لوگوں کے جاتے ہی میری رُوح سے جیسے کوئی بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ معاملہ اتنی جلدی نمٹ جائے گا اور یہ کہ میں ان حالات کے باوجود اپنا عمل جاری رکھ سکوں گا۔ حالات یقیناً خطرناک نوعیت اختیار کر گئے تھے، لیکن اس کے باوجود میں نے انتہائی مضبوط قوت ارادی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید مہ پارہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی۔

معاً ایک بار پھر کمرے میں مہ پارہ کی منحوس آواز گونج اٹھی۔ "شیخ! تم شاید اپنی فتح پر خوشی محسوس کر رہے ہو گے!" اس کی آواز میں چبھن تھی۔ "میں اس سے زیادہ عالم برزخ سے غائب نہیں رہ سکتی ورنہ تمہارا غرور آج ہی خاک میں ملا دیتی، مگر یہ نہ بھولو کہ ابھی یہ پہلی رات ہے اور ابھی عمل پورا ہونے میں بہت راتیں باقی ہیں۔ تم میرے انتقام سے بچ نہیں سکتے!" جاتے جاتے اس نے مجھے دھمکی دی اور پھر اس کی آواز معدوم ہو گئی۔

میری نظر اس وقت تھک چکی تھی اور میں چھت کی طرف دیکھ رہا تھا اس لیے اس کے پُراسرار وجود کو نہ دیکھ سکا۔ میں نے چند لمحے بعد دوبارہ اپنے سائے کی گردن پر نگاہ ڈالی تو وہ جا چکی تھی۔

اسی ہنگامے کے دوران میں دو گھنٹے کا وقت پورا ہو چکا، اب عمل کا دوسرا مرحلہ درپیش تھا۔ میں نے قریب رکھا ہوا شیشہ اٹھالیا، پھر شیشے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے دوبارہ عمل پڑھنے لگا۔ میں نے اسی عرصے میں عمل کی بقیہ ہدایات پر توجہ دی۔ عمل پڑھتے ہوئے میں نے ایک روٹی پر ذرا سا گھی اور شکر رکھی۔ جب مزید دو گھنٹے پورے ہو گئے تو میں نے روٹی پر عمل دم کیا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب مجھے اپنی حویلی سے نکل کر کسی ایسے چوراہے تک پہنچنا تھا جو عام گزر گاہ نہ ہو۔

میں روٹی لیے ہوئے اپنے کمرے سے نکلا تو ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے حویلی میں میرے سوا اور کوئی نہ ہو۔ بہرحال میں آگے بڑھتا رہا اور پھر صدر دروازے تک پہنچ گیا۔ جو خلاف توقع مجھے کھلا ہوا ملا۔ میرے ملازمین یقیناً اتنے خوف زدہ ہو گئے تھے کہ انہیں صدر دروازہ بند کرنے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ میں باہر نکلنے کے بعد دروازہ بھیڑ کر آگے بڑھ گیا۔

چاٹگام میرا دیکھا بھالا شہر تھا۔ اپنی حویلی سے نکلتے ہی میں فیصلہ کر چکا تھا کہ کدھر کا رخ کرنا ہے! رات کے وقت عموماً سپاہی بھی گشت پر ہوتے ہیں۔ میں نے اسی لیے مطلوبہ چوراہے تک پہنچنے کی خاطر گلیوں کو ترجیح دی تاکہ کسی سے مڈبھیڑ نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جاتے ہوئے اور واپسی میں نہ مجھے کسی سے گفتگو کرنا تھی اور نہ ہی پیچھے مڑ کر دیکھنا تھا۔

ان تمام مراحل سے میں پہلے بھی ایک بار گزرا تھا اس لیے میرے دل میں کوئی خوف یا وسوسہ نہیں تھا۔ میں بہ آسانی ایک چوراہے تک پہنچ گیا اور روٹی وہاں رکھ کر بلند آواز میں کہا۔ "اے ہمزاد! یہ تم کھالو۔" پھر میں الٹے قدموں واپس ہوا۔

چوراہے تک پہنچنے اور دوبارہ اپنی حویلی تک واپس آتے ہوئے راستے میں مجھے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا حالانکہ جب میں نے پہلے ہمزاد کا عمل کیا تھا تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس مرتبہ میرا ہمزاد مجھ سے تعاون کر رہا تھا اور میرے عمل میں کوئی رکاوٹ ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

میں حویلی میں پہنچا تو صورت حال بہ دستور تھی۔ میں نے وضو کر کے فجر کی نماز پڑھی کیوں کہ نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ پھر میں لباس تبدیل کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے مجھے اب نیند آ رہی تھی۔ گردن کی تکلیف اسی طرح تھی، لیکن وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے۔ "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا" سو میری حالت بھی ویسی ہی تھی اور نیند تو کانٹوں پر بھی آ جاتی ہے۔

پھر میں خود سے بیدار نہیں ہوا بلکہ مجھے آواز دے کر جگانے والا میرا خادم خاص ارشاد علی تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔

"جناب! تھانے سے ایک سپاہی آیا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ تھانیدار صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔" ارشاد علی نے بتایا۔

گزشتہ شب کے گزرے ہوئے واقعات مجھے ایک ایک کر کے یاد آتے گئے اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "اس سے کہہ دو کہ میں ابھی کچھ دیر میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔ اور یہ کہہ کر تم فوراً میرے پاس واپس آ جاؤ۔"

"جی بہتر ہے۔" یہ کہہ کر ارشاد علی چلا گیا۔

اسی وقت میری گردن میں ٹیس سی اٹھی اور پھر تکلیف کا احساس بڑھنے لگا۔ میں نے اپنی قوت برداشت سے کام لیتے ہوئے بہ مشکل منہ دھویا اور پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔ ارشاد علی

جلد ہی لوٹ آیا۔

"جناب وہ بڑی مشکل سے گیا ہے، کہہ رہا تھا کہ آپ کو ساتھ لے کر جائے گا۔" ارشاد علی نے بتایا۔

"خیر اس پر لعنت پڑھو اور یہ بتاؤ کہ تم کب لوٹے؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔ مجھے اس پر بھی غصہ تھا اور اپنے بقیہ ملازمین پر بھی جو مہ پارہ کی سازش کا شکار ہو گئے تھے اگر ارشاد علی میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کمرے کا دروازہ نہ کھولتا تو میں خواہ مخواہ کے عذاب میں مبتلا نہ ہوتا۔ غلطی اس کی تھی، مگر اس کے باوجود میرے دل میں کم از کم اس کے لیے نرم گوشہ موجود تھا۔ اس نے بہرحال آخر وقت تک مجھے پولیس سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اس میں جتنی عقل تھی اس کے مطابق تو عمل کرتا۔

ارشاد علی نے میرے لہجے سے یقیناً ناراضگی کا اندازہ لگایا تھا اسی لیے کچھ سٹپٹا گیا تھا۔ بہرحال اسے جواب تو دینا ہی پڑا۔ "صبح ہوتے ہی آ گیا تھا جناب!" اس نے بتایا۔

"میں معافی چاہتا ہوں جناب! مجھ..... مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے دروازہ نہیں کھولنا چاہیے تھا۔ دراصل مجھے اندازہ نہیں تھا کہ....."

"تمہیں تو خیر معاف کر سکتا ہوں، مگر بقیہ ان چاروں بدمعاشوں کو ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔ جنہوں نے پولیس کو اطلاع دی تھی۔" میں اس کی بات کاٹ کر غصے میں بولا۔ "ان سب کا اسی وقت حساب کر دو اور یہاں سے چلتا کرو!" میں نے گویا حکم دیا۔

گھر کے اخراجات کی مد میں ارشاد علی کے پاس کافی رقم رہتی تھی اس لیے میں نے اسے مزید رقم دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

وہ ادب سے سر جھکا کر جانے والا تھا کہ میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔ "اور سنو!" وہ رک گیا تو میں نے مزید کہا۔ "ملازماؤں سے بھی پوچھ لو، اگر ان میں سے بھی کوئی جانا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم ان کا حساب بھی صاف کر سکتے ہو۔ مزید رقم کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لینا میں ابھی یہیں ہوں۔ اتنے میں تھانے جانے کے لیے کپڑے بدل رہا ہوں، اتنے میں تم یہ کام نمٹالو۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میں لباس تبدیل کر کے باہر نکلنے والا تھا کہ میری نگاہ فرش پر پڑی ہوئی چادر پر پڑی۔ میں نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔ چادر بے داغ تھی اور فرش بھی، حالانکہ رات کو یہاں خون پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چادر ایک طرف رکھ کر میں باہر نکلا تو چاروں ملازم مجھے اس طرف آتے دکھائی

دیئے جنہیں میں نوکری سے جواب دے چکا تھا۔ ان کے چہروں پر بارہ بجے ہوئے تھے۔

"صاحب! ہمیں معاف کر دیں، غلطی ہو گئی۔" ان میں سے ایک میرے قریب آ کر گڑگڑانے لگا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے!" میں برس پڑا۔ "مجھے تم ایسے نمک حراموں کی ضرورت نہیں ہے!" یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔

بنگال میں بڑی غربت تھی۔ وہاں آدمیوں کی کمی نہ تھی۔ وہ یوں بھی میری کوٹھی میں عیش کر رہے تھے۔ انہیں ایسی نوکری کہیں اور نہیں مل سکتی تھی۔ کام برائے نام تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے مجھے جانے کیا سوجھی کہ میں ایک دم پلٹا۔ مجھے شاید ان کی غریبی پر ترس آ گیا تھا کہ وہ بے روزگار ہو جائیں گے۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ان کے قصور کو ہرگز معاف نہ کرتا۔

میں انہیں ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا اور کہا۔ "یہ تمہاری پہلی غلطی ہے اس لیے معاف کرتا ہوں۔ آئندہ تم سے کوئی غلطی سرزد ہوئی تو ہرگز معاف نہیں کروں گا۔"

ان کے بجھے ہوئے چہرے کھل اٹھے اور وہ مجھے دعائیں دینے لگے۔ اسی وقت ارشاد علی بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے بھی بتا دیا کہ انہیں معاف کر چکا ہوں۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا میں ان سب کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

میری کوٹھی سے تھانہ زیادہ دور نہیں تھا اس لیے میں پیدل وہاں تک پہنچ گیا۔ تھانیدار میرے انتظار ہی میں تھا۔ اس نے مجھے فوراً ہی اپنے کمرے میں بلایا وہ اکڑا ہوا اپنی کرسی پر یوں بیٹھا تھا کہ جیسے مجھے رعب میں لینا چاہتا ہو۔ اس نے مجھے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا اور بارعب آواز میں بولا "تم خود کیوں تھانے نہیں آئے جب کہ میں رات کو تمہارے ملازمین سے یہ کہہ کر آیا تھا اور خود تم نے بھی میرا حکم سن لیا ہوگا۔"

"میں سو رہا تھا۔" میں نے نرمی سے جواب دیا۔ "سو ہی رہا تھا کہ مجھے بیدار کر کے بتایا گیا....."

"سو رہا تھا!" منہ بگاڑ کر اس نے میری نقل اتاری، پھر سخت آواز میں کہنے لگا۔ "یہ تم اپنے گھر میں کیا چکر چلا رہے ہو؟"

"کیسا چکر؟"

"اب اتنے بھولے نہ بنو! صاف صاف بتاؤ کہ وہ لاش تم نے کہاں غائب کر دی؟"

"کون سی لاش؟ میں نے تو کوئی لاش نہیں دیکھی۔" میں نے بڑی صفائی سے جھوٹ

بولا۔

"تو کیا تم مجھے اندھا سمجھتے ہو! تم مجھے چکر نہیں دے سکتے۔ سمجھے! میرا نام ملک فیروز دین ہے اور میں اچھے اچھوں کے کس بل نکال دیتا ہوں۔" وہ اور اینٹھنے لگا۔

"اگر وہاں آپ نے کسی لاش کو دیکھا تو پھر وہ کہاں گئی! اور آپ نے اسے اپنے قبضے میں کیوں نہیں لیا؟"

"تم الٹا مجھے پڑھانے کی کوشش کر رہے ہو! ہیں!" اس نے آنکھیں نکالیں۔ "سب کچھ اگل دو ورنہ بہت بری طرح پیش آؤں گا ہیں!"

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس اکڑ فون کا مقصد کیا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ پولیس کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت بھی نہیں، مگر پولیس کی دوستی اچھی نہ دشمنی! میں نے ایک سو تیس سال کی عمر میں زندگی میں بڑے رنگ دیکھے تھے۔ جانے کتنی مرتبہ مجھے پولیس والوں سے سابقہ پڑا تھا۔ کسی شخص نے چکران کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں ہوتی کہ وہ اسے کسی بھی جھوٹے سچے مقدمے میں "لاد" دیں۔ تجربات کی دھوپ میں تپ کر مجھے یہ آگہی ہو چکی تھی کہ آدمی کو وقت دیکھ کر چلنا چاہیے۔ ورنہ زندگی اسے بہت رلاتی ہے۔ پُراسرار قوتوں کا مالک ہونے کے بعد ایسے مواقع میری زندگی میں کم ہی آئے تھے کہ میں نے مصالحت کی ہو، مگر اب صورت حال بدل چکی تھی۔ مجھے بہر حال چالیس دن کی مہلت درکار تھی۔ میں اس عرصے میں کسی بھی قسم کی غیر ذمے داری کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر تھانیدار مجھے کسی بھی چکر میں پھانس کر دو ایک دن کے لیے بھی حوالات میں بند کر دیتا تو میرے سارے خواب بکھر جاتے۔ میرے خیال میں اس کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں یہ ساری باتیں میں نے سوچ لیں اور مجھے اس پر جو غصہ آ رہا تھا، اسے دبا لیا۔ مجھے حالات سے بہر حال صلح کرنی تھی۔ وقت ٹل جانے کے بعد میں اس کے سارے کس بل نکال دیتا۔

"تم خاموش کیوں کھڑے ہو بولتے کیوں نہیں؟" تھانیدار کے لہجے میں اور سختی آ گئی۔

"کیا عرض کروں جناب!" میں بے حد نرمی سے بولا۔ "میری یہ مجال کہاں جو حضور سے بحث کر سکوں۔"

اس نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ میرا بدلا ہوا رویہ یقیناً اس کے لیے عجیب ہو گا۔ اس نے کہا۔ "ابھی تو تم بڑے پھنے خاں بن رہے تھے۔"

"میں تو خادم ہوں سرکار کا!" میں ایک سیڑھی اور نیچے اتر آیا۔

"خادم ہوں۔" وہ عجیب سے انداز میں ہنس پڑا۔ "بس زبانی دعوے کرتے ہیں سب! جب خدمت کا وقت آتا ہے تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ بیٹھو!" اس نے پہلی مرتبہ مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا' پھر بولا۔ "میں نے سنا ہے کہ تم کاروباری آدمی ہو۔ اور بڑا کاروبار ہے تمہارا؟"

"جی حضور! بڑا تو خیر نہیں' بس دال روٹی کا سہارا ہو جاتا ہے۔" میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "پھر بھی حضور کی خدمت تو کر ہی سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے!" اس نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی' پھر مطلب کی بات پر آگیا۔ "دراصل بات یہ ہے کہ چھوٹے اسٹاف کے منہ کو خون لگا ہوا ہے۔ میری تو خیر کوئی بات نہیں' اگر ان لوگوں کے علم میں کوئی بات آجائے تو بس پیچھے پڑ جاتے ہیں اس کے! پھر ان کا بھی کیا قصور' تنخواہیں کم ہیں' کریں تو کیا کریں!" بیوی بچوں کا پیٹ بھی تو ساتھ لگا ہوا ہے۔ میں بھی اسی وجہ سے کچھ زیادہ سختی نہیں کرتا ان پر! اب تمہارے ہی معاملے میں انہیں میں نے بہت سمجھایا خاک ڈالو' مگر میرے منہ پر تو کچھ نہیں بولے' پیچھے ٹر ٹر کرنے لگے۔ معاملہ بھی قتل کا تھا' کیا کہتا میں! بہر حال انہیں تو خوش کرنا ہی پڑے گا۔ سمجھ رہے ہو نا تم!"

"جی ہاں جناب' بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" میں نے فرماں برداری کا ثبوت دیا۔

پھر اس نے منہ پھاڑا کہ دس ہزار تو کم از کم دے ہی دوں' مگر بعد میں پانچ ہزار پر بھی راضی ہو گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ نچلے اسٹاف کو اس میں سے برائے نام ہی حصہ ملے گا اور ساری رقم وہی ہضم کر جائے گا' مگر اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے میرے ساتھ سادہ لباس والے ایک شخص کو بھیج دیا۔ میں اس شخص کو اپنے ہمراہ کوٹھی لے آیا اور پانچ ہزار روپے ایک تھیلے میں رکھ کر اس کے حوالے کر دیئے۔ اس کے بعد میں ناشتا کر کے فارغ ہوا تھا کہ میرے ملازم ارشاد علی نے کمرے میں آنے کی اجازت طلب کی۔

"آجاؤ!" میں نے کہا۔

"ڈاکٹر انور الحق صاحب نے کسی ڈاکٹر کو بھیجا ہے اور ان کے ساتھ دو نرسیں بھی ہیں۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے جناب!" ارشاد علی نے بتایا۔

"ٹھیک ہے' میں آتا ہوں۔" میں باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

ارشاد علی واپس چلا گیا۔ گردن کی تکلیف بہ دستور تھی۔ یہ میرا ہی حوصلہ تھا کہ میں اب تک اسے برداشت کر رہا تھا۔ اس تکلیف سے بچنے کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ

دواؤں کے ذریعے ہر وقت زخمی حصے کو سن رکھا جائے۔ میں نے اسی لیے ڈاکٹروں اور نرسوں کا بندوبست کیا تھا۔ تاکہ جس وقت بھی تکلیف بڑھے یا کوئی اور صورت حال درپیش ہو تو وہ اسے سنبھال سکیں۔

کچھ دیر بعد ہی میں اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر انور الحق نے شاید ان لوگوں کو بتا دیا تھا کہ میں سرمایہ دار آدمی ہوں اور غالباً میرے رکھ رکھاؤ سے انہوں نے خود بھی یہ اندازہ لگایا ہوگا۔ میں نے اندر قدم رکھا تو وہ لوگ شاید یہی سوچ کر احتراماً کھڑے ہو گئے۔ عام لوگوں کی نظر میں بڑائی کا پیمانہ دولت ہی ہوتی ہے۔ جس کے پاس جتنی زیادہ دولت ہے' وہ اتنا ہی بڑا آدمی ہے اور بڑے آدمی کا احترام سبھی کرتے ہیں۔

"تشریف رکھیے!" میں نے یہ کہتے ہوئے ان سب پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور ایک دم چونک اٹھا۔ میری نظریں ایک چہرے سے الجھ کر رہ گئی تھیں۔ یہ انہی دونوں نرسوں میں سے ایک نرس کا چہرہ تھا۔ اس قدر مشابہت! میں حیران رہ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مہ پارہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھی ہو۔

"جناب ڈاکٹر انور الحق نے یہ خط آپ کے لیے دیا ہے۔" ڈاکٹر نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کا ایک ہاتھ میری طرف بڑھا ہوا تھا جس میں لفافہ تھا۔

میں نے اس سے لفافہ لے لیا اور پھر ان لوگوں کے مقابل پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میری حالت اس وقت بڑی عجیب سی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟ ایسا تو صرف کہانیوں میں ہوتا ہے' حقیقی زندگی میں نہیں۔ میں لاکھ کوشش کر رہا تھا کہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کروں' مگر بار بار میری نگاہیں اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ یوں بھی کسی لڑکی یا عورت کو اس طرح براہ راست دیکھنا بے ادبی میں شمار ہوتا ہے' میں نے اس کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے ڈاکٹر انوار الحق کا لفافہ کھول لیا اور اس میں رکھے ہوئے پرچے کو نکال کر پڑھنے لگا۔ اس میں وہی لکھا تھا جو مجھے توقع تھی۔ اس نے اپنے خط میں نوجوان ڈاکٹر کا تعارف کرایا تھا جس کا نام امتیاز احمد تھا۔ حال ہی میں اس نوجوان نے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی تھی اور اب اپنا کوئی پرائیویٹ کلینک کھولنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر انوار الحق کے ایماء پر کچھ عرصے کے لیے میری ملازمت پر آمادہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر انوار الحق نے اسے میری کیس ہسٹری بھی فراہم کر دی تھی۔ نوجوان ڈاکٹر امتیاز کے لیے اس نے ایک مخصوص معاوضے کی بھی سفارش کی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے ماہانہ جو معاوضہ دینا تھا' وہ بھی لکھا تھا۔ ڈاکٹر اور نرسوں کا معاوضہ اس نے لکھا تھا وہ مجھ ایسے آدمیوں کے لیے ادا کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ میں نے

خط پڑھ کر قریبی تپائی پر رکھ دیا اور دانستہ اس نرس سے نظریں بچاتے ہوئے ڈاکٹر کو مخاطب کیا جو مہ پارہ کی ہم شکل تھی۔ میں نے کہا۔ "آپ لوگ اپنا سامان لے کر نہیں آئے؟"

"ہم نے سوچا کہ پہلے آپ سے ملاقات کرلیں' اس کے بعد......" نوجوان ڈاکٹر نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں سمجھ گیا اس ادھورے جملے کا مقصد کیا ہے! سیدھی سی بات تھی کہ اگر مجھے معاوضہ منظور ہو تو وہ میری کوٹھی میں منتقل ہو جائیں۔ میں نے مسکرا کر نوجوان ڈاکٹر کی طرف دیکھا' پھر بولا۔ "اب تو ملاقات ہو گئی نا؟"

"جی...... جی ہاں۔" وہ بھی مسکرا دیا۔

"تو پھر جتنی جلد ہی ممکن ہو آپ لوگ یہاں سامان لے کر آجائیں۔" یہ کہتے ہوئے میری نگاہ ایک بار پھر اس حسین چہرے سے الجھ گئی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ بھی مجھے دلچسپ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ شاید نوجوان ڈاکٹر نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا۔

"میں نے آپ سے ان دونوں کا تعارف تو کرایا ہی نہیں!" ڈاکٹر نے کہا۔ ان کا نام بیلا ہے اور یہ......"

چنبیلی ہیں۔" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"جی نہیں۔" وہ خود ہی بول اٹھی۔ "میرا نام مہ پارہ ہے۔"

میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ اس کی آواز بھی سو فیصد مہ پارہ سے ملتی جلتی تھی اور نام بھی وہی تھا۔ "مہ پارہ!" میں نے زیر لب کہا۔

"یہ دونوں ہی تربیت یافتہ ہیں۔" مجھے ڈاکٹر امتیاز کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ "اچھا اب ہمیں اجازت دیں۔ ہم جلد ہی لوٹ آئیں گے۔"

پھر وہ لوگ چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں آکر بستر پر دراز ہو گیا۔ میرا ذہن اس وقت بہت الجھا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ مہ پارہ کا دوسرا حربہ تو نہیں؟ کہیں اس نے مجھے شکست دینے کے لیے نرس کا روپ تو اختیار نہیں کر لیا؟ مگر یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ کیا روح کوئی مادی جسم اپنا سکتی ہے؟

عمل کے دوران میں مجھے پوری طرح چاق و چوبند رہنا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ میں دن کے وقت اپنی نیند پوری کر لوں۔ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد مجھے زیادہ دیر سونے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اس لیے میری آنکھوں میں نیند کروٹیں لے رہی تھیں۔ اس کے باوجود میری آنکھ نہ لگ سکی۔ میں سوالوں کے گرداب میں ڈوبتا ابھرتا رہا۔

دوپہر کے وقت میں خود بیدار ہوا۔ ابھی ظہر کا وقت نہیں نکلا تھا۔ اس لیے میں نے وضو کر کے پہلے ظہر کی نماز پڑھی' پھر ارشاد علی کو بلایا۔

"وہ لوگ آگئے؟" میں نے ارشاد علی سے دریافت کیا۔

"جی ہاں جناب!" اس نے جواب دیا۔ "میں نے انہیں ان کے کمروں میں ٹھہرا دیا ہے۔ دوپہر کا کھانا بھی وہ کھا چکے ہیں۔ آپ کے لیے کھانا لاؤں؟"

"ہاں لے آؤ۔"

"ڈاکٹر صاحب کئی دفعہ پوچھ چکے ہیں کہ آپ جاگے یا نہیں۔" اس نے جاتے جاتے بتا دیا۔

"ٹھیک ہے کھانا کھا کر میں انہیں خود یہاں بلوالوں گا۔"

ارشاد علی چلا گیا۔ میرا ذہن ایک بار پھر انہی سوالوں میں الجھنے لگا جو سونے سے قبل مجھے پریشان کئے ہوئے تھے۔ عمل کی ایک کڑی شرط یہ بھی تھی کہ میں لڑکیوں سے دور رہوں۔ عمل کے دوران میں مجھے اپنا زیادہ تر وقت عبادت اور مطالعے میں گزارنا تھا' مگر وہ لڑکی میرے لیے خواہ مخواہ ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ اگر یہ کوئی فریب بھی نہیں تھا تو پھر بھی میرے لیے سخت آزمائش تھی۔ وہ لڑکی ایک ایسی ہستی کی ہم شکل تھی جسے میں حاصل نہیں کر سکا تھا۔ اپنی تمام تر پُراسرار قوتوں کے باوجود میں اسے جھکنے پر مجبور نہیں کر سکا تھا۔ اس نے اپنی آنا کی خاطر موت کو گلے لگا لیا تھا اور میں ہاتھ ملتا رہ گیا تھا۔ اس سخت آزمائش سے بچنے کی ایک اور صورت بھی تو ہے۔ معاً" میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ کیوں نہ میں اسے اپنی ملازمت سے الگ کر دوں۔ اس کی جگہ دوسری نرس کا بندوبست بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں اس سلسلے میں ڈاکٹر امتیاز سے بات کر سکتا ہوں۔ مگر میں' ڈاکٹر کو اس کی وجہ کیا بتاؤں گا؟

ابھی میرے ذہن میں یہی سوال گردش کر رہا تھا کہ ارشاد علی کھانا لے کر آگیا۔ کھانے سے پہلے میں نے کئی طرح کی گولیاں زہر مار کیں اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی میں سوچتا رہا۔ رات کا بڑا حصّہ کیوں کہ عمل کے لیے مخصوص ہے اس لیے ایک نرس سے بھی تو کام چل سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ بس یہ ٹھیک ہے میں ڈاکٹر امتیاز سے کہہ دوں گا کہ دو نرسوں کی ضرورت نہیں اس لیے وہ اپنے طور پر مہ پارہ کو جواب دے دے۔ یہ سوچ کر میرے ذہن کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔

کھانے سے فراغت پاتے ہی میں نے فوراً ڈاکٹر امتیاز کو بلوایا تاکہ اس سے مہ پارہ کے سلسلے میں بات کر لوں۔

پھر جب کچھ دیر بعد ڈاکٹر امتیاز میرے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ وہ لڑکی بھی تھی جو کچھ سامان اٹھائے ہوئے تھی۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں بھی بیگ تھا۔

"ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کی گردن کے زخم کی ڈریسنگ صبح شام ہونی چاہیے۔" ڈاکٹر امتیاز نے آتے ہی کہا۔ "میں اس لیے کئی بار آپ کے ملازم سے پوچھ چکا تھا کہ آپ جاگے ہیں یا نہیں! اب کیا حال ہے؟"

اس کے سوال پر میں چونک اٹھا کیوں کہ میری نظریں تو اس غارت گر ہوش کی نظروں سے الجھی ہوئی تھیں۔ میں نے چونک کر کہا۔ "ٹھیک نہیں خاصی تکلیف ہے۔"

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ڈاکٹر امتیاز میری گردن کے گرد لپٹی ہوئی پٹیاں کھولنے لگا۔ نرس مہ پارہ اس کے قریب ہی کھڑی تھی میں سوچ رہا تھا کہ اس کی موجودگی میں کس طرح بات ہو سکتی ہے! مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ ڈاکٹر اپنے ساتھ اسے بھی لے آئے گا۔

پٹیاں کھلتے ہی تکلیف اتنی بڑھ گئی کہ میں کوشش کے باوجود میں اپنی کراہیں نہ روک سکا۔

زخم کھلا تو ڈاکٹر امتیاز کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلی۔ میں نے اپنی گردن پر چپچپاہٹ سی محسوس کی جو یقیناً خون رسنے کے سبب تھی۔ ڈاکٹر امتیاز کو شاید یہ توقع نہ ہوگی کہ وہ زخم اس نوعیت کا اور خطرناک ہوگا۔

"آپ واقعی بہت قوت ارادی کے مالک ہیں۔ شیخ صاحب!" اس نے کہا۔ "اگر آپ کی جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اس وقت اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی ہوتیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ معمولی زخم ہوگا۔ دوا کا اثر بھی تقریباً ختم ہو چکا تھا' اس کے باوجود آپ...... حیرت ہے!"

یہ کہتے ہوئے وہ جھکا اور اپنے بیگ سے ایک بوتل نکالی جس کے منہ پر اسپرے لگا ہوا تھا۔ اس نے میری گردن کی چاروں طرف اس دوا کا اسپرے کیا۔

دوا کی پہلی پھوار پڑتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میرے زخم میں ٹھنڈک اترنے لگی ہے۔

"یہ بہت موثر دوا ہے اور بہتے ہوئے خون کو فوراً بند کر دیتی ہے۔" وہ بولا اور مہ پارہ کو مخاطب کر کے بیگ سے دوسری دواؤں کو نکالنے کے لیے کہنے لگا۔

پھر کچھ ہی دیر میں اس نے میرے زخم کی ڈریسنگ کر دی۔ مہ پارہ اس کی مدد کر رہی تھی۔

ڈریسنگ ہوتے ہوتے میری تکلیف جیسے ختم ہو گئی۔

"اب رات آٹھ بجے تک کے لیے دوبارہ ڈریسنگ کی ضرورت پیش نہیں آئے

گی۔" ڈاکٹر امتیاز نے طویل سانس لیتے ہوئے بتایا' پھر بولا۔ "اب کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟"

"بالکل ٹھیک۔" میں نے جواب دیا۔ "اب ذرا بھی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی۔"

اس کے بعد ڈاکٹر نے جانے کی اجازت چاہی۔

"آپ سے کچھ بات کرنا ہے۔" میں نے بالآخر کہہ ہی دیا۔

"فرمایئے!" وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

مہ پارہ اس وقت دوائیں اور ڈریسنگ کا دوسرا سامان ڈاکٹر کے بیگ میں رکھ رہی تھی۔

"ابھی عرض کردوں گا' پہلے....." میں نے مہ پارہ کی طرف دیکھتے ہوئے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اچھا۔" اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔"

اسی وقت مہ پارہ نے مجھے نظر اٹھا کر دیکھا اور میں خود کو چور سا محسوس کرنے لگا۔ مہ پارہ کی اس ایک نظر میں جانے کیا تھا کہ میرا ارادہ متزلزل ہونے لگا۔ میں نے اس کی طرف سے نگاہ پھیر لی۔

"مہ پارہ! آپ چلیں' میں شیخ صاحب سے بات کر کے ابھی آتا ہوں۔" ڈاکٹر امتیاز نے اس فتنے کو مخاطب کیا۔ "میرا بیگ اور دوسرا سامان..... یا بیگ رہنے دیں' میں خود لے آؤں گا' بس ڈریسنگ کا سامان لے جائیں۔"

جواب میں مہ پارہ نے صرف گردن ہلانے پر اکتفاء کیا اور کمرے سے نکل گئی۔

"جی اب فرمایئے' کیا بات ہے؟" مہ پارہ کے جاتے ہی ڈاکٹر امتیاز میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"دراصل بات یہ ہے ڈاکٹر کہ....." میں بات کرتے ہوئے کچھ جھجک سی محسوس کر رہا تھا۔

"جی جی فرمائیں۔" اس نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

"پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ..... کہ ایک نرس سے بھی کام چل سکتا ہے۔ میں نے اسی غلط فہمی میں ڈاکٹر انوار الحق سے دو نرسوں کے لیے کہہ دیا تھا جب کہ ایک نرس سے بھی کام چل سکتا ہے۔" میں رک رک کر کہنے لگا۔ "آپ سمجھ رہے ہیں نا! یوں بھی رات کا بڑا حصہ میں مختلف عبادات میں گزارتا ہوں اور..... اور اس وقت مجھے کچھ ہوش نہیں ہوتا' میرا

مطلب یہ کہ یادالٰہی میں اتنا غرق ہوتا ہوں کہ تکلیف اگر ہو بھی تو مجھے اس کا زیادہ احساس نہیں ہوتا۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" ڈاکٹر امتیاز بولا۔ "میں بیلا کو جواب دے دوں گا۔ یوں بھی اسے ایک جاب ملنے والا تھا اور وہ صرف میرے کہنے پر یہاں آنے کو تیار ہو گئی تھی۔"

"بیلا کو جواب دے دیں گے۔" یہ کہتے ہوئے میں چکرا کر رہ گیا۔

"جی ہاں۔ کیوں؟ کیا آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟"

"نہیں' اعتراض تو کوئی نہیں' لیکن....." میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کہوں تو کیا کہوں؟ "میں نے جو عذر ظاہر کیا تھا' وہ اس نے بلا چوں وچرا تسلیم کر لیا تھا۔ اب میں اس سے یہ کس طرح کہتا کہ وہ بیلا کو نہیں' مہ پارہ کو جواب دے دے۔

"آپ مجھے کسی الجھن کا شکار معلوم ہو رہے ہیں جناب۔" اس نے کہا۔ "شاید آپ جو کہنا چاہتے ہیں وہ کہہ نہیں پارہے۔"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ڈاکٹر!" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے مسکرا کر کہا اور پھر موقع کی مناسبت سے بات کا رخ بدل دیا کیونکہ کہ جو اصل مقصد تھا' مفقود ہو گیا تھا۔ میں بولا۔ "دراصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کچھ غیر اخلاقی سی بات ہے۔"

"کیا؟"

"یہی کہ بیلا کو اس طرح جواب دے دیا جائے۔" میں بولا۔

"نہیں' وہ بالکل خیال نہیں کرے گی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اگر آپ کو دو نرسوں کی ضرورت نہیں تو ظاہر ہے فضول خرچی کی کیا ضرورت ہے۔"

ڈاکٹر امتیاز کی بات سن کر میں کچھ اور شرمندہ ہو گیا۔ یقیناً وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس طرح ایک نرس کی تنخواہ بچانا چاہتا ہوں۔ اپنی خجالت دور کرنے کی غرض سے میں نے کہا۔ "میرے ذہن میں پیسوں کا خیال نہیں تھا۔ ڈاکٹر میں نے تو حقیقت حال کا اظہار کیا تھا۔ بہرحال اب میں آپ سے یہی درخواست کروں گا کہ اسے جواب نہ دیجئے۔"

"جو حکم آپ کا جناب!" وہ بولا

"ہاں یہ بتایئے کہ آپ کے ذہن میں بیلا ہی کیوں آئی؟ آپ نے مہ پارہ کو جواب دینے کے بارے میں کیوں نہیں سوچا؟" میں نے موقع دیکھ کر پوچھ لیا۔

"دراصل مہ پارہ ایک جگہ جاب کر رہی تھی۔ ڈاکٹر انوار الحق صاحب کے کہنے پر وہ جاب چھوڑ کر یہاں آئی۔ ایسی صورت میں اسے جواب دینا کسی طرح مناسب نہ ہوتا۔" ڈاکٹر

امتیاز نے جواب دیا۔

میں نے کچھ سوچ کر اس سے ایک اور سوال کیا۔ "ویسے ان باتوں سے قطع نظر دونوں میں سے بہتر کون ہے؟ آپ تو دونوں ہی کو اچھی طرح جانتے ہوں گے۔"

"بیلا کو تو بہت دن سے جانتا ہوں۔ وہ یقیناً ایک اچھی تربیت یافتہ نرس ہے' لیکن مہ پارہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس سے میری ملاقات آج ہی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اس کا پتا دیا تھا اور اس کے بارے میں بتایا تھا۔ میں اس پتے پر پہنچا تو وقت مقررہ پر وہ مجھے اپنے گھر کے دروازے پر بالکل تیار ملی۔ ہاں میں نے اس کی اسناد وغیرہ ضرور دیکھی تھیں جن سے معلوم ہوا کہ وہ بھی تجربہ کار اور تربیت یافتہ ہے۔" ڈاکٹر امتیاز نے تفصیل کے ساتھ مہ پارہ کے متعلق بتایا۔

یہ باتیں معلوم ہونے کے بعد میرا ذہن کچھ اور الجھ گیا۔ میری پوچھ گچھ کا اصل مقصد یہ تھا کہ اگر اس نرس کی مہ پارہ سے مشابہت اتفاقی ہو گی تو ڈاکٹر امتیاز یقیناً اسے پہلے سے جانتا ہو گا۔ جن حالات میں ڈاکٹر امتیاز سے اس کی ملاقات ہوئی تھی وہ میرے دل میں شک پیدا کر رہے ہیں کہ ممکن ہے اس نے اصل نرس کی جگہ لے لی ہو۔ اسے ملازمت سے الگ کرنے کا ایک بہانا رائیگاں چلا گیا تھا اور اب مزید کوئی نیا بہانہ تلاش کرنے کے لیے سوچنے کی ضرورت تھی۔ میں نے اسی لیے اس وقت ڈاکٹر امتیاز سے مزید کوئی بات نہیں کی اور اسے رخصت کر دیا۔

وقت گزاری کے لیے میں نے الماری سے ایک کتاب مطالعے کے لیے نکال لی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اب میں اپنے بستر پر آکر نیم دراز ہو گیا تھا۔ مختلف زبانوں میں مختلف مضامین پر میرے پاس خاصی کتابیں تھیں۔ لیکن صرف انہی زبانوں میں جو میں جانتا تھا۔ اس وقت میرے ہاتھ میں نفسیات کے مضمون پر لکھی ہوئی ایک امریکی مصنف کی کتاب تھی۔ کتاب میں انسانی رشتوں پر بحث کی گئی تھی۔ مصنف نے لکھا تھا کہ ایک مکمل انسان وہ ہے جو رشتوں پر یقین رکھتا ہو' رشتے ہی زندگی سے اس کی گہری وابستگی کا ثبوت ہوتے ہیں۔ ان رشتوں کے بغیر انسان ادھورا رہتا ہے۔ میں مصنف کے استدلال کی روشنی میں اپنا جائزہ لینے لگا اور کتاب بند کر کے سرہانے رکھ دی۔

کیا میں ادھورا ہوں؟ میرے تو تمام رشتے مر چکے ہیں۔ تو کیا میں یونہی رائیگاں جاؤں گا؟ کیا کوئی ہے جسے میں اپنا کہہ سکوں؟ میں نے زندگی میں کیا کمایا؟ میں سوچتا رہا اور مجھ پر کھلا

کہ زندگی میں میری جڑیں گہری پیوست نہیں ہیں۔ میں ایک ایسے درخت کے مانند ہوں جس کی جڑیں نہیں۔ تند و تیز ہوا کا ایک جھونکا بھی مجھے اپنے ساتھ بہا کر کہیں سے کہیں لے جاسکتا ہے۔ زندگی میں کچھ لمحے ایسے بھی ہوتے ہیں جب کوئی معمولی سی بات دل پر اثر کر جاتی ہے۔ شاید یہ ایسے ہی لمحات تھے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے ایک گھر کی خواہش ہوئی' ایسا گھر جسے واقعی ایک گھر کہا جاسکے۔ جہاں میرے لیے کوئی چشم انتظار وا ہو' کوئی دیر سے گھر لوٹنے پر پوچھ گچھ کرتا ہو کہ کہاں تھے؟ آنگن میں معصوم بچوں کی قلقاریاں گونجتی ہوں۔ کیا یہ سکھ مجھے مل سکتا ہے؟ میرا ماضی اتنا تیز رفتار گزرا تھا کہ کبھی میں نے رک کر ان سوالوں پر غور نہیں کیا تھا۔ ایک ترنگ تھی جس میں میں بہا چلا جارہا تھا۔ فرد حساب ماہ و سال میرے سامنے تھی اور جو کچھ گزر چکا تھا ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ میری سرخوشی کے دن جانے کہاں گزر گئے تھے۔ میں کہ شاد کام بھی تھا اور ناکام بھی۔ میں نے سکھ بھی پائے تھے اور دکھ بھی' مگر نہ سکھوں کی عمر طویل تھی نہ دکھوں کی۔ اک عمر کا حاصل تنہائی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں نے رشتوں کو انسانی رشتوں کو' کبھی بھی اہمیت نہیں دی تھی۔ اگر میں آج مر بھی جاتا تو کوئی مجھے رونے والا نہیں تھا کیوں کہ میں نے خود کو آنے والی نسلوں میں محفوظ نہیں کیا تھا۔ مجھ سے شاید بھول ہو گئی تھی میں نے شاید اپنی زندگی کو سمجھا نہیں تھا۔ زندگی سے لذت کشید کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے یہ خیال رکھنا چاہیے تھا کہ کہیں میں دنیا کی بھیڑ میں بالکل اکیلا نہ رہ جاؤں۔ آدمی ساری دنیا سے جھوٹ بول سکتا ہے مگر اپنے آپ سے نہیں۔ یہ سچ تھا کہ نہ میرا کوئی دوست تھا' نہ ساتھی نہ کوئی غمگسار تھا نہ محرم راز۔ میں ایک محروم شخص تھا۔

انہی خیالوں میں عصر کا وقت ہو گیا۔ میں نے وضو کر کے نماز پڑھی اور پھر دست دعا بلند کیے۔ وہ جو دلوں کا حال جاننے والا ہے' میں نے اس سے کچھ نہ کہا' کچھ نہ مانگا کہ اسے سب خبر تھی۔ سب کچھ معلوم تھا۔ اس وقت جانے کیوں مجھ پر رقت سی طاری ہو گئی۔ پھر جانے کب تک میرے ہاتھ اٹھے رہے اور میرے رخساروں پر آنسو بہتے رہے۔ میں چونکا اس وقت جب دروازہ آہستہ سے کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنی میں نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لیے کمرے میں داخل ہونے والا میرا ملازم ارشاد علی تھا۔ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ڈاکٹر صاحب نے ایک نرس کو بھیجا ہے اور وہ آپ کے کمرے میں آنا چاہتی ہے۔ میں نے آپ سے اجازت لینا ضروری سمجھا۔ کہیں تو اسے اندر بھیج دوں۔" ارشاد علی نے بتایا۔

"کس لیے آئی ہے وہ؟" میرا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"معلوم نہیں جناب۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے' اسے آنے دو۔" یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا اور پھر مصلیٰ لپیٹ کر اس کی جگہ رکھ دیا۔

چند ہی لمحے بعد نرس مہ پارہ کمرے میں داخل ہوئی اور میں اسے دیکھ کر چونک اٹھا۔ میں یہ سوچنے میں حق بہ جانب تھا کہ بار بار وہی میرے سامنے کیو آجاتی ہے؟

"چارٹ کے مطابق اس وقت آپ کو یہ دو ٹیبلیٹس کھانا ہیں جناب۔"

وہ یہ کہتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ "ڈاکٹر صاحب نے آپ کا چارٹ میرے حوالے کر دیا ہے جناب کہ وقت پر آپ کو دوائیں استعمال کراتی رہوں۔ یہاں پانی ہو گا؟"

"جی ہاں۔ وہ ادھر میز پر جگ اور گلاس رکھا ہے۔" میں نے میز کی طرف اشارہ کیا' پھر بولا۔ "ویسے آپ نے ناحق زحمت کی' میں خود وقت پر دوا کھا لیتا ہوں۔"

وہ میز کی طرف بڑھ گئی اور گلاس میں پانی بھر کے پھر میرے پاس آگئی۔ "لیجیے۔" اس نے گولیاں مجھے دیں' پھر پانی کا گلاس میری طرف بڑھایا۔

میں جب پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے لے رہا تھا تو اس کی انگلیاں میری انگلیوں سے مس ہو گئیں اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سارے جسم میں ایک برقی رو سی دوڑ گئی ہو۔

"آپ کے پاس جو دوائیں ہیں' مجھے دے دیں۔" اس نے کہا۔ "میں وقت پر......"

"میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں۔" میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ میں نے دونوں گولیاں کھا لیں تھیں اور اس نے خالی گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا تھا۔

"آپ کو زیادہ سے زیادہ آرام اور نگہداشت کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ آپ نے اسی لیے ہمیں ملازم رکھا ہے۔"

میں نے اس سے بحث کرنے کی بجائے ساری دوائیں اس کے حوالے کر دیں۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے شاداب چہرے سے لمحہ بھر کو بھی میری نظر نہیں ہٹی تھی۔

معاف کیجیے گا یہ کچھ ذاتی سا سوال ہے' لیکن...... چھوڑیں۔" وہ جانے کے لیے پلٹی۔

"ٹھہر جائیں۔" میں نے اسے روک لیا۔ "جو بات زبان پر آجائے اسے کہہ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

"دراصل میں یہ سوچ رہی تھی کہ کہیں آپ خیال نہ کریں اس لیے......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں تنگ نظر نہیں ہوں' آپ جو سوال کرنا چاہتی تھیں بلا جھجک کریں۔"

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں کوٹھی میں جتنے بھی مرد اور عورتیں ہیں' وہ سبھی آپ کے ملازم ہیں۔"

"تو پھر؟"

"پھر یہ..... یہ کہ کیا آپ نے شادی نہیں کی"؟ کیا آپ کے بیوی بچے نہیں ہیں؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

"آپ کھڑی کیوں ہیں۔ بیٹھیں نا۔" میں نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "اور ہاں آپ نے شام کی چائے پی لی؟"

"جی ابھی نہیں۔" یہ کہہ کر وہ کچھ جھجکتی ہوئی میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے ارشاد علی کو آواز دی اور جب وہ آگیا تو چائے لانے کو کہا۔ ارشاد علی چائے لانے چلا گیا تو وہ پھر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

مجھے اس وقت جانے کیسے ولا یاد آگئی۔ میری زندگی میں ایک وہی ایسی لڑکی آئی تھی جس نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا۔ میں نے ذہنی طور پر اسے قبول کرلیا تھا۔ میری خاطر اس نے اپنے مذہب کو بھی چھوڑ دیا تھا اور مسلمان ہوگئی تھی۔ وہی ایک ایسی تھی میں نے جس سے نکاح کیا تھا۔ اس وقت بھی میں نے گھر کے خواب دیکھے تھے' مگر وہ سارے خواب فوراً ہی بکھر گئے تھے۔ وہ بے وفا ثابت ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے یہ سارا ڈھونگ رچایا تھا۔ اس نے موقع پاتے ہی مجھ پر خطرناک قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اگر ہمزاد چوکنا نہ ہوتا تو شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی۔ اس دن کے بعد سے عورت پر میں نے اعتماد کرنا چھوڑ دیا تھا' لیکن اب میرے انداز فکر میں تبدیلی آرہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ ہر عورت ولا نہیں ہوتی۔

"آپ کیا سوچنے لگے جناب؟" مہ پارہ مجھے خیالوں میں کھویا ہوا دیکھ کر بول اٹھی۔ "کیا کوئی یاد آگیا؟"

میں چونک اٹھا۔ مہ پارہ نے لاعلمی میں بالکل صحیح بات کی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لیا' پھر بولا۔ "ہاں ایک بے وفا کی یاد آگئی تھی۔"

"کون تھی وہ؟" اس نے پوچھا۔

"تھی کوئی۔" میں نے اس ذکر کو ٹالنا چاہا اور بات کا رخ بدلنے کے لیے کہا۔ "آپ

نے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ کچھ اداس سی نظر آنے لگی تھی۔ پھر اس نے بھاری آواز میں بتایا۔ "اس بھری پری دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ میں نے بھی آپ کی طرح کسی کو چاہا تھا' مگر..... مگر اس نے بھی میرے ساتھ بے وفائی کی۔ اگر میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید حقیقت حال جاننے کے بعد کبھی اپنی محبت پر قائم نہ رہ سکتی۔"

نہ جانے اس کے لہجے اور آواز میں کیا سحر تھا کہ اس وقت میرے ذہن سے تمام تاثرات حرف غلط کی طرح مٹ گئے میں ہمہ تن گوش ہوگیا' مگر اب وہ خاموش تھی اور میری طرف دیکھنے کی بجائے بس ایک ٹک خلا کو گھورے جارہی تھی۔ پھر اسی عالم میں اس کی حسین پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور اس نے جلدی سے اپنا چہرہ دوسری جانب کرلیا۔ میں نے اس کے باوجود اس کے رخساروں پر موتیوں کی لڑیاں دیکھ لی تھیں۔ جنہیں اس نے بڑی تیزی سے اپنے آنچل میں چھپالیا تھا۔ پھر وہ اس طرح میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ اس کے بعد وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب مجھے اجازت دیجئے۔" اس نے کہا۔

"مگر آپ نے اپنے بارے میں ابھی تو کچھ بتایا بھی نہیں۔" میں بولا۔

"آپ نے بھی تو کچھ نہیں بتایا۔" وہ مسکرائی۔

"بس میری تو اتنی سی کہانی ہے کہ کسی نے زندگی بھر کے لیے ساتھ نہیں نبھایا اور کسی نے یہ وعدہ کیا بھی تو وفا نہیں کی۔ میں بھی آپ ہی کی طرح اکیلا ہوں۔"

"گویا ہم دونوں کا دکھ ایک ہے۔"

"ہاں۔" میری آواز جذبات سے بوجھل ہوگئی۔ "آپ اٹھ کیوں گئیں' بیٹھیں نا۔"

"پھر آؤں گی۔" وہ بولی۔

"کب؟"

"آج رات۔" اس نے جواب دیا۔

"مگر رات کو میں عبادت میں مصروف ہوتا ہوں۔"

"میں نصف شب سے پہلے آجاؤں گی۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

میں ایک بار پھر چونک اٹھا۔ "آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں نصف شب کے بعد عبادت میں مصروف ہوتا ہوں؟"

"اگر آنکھیں اور کان کھلے رکھے جائیں تو بہت سی باتیں خود معلوم ہو جاتی ہیں۔"

بہر حال میرا قیام بھی آپ کی کوٹھی ہی میں ہے۔ آپ کا ملازم خاص مجھے تاکید کر چکا ہے کہ نصف شب کے بعد کسی بھی صورت کوٹھی کے اس حصّے کا رخ نہ کروں۔ میں نے اسی سے یہ اندازہ لگایا کہ یہ وقت آپ کی عبادت کا ہوگا۔"

اس کا جواب سن کر میرا شک دور ہو گیا۔ ارشاد علی نے ان لوگوں کو یہ تاکید کر کے یقیناً عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ پھر وہ جانے لگی تو اسی وقت ارشاد علی چائے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ اسے بھی یاد نہیں رہا تھا اور میں بھی بھول گیا تھا کہ چائے آ رہی ہے۔ میرے اصرار پر اس نے چائے پی لی، مگر اس دوران میں زیادہ بات نہیں کی۔ وہ مجھے کچھ کھوئی کھوئی سی لگ رہی تھی۔ شاید اس وقت کی گفتگو سے اس کے زخم ہرے ہو گئے تھے۔ چائے پیتے ہی وہ چلی گئی۔

میں کمرے میں تو تنہا رہ گیا تو سوچنے لگا کہ اس کی طرف سے میرے ذہن میں جو خدشات ہیں۔ وہ درست نہیں۔ وہ میری دشمن جاں کی ہم شکل ضرور ہے، مگر حقیقتاً ایسا نہیں جیسا میں نے سوچا ہے نام اور آواز کی مماثلت بھی اتفاقی ہو سکتی ہے۔ اگر مہ پارہ مجھ سے اس طرح انتقام لینا چاہتی تو کبھی اپنے اصل روپ میں سامنے نہ آتی۔ یہ کوئی اور ہی لڑکی ہے۔

ڈاکٹر امتیاز نے مجھ سے رات کو آٹھ بجے میرے کمرے میں آنے کے لیے کہا تھا تاکہ میری گردن کے زخم کی ڈریسنگ دوبارہ کر دے۔ اس وقت تک مجھے اپنی گردن میں کوئی تکلیف محسوس نہ ہوئی تھی۔ اسی لیے جب وہ آیا تو میں نے کہا۔ "ابھی تک تو دوا کا اثر برقرار ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ صبح....."

"میں نے احتیاطاً" آٹھ بجے کا وقت رکھا تھا۔" وہ میری بات کاٹ کر مسکرایا۔ "دوا کا اثر تو رات بارہ بجے تک رہے گا مگر اس وقت تک آپ عبادت میں مصروف ہو جائیں گے۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔"

میرا جملہ ختم ہوا ہی تھا کہ معاً" کمرے کا دروازہ کھلا اور دوسری نرس بیلا اندر آ گئی۔ وہ ڈریسنگ کے لیے ضروری سامان لے کر آئی تھی۔ میں نے دانستہ مہ پارہ کے بارے میں کچھ نہ پوچھا تاکہ ڈاکٹر امتیاز کو یہ شک نہ ہو کہ میں 'مہ پارہ میں دلچسپی لے رہا ہوں۔

دن کے وقت ڈریسنگ ہوئی تھی تو مجھے سخت اذیت سے گزرنا پڑا تھا، مگر اب ایسا نہ ہوا۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ دوا کا اثر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ڈریسنگ کے بعد ڈاکٹر اور نرس دونوں چلے گئے۔ ارشاد علی نے کھانے کے لیے آکر پوچھا تو مجھے ان دواؤں کا خیال آیا جو کھانے سے پہلے استعمال کرتا تھا ساری دوائیں مہ پارہ میرے کمرے سے لے جا چکی تھی۔

"کچھ دیر ٹھہر جاؤ، میں خود تمہیں بلا کر کھانے کے لیے کہہ دوں گا۔" میں نے اس سے کہا اور وہ چلا گیا۔

ذرا دیر ہوئی تھی کہ ارشاد علی نے مہ پارہ کے آنے کی اطلاع دی۔

"دیکھو دن کے وقت..... بلکہ اس وقت تک کم از کم ڈاکٹر اور نرسوں کو میرے کمرے میں آنے سے نہ روکا کرو جب تک میری عبادت کا وقت نہ ہو جائے۔ سمجھ گئے نا۔"

"بہتر ہے جناب۔ آئندہ ایسا ہی ہوگا۔" وہ ادب سے سر جھکا کر بولا۔

"ڈاکٹر اور نرسوں کو کھانا دے دیا گیا؟" میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"ابھی نہیں جناب!" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر ایسا کرو کہ اس نرس کا کھانا بھی یہیں لے آؤ اور اسے اندر بھیج دو۔" میں بولا۔ "اور ہاں سنو! جب تک وہ میرے کمرے میں رہے کسی کو اندر نہ آنے دینا۔"

ارشاد علی کو میری ملازمت میں خاصے دن ہو گئے تھے۔ وہ میرے مزاج اور طبیعت کی رنگینی سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کے باوجود میں نے لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر حیرت سی دیکھی۔ شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ میں نے اپنی حسین و خوب رو ملازماؤں پر اپنے کمرے میں آنے پر پابندی لگا دی تھی۔ مگر مہ پارہ کے معاملے میں اسے اس طرح کا معنی خیز حکم دے رہا تھا بہر حال وہ اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے نکل گیا۔

ارشاد علی کے جاتے ہی مہ پارہ اندر آ گئی اور آتے ہی بولی۔ "معاف کیجئے گا کہ میں آپ کے ملازم سے یہ پوچھنا بھول گئی تھی کہ آپ رات کو کس وقت کھانا کھاتے ہیں کیوں کہ کھانے سے پہلے دوائیں ضروری ہیں آپ بتا دیں کس وقت....."

"آپ ٹھیک وقت پر آئی ہیں۔ میں اسی وقت کھانا کھاتا ہوں۔ ملازم کھانے کے لیے ہی پوچھنے آیا تھا اور اب لا ہی رہا ہوگا، بیٹھیں۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس وقت وہ مجھے کچھ زیادہ ہی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ ہلکے سے میک اپ نے اس کے حسن کو کچھ اور نکھار دیا تھا۔

"آپ بھی ساتھ ہی کھانا کھا لیجئے گا۔" میں نے اس کے حسین چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو اپنا پرہیزی کھانا نہیں کھلاؤں گا، گھبرائیں نہیں۔" میرے لہجے میں شوخی آ گئی۔

"نہیں یہ بات نہیں تھی۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"پھر کیا بات ہے؟"

"لوگ جانے کیا سوچیں۔"

"کون لوگ؟"

"آپ کے ملازمین اور...... اور ڈاکٹر امتیاز ' بیلا......"

"کسی کے ساتھ کھانا کھا لینا کوئی قابل اعتراض بات تو نہیں۔" میں نے کہا۔ "پھر یہ کہ آپ کسی کو جواب دہ ہیں نہ میں! ہم دونوں ہی شاید بالغ اور خود مختار ہیں۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرا لہجہ پھر شوخ ہو گیا۔ میں نے مزید کہا۔ "آپ بالغ ہو چکی ہیں نا۔"

میرے جملے کی معنویت کے سبب شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور یوں وہ مزید حسین نظر آنے لگی۔ وہ خاص مشرقی لڑکیوں کی طرح اپنے دوپٹے کا آنچل ' انگلی پر لپیٹنے اور کھولنے لگی۔

"آپ تو بالکل کنواری لڑکیوں کی طرح شرما رہی ہیں۔" میں نے اسے چھیڑا۔ "شاید ابھی آپ کی شادی نہیں ہوئی اور آپ کنواری ہیں۔"

"شادی۔" اس نے زیر لب کہا اور پھر ٹھنڈا سانس بھرا۔ "میری شادی ہو چکی ہے ' مگر...... مگر......" وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکی۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر حیا کی سرخی دوڑ گئی تھی۔

"مگر کیا؟" میں اسے خاموش دیکھ کر بولا۔

"چھوڑیں اس ذکر کو ' کوئی اور بات کریں۔"

"مگر آپ نے تو کہا تھا کہ رات کو اپنے بارے میں بتائیں گی۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا تھا۔" اس نے جھکی ہوئی نظریں اٹھائیں۔

"کچھ باتیں بغیر کہے ہوئے بھی تو سمجھ لی جاتی ہیں۔"

"کھانا کھا لیں پہلے پھر باتیں کریں گے کیوں کہ آپ کا ملازم کسی بھی وقت کمرے میں آ سکتا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ کسی کو بھی میری محرومی کا علم ہو۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو گویا آپ مجھے اپنی داستان حیات سنانے پر راضی ہیں۔"

"آپ ہی مجبور کر رہے ہیں ورنہ...... ورنہ کون اپنی خوشی سے اپنے زخموں کو کریدنے پر آمادہ ہوتا ہے۔"

کچھ دیر ہم دونوں کے درمیان خاموشی رہی اور میں اس دوران میں بار بار اس کے حسین و پرکشش چہرے کو دیکھتا رہا۔ کئی بار ہم دونوں کی نظریں بھی آپس میں ٹکرائیں۔ میں

نے اس کی نظروں میں اپنے لیے محبت کی جھلک محسوس کر لی پھر ارشاد علی کھانا لے آیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر چائے کا دور چلا اور پھر جب ارشاد علی برتن سمیٹ کر چلا گیا تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ "اب کوئی کمرے میں نہیں آئے گا۔ اب کہیں آپ کیا کہہ رہی تھیں؟"

"کب؟"

کھانا آنے سے پہلے آپ نے بتایا تھا کہ آپ کی شادی ہو چکی ہے ' پھر آپ 'مگر' کے بعد رک گئی تھیں۔ کیا شوہر سے علیحدگی ہو گئی؟" میں نے اسے بولنے پر اکسایا۔

"ہاں۔" اس نے آہستہ سے کہا ' پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "اب آپ اس کی وجہ بھی جاننا چاہیں گے۔"

"ظاہر ہے۔" میں مسکرایا۔

"اس سے محبت میں پہل میں نے ہی کی تھی۔" اس نے اپنی داستان حیات کا آغاز کیا۔ "اس نے دامن بچانا چاہا ' گریز کیا تو میری محبت میں اور شدت آ گئی۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کس لیے مجھ سے کھنچا کھنچا سا رہتا تھا اور کیوں ایک خوف سا اسے میرے قریب نہیں آنے دیتا تھا۔ وہ اکثر کہتا کہ مہ پارہ تم میرا ساتھ نہ دے سکو گی ' اب بھی وقت ہے لوٹ جاؤ تمہیں میں وہ خوشیاں نہ دے سکوں گا جو ہر لڑکی چاہتی ہے۔ تم میرے ساتھ خوش نہ رہ سکو گی۔ میں اس کی وجہ پوچھتی تو وہ ادھر ادھر کی باتوں میں میرے سوال کو ٹال جاتا۔ اس وقت مجھ میں اتنی سمجھ نہیں تھی کہ اس کی باتوں کی گہرائی تک پہنچ سکتی۔ وہ کھاتے پیتے خاندان کا فرد تھا۔ بہ ظاہر کوئی ایسی بات معلوم نہ ہوتی تھی کہ واقعی وہ مجھے خوش نہ رکھ سکے گا۔ مختصر یہ کہ میری محبت کی شدتوں کے سامنے اس نے سپر ڈال دی تھی۔ شادی سے پہلے اس نے میری یہ بات مان لی تھی کہ میں بہ دستور ملازمت کرتی رہوں گی۔ اور اپنی تنخواہ ماں کو دیتی رہوں گی جن کی گزر بسر کا دارومدار میری تنخواہ ہی پر تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ اسے حاصل کرنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں۔ پھر وہ وقت آ گیا جب مجھے اپنا یہ دعویٰ ثابت کرنا تھا۔ میری اس سے شادی ہو گئی۔ پھر اسی رات مجھے معلوم ہوا کہ وہ کس لیے گریزاں رہتا تھا۔ اس کی محرومی کا کوئی علاج ممکن نہیں تھا۔ اس حقیقت کا علم ہونے کے بعد کچھ دیر کو میں سناٹے میں رہ گئی اور سوچا کہ اسے پہلے ہی صاف صاف مجھے سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اس نے کب میری تمنا کی تھی ' میں ہی تو اس کی محبت میں دیوانی ہو گئی تھی۔ اس نے تو آخر وقت تک کوشش کی تھی کہ شادی نہ ہو۔ میں نے ہی تو دعویٰ کیا تھا کہ اس کی

خاطر ہر قربانی دے سکتی ہوں۔ میں نے سوچا کہ جسم ہی تو سب کچھ نہیں محبت صرف جسمانی رشتوں کا نام نہیں، محبت اس سے بلند ہے۔ وہ مجھے گم صم دیکھ کر خود بھی اداس ہو گیا تھا۔ معاً میں آگے بڑھی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر میں نے جو کچھ سوچا تھا، اس سے کہہ دیا اور اس کا چہرہ کھل اٹھا سب کچھ جان لینے کے باوجود میں نے ایک بار پھر ساتھ نبھانے کا عہد کیا۔ میری محبت قربانی چاہتی تھی اور میں نے قربانی دے دی تھی۔ لیکن..... پھر بھی....." وہ چپ ہو گئی۔

کچھ دیر میں اس کے بولنے کا منتظر رہا، مگر اس کے لب نہ ہلے۔ میں نے اس خاموشی کو توڑا۔ "تم نے واقعی بہت بڑی قربانی دی تھی، پھر کیا ہوا؟ علیحدگی کیوں ہو گئی؟ اس کی نوبت کیوں آئی؟" میں اب "آپ" سے "تم" پر آ گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ میرے اور اس کے درمیان حجابات کے پردے اٹھتے جا رہے تھے۔

"اس کا سبب اس کا باپ تھا۔" بالآخر وہ بول اٹھی۔ "پہلے پہل کچھ دن میں اس کی بے تکلفی جو نظر انداز کرتی رہی، یہ سوچ کر کہ بہرحال وہ میرے شوہر کا باپ ہے اور شاید اسی رشتے کی وجہ سے ہر وقت میرا خیال رکھتا ہے تاکہ میں نئے گھر میں اجنبیت محسوس نہ کروں۔ وہ وقت بے وقت میرے کمرے میں آ جاتا۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ میں اکیلی اپنے کمرے میں سو رہی تھی کہ اس نے ایک ایسی نازیبا حرکت کی جسے کوئی شریف لڑکی برداشت نہیں کر سکتی میں جاگ اٹھی اور اس پر برس پڑی۔ وہ پہلے بے حیائی سے ہنستا رہا، پھر سنجیدہ ہو گیا اور..... اور کہنے لگا کہ....." وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔

میں اس کے چہرے پر آتے جاتے رنگ دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ اپنی بات کہنے کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب کر رہی تھی۔ اس مرتبہ مجھے درمیان میں بولنے کی ضرورت نہ پڑی۔

"اس بے غیرت شخص نے مجھ سے کہا کہ اگر مجھے اپنے شوہر سے واقعی محبت ہے اور اسے بدنامی سے بچانا چاہتی ہوں تو....." وہ رک رک کر دوبارہ بولنے لگی۔ "تو مجھے اس کی ہر بات مان لینا چاہیے، مجھے یہ قربانی دینے سے دریغ نہیں کرنا چاہیے، اس نے مجھے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ مجھے اپنے بیٹے سے طلاق دلوا دے گا۔ یہ سن کر میں آپے سے باہر ہو گئی اور اس شیطان کو اپنے کمرے سے نکال دیا۔ میں نے اپنے شوہر سے اس کی شکایت کی اور تمام واقعہ بیان کر دیا اور پھر..... پھر میرے سارے خواب بکھر گئے۔ مجھے پہلی بار اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ بے غیرت باپ کا بیٹا بھی بے غیرت نکلا کیوں کہ وہ اپنے باپ کا ہم نوا بن گیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے مہ پارہ کی آواز بھرا گئی۔ شدت جذبات سے اس کے نازک نازک ہونٹ لرز رہے تھے۔

حسین لڑکی اداس بھی ہو تو حسین لگتی ہے بلکہ بعض لڑکیاں تو حالت سوگواری میں اور ہی قیامت ڈھانے لگتی ہیں۔ مہ پارہ بھی ایسی ہی لڑکیوں میں سے تھی۔ جانے کیسے اور کب میں نے اس کا نرم و گداز ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور اب تسلی آمیز انداز میں اسے تسلیاں دے رہا تھا۔

"مہ پارہ زندگی نے تمہیں بھی تنہا کر دیا ہے اور..... اور میں بھی اکیلا ہوں، مگر تمہاری والدہ تو ابھی زندہ ہوں گی۔"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا اور آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ "مجھے طلاق ہوئی اور یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور..... اور کچھ ہی دن بعد....." وہ سسک اٹھی۔

"ہمت کرو مہ پارہ۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "آنسو بہت قیمتی شے ہوتے ہیں، انہیں یوں نہیں گنواتے۔ اگر..... اگر تم چاہو تو مجھے..... مجھے اپنی اداس اور محروم زندگی کا سہارا سمجھ سکتی ہو۔"

"آپ..... آپ....." اس کے ہونٹ لرزے۔ "آپ تو خود زندگی کی آخری سرحد پر کھڑے ہیں۔"

"نہیں مہ پارہ۔" میں نے پرزور آواز میں کہا۔ "اگر تم چاہو تو مجھے موت کی سرحد سے کھینچ کر دوبارہ زندگی کی حدود میں واپس لا سکتی ہو۔ محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔"

"کیا..... کیا یہ..... یہ ممکن ہے؟" وہ جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھی۔

"ہاں بالکل ممکن ہے۔" میں پر اعتماد آواز میں بولا۔ ہمزاد کا عمل پورا ہونے کے بعد مجھے یقیناً نئی زندگی مل جاتی، مگر میں یہ بات اسے نہیں بتا سکتا تھا میں نے اسی لیے محبت کا بہانہ بنایا تھا۔

اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا اور اپنے آنسو پونچھ لیے۔ اب اس کا چہرہ کسی ایسے گلاب کے مانند محسوس ہو رہا تھا جیسے شبنم کے قطروں نے اور نکھار دیا ہوں وہ اس لڑکی کی ہم شکل تھی جسے پانے کی تمنا میں مجھے بڑے عذابوں سے گزرنا پڑا تھا اور اب تک ان عذابوں سے مجھے نجات نہیں ملی تھی۔ میں اسے نہیں پا سکا تھا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ لڑکی مجھے مل گئی تو شاید میری زندگی کا وہ خلا پر ہو جائے گا۔ مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں وہ اسی جذباتی فضا میں جانے کب میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کرسی سے اٹھایا اور پھر اسے لیے ہوئے اپنی مسہری پر لٹایا۔ اس وقت یقیناً میں اپنے حواس میں نہیں تھا اور وہ بھی شاید ہوش کھو بیٹھی تھی یہ وہ لمحے تھے جو الفاظ کا بوجھ نہیں اٹھاتے۔ بے زبانی کی زبان میں گفتگو کا فن اسے آتا ہو یا نہ آتا ہو

مگر مجھے آتا تھا۔ یہ وہ فن ہے جسے سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ خود بہ خود آجاتا ہے۔ چند ہی لمحے بعد میں نے محسوس کیا کہ اسے بھی گفتگو کا یہ فن آتا جارہا ہے۔ انفاس کی خوشبو سے مہکتی ہوئی ساعتوں میں مجھے اچانک شدید خطرے کا احساس ہوا۔ میں یہ کیا کر رہا ہوں؟ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں اس طرح تو میرا عمل ناکام ہو جائے گا۔ میں نے موت کو گلے کیوں لگا لیا ہے؟ نہیں، مجھے زندہ رہنا ہے، میں زندہ رہوں گا اس احساس کے ساتھ ہی منزل شوق کی طرف اٹھتے ہوئے قدم رک گئے اور میں نے خود پر قابو پالیا، مگر ضروری نہیں کہ جو ہم سفر ہو اس کے قدم بھی رک جائیں۔

مجھے گریز پا دیکھ کر اس پر ایک جنون سا طاری ہو گیا۔

"مہ پارہ.... مہ پارہ! خود کو سنبھالو!" میں نے اسے جھنجوڑا۔

"تم ظالم ہو.... دھوکے باز ہو.... فریبی اور سنگ دل ہو۔" وہ چیخ اٹھی۔ "تم میری توہین کر رہے ہو.... مجھے ذلیل کیا ہے تم نے.... میں تمہیں.... تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ نہ معلوم اس میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی کہ ایک ہی جھٹکے میں میرا گریبان، دامن سے جاملا۔

یقیناً اس کی چیخیں کمرے سے باہر بھی جارہی ہوں گی، مگر ارشاد علی اندر نہ آیا۔ پھر وہ میرے چہرے پر نقش و نگار بنانے لگی۔ اور میری قوت برداشت جواب دے گئی تو میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ مسہری سے فرش پر گری اور پھر اسے جانے کیا سوجھی کہ چیختے ہوئے اس نے خود اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔

"جس طرح تو نے مجھے.... مجھے ذلیل کیا ہے، میں بھی تجھے ذلیل و رسوا کروں گی۔" وہ کسی پاگل عورت کی طرح چیخی اور پھر اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگی۔

"وہ چیختی ہوئی دروازہ کھول کر نکل گئی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے اور اچانک ہوا تھا کہ کچھ دیر کو میری عقل گم ہو کر رہ گئی۔ میری سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

پھر جب میرے حواس کچھ بجا ہوئے تو میں نے تیزی کے ساتھ لباس تبدیل کیا اور کمرے سے نکلا۔ دروازے پر ارشاد علی بوکھلایا ہوا سا کھڑا تھا۔ اس نے اب سے پہلے یقیناً میری کوٹھی میں کوئی ایسا منظر نہیں دیکھا تھا۔ اس کی بوکھلاہٹ فطری تھی۔

"وہ کہاں گئی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"وہ.... وہ ادھر چیختی ہوئی گئی تھی جناب۔" اس نے جواب دیا۔

"اسے ڈھونڈو.... تلاش کرو.... جلدی! کہیں وہ کوٹھی سے نکل نہ جائے۔" میں نے ارشاد علی کو حکم دیا۔ مجھے اب پوری طرح خطرے کی شدت کا احساس ہو چکا تھا۔

ارشاد علی میرا حکم سنتے ہی دوڑ گیا۔ مجھ پر اتنی بدحواسی طاری تھی کہ خود بھی اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔

ساری کوٹھی میں ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اچانک ہوا کیا! ڈاکٹر امتیاز اور نرس بیلا مہ پارہ کی چیخیں سن کر اپنے کمروں سے نکل آئے تھے۔ انہوں نے مہ پارہ کو چیختے ہوئے صدر دروازے کی طرف بھاگتے دیکھا تھا۔ مجھے یہ معلوم ہوا تو جیسے میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

"ہوا کیا جناب؟" ڈاکٹر امتیاز مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ "وہ آپ کے کمرے کی طرف گئی تھی اور پھر جب وہ لوٹی تو اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور وہ چیختی ہوئی بھاگ رہی تھی۔" اس کے لہجے سے شک و شبہے کا اظہار ہو رہا تھا۔

"مجھے خود نہیں معلوم ڈاکٹر کہ اسے کیا ہوا؟" میں نے جواب میں کہا۔ "اس نے ایک دم ہی مجھ پر حملہ کر دیا تھا اور پھر خود ہی اپنے کپڑے پھاڑ لیے تھے اور...."

"لیکن.... لیکن جناب، یہ کس طرح ممکن ہے۔" وہ بولا۔

"میں خود حیران ہوں۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے، وہ کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہو۔"

اسی وقت ارشاد علی اور میرے دوسرے ملازمین نے آکر بتایا کہ مہ پارہ، کوٹھی میں کہیں نہیں ہے اور صدر دروازہ کھلا ہوا پایا گیا۔ ہے۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ وہ یقیناً کوٹھی سے فرار ہو چکی ہے۔

"صدر دروازہ بند کر دیا تم لوگوں نے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں جناب۔" ارشاد علی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

"سنئے جناب۔" ڈاکٹر امتیاز نے پیچھے سے مجھے آواز دی۔

"جی۔" میں نے رک کر کہا۔

"مجھے آپ سے کچھ بات...."

"میرے ساتھ آجائیے۔" میں بات کاٹ کر بولا۔ "کمرے میں چل کر بات کریں گے۔"

ڈاکٹر امتیاز میرے ساتھ ہولیا۔ جلد ہی میں اس کے ساتھ اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ میرے اشارے پر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہاں اب کہیں 'کیا بات ہے؟" میں اس کے مقابل والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ڈاکٹر انوالحق صاحب یقیناً مجھ سے اس سلسلے میں استفسار کریں گے۔ اس صورت میں انہیں میں کیا جواب دوں؟" اس نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ "مہ پارہ بہرحال انہی کے ایما پر یہاں آئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان کے علم میں بھی یہ واقعہ آئے گا۔"

"غالباً ابھی کچھ دیر پہلے میں اس سلسلے میں وضاحت کر چکا ہوں۔ میرے لہجے میں تلخی سی آگئی۔

"لیکن یہ بیان تو آپ کا ہے۔"

"تو کیا آپ مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ میں نے اس پر مجرمانہ حملہ کیا ہوگا؟" میرا لہجہ کچھ اور تلخ ہوگیا۔ میرا ذہن یوں ہی پریشان تھا اور وہ بحث کیے جارہا تھا اس لیے جھنجلاہٹ سوار ہو جانا فطری ہی تھی۔

"نہیں 'میرا مطلب یہ نہیں تھا جناب۔" وہ کچھ سٹپٹا گیا حالانکہ مجھے یقین تھا کہ جو کچھ میں نے کہا تھا' اس کے ذہن میں وہی تھا۔

"پھر کیا مطلب تھا آپ کا؟" میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے لاجواب کرنا چاہا۔

"میرا مطلب تھا جناب کہ ڈاکٹر انوارالحق میری بات پر یقین بھی کریں گے یا نہیں۔ کیوں کہ انہوں نے دونوں نرسوں کو بہرحال میری ذمے داری پر اور میرے ساتھ یہاں بھیجا تھا۔" وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ "آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ مجھے آپ کی بات پر یقین ہے۔ عین ممکن ہے کہ مہ پارہ کسی دماغی عارضے ہی کا شکار ہو۔"

"حقیقت بہرحال حقیقت ہوتی ہے۔" میں نرمی سے بولا۔ "یہ بہرحال میرا مسئلہ نہیں کہ ڈاکٹر انوارالحق آپ کی بات پر یقین کرتے ہیں یا نہیں۔"

ابھی میری بات ختم ہوئی تھی کہ میرا ملازم ارشاد علی کمرے میں داخل ہوا اور کہا۔ "جناب دوسری نرس صاحبہ' ڈاکٹر صاحب کو بلا رہی ہیں۔ کہہ رہی ہیں کہ انہیں ڈاکٹر صاحب سے کوئی ضروری بات کرنا ہے۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"جائیں آپ۔" میں نے ڈاکٹر امتیاز سے کہا۔ "دیکھیں کیا بات ہے۔"

میری بات سن کر ڈاکٹر امتیاز اٹھ کھڑا ہوا اور پھر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ پھر جب وہ کچھ دیر بعد لوٹ کر آیا تو اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھتے

ہی بولا۔ "آپ ہی بتائیں جناب کہ اب کیا کیا جائے؟"

"کس سلسلے میں؟" میں نے پوچھا۔

"نرس بیلا فوری طور پر یہاں سے جانا چاہتی ہے۔ وہ اپنا سامان بھی باندھ چکی ہے۔ میرے سمجھانے اور اصرار پر وہ کچھ دیر رک گئی ہے۔" ڈاکٹر امتیاز نے بتایا۔

"آپ نے ناحق روکا اسے۔" میں جھنجلا گیا۔ "اگر وہ جانا چاہتی ہے تو جانے دیں۔ اسے زبردستی تو یہاں رہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔"

"لیکن کوئی ایک نرس تو ہونا ہی چاہیے تھی۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"کیوں 'کیا آپ تنہا ڈریسنگ نہیں کرسکتے؟"

"کرسکتا ہوں 'مگر اور بھی تو مسئلے ہیں۔ وقت پر آپ کو دوائیں....."

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔" میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "میں خود بھی وقت پر دوائیں کھا سکتا ہوں۔ مسئلہ صرف ڈریسنگ کا ہے۔"

اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہاں میرے قیام کی بھی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں رہتی۔"

"تو کیا آپ بھی جانا چاہتے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ جب صرف ڈریسنگ ہی کرنا ہے تو صبح و شام آکر....."

"ٹھیک ہے۔" میں بول اٹھا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں....." میں دراصل اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ عمل کے دوران میں کوٹھی کے اندر کوئی باہر کا آدمی نہ ہو تو بہتر ہے ملازمین سے تو کسی طرح نمٹا بھی جاسکتا ہے۔ مگر باہر کے آدمی پر حکم نہیں چلایا جاسکتا۔ کیا خبر ابھی کیا صورت پیش آئے اور میری دشمن جاں کے ترکش میں میرے لیے کتنے تیر باقی ہوں۔

"پھر میں کل صبح آپ کی ڈریسنگ کر کے یہاں سے چلا جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں بیلا سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ چلی جائے۔"

میں کچھ نہ بولا اور ڈاکٹر امتیاز میرے کمرے سے نکل گیا۔

ابھی ڈاکٹر امتیاز کو گئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ارشاد علی نے آکر وہ خبر دی جس کا میں بہت دیر سے منتظر تھا۔

"انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھادو' میں آرہا ہوں۔" میں نے اس سے کہا۔

مجھے علم تھا کہ وہ لڑکی جو دھمکی دے کر گئی تھی' اس کا نتیجہ بھی برآمد ہوگا۔ پولیس میری کوٹھی تک پہنچ چکی تھی۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ ایک اے ایس آئی تھا اور اس کے ساتھ

دو پولیس والے بھی تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اے ایس آئی بولا۔ "آپ کو ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہے۔"

"مگر کیوں؟" میں جان کر انجان بن گیا۔

"ایک نرس مہ پارہ نے آپ کے خلاف رپورٹ درج کرائی ہے کہ آپ نے اس پر مجرمانہ حملہ کیا ہے۔" اے ایس آئی نے جواب دیا' پھر بولا۔ "اور یہ بھی سن لیجیے کہ اس وقت آپ کی کوٹھی میں جو افراد موجود ہیں' وہ یہاں سے کہیں نہ جائیں کیوں کہ بہ طور گواہ ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"مجھے بیلا کا خیال آگیا۔ کیا خبر وہ اب تک جا چکی ہو یا موجود ہو۔ "ٹھہریں' میں آتا ہوں ابھی۔" میں نے کہا۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟" اے ایس آئی فوراً کھڑا ہو گیا۔ "آپ اس وقت تک خود کو زیر حراست سمجھیں جب تک بے گناہ ثابت نہ ہو جائیں۔"

اس کی بات سن کر مجھے غصّہ آگیا' مگر یہ وقت غصّے کے اظہار کا نہیں تھا۔ میں نے اسی لیے غصہ ضبط کرتے ہوئے اسے بتا دیا کہ کہاں جا رہا ہوں۔

"ٹھیک ہے' چلیں۔" اے ایس آئی میرے ساتھ ہو لیا اور دونوں پولیس والوں نے بھی اس کی تقلید میں ایسا ہی کیا۔

ڈاکٹر امتیاز اپنے کمرے میں تھا' مگر بیلا کا کمرہ خالی تھا۔ وہ جا چکی تھی۔

"آپ کے پاس اس کا پتا ہے؟" اے ایس آئی نے ڈاکٹر امتیاز سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" ڈاکٹر امتیاز نے جواب دیا اور پھر اے ایس آئی کے کہنے پر پتا لکھ کر دے دیا۔

"ممکن ہے کہ آپ کو بھی ابھی کچھ دیر بعد یا کل صبح تھانے بلوایا جائے اس لیے یہیں رہیں۔" اے ایس آئی نے ڈاکٹر امتیاز سے کہا' پھر میری طرف مڑا۔ "چلیں جناب' آپ تو چلیے۔"

میں اس کے ساتھ چل دیا کیوں کہ اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ اس وقت رات کے پونے گیارہ بج رہے تھے۔ ابھی عمل شروع کرنے میں سوا گھنٹا باقی تھا اور اسی عرصے میں مجھے بہرحال یہ معاملہ نمٹانا تھا ورنہ یہ عمل شروع نہ کر سکتا۔

مجھے توقع تھی کہ تھانے پہنچ کر میری ملاقات ایس ایچ او سے ہو گی جسے میں اس دن صبح پانچ ہزار روپے بہ طور رشوت دے چکا تھا۔ وہ یقیناً میرا کچھ نہ کچھ خیال کرے گا' مگر وہاں

جا کر معلوم ہوا کہ موصوف گشت پر ہیں۔ پولیس والوں سے اب تک میرا بڑا سابقہ پڑ چکا تھا۔ مجھے "گشت" کا مطلب اچھی طرح معلوم تھا۔ جب ایس ایچ او اندرجات کے مطابق علاقے کے گشت پر ہوتا ہے تو عموماً اس کا گشت صرف گھر تک ہوتا ہے اور وہ اس وقت خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا ہوتا ہے۔

مہ پارہ ابھی تک تھانے میں موجود تھی۔ اے ایس آئی نے اس سے میری شناخت کرائی اور پھر اس کو جانے کی اجازت دے دی۔ وہ اس وقت بھی مجھے بڑی خوں خوار نظروں سے گھور رہی تھی جیسے کچا ہی چبا جائے گی۔ میرا خیال تھا کہ اب اے ایس آئی مجھ سے پوچھ گچھ کرے گا' میرا بیان وغیرہ لے گا' مگر ایسا نہیں ہوا' اس نے ایک کانسٹیبل کو حکم دیا۔ انہیں لے جا کر حوالات میں بند کر دو۔"

یہ سنتے ہی جیسے میری سٹی گم ہو گئی اور میں بہ مشکل کہہ سکا۔ "مگر کیوں؟ ابھی..... ابھی تو مجھ پر ثابت نہیں ہوا۔"

""حوالات میں صرف مجرموں ہی کو نہیں' ملزموں کو بھی بند کیا جاتا ہے۔" اے ایس آئی کے لہجے میں چبھن تھی۔ "آپ یقیناً پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں' مجرموں اور ملزم کا فرق اچھی طرح سمجھتے ہوں گے۔"

"ہاں میں جانتا ہوں کہ مجرم اسے کہتے ہیں جس پر جرم ثابت ہو جائے اور ملزم وہ ہے جس پر کوئی الزام ہو۔" مجھے غصّہ آنے لگا۔ "آپ مجھے صفائی کا موقع بھی نہیں دے رہے اور حوالات میں بند کرا رہے ہیں۔ یہ کچھ مناسب بات تو نہیں۔"

"کیا مناسب ہے کیا نہیں' اسے ہم بہتر سمجھتے ہیں۔" وہ سختی سے بولا۔ "اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ ضروری نہیں کہ اسی وقت تفتیش شروع کر دی جائے۔ یہ کام صبح بھی ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر مجھے بھی آپ صبح بلوا سکتے ہیں۔" میں ترکی بہ ترکی بولا۔

"اور رات کو تم فرار ہو جاؤ تو۔" وہ "آپ" سے "تم" پر اتر آیا۔ "تمہارے خلاف ایف آئی آر کٹ چکی ہے' سمجھے! اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس میں وقت بھی درج ہوتا ہے۔ اگر ہم سے جواب طلب کیا گیا کہ رات ہی کو کارروائی کیوں نہیں کی گئی؟ پھر..... پھر ہمارے پاس کیا جواب ہو گا۔"

"اچھا یہ بتائیں کہ آپ کے ایس ایچ او صاحب کب تک گشت سے لوٹ آئیں گے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ انہیں گشت کے دوران میں اطلاع دی جا سکے....."

"کس بات کی اطلاع؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔ رفتہ رفتہ اس کا رویہ میرے ساتھ سخت ہوتا جارہا تھا۔

"یہی کہ میں ان سے فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا "آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میرے ان سے اچھے تعلقات ہیں۔"

"آپ کے ان سے اچھے تعلقات ہیں' اس کا اندازہ تو مجھے گذشتہ رات ہی ہو گیا تھا۔" اس کے لہجے میں کاٹ تھی۔ "کل جب آپ کے کمرے کا تالا توڑا گیا تھا تو یہ خادم بھی وہاں موجود تھا۔ ظاہر ہے کہ آپ کے ایس ایچ او صاحب سے اچھے تعلقات نہ ہوتے تو ایسا کیوں ہوتا۔ ویسے میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔" اس کے بعد وہ پھر بے تکلفی پر اتر آیا۔ "سنو! ایف آئی آر کٹنے کے بعد وہ بھی کچھ نہیں کرسکتے۔ گزشتہ رات والا معاملہ مختلف تھا۔ اس کی رپورٹ درج نہیں ہوئی تھی۔ سمجھ گئے اب کہ اس معاملے میں تعلقات نہیں چلیں گے۔" اس نے لفظ تعلقات پر زور دے کر کہا۔ یقیناً اس کے علم میں یہ بات ہوگی کہ میں نے ایس ایچ او کو رشوت دی ہے۔

میں چکرا کر رہ گیا۔ عمل شروع کرنے میں صرف ایک گھنٹا باقی رہ گیا تھا۔ اگر وہ مجھے حوالات میں بند کردیتا تو سارا کھیل ہی ختم ہو جاتا۔ ہمزاد کے عمل میں وقت اور جگہ کو خصوصی حیثیت حاصل تھی۔ شرائط کے مطابق نہ جگہ بدلی جاسکتی تھی۔ نہ وقت جس جگہ اور جس وقت عمل شروع کیا گیا تھا' اس کی پابندی لازمی تھی ورنہ عمل باطل ہو جاتا اور عمل کے باطل ہونے کا مطلب میری یقینی موت تھا۔ اب میں بڑی حد تک اس نتیجے تک پہنچ گیا تھا کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے' اس میں میری دشمن جاں کے انتقام کو دخل ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ میں عمل پورا کرسکوں۔ گذشتہ شب وہ میری قوت ارادی کے سبب ناکام ہوگئی تھی۔ کوئی اور میری جگہ ہوتا تو ان حالات میں کسی نہ کسی مرحلے پر دھوکا کھا جاتا یا اگر میں بھی تجربہ کار نہ ہوتا تو اس کے وار سے بچنا مشکل تھا۔ اس مرتبہ اس نے ایک اور حربہ آزمایا تھا' مگر کس طرح ایسا ممکن ہوا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اب تک میں نے ارواح کے متعلق جو کچھ پڑھا تھا اور جو باتیں خود میرے تجربے میں آئی تھیں' موجودہ واقعہ ان سے قطعی مختلف تھا۔ کوئی روح بھلا کسی مادی جسم کو کس طرح اپنا سکتی ہے۔ میں نے اس نرس کے مادی وجود کو چھوا تھا۔ وہ ایک جیتی جاگتی لڑکی تھی۔ اس پر کسی روح کا گمان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت مجھے وہ زمانہ یاد آگیا جب مہ پارہ ایک عمل کر رہی تھی اور میں چاہتا تھا کہ وہ عمل پورا نہ کرسکے۔ میں نے بھی اس پر بہت حربے آزمائے تھے' مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ چند ہی لمحوں میں میرے ذہن

نے ایک فیصلہ کرلیا' اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا' لیکن اس کا دارومدار اس شخص پر تھا جو میرے سامنے وردی میں ملبوس بیٹھا ہوا تھا۔ معاً میں نے اس سے کہا۔ "میں آپ سے خلوت میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھو یہ معاملہ بہت ٹیڑھا ہے' میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکوں گا۔" اس نے غالباً اپنا بھاؤ بڑھانے کے لیے پیش بندی کی' پھر بولا۔ "خیر کہو کیا بات ہے؟" یہ کہتے ہی اس نے اپنے کمرے سے دونوں کانسٹیبلوں کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

کمرے میں وہ اکیلا رہ گیا تو میں بولا۔ "یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ لوگوں کے لیے بدتر سے بدتر حالات میں کوئی بہتر راہ نکالنا مشکل نہیں ہوتا۔"

"تمہید نہ باندھو۔ اس نے مجھے تاکید کی۔ "جو کہنا ہے' صاف صاف کہو اور یہ بات ذہن میں رکھو کہ میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتا' یہ میرے اختیار کی بات نہیں ہے۔ اس وقت ضمانت بھی نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ ہونا ہے' صبح ہی ہوگا۔ یہ تم بھی جانتے ہو کہ اس وقت کوئی عدالت کھلی نہیں ہوگی۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے سر ہلایا۔ "مگر میں نے کچھ اور ہی سوچا ہے۔ یہ آپ کے بس میں ہے۔"

"کچھ کہو بھی تو۔" اس نے منہ بگاڑ کر کہا۔

"دراصل میری ایک مجبوری ہے کہ میں اپنی کوٹھی سے باہر رات بسر نہیں کرسکتا۔" میں نے آخر کہہ ہی دیا۔ "میں ایک عمل کر رہا ہوں جس کے لیے جگہ اور وقت لازمی شرائط ہیں۔"

"پھر میں اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں؟" اس کے لہجے میں روکھا پن تھا' شاید اس لیے کہ میں نے ابھی اس کے مطلب کی بات نہیں کی تھی۔

"آپ ہی تو سب کچھ کرسکتے ہیں۔" میں جلدی سے بولا۔ "آپ مجھے گھر جانے کی اجازت دے کر یہ بھی ظاہر کرسکتے ہیں کہ آپ نے کارروائی کی مگر میں اپنی کوٹھی میں نہیں ملا۔"

"بہت خوب۔" اس نے طنزیہ آواز میں کہا۔ "تمہارے خیال میں یہ بات چھپی رہ سکتی ہے۔"

"اگر یہ ممکن نہیں تو ایک اور صورت ہے۔"

"وہ بھی بیان کردو۔" اس کے لہجے میں بدستور چبھن تھی۔

میں نے اس کے طنزیہ لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "آپ روزنامچے میں یہی درج کریں کہ مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا ہے' مگر مجھے صبح تک کے لیے اپنے گھر جانے کی اجازت دے دیں تاکہ میں عمل کر سکوں۔"

"اور تم رات کو غائب ہو جاؤ تو اپنی نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ صبح ہوتے ہی حاضر ہو جاؤں گا۔" میں نے پرزور آواز میں اسے یقین دلانا چاہا۔

"یہ جو تم اتنی باتیں بنا رہے ہو' اور مجھے رستہ دکھا رہے ہو تو اس سے مجھے کتنی رکعت کا ثواب ملے گا۔" وہ آخر مطلب کی بات پر آہی گیا۔

"آپ جو حکم دیں' میں وہ خدمت کرنے کو تیار ہوں۔ صرف ایک رات کی بات ہے۔"

وہ کچھ سوچنے لگا' پھر بولا۔ "دیکھو یہ کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ اگر تم صبح لوٹ کر نہ آئے تو میری وردی اتر جائے گی۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "نہیں' میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اگر ملک صاحب کو معلوم ہو گیا اور وہ صبح جلدی تھانے آگئے تو بات بگڑ جائے گی۔"

"میں ان کے آنے سے پہلے صبح فجر پڑھتے ہی یہاں آ جاؤں گا۔ ویسے آپ کے اس اطمینان کے لیے کہ میں فرار نہیں ہوں گا' ایک اور صورت ہے۔"

"کیا؟" اس نے پوچھا۔

"آپ اپنے کسی سپاہی کو میرے ساتھ بھیج دیں جو میرے کمرے کے دروازے پر کھڑا رہے اور صبح ہونے تک میری نگرانی کرے۔" میں نے تجویز پیش کی۔

"ہاں یہ ہو سکتا ہے' لیکن......" وہ کچھ سوچنے لگا' پھر خود ہی سر ہلا کر کہنے لگا۔ "شریف اللہ..... ہاں وہ ٹھیک رہے گا۔" اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ پھر اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بولا۔ "مگر ابھی تم نے مطلب کی بات تو کی ہی نہیں۔"

پھر "مطلب کی بات" دو ہزار میں طے ہو گئی۔ اس سودے بازی میں ساڑھے گیارہ بج گئے اور مجھ پر اضطراب طاری ہونے لگا۔ وہ خود میرے ساتھ کوٹھی تک آیا۔ اس کے ساتھ ایک کانسٹیبل بھی تھا اور شاید اسی کا نام شریف اللہ تھا۔ اس کانسٹیبل کو صبح تک میری نگرانی کرنا تھی۔

جب اے ایس آئی جانے لگا تو مجھ سے اس نے کہا۔ "یہ غریب شریف اللہ صبح تک محض تمہاری خاطر جاگے گا' اسے بھی سو دو سو دے دینا۔"

"بہتر ہے۔" میں نے حامی بھرلی' پھر مجھے ایک بات یاد آگئی۔ "سنیں صبح ہونے سے کچھ پہلے میں' کوٹھی سے نکل کر جاؤں گا اور پھر کچھ دیر بعد میری واپسی ہو گی۔ اپنے آدمی سے کہہ دیں کہ وہ مجھے نہ روکے اور چاہے تو اس دوران میں بھی مجھ پر نظر رکھے' مگر کوئی بات نہ کرے۔

"ٹھیک ہے' میں کہے دیتا ہوں' مگر خیال رکھنا' کوئی دھوکا کیا تو تمہارے حق میں اچھا نہیں ہو گا۔" اے ایس آئی نے کہا۔ پھر وہ کانسٹیبل کو الگ لے جا کر کچھ ہدایات دیتا رہا' اس کے بعد رخصت ہو گیا۔

اب عمل شروع کرنے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ میں جلدی سے اپنے کمرے میں گھس گیا۔ میں نے ارشاد علی کو اس سے پہلے یہ بتا دیا تھا کہ وہ کانسٹیبل بھی میرے کمرے کے دروازے پر متعین رہے گا' مگر اس کے باوجود کمرے کا دروازہ کسی صورت نہیں کھولنا ہے۔ میں اندر چلا گیا تو اس نے دروازہ بھیڑ دیا۔ میں نے بہ طور احتیاط اندر سے کنڈی چڑھائی۔ عمل کے دوران میں مجھے جن چیزوں کی ضرورت تھی' وہ میری ہدایات کے مطابق ارشاد علی نے پہلے ہی وہاں رکھ دی تھیں۔

عمل شروع کیے ہوئے مجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اپنے سائے کے قریب میں نے مہ پارہ کا ہیولا دیکھا۔ معاً مجھے اس کی زہریلی آواز سنائی دی۔ "میرے دوسرے وار سے بھی بچ گئے۔ شیخ میں بھی دیکھتی ہوں کہ تم کب تک بچتے ہو۔"

اس کی آواز میرے کانوں میں آرہی تھی اور اس کا ہیولا بھی میرے دائرہ نظر میں تھا' مگر عمل کا ورد بہ دستور جاری تھا۔ اس کے الفاظ ختم ہوئے ہی تھے کہ اچانک مجھے بہت زور کی گڑگڑاہٹ محسوس ہوئی۔ یوں لگا جیسے میں جس زمین پر بیٹھا ہوں' وہ اندر دھنستی جا رہی ہے۔ اور کمرے کی دیواریں میرے اوپر گرنے والی ہیں۔

اسی وقت کسی نے باہر سے دروازہ دھڑ دھڑایا اور پھر مجھے اپنے ملازم ارشاد علی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "زلزلہ!..... زلزلہ آرہا ہے جناب! دروازہ کھولیے ورنہ دب جائیں گے۔"

لمحہ بھر کو جیسے میں خوف زدہ ہو گیا۔ چاٹگام میں زلزلہ آنا کوئی ناممکن بات نہیں تھی۔ وہاں آئے دن یوں بھی طوفان آتے رہتے تھے۔ میں نے سوچا کہ کہیں سچ مچ زلزلہ نہ آگیا ہو۔ مگر پھر میں نے فوراً ہی اپنے حواس کو قابو میں کر لیا۔ مجھے خیال آیا کہ حصار سے اٹھ کر بھاگنے کا مطلب بھی موت ہے' اب نہیں تو کچھ دن بعد' اور اگر واقعی زلزلہ آگیا ہے' کوٹھی کے درو

دیوار گرنے والے ہیں تو بھی موت یقینی ہے۔ پھر میں کیوں عمل کا ورد چھوڑوں۔ اس دوران میں مہ پارہ کا ہیولا غائب ہو چکا تھا۔

ارشاد علی نے مزید کچھ دیر کوشش کی کہ میں دروازہ کھول دوں' پھر شاید وہ ناکام ہو کر اپنی جان بچانے کی خاطر وہاں سے بھاگ گیا۔ پھر یوں لگا جیسے میرا وجود تیز ہواؤں کی زد میں ہو اور یہ کہ میں اپنی جگہ بیٹھا نہ رہ سکوں گا۔ یہ بھی فریب ہے۔ میں نے سوچا۔ اگر واقعی طوفانی جھکڑ چل رہے ہوتے تو چراغ کیسے جلتا رہتا اور چراغ نہ جل رہا ہوتا تو دیوار پر میرا سایہ کس طرح دکھائی دیتا۔ اس شب یہی ہنگامہ آرائی رہی۔ میں نے اسی دوران میں عمل کی ہدایات کے مطابق آئینہ بینی بھی کی اور پھر روٹی لے کر اپنے کمرے سے نکلا۔ مجھے قدم اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ ہر قدم پر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں منہ کے بل زمین پر گر پڑوں گا۔ میرے پیروں کے نیچے جیسے زمین کانپ رہی تھی۔ دروازے کے باہر مجھے نہ ارشاد علی ملا نہ کانسٹیبل شریف اللہ وہی کیا' ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوٹھی میں کوئی نہیں ہے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں' صدر دروازے پر پہنچا تو اس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے ملے۔ یوں جیسے کوٹھی سے نکلنے والے وحشت زدہ ہو کر وہاں سے بھاگے ہوں اور انہیں اتنا ہوش بھی نہ رہا کہ دروازہ بند کر جاتے۔

پھر جب چوراہ پر روٹی رکھ کر میں نے دوبارہ اپنی کوٹھی میں قدم رکھا تو ہر چیز معمول کے مطابق تھی۔ نہ اب زمین ہل رہی تھی' نہ طوفانی ہواؤں کا شور تھا۔ اس وقت صبح کی اذان ہو رہی تھی میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر وضو کیا اور پھر کچھ دیر بعد نماز پڑھی۔ سلام پھیرا تو مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے توجہ نہ دی اور دعا مانگنے لگا۔

مصلّیٰ تہ کر کے میں اٹھا تو سامنے ہی ارشاد علی کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر انتہائی بدحواسی نظر آ رہی تھی۔

"تم حماقت سے باز نہیں آ رہے۔" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ "رات کو تم کیوں میرا دروازہ دھڑ دھڑا رہے تھے؟"

"وہ..... وہ جناب زلزلہ....." ہلکانے لگا۔

"بکو مت۔" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ "جب میں کہہ چکا ہوں کہ کسی صورت رات کے وقت میرے کمرے کا دروازہ کھلوایا جائے تو پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"غلطی ہو گئی جناب۔" اس نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

"اور تم غارت کہاں ہو گئے تھے؟"

"میں قریبی مسجد میں پناہ لینے چلا گیا تھا۔ وہاں کے مولوی صاحب سے میری جان پہچان

ہے۔ بقیہ سارے ملازمین اور ملازمائیں بھی مولوی صاحب کے حجرے میں ہیں۔" اس نے بتایا۔

"میں نے سوچا کہ صرف میں ہی فریب سماعت اور فریب نظر کا شکار نہیں ہوا تھا بلکہ میری کوٹھی میں جتنے بھی افراد تھے' ان پر یہی گزری تھی۔ اس خیال نے میرا غصّہ کم کر دیا اور میں نے نرمی سے کہا۔ "ان سب کو اب کوٹھی میں لے آؤ۔ یہ کہتے ہی مجھے ڈاکٹر امتیاز کا خیال آیا۔ "اور ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟"

"معلوم نہیں جناب! ہوش کسے تھا' سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "میں نے تو بس سپاہی کو بھاگتے دیکھا تھا۔ وہ مجھ سے بھی پہلے بھاگ گیا تھا' اس وقت جب میں آپ کے کمرے کا دروازہ کھلوانے کی کوشش کر رہا تھا جب میں کوٹھی سے نکلا تو سارے ملازموں اور ملازماؤں کو کوٹھی سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے دیکھا۔ ان میں ڈاکٹر صاحب نہیں تھے۔ پھر میں ان سب کو لے کر قریبی مسجد میں چلا گیا۔ صاحب! یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جب میں نے مولوی صاحب سے زلزلے کا ذکر کیا تو انہوں نے صفا انکار کر دیا اور کوٹھی سے نکلتے ہی خود مجھے بھی ایسا لگا جیسے زلزلہ آنا بند ہو گیا ہے۔"

میں اسے کیا بتاتا کہ محلے کی مسجد کا مولوی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ زلزلہ ولزلہ کچھ نہیں آیا تھا' وہ سب کچھ مہ پارہ کی شیطانی قوتوں کا کمال تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ میں کسی طرح گھبرا کر حصار سے نکل جاؤں' مگر اسے کیا خبر تھی کہ میرے اوپر اس کا یہ وار بھی رائگاں جائے گا۔

"تم ذرا ڈاکٹر صاحب کو دیکھو اور آ کر مجھے بتاؤ کہ وہ اپنے کمرے میں ہیں یا نہیں۔" میں نے اس سے کہا۔

ارشاد علی چلا گیا تو میں نے لباس تبدیل کیا۔ اب میں حسب وعدہ تھانے پہنچنا چاہتا تھا' لیکن اس سے پہلے ڈریسنگ ہو جاتی تو بہتر تھا۔ ویسے مجھے امید نہیں تھی کہ ڈاکٹر امتیاز اپنے کمرے میں ہو گا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ بھی رات کو کوٹھی سے نکل بھاگا ہو گا۔ جب میرے ملازمین کو یہ صورت حال پیش آئی تھی تو پھر ڈاکٹر امتیاز اس سے کیسے بچ جاتا۔

تھانے پہنچ کر کیا گزرتی' میں فی الحال اس سے بے خبر تھا۔ ممکن ہے کہ آج ہی میرا چالان عدالت میں پیش کر دیا جاتا یا پھر آج پولیس تفتیش اور پوچھ گچھ میں گزارتی اور پھر آئندہ روز پورا کیس تیار کر کے عدالت میں پیش کرتی۔ ایسی صورت میں مجھے حوالات ہی میں رہنا پڑتا۔ میں اسی لیے یہ چاہتا تھا کہ اگر ڈاکٹر امتیاز موجود ہو تو کم از کم اس وقت تو ڈریسنگ کرا ہی لوں' آگے اللہ مالک ہے۔

ذرا دیر بعد ارشاد علی نے آکر بتایا کہ ڈاکٹر امتیاز اپنے کمرے میں موجود ہے اور سو رہا ہے تو مجھے حیرت سی ہوئی۔ میں کپڑے بدل چکا تھا اور ایک بڑی رقم بھی اپنی جیب میں رکھ لی تھی کہ ضرورت کے وقت کام آئے۔ میں نے سوچا کہ ڈاکٹر امتیاز کو وہاں بلوانے کی بجائے خود ہی اس کے کمرے میں کیوں نہ چلا جاؤں' ڈریسنگ وہیں کرالوں گا۔ وہ خود مجھے اپنے کمرے میں دیکھے گا تو ذرا جلدی ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر میں تیزی کے ساتھ اپنے کمرے سے نکلا۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد تھانے پہنچ جاؤں۔ تاکہ اے ایس آئی پر کوئی حرف نہ آئے۔

ڈاکٹر امتیاز کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی' مگر دروازہ بند تھا۔ میں نے کھڑکی سے اس پر ایک نظر ڈالی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ پھر دروازے پر کئی زوردار دستکیں دینے کے بعد اس کی غنودہ سی آواز سنائی دی۔

"دروازہ کھولیں ڈاکٹر۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔

چند لمحے کے بعد دروازے کے پیچھے سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ ڈاکٹر امتیاز کے چہرے سے حیرت اور قدرے ناگواری کا سا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"دراصل مجھے اسی وقت پہنچنا ہے۔" میں نے کمرے میں داخل ہو کر اس کی طرف معذرت خواہانہ انداز میں دیکھا۔ "معاف کیجئے گا۔ آپ کو صبح ہی صبح زحمت دی۔ وجہ یہ کہ کچھ خبر نہیں کب تک واپسی ہو' میں یہ چاہتا تھا کہ آپ اسی وقت ڈریسنگ کر دیتے۔"

"کوئی..... کوئی بات نہیں۔" اس نے بظاہر اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ "آپ تشریف رکھیں' ذرا میں منہ دھولوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ مجھے اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نظر آئے۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ڈاکٹر؟" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"بات یہ ہے جناب کہ اگر ٹینشن ہو تو میرے سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔" اس نے بتایا "کل رات کا واقعہ بھی میرے لیے ٹینشن کا سبب ہوا تھا۔ سر درد ہی کی وجہ سے مجھے رات کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اسی لیے میں نیند کی گولی کھا کر سویا تھا۔"

اس کی بات سن کر میں نے طویل سانس لیا۔ اب یہ بات میرے لیے کوئی معما" نہیں رہی تھی کہ رات کو ڈاکٹر امتیاز کوٹھی سے کیوں نہیں نکلا تھا۔ اس وقت وہ یقیناً گہری نیند سو رہا تھا۔ جب رات کو کوٹھی پر ہنگامہ ہوا تھا۔

پھر کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر نے میری گردن کے زخم کی ڈریسنگ کر دی' پھر کہنے لگا۔ "ممکن ہے میرا بیان لینے کے لیے بھی مجھے تھانے بلایا جائے۔"

"ہاں ممکن ہے۔" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے کہ پولیس کی ہدایت کے مطابق مجھے اس وقت تک یہیں رہنا پڑے گا جب تک میرا بیان نہ ہو جائے۔"

"تو کیا حرج ہے۔ آپ آرام سے رہیں یہاں میرے ملازم ہر طرح آپ کا خیال رکھیں گے۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ نادرہ کو ہوا کیا تھا۔ بظاہر تو وہ ایسی لڑکی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ پھر یہ کہ اس کی صورت شکل بھی....."

"کون نادرہ؟" میں نے ڈاکٹر کی بات کاٹ کر پوچھا۔

جواب دینے کی بجائے ڈاکٹر امتیاز مجھے حیرت سے دیکھنے لگا' یوں جیسے میں نے واقعی کوئی عجیب بات پوچھ لی ہو۔ بالآخر وہ بولا میں اسی نرس کا ذکر کر رہا ہوں۔ جو کل رات چیختی ہوئی آپ کے کمرے سے بھاگی تھی۔"

"کیا۔"

اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ "اس کا نام تو مہ پارہ تھا' شاید آپ بھول رہے ہیں ڈاکٹر۔"

"میں تو نہیں بھول رہا' آپ یقیناً بھول رہے ہیں۔"

خدا جانے ڈاکٹر امتیاز مجھے کیوں جھٹلا رہا تھا۔ مگر یہ وقت اس سے بحث کرنے کا نہیں تھا۔ میں مزید کچھ کہے بغیر اس کے کمرے سے نکل آیا۔ اب میرا رخ صدر دروازے کی طرف تھا۔

تھانے کی طرف جاتے ہوئے میں گزشتہ واقعات پر غور کر رہا تھا۔ گزشتہ شب میری دشمن جاں نے یہ اعتراف کر لیا تھا اس کا مطلب یہی تھا کہ نرس کے معاملے میں اسی کا ہاتھ تھا' مگر کس طرح؟ یہ سوال میرے لیے اب تک تشنہ جواب ہی تھا۔ وہ آخر نرس کا جسم کیسے اپنا سکتی تھی۔ کوئی روح کسی مادی جسم پر اس طرح قبضہ نہیں کر سکتی۔ بالفرض وہ جسم اسی کا تھا تو پھر برسوں پہلے مٹی ہو جانے والا جسم دوبارہ کس طرح وجود میں آ گیا؟ یہ قطعی ناممکن بات تھی۔ یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

انہی خیالوں میں گھرا ہوا میں تھانے پہنچ گیا۔ اے ایس آئی میرا ہی منتظر تھا۔ مجھے دیکھ

کراس کے چہرے پر بہار آگئی اور اس نے خوش ہو کر کہا۔ "تم واقعی وعدے کے سچے نکلے...... اور ہاں......" پھر اسے جیسے کوئی بات یاد آگئی۔ "یہ رات کو تمہاری کوٹھی میں کیا چکر چل رہا تھا؟ کیا تمہاری کوٹھی آسیب زدہ ہے؟ شریف اللہ کچھ دیر بعد ہی بدحواس ہو کر وہاں سے بھاگ آیا تھا۔" اس نے کانسٹیبل شریف اللہ کا ذکر کیا جسے میری نگرانی کے لیے ساتھ بھیجا تھا۔

"معلوم نہیں اسے کیا محسوس ہوا' کیا نہیں میں تو عبادت میں مصروف تھا۔" میں بات کو ٹال گیا۔

"صرف اسی پر کیا منحصر' وہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے ملازم بھی گھبرائے ہوئے تھے۔" وہ مجھے مشتبہ انداز میں دیکھتا ہوا بولا۔ "انہوں نے بھی تو تمہیں بتایا ہو گا۔"

"ہاں وہ لوگ بھی کہہ رہے تھے۔" میں نے اس طرح سرسری انداز میں کہا جیسے اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ "مجھے بہرحال اس سلسلے میں کچھ نہیں معلوم اور نہ ہی میں نے کوئی ایسی بات محسوس کی۔"

"کوئی بات ہے ضرور۔" اس کا شک دور نہ ہوا۔ "اس سے پہلے تمہارے کمرے میں ایک لڑکی کی لاش پائی گئی تھی جو پراسرار طور پر غائب ہو گئی اور کل رات یہ واقعہ ہوا۔ کوئی نہ کوئی چکر تو ہے خیر......" یہ کہہ کر اس نے کسی کانسٹیبل کو آواز دی۔

"انہیں حوالات میں بند کر دو۔" اس نے کانسٹیبل کو حکم دیا' پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "ایس ایچ او صاحب بس اب آنے والے ہوں گے۔ وہ آجائیں گے تو پھر تمہارا بیان وغیرہ ہو گا۔"

میں نے سر ہلایا اور کانسٹیبل کے ساتھ چل دیا۔ مجھے ضمانت کی فکر نہیں تھی۔ میرا شریک کار نصیر الدین میری ضمانت لے لیتا میں نے اس کی شراکت میں کام شروع کیا تھا۔ میرے کاروبار کی ساری ذمے داری ایک طرح سے اسی کے کاندھوں پر تھی۔ میں تو بس یوں ہی کبھی کبھار دفتر چلا جایا کرتا تھا۔ کاروبار تو بس ایک آڑ کے لیے تھا کہ کسی کو یہ شبہہ نہ ہو' اتنی دولت کہاں سے آئی اور یہ کہ میں ایسی پر آسائش زندگی کس طرح گزار رہا ہوں۔ ہمزاد کی موجودگی میں بھلا کس چیز کی مجھے کمی ہوتی۔ وہ میرے سامنے دولت کے انبار لگا سکتا تھا۔ اس اطمینان نے کبھی مجھے دولت کی ذخیرہ اندوزی پر مائل نہیں کیا۔ جب بھی ضرورت ہوتی اور جتنی ہوتی' میں ہمزاد سے کہہ دیتا۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں بھی پچاس ساٹھ ہزار روپے سے زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ گھر میں بھی میں زیادہ رقم نہیں رکھتا تھا۔ اس کے باوجود میرے گھر کی سیف میں دس پندرہ ہزار روپے پڑے ہی رہتے تھے کہ کیا خبر کب ضرورت پڑ جائے۔ اسی رقم

میں سے اب تک پولیس والوں کو رشوت دی تھی۔

حوالات میں بند ہوئے مجھے نصف گھنٹا گزرا تھا کہ میری طلبی ہو گئی۔ ایک کانسٹیبل نے حوالات کا دروازہ کھولا اور بتایا کہ ایس ایچ او کے سامنے میری پیشی ہے۔

میں جب ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچا تو وہاں اے ایس آئی بھی موجود تھا۔ ایس ایچ او نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا' پھر اپنی بھاری آواز میں بولا "تم آخر ہو کیا شے؟"

"میں سمجھا نہیں جناب کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔" میں نے جان کر انجان بنتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو۔" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"شکریہ۔" میں یہ کہہ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"سمجھتے تو ہو تم سب کچھ۔" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ بس ہمیں چکر دے رہے ہو۔ آخر معاملہ کیا ہے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ کل تم نے ایک لڑکی پر مجرمانہ حملہ کیا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ لڑکی بھی کوئی حور پری نہیں تھی۔ تمہاری ملازمائیں اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ہیں۔"

وہ مجھے خود صفائی کا موقع دے رہا تھا اس لیے میں نے فوراً کہا۔ "یہ الزام ہے مجھ پر جناب کہ میں نے اس پر مجرمانہ حملہ کیا تھا۔ اس نے خود ہی اپنے کپڑے پھاڑ لیے تھے اور پھر یہاں......"

"تو کیا وہ لڑکی مینٹل کیس تھی۔ آخر کوئی تو ایسی وجہ ہو گی جو اس نے ایسا کیا۔"

"دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں جناب۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "یا تو وہ واقعی کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہے یا پھر وہ کسی وجہ سے مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو گی۔"

"کیوں کیا اس سے تمہاری کوئی پرانی دشمنی تھی۔" اس کی آواز میں طنز تھا۔ "اس کا بیان پڑھا ہے میں نے وہ کل ہی تمہاری کوٹھی میں آئی تھی۔ کیا اس سے پہلے بھی تمہاری اس سے شناسائی تھی؟"

لفظ شناسائی پر اس نے زور دیا۔

"جی نہیں جناب!" میں نے جواب دیا۔ "کل سے پہلے میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اس کے لیے اور وہ تمہارے لیے کل سے پہلے بالکل اجنبی تھے۔ پھر پرانی دشمنی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اصل بات بتاؤ تھا کیا چکر؟" وہ پولیس

والوں کے مخصوص لہجے میں مجھ سے کہنے لگا۔ "دیکھو اگر تم نے سچ بات اگل دی تو یہ تمہارے ہی حق میں بہتر ہوگا۔"

"دراصل اس نے مجھے اپنی دکھ بھری کہانی سنائی تھی کہ وہ بھری دنیا میں تنہا ہے۔ میں نے اخلاقاً" بطور ہمدردی اسے دلاسا دیا تھا۔ بس پھر وہ پھیلتی چلی گئی۔ گلے پڑ گئی۔"

"اور جب تم نے اس کی بات نہیں مانی تو اس نے یہ ڈراما کھیلا۔ یہی کہنا چاہتے ہو، ناتم۔"

"جی..... جی ہاں جناب۔" میں بولا۔

"تم ذرا باہر جاؤ۔" ایس ایچ او نے اے ایس آئی سے کہا۔ نہ معلوم وہ مجھ سے تنہائی میں کیا بات کرنا چاہتا تھا۔ اے ایس آئی باہر چلا گیا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سنو جو کچھ تم نے کہا ہے، اس میں کوئی حقیقت ہو یا نہ ہو، لیکن کیس کو عدالت کے سامنے اس انداز میں ضرور پیش کیا جاسکتا ہے، مگر میرے پاس بھی تو اس کا کوئی جواز ہونا چاہیے۔ سمجھ رہے ہو، ناتم۔"

میں خوب سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اسی لیے میں نے کہا۔ "میں آپ کے حکم سے باہر نہیں ہوں، جو حکم دیں گے اسے پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"میرے حکم کو چھوڑو، اپنی بات کرو۔ یہ معاملہ اور ہے۔ اس میں مدعی موجود ہے اور ایف آئی آر بھی کٹ چکی ہے، لیکن تمہاری خاطر میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لوں گا۔ میں اس لڑکی کو تھانے بلوا کر بات کرتا ہوں کہ وہ کچھ لے دے کر معاملہ یہیں ختم کردے۔ دوسرا بیان دے دے میرا خیال ہے پندرہ بیس ہزار میں بات بن جائے گی، مان جائے گی وہ۔"

"یہ تو بہت ہیں جناب۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"بہرحال تمہاری بے عزتی سے کم ہیں۔" وہ بولا۔ "اور یہ تو محض میرا اندازہ ہے۔ ممکن ہے وہ اس پر راضی ہی نہ ہو یا پھر اس سے بھی زیادہ کا مطالبہ کرے۔"

"ٹھیک ہے، آپ بلوالیں اسے۔" مجھے کہنا ہی پڑا کیوں کہ اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار بھی نہیں تھا۔ میں ایس ایچ او کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پھر اس نے اے ایس آئی کو طلب کرکے حکم دیا کہ کسی کانسٹیبل کو بھیج کر وہ لڑکی کو بلوا لے۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا "اب تم جاؤ، اگر معاملہ طے ہوگیا تو میں تمہیں بلوالوں گا اور ہاں یہ معاملہ نمٹ گیا تو تمہیں میرے عملے کو بھی خوش کرنا پڑے گا۔"

میں کہتا بھی کیا، مجبوراً اقرار میں گردن ہلانا پڑی۔ اسی وقت مجھے خیال آیا کہ یہ معاملہ لمبا کھنچ رہا ہے اور اس میں دس پندرہ ہزار سے کم میں بات نہیں بنے گی۔ سات ہزار پہلے ہی

خرچ ہوچکے تھے۔ آج تک میں نے کبھی اپنی سیف میں موجود رقم گنی نہیں تھی کہ کتنی ہے، کیا خبر اتنے روپے ہوں گے بھی یا نہیں یہی سوچ کر میں نے ایس ایچ او سے کہا کسی کانسٹیبل کو میری کوٹھی پر بھیج کر ذرا میرے ملازم ارشاد علی کو بلوادیں۔"

"کیوں کیا ناشتا کرکے نہیں آئے؟ میں تمہارے لیے منگوادیتا ہوں۔ ناشتا۔"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "دراصل احتیاطاً" میں کچھ رقم بینک سے نکلوانا چاہتا ہوں۔"

"اچھا اچھا۔" وہ ہنسا۔ "ٹھیک ہے۔ تم کافی سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اور ہاں کچھ رقم سے کام نہیں چلے گا۔ یہ بات اپنے ذہن میں رکھنا۔"

میرا جی چاہا کہ اس لالچی شخص کو کھری کھری سنادوں، مگر اپنا غصہ پی گیا۔ اس طرح بات بگڑ جاتی میں نے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے پھر حوالات میں بند کردیا گیا۔ میں سوچنے لگا کہ اگر اس معاملے میں میری دشمن جاں کا ہاتھ ہے تو پھر وہ نرس کسی صورت کوئی اور بیان دینے پر آمادہ نہیں ہوگی، لیکن اب مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں تھی کیوں کہ ایس ایچ او میرے ساتھ تھا۔ وہ میرے بیان کی روشنی میں کیس کو دوسرا رخ بھی دے سکتا تھا۔ اس طرح سارا الزام اس نرس پر آجاتا۔ وہ خود اس کیس میں پھنس جاتی کہ اس نے ایک شریف اور باعزت شہری کی عزت و آبرو سے کھیلنا چاہا اور جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے تو مجھے بدنام کرنے کے لیے الٹا مجھ پر مجرمانہ حملے کا الزام لگادیا۔ اس سلسلے میں یقیناً گواہوں کی ضرورت بھی پیش آتی۔ پولیس بہ ایں وجوہ میرے ساتھ تعاون کر رہی تھی اس لیے جھوٹے گواہ فراہم کرنا کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا۔ میرے ملازم میرے ایما پر عدالت میں وہی بیان دیتے جو میں چاہتا۔ ایس ایچ او کے ذہن میں بھی یقیناً یہ بات ہوگی مجھے یہ اندازہ تھا کہ ایس ایچ او اس معاملے میں دہری کمائی کے چکر میں تھا۔ ایک طرف تو وہ اس نرس کو کم سے کم رقم لینے پر راضی کرتا، اسے ڈراتا، دھونساتا اور دوسری جانب مجھ سے لڑکی کے نام پر زیادہ رقم اینٹھنے کی کوشش کرتا۔ اس کے علاوہ معاملہ ختم کرانے کی "خدمت" مجھ سے الگ وصول کرتا۔ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی سب کچھ جان بوجھ کر خود بے وقوف بن جاتا ہے اور یہ معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔

میں انہی خیالات میں سرگرداں تھا کہ معاً" میری نگاہ حوالات کی سلاخوں کے باہر ارشاد علی پر پڑی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا حوالات کی طرف آرہا تھا اور تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا شریک کار نصیرالدین بھی کسی فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوا چلا آرہا تھا۔ اس

کے جسم پر کچھ زیادہ ہی چربی چڑھی ہوئی تھی ایک تو اس کا قد چھوٹا تھا' اس پر ستم یہ کہ جسم پر گوشت کی بے تحاشا تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی وجہ سے اس کی گردن گم ہو کر رہ گئی تھی' دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے شانوں پر سر رکھا ہو۔ پھر یہ کہ وہ ظالم چست کپڑے پہنتا تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی گول اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور سر پر برائے نام بال تھے۔ اسے تیز چلتے دیکھ کر ہمیشہ میری ہنسی چھوٹ جاتی تھی۔ اس وقت ہر چند کہ میں پریشان کن حالات سے دوچار تھا' مگر اس کے باوجود میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ ہی گئی۔ خدا معلوم اسے کیسے خبر ہو گئی تھی کہ میں تھانے میں ہوں۔

بالآخر ارشاد علی اور نصیر الدین دونوں حوالات کے دروازے پر پہنچ گئے۔ تیز تیز چلنے کی وجہ سے نصیر الدین کا سانس چڑھ گیا تھا اور وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے سلام کر کے ہانپنے لگا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ارشاد علی کو مخاطب کیا جس کے چہرے پر فکر مندی اور حیرت کے آثار تھے۔ "میری الماری کی چابی تکیے کے نیچے رکھی ہے۔ الماری کھول کر درمیانی خانے میں سے تم میری چیک بک لے آؤ۔ کچھ دیر بعد بینک کھل جائیں گے۔ میں تمہیں چیک دوں گا' تم بینک سے رقم نکلوا کر سیدھے یہاں آجانا اور سنو کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے بینک سے کتنی رقم نکلوائی ہے۔" سمجھ گئے؟"

"جی صاحب۔" اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

"اچھا تو پھر جاؤ۔" میں نے اس سے کہا۔

"مگر..... مگر صاحب' آپ کو..... ان لوگوں نے حوالات میں کیوں..... کیوں بند کر دیا ہے؟" وہ آخر مجھ سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم سے جو کہا ہے' وہ کرو اور فضول باتوں میں اپنا دماغ نہ لگاؤ۔" میں نے سختی سے کہا۔ "تمہارے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں' سمجھے۔"

وہ غریب منہ لٹکا کر الٹے قدموں واپس ہو گیا۔ میں اسے بتاتا بھی کیا۔ بہر حال ایک وفادار ملازم ہونے کی حیثیت سے اس کی فکر مندی بجا تھی۔

نصیر الدین اب اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پا چکا تھا۔ ارشاد علی چلا گیا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیا ہوا شیخ صاحب! یہ کیا معاملہ ہے؟"

"پہل تم یہ بتاؤ کہ یہاں تک کیسے چلے آئے؟" میں نے پوچھا۔ "تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ....."

"میں کل ہسپتال گیا تھا' رات کو" وہ کہنے لگا۔ "معلوم ہوا کہ آپ ڈسچارج ہو کر گھر

جا چکے ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ دراصل مجھے کچھ کاغذات پر آپ سے دستخط کرانا تھے۔ اس وقت مجھے ایک دعوت میں جانا تھا اس لیے سوچا صبح کوٹھی پر آپ سے مل لوں گا۔ یہاں آیا تو ارشاد علی نے بتایا کہ آپ تھانے گئے ہیں پھر میرے ہی سامنے تھانے سے ایک سپاہی آیا اور اس نے کہا کہ ارشاد علی کو بلوا رہے ہیں' پھر میں بھی ارشاد علی کے ساتھ یہاں چلا آیا۔ راستے میں ارشاد علی سے میں نے پوچھا کہ آپ کس لیے تھانے گئے ہیں؟ مگر اس نے کچھ بتایا ہی نہیں' آپ کم سے کم مجھے تو اطلاع کرا دیتے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات تھی۔" آخر میں نصیر الدین کا لہجہ شکایتی ہو گیا۔

"کوئی ایسی فکر کی بات نہیں تھی کہ میں تمہیں بلاتا۔ بہر حال اب تم آ گئے ہو تو ممکن ہے کہ تمہاری ضرورت پڑ جائے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں میری ضمانت لینا پڑے گی۔"

"مگر کس سلسلے میں؟ کچھ بتائیں تو سہی۔" وہ بولا۔

"بس یوں سمجھ لو کہ برا وقت کہہ کر نہیں آتا۔" میں نے طویل سانس لیا اور پھر مختصراً اسے ساری بات بتا دی۔

"حیرت ہے شیخ صاحب۔" وہ واقعی حیرت سے کہنے لگا۔ "آپ کے لیے کمی کیا ہے۔" وہ میری حسن پرست فطرت سے کسی حد تک واقف تھا۔ "آپ نے اسے اپنے کمرے سے نکلنے ہی کیسے دیا۔ آپ تو اس میدان کے کھلاڑی ہیں۔"

"کھلاڑی ہی کبھی کبھی اناڑی بن جاتے ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"ظاہر ہے لڑکی بہت ہی خوبصورت ہو گی جبھی تو....."

"خیر چھوڑو اس کا ذکر۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "ایس ایچ او نے اسے بلوایا ہے' تم خود دیکھ لینا۔" یہ کہتے ہوئے میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ میں مہ پارہ کو تو کیا اس کی ہم شکل کو بھی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے اپنا دھیان ہٹانے کے لیے نصیر الدین سے کاروبار کا ذکر چھیڑ دیا۔ "کہو کام کیسا چل رہا ہے؟"

"ٹھیک ہے' لیکن....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"لیکن کیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہ موقع تو نہیں تھا اس بات کا شیخ صاحب' مگر آپ..... آپ نے ذکر چھیڑ ہی دیا ہے تو پھر..... دراصل میں اسی لیے آپ سے ملنا چاہتا تھا۔" وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"تم کھل کر بات کرو نصیر الدین کیا بات ہے؟"

"ایک سودے میں خاصا گھاٹا ہو گیا ہے اور اس وقت ساکھ برقرار رکھنے کے لیے رقم

کی بڑی ضرورت ہے۔ فرم کوئی تین لاکھ سے اوپر کے گھاٹے میں آگئی ہے۔ میں نے کل حساب کیا تھا۔ آپ کی طرف فرم کے تقریباً پونے دو لاکھ روپے واجب الادا ہیں۔ اگر وہی مل جائیں تو فی الحال کام چل سکتا ہے۔"

"میری طرف واجب ہیں؟ پونے دو لاکھ؟..... کہہ کیا رہے ہو تم؟" میں چکرا گیا۔

"میرے پاس ساری رسیدیں موجود ہیں جن پر آپ کے دستخط بھی ہیں۔ آپ وقتاً فوقتاً" جو رقم لیتے رہے ہیں اس کا پورا اندراج ہے میرے پاس! اس کے لہجے میں عیّاری تھی اور اب وہ مجھ سے نظریں بھی چرا رہا تھا۔

"کاروبار کے سلسلے میں اکثر وہ مجھ سے مختلف کاغذات پر دستخط کراتا رہتا تھا۔ میرے نزدیک یہ سب خانہ پری تھی۔ مجھے کاروبار سے دلچسپی ہوتی تو کبھی ان کاغذات کو پڑھنے کی کوشش بھی کرتا۔ مجھے کبھی گمان بھی نہیں ہوا کہ نصیرالدّین خاموشی سے کیا کھیل کھیل رہا ہے۔ مجھے اس سے رقم لینے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ میں نے اس سے آج تک ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں لی تھی بلکہ کاروبار میں میری ہی ساری رقم لگی ہوئی تھی۔ بنیادی سرمایہ پانچ لاکھ روپے تھا جو میں نے ہی فراہم کیا تھا۔ نصیرالدّین ورکنگ پارٹنر تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے اس سے کبھی رقم کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ اب وہ مجھ پر پونے دو لاکھ روپے واجب بتا رہا تھا تو ظاہر ہے کہ یہ سراسر فراڈ ہی تھا۔ بالآخر میں نے اپنے غصّے کو ضبط کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ "دیکھو نصیرالدّین مجھے نہیں معلوم کہ تم مجھ سے کن کن کاغذات پر دستخط کراتے رہے ہو۔ مجھے تم پر پورا اعتماد تھا اس لیے میں نے کبھی تم سے کچھ نہیں پوچھا' لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ تم میری آنکھوں میں دھول ہی جھونکنے لگو۔ تم نے اس وقت میرے اعتماد کو زبردست ٹھیس پہنچائی ہے۔"

"اس میں ٹھیس پہنچنے کی تو کوئی بات نہیں شیخ صاحب۔" وہ مجھ سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔ "حساب تو حساب کی جگہ ہے۔ آپ نے جو رقم لی ہے' یعنی جو آپ کی طرف واجب الادا ہے وہ تو....."

"بکو مت۔" مجھے غصّہ آگیا۔ آخر میں برداشت کرتا بھی تو کب تک۔ "میں تمہیں پھوٹی کوڑی دینے کو تیار نہیں۔"

"تو پھر مجبوراً مجھے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ "پونے دو لاکھ کی رقم ایسی تو نہیں کہ یوں ہی چھوڑ دی جائے۔"

"اور میرے پانچ لاکھ! وہ کیا ہوئے؟ ان کا حساب کون کرے گا جو میں نے کاروبار میں

لگائے تھے۔"

"وہ تو کبھی کے واپس لے چکے شیخ صاحب۔"

"کیا؟" میں تقریباً چیخ اٹھا۔

"جی ہاں! اور انہی پانچ لاکھ کی واپسی کے بعد اصولی طور پر ہماری شراکت کا معاہدہ بھی ختم ہوگیا ہے۔ اب صرف میں فرم کا مالک ہوں۔ فرم سے دست برداری کے کاغذات پر بھی آپ کے دستخط موجود ہیں اور ان کاغذات پر بھی جن کی رو سے آپ پر میرے پونے دو لاکھ واجب الادا ہیں۔"

"بہت خوب نصیرالدّین۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "تم نے یقیناً اپنی دانست میں یہ بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے' لیکن شاید ابھی تم مجھے جانتے نہیں۔ میرا نام شیخ کرامت ہے وہ شیخ کرامت جس نے اچھے اچھوں کو زمین چاٹنے پر مجبور کردیا ہے۔"

ابھی میری بات ختم ہی ہوئی تھی کہ ارشاد علی' چیک بک لے کر آگیا۔ میں نے اس سے چیک بک لے لی اور پھر بیس ہزار روپے کا چیک کاٹ کر اسے دیتے ہوئے بولا۔ "رقم احتیاط سے سنبھال کر لانا۔ بینک جاتے ہوئے میرے کمرے سے بریف کیس لے لینا۔" میں نے موقع محل کی نزاکت کے پیش نظر اسے سمجھایا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں رقم کی اتنی پرواہ نہ کرتا' مگر اب عمل پورا کرنے سے پہلے مزید رقم کا حصول میرے لیے ناممکن تھا۔ نصیرالدّین سے اب اس سلسلے میں کچھ کہنا ہی فضول تھا۔ اس کی نیت میں تو پہلے ہی فتور آچکا تھا۔

ارشاد علی چیک لے کر چلا گیا۔ میں اسے پہلے ہی یہ ہدایت دے چکا تھا کہ وہ رقم لے کر تھانے ہی میں آئے۔ مجھے توقع تھی کہ وہ میری ہدایت پر پورا عمل کرے گا۔

"شیخ صاحب۔" معاً نصرالدّین نے مجھے مخاطب کیا۔

"ہوں۔" میں نے تیوریوں پر بل ڈال کر اس کی طرف دیکھا۔

"بہتر یہ ہے کہ بات عدالت تک نہ جائے۔ میرے آپ کے دیرینہ تعلقات ہیں' خواہ مخواہ جگ ہنسائی ہوگی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ رقم کی ادائیگی کردیں۔"

میں اسے غصّے سے گھورنے لگا' پھر بولا۔ "تم شاید میرے ضبط کا امتحان لے رہے ہو۔

"ابھی بھی میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔"

"وہ بھی بک دو۔"

"اگر آپ کے پاس ادائیگی کے لیے نقد رقم نہیں ہے تو جس کوٹھی میں آپ رہتے ہیں' میرے نام کردیں۔ مگر یہ کام فوری طور پر ہونا چاہیے کیوں کہ مجھے رقم کی شدید ضرورت

ہے۔ میں پونے دو لاکھ کے عوض کوٹھی لینے پر تیار ہوں۔ حالانکہ ضروری نہیں کہ مجھے کوٹھی بیچ کر اتنی رقم مل ہی جائے، مگر محض آپ سے تعلقات برقرار رکھنے کی خاطر اگر کچھ گھاٹا بھی ہو جائے تو میں اسے برداشت کرلوں گا۔ اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ میں آپ کو ایک ہفتے کی مہلت دے سکتا ہوں۔ وہ بھی یہ سوچ کر کہ آپ اس دوران میں اپنی سکونت کا کہیں بندوبست کرلیں۔"

"نصیرالدّین۔" میں پھر چیخ اٹھا۔ "بہت ہوگیا۔ بند کرو اپنی بکواس! دفع ہو جاؤ یہاں سے! میں تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے گھٹیا اور کمینے آدمی ہوگے۔"

"کون گھٹیا ہے شیخ صاحب، یہ تو صاف معلوم ہو رہا ہے۔ آپ سلاخوں کے پیچھے ہیں اور میں سلاخوں کے باہر۔" اس نے اوچھا وار کیا، پھر میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی مزید کہا۔ "میں جو بات ایک بار کہہ دیتا ہوں، اس سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ میں نے آپ کو ایک ہفتے کی مہلت دی ہے اس عرصے میں آپ خوب سوچ سمجھ لیں۔ میں ایک ہفتے کے بعد آپ سے ملوں گا، بشرطیکہ آپ سلاخوں کے باہر ہوئے۔ دوسری صورت میں ظاہر ہے مجھے آپ کے باہر آنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔" یہ کہتے ہی وہ مڑا اور پھر گویا لڑکھتا ہوا میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

میں سوچنے لگا جب آدمی پر بُرا وقت آتا ہے تو ہر طرف ہی سے مصیبتیں اس پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ نصیرالدین کو بھی اسی وقت مجھ سے نظریں پھیرنا تھیں۔ میں غصے کے سبب اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ نصیرالدّین کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ اس نے کس شخص کو چھیڑ دیا ہے۔ وقت کی بات تھی ورنہ میں اسے ایک منٹ میں بھنگی بنا دیتا اور اپنے سامنے منت سماجت پر مجبور کر دیتا۔

کچھ وقت اور گزرا ہوگا کہ ایک سپاہی نے آکر بتایا کہ ایس ایچ او مجھے بلوا رہا ہے۔ اس نے حوالات کا قفل کھول کر مجھے باہر نکالا اور پھر میں اس کے ہمراہ ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچ گیا۔ مجھے توقع تھی کہ وہاں وہ نرس بھی ہوگی، مگر کمرے میں صرف ایس ایچ او ہی تھا۔ اس کے اشارے پر میں نے کرسی سنبھال لی۔

"میں نے نادرہ کو راضی کرلیا ہے۔" ایس ایچ او نے میرے بیٹھتے ہی کہا۔

"نادرہ۔" میں چونک اٹھا۔ میں نے دوسری بار یہ نام سنا تھا، پہلی بار آج ہی ڈاکٹر امتیاز نے اسے نادرہ کہا تھا۔

"ہاں وہ نرس جس نے تمہارے خلاف رپورٹ درج کرائی تھی میرے بھائی۔"

"مگر اس کا نام تو مہ پارہ ہے۔" میں نے کہا۔

"رپورٹ میں اس نے اپنا یہی نام لکھوایا ہے، تمہیں اگر اس نے مہ پارہ بتایا ہو تو مجھے نہیں معلوم! بہرحال نام کا جھگڑا چھوڑو۔ اصل بات سنو۔ میرے سمجھانے بجھانے پر وہ دس ہزار روپے پر آمادہ ہوگئی ہے بولو اب تم کیا کہتے ہو؟"

"مجھے کیا کہنا ہے جناب۔" میں نے بے دلی سے کہا۔ ویسے مجھے حیرت ضرور تھی کہ وہ لڑکی اپنا بیان بدلنے پر کیسے راضی ہوگئی۔

"تو تم رقم مجھے دو اور باقی معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔"

"میں نے اپنے ملازم کو بینک بھیجا ہے، وہ آتا ہی ہوگا۔"

"اور ہاں۔" وہ مسکرایا۔ "دس ہزار تو وہ لے جائے گی اور ہم....." ہمارا بھی تو کچھ حق ہے نا۔

"کیوں نہیں جناب۔" میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "آپ جو کہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں بھئی یہ خوشی کا سودا ہے۔ تم جو مٹھی بند کرکے دوگے لے لوں گا میں! وہ بھی نچلے عملے کے لیے، مجھے اس میں سے کچھ بھی نہیں چاہیے۔"

مجھے نہیں معلوم کہ اس نے لڑکی سے کیا طے کیا تھا، مگر اتنا اندازہ ضرور تھا کہ وہ درمیان میں "روڑا" ضرور لگائے گا۔ اس نے میرے اندازے کے مطابق لڑکی سے دو تین ہزار روپے دلوانے کی بات کی ہوگی اور بقیہ رقم خود ہضم کر رہا ہوگا لیکن مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا میں تو یہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح یہ جھنجٹ ختم ہو جائے۔

پھر ایس ایچ او نے مجھے وہیں بٹھالیا اور ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ دیکھو شیخ صاحب کا ملازم آئے گا، اسے میرے کمرے میں بھیج دینا۔

کانسٹیبل اقرار میں سر ہلا کر "یس سر" کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

"وہ لڑکی نظر نہیں آئی مجھے۔" میں نے کہا۔

"اسے میں نے دوسرے کمرے میں بٹھا دیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "دراصل وہ یہ کہہ رہی تھی کہ تمہارا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔ ایسے معاملوں میں ایسا ہوتا ہے اس لیے میں نے بھی زور نہیں دیا۔" یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں عیاری تھی۔

میں خوب سمجھ رہا تھا کہ وہ میرے سامنے لڑکی کو رقم دینا نہیں چاہتا تھا تاکہ اس کی "دلالی" کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ میں نے پھر کچھ نہیں کہا۔

"کچھ ہی دیر بعد ایک کانسٹیبل' ارشاد علی کو لے کر وہاں آگیا۔ میں نے اس سے بریف کیس لے لیا۔ بریف کیس میں پانچ پانچ ہزار کی چار گڈیاں تھیں میں نے تین گڈیاں نکال کر ایس ایچ او کی طرف بڑھادیں تاکہ اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہ ملے۔ پندرہ ہزار روپے اسے تھما کر میں نے بریف کیس بند کیا اور ارشاد علی کو تھمادیا۔

ایس ایچ او کے چہرے پر نوٹوں کی گڈیاں تھامتے ہی بہار آگئی۔ وہ انہیں اپنی میز کی دراز میں ڈالتا ہوا بولا۔ "اب تم جاسکتے ہو' بے دھڑک۔" اس کی آواز سے خوشی چھلکی پڑ رہی تھی۔

میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

آج مجھے فجر کے بعد سونے کا موقع نہیں ملا تھا اور اس وقت صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے اس لیے کوٹھی پہنچتے ہی میں نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ راستے میں ڈاکٹر امتیاز سے مڈبھیڑ ہوگئی میں نے اس سے کہا "ڈاکٹر اب اگر آپ جانا چاہیں تو جاسکتے ہیں' ہاں شام کو ضرور آجایئے گا ڈریسنگ کرنے۔"

"اور وہ جو پولیس کا چکر تھا اور......"

"وہ ختم ہوگیا۔" میں نے مزید وضاحت ضروری نہیں سمجھی اور آگے بڑھ گیا۔

اپنے کمرے میں آکر ابھی میں لباس تبدیل کرکے بستر پر سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ ارشاد علی اندر آگیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ اب میں سونا چاہتا ہوں۔" میں ناگواری سے بولا۔

"میں نے ان سے کہا تھا جناب' مگر وہ مان ہی نہیں رہیں۔" اس کے لہجے میں بے بسی سی تھی۔

"کون؟" میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"نرس نادرہ۔" اس نے جواب دیا۔

تیسری بار یہ نام سن کر مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہوگئی۔ "کون نادرہ...... یا تو تم پاگل ہوگئے ہو یا میرا دماغ چل گیا ہے' اس کا نام مہ پارہ ہے مہ پارہ سمجھے۔"

"جی صاحب۔"

پھر معاً مجھے خیال آیا کہ اب وہ مجھ سے ملنے کیوں آئی ہے؟ اب آخر کیا چاہتی ہے وہ؟ میں نے ارشاد علی سے کہا۔

"اچھا بھیجو اسے۔"

ارشاد علی سر جھکا کر چلا گیا اور پھر چند لمحے بعد ہی ایک بدشکل لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا رنگ سیاہ تھا اور چہرے پر چیچک کے نمایاں داغ تھے۔ وہ میرے لیے قطعی اجنبی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا۔ وہ بول اٹھی۔ "میں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔"

"کس بات کی معافی؟" میں حیرت سے بولا۔ "اور...... اور تم ہو کون؟"

"ہاں میں اسی قابل ہوں کہ آپ مجھے پہچاننے سے انکار کردیں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ میں نے اس سے اب تک بیٹھنے کو بھی نہیں کہا تھا۔ اس نے مزید کہا۔ "میں...... میں خود بھی حیران ہوں جناب کہ...... کہ مجھے کل کیا ہوگیا تھا۔ جو...... جو میں نے آپ...... آپ ایسے شخص پر اتنا بڑا الزام لگادیا کہ...... کہ آپ نے مجھ پر مجرمانہ حملہ کیا ہے۔ میں...... میں اسی کی معافی مانگنے آئی ہوں۔ خدا کے لیے مجھے معاف...... معاف کریجئے ورنہ میرا ضمیر مجھے...... مجھے چین نہیں لینے دے گا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں حیرت سے اس لڑکی کو دیکھے جارہا تھا اور میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اے خدا یہ کیا طلسم ہے؟ کہیں میں پاگل تو نہیں ہوگیا؟ آخر یہ لڑکی کون ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کیوں کررہی ہے کہ گزشتہ شب جو اندوہناک واقعہ پیش آیا تھا' اسی سے متعلق تھا؟ اس کی آواز بھی بھدی تھی۔

"کیا تمہارا نام مہ پارہ ہے؟" میں نے یقین اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔

"جی نہیں' میرا نام نادرہ ہے۔" اس نے اپنے رخساروں سے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔



میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا کہ شاید جھوٹ اور سچ کا اندازہ لگا سکوں ورنہ قابل دید کچھ بھی نہ تھا۔ لڑکیاں بڑی خوب صورتی سی جھوٹ بولتی ہیں اور ان کے آنسو بھی مگر وہ ایسی معلوم نہیں ہو رہی تھی پھر وہ کیا معما ہے؟ میں سوچنے لگا۔ آخر اسے کیا پڑی جو اجنبی ہونے کے باوجود مجھ سے ملتی' معافی مانگتی اور ایک ایسی لڑکی بننا پسند کرتی جس سے ایک شرم ناک واقعہ وابستہ تھا؟ کیا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا بھی جھوٹ ہو سکتا ہے؟ اس سوال نے رفتہ رفتہ میرے ذہن کو جیسے جھنجوڑنا شروع کر دیا۔

مہ پارہ کے سلسلے میں آنکھوں دیکھا کئی بار غلط ثابت ہو چکا تھا۔ گزشتہ شب وہ ایک مقتول لڑکی بن گئی تھی اور میں ہی نہیں میرے نوکروں اور پولیس والوں نے بھی اس کی لاش دیکھی تھی۔ اس نے مجھے فریب نظر میں مبتلا کر دیا تھا اور میرے علاوہ وہ دوسروں کو بھی۔ وہ ایسا کرنے کی اہل تھی کہ حقیقتاً جو نہ ہو' آدمی کو نظر آنے لگے۔ جب وہ یہ قوت رکھتی تھی تو اس کے لیے یہ کیا مشکل تھا کہ ایک بدصورت لڑکی مجھے حسین اور اس کی ہم شکل نظر آنے لگے۔ عمل کے دوران ہی میں یہ واقعہ بھی پیش آیا تھا کہ میں نے زلزلے کی گڑگڑاہٹ سنی تھی۔ یہ فریب سماعت تھا۔ حقیقت میں زلزلہ نہیں آیا تھا۔ جس کا ثبوت ارشاد علی کا بیان تھا۔ اس نرس کی آواز مجھے مہ پارہ جیسی معلوم ہوئی' یہ بھی سماعت کا فریب ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا نام مجھے نادرہ کی بجائے مہ پارہ سنائی دیا اسے بھی اسی خانے میں رکھا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ میں تو مہ پارہ کہوں اور دوسرے فریب سماعت میں مبتلا ہو کر نادرہ سنیں۔ یقیناً اس نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے یہ کھیل کھیلا تھا' ایسی ہوشیاری کہ میں بھی دھوکا کھا گیا تھا۔ نرس نادرہ اس وقت مہ پارہ کی پُراسرار قوتوں ہی کے زیر اثر رہی ہو گی۔ جب اس نے اپنے کپڑے پھاڑ لیے تھے اور میرے خلاف تھانے میں جا کر رپورٹ درج کرائی تھی۔ پھر ان خطرناک حالات میں بھی میں نے ایک راہ نکال لی تو مہ پارہ نے نادرہ کو اپنے سحر سے آزاد

کر دیا تھا۔ مجھے اپنا قیاسات صدفی صد درست معلوم ہونے لگے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اب وہ لڑکی ایسی نظر نہ آتی۔

اس طرح مہ پارہ نے مجھ پر دہرا وار کیا تھا۔ اول یہ کہ میں جذ! ... بلکہ ہوں اور اس طرح عمل کی ایک شرط پوری کرنے میں ناکام ہو جاؤں۔ بروقت مجھے خطرے کا احساس ہو گیا اور میں سنبھل گیا تو اس نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ عمل کی شرط پوری نہ ہو سکے' یعنی میں مقررہ وقت پر اور مقررہ جگہ پر عمل جاری نہ رکھ سکوں۔ ظاہر ہے کہ میں حوالات میں بند ہوتا تو جگہ کی پابندی نہ کر پاتا۔ یہ بھی مہ پارہ کی کامیابی ہوتی۔ مہ پارہ نے اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے اس مظلوم لڑکی نادرہ کو اپنا آلہ کار بنایا تھا جو اس وقت میرے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔ یہ لڑکی مظلوم اور بے گناہ ہے' اس خیال نے میرے دل میں اس بدصورت لڑکی کے لیے ہمدردی پیدا کر دی۔

"بیٹھ جاؤ نادرہ!" میں نے اسے کافی دیر بعد مخاطب کیا۔

"جی؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور اس کی حیرت غلط نہیں تھی کیوں کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اسے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

"ہاں بیٹھ جاؤ اور اپنے دل سے یہ بات نکال دو کہ میں تم سے خفا ہوں۔" میں پھر بولا۔

وہ کچھ جھجکی پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"نادرہ! جو کچھ ہوا' اسے اپنے ذہن سے جھٹک دو کہ اسی میں تمہاری اور میری بھلائی ہے۔"

"تو... تو کیا آپ نے مجھے... مجھے معاف کر دیا؟" اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔

"تم نے کوئی غلطی نہیں کی کیوں کہ تمہیں خود اعتراف ہے' تم اس وقت اپنے حواس میں نہیں تھیں۔ اس کے باوجود اگر تمہارا دل اس سے مطمئن ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں معاف کر دوں تو میں نے معاف کیا' میرے خدا نے معاف کیا۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر یقیناً یہ آنسو ممنونیت اور خوشی کے تھے۔ "آپ.... آپ بہت اچھے ہیں۔" اس کے ہونٹ کانپے۔

"تمہیں اپنی غلطی کا احساس کب ہوا؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا' مقصد وہ نہیں تھا جو از خود سامنے آ گیا۔

"آج صبح۔" اس نے بوجھل سی آواز میں جواب دیا۔ "میں خود یہ سوچ رہی تھی کہ

تھانے جا کر حقیقت کا اظہار کروں گی' چاہے مجھے خود ہی کیوں نہ سزا بھگتنا پڑے۔ غلط بیانی اور کسی پر جھوٹا اور اتنا سخت الزام لگانا بھی بہرحال جرم ہے۔ اسی دوران میں تھانے سے خود ہی بلاوا آ گیا۔"

میں چونک اٹھا۔ تو گویا نادرہ خود ہی اپنا بیان بدلنے پر آمادہ تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ ایس ایچ او نے اسے بیان بدلنے پر راضی نہیں کیا تھا اور اس نے مجھے خواہ مخواہ اچھا خاصا "چھیل" لیا تھا' وہ بھی ایسے وقت جب کہ میرے پاس زیادہ رقم نہ تھی۔ یہ سوچ کر مجھے اس عیار شخص پر غصہ آنے لگا' مگر جلد ہی میں نے اپنے غصّے پر قابو پا کر پہلے اپنے اقیاس کی تصدیق کی۔

پھر جواباً" نادرہ نے جو کچھ بتایا' اسے سن کر میں مزید کھول اٹھا۔ پولیس نے واقعی حد کر دی تھی مجھ سے رقم اینٹھی تو اینٹھی تھی' اس غریب کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ہوا یہ کہ نادرہ نے تھانے پہنچ کر صاف صاف کہہ دیا کہ اسے مجھ سے کوئی شکایت نہیں اور وہ اپنا تحریری بیان واپس لینا چاہتی ہے۔ ایس ایچ او نے اسے کہا کہ یہ مشکل ہے کیوں کہ میں' نادرہ پر جھوٹا الزام لگانے پر کیس کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے منت سماجت کی تو ایس ایچ او بڑی مشکل سے پانچ سو روپے لے کر اس بات پر راضی ہوا کہ اس کا تحریری بیان واپس کر دے گا۔ پھر مجھ سے اس نے پندرہ ہزار روپے اینٹھے۔ نادرہ نے وہ تحریری بیان لے کر پھاڑ دیا اور مجھ سے معذرت کرنے چلی آئی۔ نادرہ کے بیان کی روشنی میں' میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ پولیس نے یقیناً اس کی رپورٹ درج نہیں کی ہو گی تاکہ اس کا تحریری بیان دکھا کر مجھ سے رقم اینٹھ سکے' گویا یہ جھوٹ تھا کہ ایف آئی آر کٹ چکی ہے۔ تحریری بیان کی کوئی اہمیت نہیں تھی' اسے استعمال بھی کیا جا سکتا تھا اور نہیں بھی۔ اس کا انحصار حالات پر تھا۔ پولیس اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہی تھی۔ اگر ایف آئی آر کٹ چکی ہوتی تو اس تحریری بیان کو ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پہلے جانے یہ کیوں نکتہ میری سمجھ میں نہ آیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پے در پے واقعات نے مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہ دی تھی۔

نادرہ ایک معمولی نرس تھی اور اس کے لیے پانچ سو روپے بھی بہت تھے۔ یہ سوچ کر میں اٹھا اور اسے الماری سے پانچ سو روپے نکال کر دینے لگا۔ "یہ رکھ لو!" میں نے اس سے کہا۔

"مگر کیوں جناب!" [illegible] سے بولی۔ "آپ یہ روپے کیوں دے رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ میری نظر میں تم بے قصور ہو اور کسی بے قصور کو سزا نہیں ملنا

چاہیے۔" میں بولا۔ "رکھ لو انہیں!" میں نے پھر اس کی طرف نوٹ بڑھا دیے۔

"لیکن میں یہ روپے نہیں لوں گی۔ آپ کا یہی احسان کم نہیں کہ مجھے معاف کر دیا۔" اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

میں نے بہت چاہا کہ وہ روپے لے لے' مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ یقیناً ایک شریف باضمیر لڑکی تھی۔ دکھے ہوئے دل کے لوگ شاید ایسے ہی ہوتے ہیں۔

"اچھا اب میں جاؤں؟" اس نے بڑے بھولپن سے کہا' بالکل اس طرح جیسے میں اسے جانے نہ دوں اور روک لوں۔

میں اس کی آنکھوں میں مچلنے والے جذبات کو محسوس کر رہا تھا اور مجھے یہ بھی یاد تھا کہ میں نے اس سے گزشتہ روز کیا کہا تھا! مگر وہ اور لمحے تھے اور بات تھی۔ میں اسے مہ پارہ کی ہم شکل سمجھ رہا تھا حالانکہ حقیقت یہ نہ تھی۔ میں اب مزید کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔ "ہاں نادرہ تم جاؤ۔"

"آپ.... آپ نے مجھے دل سے معاف کر دیا ہے نا؟ میرا... مطلب ہے کہ اس نازیبا حرکت پر؟" وہ رک رک کر کہنے لگی۔

"ہاں ہاں بالکل!" میں نے اسے یقین دلایا۔

"پھر.... پھر آپ نے کل مجھے جو.... جو کچھ کہا تھا تاکہ.... میں.... میں آپ کو اپنی اداس اور محروم زندگی کا سہارا سمجھ سکتی ہوں" آخر اس کی محرومیاں جاگ ہی اٹھیں اور دل کی بات زبان پر آ گئی۔

مجھے اس بھولی اور اداس لڑکی پر بہت ترس آیا' مگر ظاہر ہے کہ اب وہ طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے اس سے نہیں' مہ پارہ سے اظہار محبت کیا تھا' یعنی اسے مہ پارہ سمجھ کر!

"سنو نادرہ!" میں نے کچھ سوچتے ہوئے انتہائی نرمی سے کہا۔ "جس طرح تمہیں کل کچھ ہو گیا تھا' وہی میرے ساتھ ہوا۔ اس عالم میں جانے کیا کیا کہتا رہا! ان باتوں کو بھلا دو اور اپنے ہی شب و روز میں آباد رہو۔ میں نے اس عالم میں جو کچھ کہا اس کے لیے تم سے معذرت چاہتا ہوں۔"

وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہوئی اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں سمجھ گیا کہ یقیناً میری بات سن کر ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہوں گے جنہیں چھپانے کی خاطر اس نے منہ پھیر لیا تھا۔

"خدا حافظ!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی

دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"خدا حافظ نادرہ!" میں بھی جواباً بولا اور اس کی طرف سے نگاہ ہٹالی۔

وہ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی تو میں بستر پر دراز ہو گیا' پھر رات بھر کی تھکن اور بیداری نے بہت جلد میری آنکھوں میں نیند کے جال بن دیے۔

پھر پانچ چھ دن کسی قابل ذکر واقعے کے بغیر گزر گئے۔ میں بہ دستور عمل کرتا رہا۔ ڈاکٹر امتیاز صبح شام آ کر میرے گردن کے زخم کی ڈریسنگ کر جاتا تھا جس کے سبب مجھے تکلیف و اذیت سے نجات ملی ہوئی تھی ورنہ جانے مجھ پر کیا گزرتی!

میں اب یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ شاید مہ پارہ کی روح میری طرف سے مایوس ہو گئی ہے ورنہ مجھ پر کوئی نیا حربہ ضرور آزماتی۔ شاید اب اس کی ترکش میں کوئی تیر نہیں رہا۔

اس عرصے میں مجھے اپنے ورکنگ پارٹنر نصیرالدین کا خیال ہی نہیں تھا جس کے دل میں بے ایمانی آ گئی تھی۔ اس نے نہ صرف فرم پر قبضہ کر لیا تھا اور اس کا تنہا مالک بن بیٹھا تھا بلکہ مجھ پر پونے دو لاکھ روپے بھی واجب الادا بتا رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک ہفتے کی مہلت دی تھی کہ میں رقم ادا کروں ورنہ وہ میرے خلاف قانونی کارروائی کرے گا۔ اس کے پاس اس قسم کی رسیدیں موجود تھیں۔ مہلت ختم ہوتے ہی وہ بڑی ڈھٹائی سے آدھمکا چوری اور سینہ زوری والا معاملہ تھا۔ ظاہر ہے مجھے اس پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ جب میری ملازم ارشاد علی نے ایک شام اس کے آنے کی اطلاع دی تو میں بپھر گیا۔

"اس کمینے کو دھکے دے کر میری کوٹھی سے باہر نکال دو!" میں تقریباً چیخ اٹھا۔

"جی!" ارشاد علی حیران رہ گیا۔ ظاہر ہے اسے یہی معلوم تھا کہ نصیرالدین میرا شریک کار ہے۔ اس کی حیرت بجا تھی۔

"میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو جاؤ!" میں پھر چیخا۔

ارشاد علی سٹپٹا کر کمرے سے نکل گیا۔ مجھے نصیرالدین کی فکر نہیں تھی۔ اگر اس کے پاس یہ ثبوت تھا کہ میں فرم سے دستبردار ہو چکا ہوں اور یہ کہ فرم کے مجھ پر پونے دو لاکھ روپے نکلتے ہیں تو یہ روپے وہ مجھ سے فوری طور پر نہیں لے سکتا تھا' پہلے اسے مجھ پر کیس کرنا پڑتا' پھر اس دعوے کو ثابت کرنے میں ایک لمبا عرصہ لگتا۔ یہ "دیوانی" کا کیس تھا جو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ کچہری کے چکر کاٹتے کاٹتے جوتیاں گھس جاتی ہیں اور برسوں میں جا کے فیصلہ ہوتا ہے۔ مجھے تو صرف چند دن درکار تھے۔ اس کے بعد اس خبیث اور بے ایمان کے سارے کس بل نکال دیتا۔

جاتے جاتے وہ چند سطری خط میرے نام لکھ گیا تھا۔ یہ خط مجھے ارشاد علی نے لا کر دیا۔ غصے کے باوجود میں نے اس پر ایک نظر ڈال لی اور پھر پرزے پرزے کر دیا۔ نصیرالدین نے مجھ پر کیس کرنے کی دھمکی دی تھی اور یہ بتایا کہ وہ بہت بارسوخ آدمی ہے جلد ہی مجھ سے اپنی رقم وصول کر لے گا۔

یہ واقعہ اس کے دوسرے دن کا ہے کہ مجھے بلدیہ چاٹگام کی جانب سے ایک خط ملا۔ خط میں لکھا تھا کہ میں فوری طور پر بلدیہ کے متعلقہ حکام سے ملوں۔ مجھے اس طلبی پر بڑی حیرت ہوئی۔ بہرحال میں اپنا تجسس دور کرنے کے لیے بلدیہ کے دفتر پہنچ ہی گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مجھے بلدیہ کی طرف سے جو خط بھیجا گیا تھا۔ "اس پر اشد ضروری درج تھا۔

بلدیہ کے دفتر پہنچ کر مجھے متعلقہ افسر تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ ادھیڑ عمر شخص تھا اور خدوخال سے چڑچڑے مزاج کا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس سے اپنا تعارف کرایا تو وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تو آپ ہیں شیخ کرامت! آ گئے آپ!"

"جی۔" میں نے اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے سکون سے کہا۔

"تشریف رکھیے!" اس نے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "فرمایئے مجھے کیوں طلب کیا گیا ہے؟"

"ہفتے بھر میں تین خط آپ کو لکھے جا چکے ہیں۔ معلوم نہیں آپ سرمایہ دار لوگ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں!" وہ منہ بگاڑ کر کہنے لگا۔

"مگر مجھے تو یہ پہلا خط ملا ہے' جناب!" میں نے احتجاج کیا۔ "آپ بلاسبب میری طرف سے بدگمان ہو رہے ہیں! یہ بتائیں کہ بات کیا ہے؟"

"بات بہت اہم ہے!" اس نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے کہا۔ "احکام براہ راست ڈھاکہ سے آئے ہیں جن کی تعمیل جلد سے جلد ضروری ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں حیرت سے بولا۔

"وہی سمجھانے تو بلایا ہے میں نے آپ کو!" اس نے دیدے گھمائے' پھر بولا۔ "جہاں آپ کی کوٹھی واقع ہے' وہاں سے ہمیں ایک سڑک نکالنا ہے۔"

"وہ کس خوشی میں؟" میں اس کے لہجے سے تپ گیا۔

"اس خوشی میں!" یہ کہہ کر اس نے میز پر رکھی ہوئی ایک فائل کھول کر میرے سامنے رکھ دی۔ "یہ گورنر صاحب کا حکم ہے۔"

میں فائل میں لگے ہوئے کاغذ کو پڑھنے لگا۔

"گذشتہ دنوں گورنر صاحب نے چاٹگام کا دورہ کیا تھا۔" وہ کہتا رہا۔ "گورنر صاحب اس طرف سے بھی گزرے تھے۔ جہاں آپ کی کوٹھی ہے۔ اس جگہ راستہ بہت تنگ ہے۔ انہوں نے موقع ہی پر حکم دیا تھا کہ سڑک کو کشادہ کیا جائے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ......"

"لیکن وہ میری پراپرٹی ہے، سرکاری نہیں۔" میں نے فائل بند کرتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

"بہت خوب" اس کا لہجہ پھر طنزیہ ہو گیا۔ "آپ کے خیال میں حکومت کو اتنا بھی اختیار نہیں کہ وہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی قدم اٹھا سکے!"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ آپ لوگ میری مرضی و منشا کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ یہ میرا قانونی حق ہے!" مجھے جانے کیوں اس پر غصہ آئے جا رہا تھا۔

"دیکھیں حکومت سے ٹکر لینا کوئی اچھی بات نہیں!" اس نے گویا دھمکی دی۔ "حکومت آپ کو اس کا معاوضہ دے گی، یوں ہی آپ کی جگہ پر قبضہ نہیں کرے گی۔"

"اور اگر میں معاوضہ لینے پر تیار نہ ہوں تو؟" میں نے اسے گھورا۔

"تو مجبوراً" دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

"یعنی آپ زبردستی میری کوٹھی کو مسمار کر دیں گے؟" میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔

"یہ تو وقت بتائے گا کہ کیا ہو گا۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "میرا فرض تھا کہ آپ کو بلا کر یہ بتا دوں کہ اسی مہینے کے اندر اپنی سکونت کا کوئی اور بندوبست کر لیں۔ آپ کے پاس صرف بیس روز ہیں۔ اگر آپ پہلے ہی سے آ جاتے تو ممکن ہے ایک ہفتہ اور مل جاتا۔"

"یہ تو زبردستی ہوئی۔"

"جو بھی سمجھیں آپ! اس سلسلے میں کل تک آپ کو تحریری طور پر حکم مل جائے گا۔" اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی فائل کھولی، پھر بولا۔ "آپ جا سکتے ہیں۔"

"خدا حافظ!" میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں سنیں!" اس نے گویا مجھے چڑایا۔ "اگر آپ چاہیں تو اس سلسلے میں عدالت کا دروازہ بھی کھٹکھٹا سکتے ہیں، لیکن یہ ذہن میں رکھیے گا کہ حاصل کچھ نہیں ہو گا۔"

"میں خوب جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے!" میں نے سخت لہجے میں کہا اور پھر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

پھر جب میں اس کے کمرے سے نکل رہا تھا تو میری سماعت سے ایک آشنا ہنسی کی آواز

ٹکرائی اور میں چونک اٹھا۔ اسی کے ساتھ میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ وہ ہنسی مہ پارہ کی تھی، میری دشمن جاں کی ہنسی! جسے یقیناً میں ہی سننے کا اہل تھا۔

"کہو شیخ یہ کیسی رہی؟" میں نے مہ پارہ کی زہریلی آواز سنی اور پھر دوبارہ اس کی ہنسی کی آواز سنائی دی جو رفتہ رفتہ دور ہوتی چلی گئی۔

تو یہ سارا چکر اس کا چلایا ہوا ہے! چلتے چلتے میں سوچنے لگا۔ اس کا تعلق بھی میرے عمل سے تھا۔ میرے لیے ضروری تھا کہ جس جگہ عمل شروع کیا ہے، وہیں پورے چالیس دن تک بلاناغہ عمل جاری رکھوں۔ عمل کے لیے میں جگہ نہیں بدل سکتا تھا میں نے حساب لگایا۔ ابھی مجھے عمل کرتے ہوئے صرف دس روز ہوئے تھے۔ میرے پاس بیس دن اور تھے، مہلت کے مطابق! گویا دس دن پہلے میری کوٹھی مسمار کر دی جاتی اور میں اس طرح اس جگہ پر عمل جاری رکھنے کی پابندی کو پورا نہ کر پاتا۔

یہ معاملہ پولیس کا نہیں تھا کہ کچھ لے دے کر جان چھوٹ جاتی، میں اسی لیے فکر مند تھا۔ بہرحال ابھی میرے پاس سوچنے کے لیے وقت تھا۔

دوسرے دن مجھے بلدیہ کی طرف سے ایک اور تفصیلی خط ملا۔ اس میں کوٹھی کی قیمت ساٹھ ہزار مقرر کی گئی تھی۔ یہ قیمت تحریر کے مطابق اسیسمنٹ کے بعد مقرر کی گئی تھی۔ لکھا تھا کہ میں اٹھائیس فروری تک کوٹھی خالی کر دوں اور اس کا معاوضہ بلدیہ سے وصول کر لوں۔ میں نے کچھ سوچ کر وہ رجسٹری خط سنبھال کر رکھ دیا۔

تین چار دن اور گزر گئے۔ ابھی تک میں کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ ساتویں دن مجھے عدالت کی طرف سے سمن ملے اور میں کھول کر رہ گیا۔ نصیر الدین نے میرے خلاف مقدمہ دائر کیا تھا۔ دو روز بعد مجھے عدالت میں حاضر ہونا تھا۔ وہ وقت میرے سونے کا تھا۔ دن میں سونا میرے لیے بہت ضروری تھا تاکہ رات کو عمل کرتے وقت میرے ذہن پر غنودگی نہ ہو۔ بہرحال قہراً" و جبراً" مقررہ دن سے پہلے میں نے ایک وکیل کر لیا۔ ایڈووکیٹ چودھری سے میں نے صرف اتنا کہا کہ وہ کسی طرح بھی ایک مہینہ گزار دے۔ اور تاریخیں لیتا رہے، مگر اس کے باوجود مجھے پہلی پیشی پر عدالت پر حاضری دینا ہی پڑی۔ خلاف توقع اگلی تاریخ اسی [illegible] پڑی جب کہ عموماً" ایسا نہیں ہوتا۔ وکیل نے مجھے تسلی دی کہ آپ فکر نہ کریں، میں تاریخ بڑھوا لوں گا۔

مجھے نہ تو اس کوٹھی سے کوئی جذباتی لگاؤ تھا کہ وہیں سکونت پر اصرار کرتا اور نہ ہی نصیر الدین نے مجھ پر جتنی رقم کا دعویٰ کیا تھا، اس کی کوئی پروا تھی۔ سارا مسئلہ وقت کا تھا اور

وقت کسی طرح میرے حق میں نہیں تھا۔ اب میرے ذہن میں یہ بات بھی واضح ہوتی جا رہی تھی کہ نصیر الدین کا معاملہ بھی خالی از علت نہیں۔ اس سلسلے میں بھی مہ پارہ کا ہاتھ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ چاہے جتنا بے ایمان سہی، مگر اتنی دیدہ دلیری کا ثبوت نہیں دے سکتا تھا کہ جو رقم مجھ پر واجب الادا نہیں تھی۔ اس کے لیے دعویٰ دائر کر دیتا۔

بلدیہ کی طرف سے دی جانے والی مہلت پوری ہونے میں پانچ دن باقی تھے کہ مسلسل سوچتے سوچتے آخر میں نے ایک راہ نکال ہی لی۔ اس کا دار و مدار بلدیہ والوں پر تھا کہ وہ میری تجویز پر اتفاق کرتے یا نہ کرتے۔ بہرحال میں نے آخری کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا اور بلدیہ کے دفتر پہنچ گیا۔

مجھے اس افسر سے ملنے کے لیے پورے ایک گھنٹے انتظار کرنا پڑا جس سے پہلے بھی مل چکا تھا۔ موصوف کسی ضروری میٹنگ میں تھے۔ میں اس عرصے میں کھولتا رہا۔ بہرحال کسی طرح خدا خدا کر کے اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور کمرے میں قدم رکھتے ہی گویا میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔

"آپ یقیناً کوئی معاوضہ لینے آئیں ہوں گے!" یہ کہہ کر وہ رکے بغیر مزید بولا۔ "جب تک بلدیہ کو قبضہ نہیں مل جائے گا۔" ادائیگی نہیں ہو گی۔"

"میں معاوضہ لینے نہیں آیا! سمجھے آپ!" میں اپنے غصے پر قابو پا کر آگے بڑھا اور پھر اس کے کہے بغیر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"پھر؟.... پھر کیوں آئے ہیں آپ؟.... میرا وقت بہت قیمتی ہے" وہ منہ بنا کر بولا۔

"آپ کے قیمتی وقت کا مجھے پوری طرح احساس ہے، لیکن میں بھی گھر سے فالتو نہیں ہوں، کوئی وجہ ہے جو آیا ہوں۔"

"بیان کریں۔"

"میری کوٹھی خاصی بڑی ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کو سڑک ہی کشادہ کرنی ہے اور اس لیے پوری کوٹھی مسمار کرنا ضروری نہیں۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"پھر یہ کوٹھی کا نصف حصہ آپ کے لیے کافی ہو گا۔" "نہیں"۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔

"مگر کیوں؟"

"دراصل یہ بات میرے ذہن میں تھی میں نے اسی لیے اوپر والوں کو ایک تجویز پیش کی تھی جس کی منظوری مل گئی ہے۔ اس کے بعد پوری کوٹھی ہی مسمار کرنا پڑے گی۔"

"آپ تو ایسے بات کر رہے ہیں جیسے وہ میری نہیں آپ کی ملکیت ہو!" مجھے دوبارہ غصہ آ گیا۔

"اگر فی الحال نہیں تو چند دن بعد ہو جائے گی۔" اس کی آواز میں چبھن تھی۔ پھر وہ خود ہی بولا۔ "دراصل علاقہ بہت کنجسٹیڈ ہے وہاں کوئی چھوٹا سا پارک بھی ہونا چاہیے۔ میں نے یہی تجویز اوپر بھیجی تھی کہ وہ جگہ خواہ مخواہ خالی پڑی رہے گی، اس سے تو یہ بہتر ہے کہ وہاں پارک بنا دیا جائے۔ اب سڑک کو کشادہ کرنے کے بعد جو جگہ بچے گی وہاں پارک بنے گا۔"

"کیا یہ تجویز واپس نہیں لی جا سکتی؟" میں نے یہ سوال کرتے ہوئے انتہائی ضبط کا مظاہرہ کیا۔

"آپ یہ کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں! سرکاری فیصلے آپ کی مرضی کے تابع نہیں ہوتے! آپ جا سکتے ہیں۔ خواہ مخواہ آپ نے میرا وقت ضائع کیا!"

"مجھے اب عدالت ہی سے رجوع کرنا پڑے گا!" یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔

"ضرور میں نے تو پہلے ہی آپ کو مشورہ دیا تھا، دیر کر دی آپ نے!"

"ہاں یقیناً دیر ہو گئی؟" میں نے کہا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے کمرے سے نکل آیا۔

دراصل وہ کمرا جہاں میں عمل کرتا تھا، کوٹھی کے آخری حصے میں تھا۔ اگر کوٹھی کا نصف بیرونی حصہ مسمار بھی کر دیا جاتا تو فی الحال میں صبر کر لیتا اور وہیں رہتا مگر اس — خبیث نے بالا ہی بالا ایک پارک کی منظوری بھی لے لی تھی۔ اور اب یہ راہ بھی میرے لیے بند کر دی تھی۔ معاملہ صرف دس روز کا تھا۔ اگر کسی طرح دس روز گزر جاتے تو پھر مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔ چاہے بلدیہ والے پوری کوٹھی مسمار کرتے یا آدھی مجھے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔ اب یہی واحد صورت رہ گئی تھی کہ میں اس سلسلے میں عدالت سے رجوع کرتا۔ مجھے کیس جیتنے ہارنے سے بھی کوئی فائدہ یا نقصان نہیں تھا۔ سارا مسئلہ دس دن کا تھا کہ دس دن بلدیہ کو کس طرح کوٹھی مسمار کرنے سے روکا جائے؟

میں وہاں سے سیدھا کچہری پہنچا۔ ایڈووکیٹ چودھری اپنے دفتر میں نہیں تھا۔ اس کے محرر نے بتایا کہ چودھری صاحب کسی کیس کی پیروی کرنے کسی عدالت میں گئے ہیں۔ مجھے تقریباً پون گھنٹے انتظار کرنا پڑا اور اس عرصے میں بہت بیزار ہوا۔ ان دونوں میری نیند بھی پوری نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے طبیعت میں اور بھی جھنجھلاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔

"کہیے چودھری صاحب، کیسے آنا ہوا؟" ایڈووکیٹ چودھری نے آتے ہی خوش مزاجی سے پوچھا۔ "کیس کی تاریخ تو پرسوں ہے" وہ غالباً یہ سمجھا تھا کہ میں نصیر الدین والے

کیس میں اس سے ملنے آیا ہوں۔"

"وہ مسئلہ نہیں چودھری صاحب!" میں بولا۔ "وہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ اس کیس میں نئی تاریخ لے لیں گے۔"

"پھر؟" وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "کیا کوئی نیا چکّر ہے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا اور پھر ازاول تا آخر اسے ساری بات بتا دی۔

"ہوں!" وہ کچھ سوچنے لگا پھر ذرا دیر بعد بولا۔ "اس سلسلے میں بلدیہ کی طرف سے آپ کو جو خط ملے ہیں' وہ لائے ہیں اپنے ساتھ؟"

"نہیں' اس وقت تو نہیں لایا۔" میں نے جواب دیا "دراصل اس وقت میں بلدیہ کے دفتر ہی سے آرہا تھا۔" پھر میں نے آج وہاں جانے کی وجہ بھی بتا دی اور بلدیہ والوں کے نئے فیصلے سے بھی آگاہ کر دیا کہ وہ وہاں پارک بھی بنانا چاہتے ہیں۔

"بات دراصل یہ ہے شیخ صاحب کہ اس معاملے میں صوبائی حکومت کا ایما بھی شامل ہے۔ اور بہ راہ راست گورنر نے اس سلسلے میں حکم دیا ہے اس لیے....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہہ دیں چودھری صاحب!" میں نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ "میں ہر بات سننے کے لیے تیار ہوں۔"

"اگر صرف بلدیہ کا معاملہ ہوتا تو کامیابی کے امکانات تھے' اس کیس میں! آپ نے جو صورت حال بتائی ہے' اس میں مشکل ہی ہے کہ ہم کیس جیت سکیں۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں آپ کو دم دلاسے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ بہرحال آپ ایسا کریں کہ آج رات کو سات آٹھ کے درمیان گھر وہ کاغذات لے کر آجائیں ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے۔"

ٹھیک ہے' میں آجاؤں گا اور آپ کو کوئی نہ کوئی راہ نکالنا ہی پڑے گی!" میں نے زور دے کر کہا۔

"دیکھتے ہیں' اللہ مالک ہے۔ آپ آئیں تو سہی۔ یہ کہہ کر چودھری اپنے محرر سے کسی کیس کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"اچھا میں چلتا ہوں اب!" میں نے اس سے اجازت چاہی۔

"خدا حافظ! اس نے میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ بلدیہ کی جانب سے مجھے دو ہی خط ملے تھے' میں رات کو وہ خط لے کر ساڑھے سات بجے کے قریب ایڈووکیٹ چودھری کے گھر پہنچ گیا۔

"میں نے آپ کی کوٹھی دیکھی ہے۔" ایڈووکیٹ چودھری ایک خط پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "انہوں نے ساٹھ ہزار روپے بہ طور معاوضہ بہت کم لگائے ہیں۔ اسیسمنٹ صحیح نہیں ہوا۔"

"مجھے رقم سے کوئی دلچسپی نہیں چودھری صاحب!" میں نے صاف گوئی سے کہا۔ "اگر یہ رقم ساٹھ ہزار کی بجائے آٹھ ہزار بھی ہوتی تو میرے لیے کوئی فرق نہ پڑتا۔ میں تو دراصل یہ چاہتا ہوں کوٹھی پر بلدیہ کا قبضہ نہ ہو۔

یہ تو مشکل ہے شیخ صاحب! میں آپ کو جھوٹی تسلیاں دینا نہیں چاہتا' اور یوں بھی اب وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں پہلے ہی مجھ سے مشورہ کر لینا چاہیے تھا۔" اس نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ بھی ممکن نہیں کہ صرف چند دن معاملہ ٹل جائے؟" میں نے پوچھا۔

"میں سمجھا نہیں' چند دن سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اس نے وضاحت چاہی۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ دس مارچ تک کوٹھی کو مسمار نہ کیا جائے۔" میں نے عمل کی مدت کو ذہن میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' آپ نے نصیر الدّین والے کیس میں بھی شاید اسی تاریخ کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ اگلی تاریخ بہرحال دس مارچ کے بعد پڑنی چاہیے۔ کیا دس مارچ کی کوئی خاص اہمیت ہے آپ کی نظر میں؟ کہیں کسی نجومی وجومی نے تو آپ کو یہ تاریخ نہیں بتا دی؟" وہ مسکرا کر بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں چودھری صاحب!" میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ "میں نجومیوں کے چکّر میں نہیں پڑتا۔ میں نے دانستہ ایک جھوٹ بولا۔ "دراصل دس مارچ کو میں ایک کاروباری معاہدہ کرنے والا ہوں جس کے بعد مجھے بڑی رقم مل جائے گی۔ ظاہر ہے کہ جب ہاتھ میں پیسا ہوتا ہے تو پھر مسئلہ' مسئلہ نہیں ہوتا۔ آدمی جو چاہے کر سکتا ہے"

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے میری تائید کی۔

"ہاں تو پھر میرا سوال..... یعنی دس مارچ تک ممکن ہے کہ بلدیہ کو کوئی قدم اٹھانے سے روکا جا سکے؟"

"میں اپنی گفتگو کے آغاز میں ایک بات کہی تھی جس پر آپ نے زیادہ توجہ نہیں دی۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"کیا؟"

"یہ کہ اسسیمنٹ صحیح نہیں ہوا۔" اس نے جواب میں کہا۔ "اس بنیاد پر وقت کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کو رقم سے کوئی دلچسپی ہے یا نہیں' اسے بہرحال جواز بنایا جا سکتا ہے کہ صحیح قیمت مقرر نہیں کی گئی۔ اگر آپ کہیں تو کیس تیار کرتا ہوں۔"

"اس طرح کیا آپ کو امید ہے کہ مطلوبہ مہلت مل جائے گی۔" میں نے دریافت کیا۔

"کیوں نہیں۔" وہ بولا۔ "پہلا کام تو ہم یہ کریں گے کہ اس سلسلے میں عدالت سے اسٹے آرڈ لے لیں گے۔ اس کے بعد اسسیمنٹ کی درخواست دیں گے۔ ری اسسیمنٹ میں بہرحال اتنا وقت تو گزر ہی جائے گا۔"

"یعنی یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا؟"

"وقت سے پہلے کیا کہا جا سکتا ہے! ظاہر ہے کہ قیاس ہی ممکن ہے۔"

اگر انہوں نے دس مارچ سے پہلے ری سسیمنٹ کی کارروائی مکمل کر لی تو؟"

"آپ تو ناحق گھبرا رہے ہیں شیخ صاحب!" وہ ہنسا۔ "ارے بھائی' کوئی ضروری تو نہیں کہ ہم اس اسسیمنٹ کو قبول ہی کر لیں۔ اس پر بھی تو اعتراض داخل کیا جا سکتا ہے! یہ عدالتی معاملات ہیں وقت کو کس طرح ٹالا جاتا ہے' اس کے چھپتر طریقے ہم لوگوں کے پاس ہیں۔ نتائج کیا نکلتے ہیں کیا نہیں' اس سے تو بہرحال آپ کو کوئی دلچسپی نہیں' صرف وقت ٹالنے ہی کا تو معاملہ ہے۔ وہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ یہی تو ہوگا نا کہ ہماری درخواست خارج ہو جائے گی' ہم کیس ہار جائیں گے جس کے لیے آپ پہلے سے تیار ہیں پھر فکر کی کیا بات ہے!"

"تو پھر ٹھیک ہے چودھری صاحب' آپ کیس تیار کریں۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"پھر آج ہی رات مجھے تیاری کرنا پڑے گی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی میز کی دراز کھولی اور وکالت نامہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ "اس پر دستخط کر دیں۔"

میں نے وکالت نامے پر دستخط کر دیے اور پھر اس کی فیس بھی ادا کر دی۔ وہ مہنگا وکیل ضرور تھا' مگر میں اس سے پوری طرح مطمئن تھا۔ اس نے بہرحال اس وقت میرے ذہن پر سے ایک بہت بڑا بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔

"آپ صبح ساڑھے نو بجے کچہری آ جائیے گا۔ اس نے چلتے وقت مجھ سے کہا۔

"بہتر ہے۔" میں نے جواباً" اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور اٹھ

کھڑا ہوا۔

دوسرے دن بہ مجبوری مجھے پھر نیند کی قربانی دینی پڑی اور میں وقت پر کچہری پہنچ گیا حالانکہ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ پھر جب ایڈووکیٹ چودھری نے اسی روز عدالت سے اس اسٹے آرڈر حاصل کر لیا تو مجھے سکون ہوا۔ اب بلدیہ فوری طور پر میری کوٹھی کو مسمار نہیں کر سکتی تھی۔ چودھری نے اسسیمنٹ کی درخواست بھی اسی دن دے دی تھی اور اس بنیاد پر اسٹے آرڈر ملا تھا۔

جزوی طور پر مہ پارہ کا یہ حربہ ناکام ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں میرا دل کچھ مطمئن سا نہیں تھا۔ ہر لمحے مجھے یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ خدا جانے کب کیا ہو جائے! اسی فکر نے میری صحت پر بھی برا اثر ڈالا تھا۔ میں تو پہلے ہی سے زیر علاج تھا اور دواؤں کے بل پر چل رہا تھا' ان واقعات نے اور مجھے توڑ کے رکھ دیا۔

دوسرے دن صبح جب ڈاکٹر امتیاز میرے گردن کے زخم کی ڈریسنگ کرنے آیا تو میں نے اس سے اپنا چیک اپ بھی کرایا اور شکایت کی۔ "پہلے کی نسبت میں اب کافی جسمانی کمزوری محسوس کرنے لگا ہوں ڈاکٹر۔"

"مجھے تو یہی حیرت ہے شیخ صاحب کہ آپ چلتے پھرتے کیسے ہیں!" ڈاکٹر امتیاز بولا۔ "آپ کا مرض آخری مراحل میں ہے اور آپ کو آرام کی شدید ضرورت ہے۔"

"بس ان دنوں یہی ممکن نہیں ڈاکٹر!" میں پژمردگی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو میں کہوں گا کہ راتوں کو جاگنا اور عبادت کرنا چھوڑ دیں۔ آپ کی صحت اس کی اجازت نہیں دیتی۔"

"صرف چند دن کی بات ہے ڈاکٹر!" میرے منہ سے جانے کیسے یہ بات نکل گئی۔

ڈاکٹر امتیاز اس بات کا اور ہی مطلب سمجھا اور مجھے تسلی دینے لگا۔ "ایسی کوئی بات نہیں شیخ صاحب! زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ رپورٹس کے مطابق تو آپ موجودہ حالت بھی قابل یقین ہے آپ کو بستر سے ہلنا بھی نہیں چاہیے' مگر آپ خدا کے فضل سے چلتے پھرتے ہیں اور بہ ظاہر صحت مند بھی نظر آتے ہیں۔"

میں اس کی بات پر صرف مسکرا کر رہ گیا۔ مجھے مسکراتے دیکھ کر لمحے بھر کو اس کے چہرے پر حیرت نظر آئی' پھر وہ بھی خواہ مخواہ مسکرانے لگا۔ ظاہر ہے کہ اسے یہ بات کس طرح معلوم ہو سکتی تھی کہ میں چند دن کی بات کیوں کہی ہے!

عمل کرتے ہوئے اب تک چھبیس دن گزر چکے تھے اور یہ ستائیسویں شب کا ذکر ہے

کہ میں صبح ہونے سے قبل اپنے کمرے سے نکل کر حسب معمول چوراہے پر روٹی رکھنے جا رہا تھا۔ اب تک میرا عمل تمام شرائط کے ساتھ پوری طرح جاری تھا۔ صدر دروازے تک پہنچنے کے لیے ابھی میں ایک راہداری سے گزر رہا تھا کہ مجھے معاً اپنی دائیں جانب کچھ آہٹیں سی محسوس ہوئیں اور پھر پھنکار سی سنائی دی۔ بے اختیار میری نگاہ اس پر اٹھ گئی اور میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا میرے قدم غیر ارادی طور پر خود بہ خود رک گئے تھے۔ اس طرف میری ایک ہندو بنگالی ملازمہ کا کمرا تھا۔ اس کمرے میں مجھے خفیف سی روشنی دکھائی دی جو کچھ غیر فطری سی تھی۔ وہ نہ بلب کی روشنی معلوم ہو رہی تھی نہ کسی چراغ کی کمرے کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور ایک بڑا سا سانپ اس کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال آنا فطری امر تھا کہ میری بنگالی ملازمہ سریتا کی زندگی خطرے میں ہے۔ سانپ کمرے میں داخل ہو کر اسے ڈس لیتا۔ فوری طور پر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ سریتا کو اس خطرے سے آگاہ کر دوں، مگر دوسرے ہی لمحے جیسے مجھے ہوش آ گیا۔ مجھے عمل کی شرائط کے مطابق چوراہے پر روٹی رکھ کر واپس آنے تک کسی سے کلام نہیں کرنا تھا۔ اگر میں دانستہ یا نادانستہ ایسا کر گزرتا تو عمل باطل ہو جاتا۔

مہ پارہ کا ایک اور حربہ! میں نے سوچا اور دل ہی دل میں ہنسا۔ پھر میرے قدم تیزی سے صدر دروازے کی طرف اٹھنے لگے۔ خیریت یہ ہوئی تھی کہ میں اس دوران مڑ کر نہیں دیکھا تھا، صرف چلتے ہوئے رک کر اس طرح نگاہ اٹھائی تھی۔ سریتا کے کمرے میں غیر فطری سی روشنی نظر آنا اور پھر کھڑکی کے راستے سانپ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھنا، میرے نزدیک یہ سب کچھ فریب نظر تھا۔

کچھ دیر بعد میں اپنی کوٹھی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ صبح ہونے میں ابھی ذرا دیر تھی اور ہر طرف سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے کوٹھی میں قدم رکھا تو مجھے خلاف معمول اپنے اعصاب پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔ میری واپسی اسی راہداری سے ہونا تھی جس سے گزر کر میں باہر گیا تھا۔ اب میں چوراہے پر اپنے ہمزاد کے لیے روٹی رکھ کر آ چکا تھا اور عمل کی تمام شرائط پوری کر دی تھیں۔ اب کسی بھی فریب نظر یا فریب سماعت یا میرے بولنے سے عمل باطل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس راہداری سے گزرتے ہوئے میں چونک اٹھا۔ سریتا کے کمرے میں اب بھی وہی پراسرار روشنی نظر آ رہی تھی۔ اسی کے ساتھ میں نے یہ محسوس کیا کہ کوئی مدھم اور دبی دبی زبان میں.... کچھ کہہ رہا ہے۔ یہ آواز سو فی صد مردانہ تھی۔ میں رک گیا۔ اب میں بجا طور پر یہ سوچنے میں حق بہ جانب تھا کہ کوٹھی سے جاتے ہوئے میرے نگاہ سے جو منظر گزرا

تھا، وہ فریب نظر ہرگز نہیں تھا۔ کچھ نہ کچھ تھا ضرور! کیا؟ یہی جاننے کے لیے دبے پاؤں اس طرف بڑھا کمرے کا دروازہ بند تھا، مگر کھڑکی اب تک کھلی ہوئی تھی۔ میں دیوار سے لگ کر کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ کمرے کا اندرونی منظر اب تک میری نظروں سے اوجھل تھا، مگر اندر گونجنے والی سرگوشیاں اب مجھے واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔

وہ مردانہ آواز میرے ملازمین میں سے کسی کی نہیں تھی وہ آواز میرے لیے قطعی اجنبی تھی۔

"کون شیخ کرامت! میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ تو میرے ساتھ چل! میں کچھ اور سننا نہیں چاہتا!" مجھے مردانہ آواز سنائی دی وہ جو کوئی بھی تھا، یقیناً سریتا سے مخاطب تھا۔

"میں تیری بنتی کرتی ہوں، مجھے یہاں چین سے رہنے دے اور چلا جا!" یہ التجا آمیز آواز سریتا کی تھی۔

"ہاں یہ تو تو نے بتایا ہی نہیں ابھی کہ کہیں اس شیخ کے بچے نے تجھے خراب تو نہیں کر دیا! بول.... جواب دے اگر اس نے ایسا کیا ہے تو ---- تو پھر وہ میرے انتقام سے نہیں بچ سکے گا۔"

"تو.... تو.... یہاں آ کیسے گیا؟ میرے بند کمرے میں! مجھے.... مجھے تو یہی حیرت ہے۔" سریتا کی آواز آئی۔

جواب میں ہلکی سی مردانہ ہنسی کی آواز سنائی دی، پھر کہا گیا۔ "میں یہاں اپنی شکتی کے بل پر آ گیا۔ تو اگر سات پردوں میں ہوتی تو میں تجھ تک پہنچ جاتا۔ تجھے نہیں معلوم سریتا کہ میں نے تیری خاطر کتنے بنوں کی خاک چھانی ہے اور کتنی تپسیا کی ہے۔ جب مجھے یہ گیان پراپت ہوا ہے۔ تو اسی سے سمجھ لے کہ مجھ میں کتنی شکتی آ گئی ہے! کیا تو بھول گئی کہ تیری ہی خاطر میں نے شنکر کا خون کر دیا تھا کیوں کہ وہ تجھے چاہنے لگا تھا اور میں اپنے کسی رقیب کو برداشت نہیں کر سکتا چاہے وہ شنکر ہو یا۔"

"مگر میں تو آج بھی شنکر کو چاہتی ہوں اور.... اور تجھ سے نفرت کرتی ہوں خبیث بوڑھے!" سریتا کی آواز میں بلا کی نفرت تھی۔ "ہاں مجھے خبر ہے کہ شنکر کو کسی سانپ نے نہیں، تو نے ڈسا تھا۔ تو نے ہی اس کی جھونپڑی میں زہریلے سانپ کو لا کر چھوڑا تھا۔ چلا جا شمبھو۔ چلا جا یہاں سے ورنہ.... میں تیرا خون کر دوں گی!" اب سریتا کی آواز کچھ تیز ہو گئی تھی۔

"غصہ کرتی ہے تو مجھے تو اور بھی پیاری لگتی ہے" ڈھٹائی سے کہا گیا، پھر ہنسی کی آواز آئی۔

"تو میری بے بسی پر ہنس رہا ہے! اچھا.... میں بتاتی ہوں تجھے!" سریتا کی آواز میں شدید غصہ تھا۔

پھر میں نے قدموں کی چاپ سنی۔ شاید سریتا غصّے میں اس اجنبی شمبھو کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اب تک میں بڑے صبر و سکون اور ضبط کے ساتھ سب کچھ سنتا رہا۔ میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ مگر اب میری قوّت برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔ یہ میرے لیے توہین کی بات تھی کہ کوئی اجنبی اس طرح میرے گھر میں داخل ہو کر میری ایک ملازمہ کو دھمکیاں دے اور ملازمہ بھی وہ جو میری منظور نظر تھی! اس کے علاوہ اس نے خود میرے لیے بھی توہین آمیز الفاظ استعمال کیے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں مداخلت کرتا، مجھے سریتا کی خوف زدہ سی آواز سنائی دی اور اسی وقت میں نے کسی کے زمین پر گرنے کی آواز بھی سنی۔ میں نے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر کھڑکی سے کمرے کے اندر جھانکا۔ میں نے اپنی زندگی میں بڑے عجیب اور حیرت انگیز منظر دیکھے ہیں، مگر وقتی طور پر مجھے کمرے کے اندرونی منظر نے جیسے اپنے سحر میں گرفتار کر لیا۔ میری پہلی نظر سریتا پر پڑی۔ وہ فرش پر چت پڑی تھی اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے کے قریب ایک بڑا سا سیاہ سانپ پھن کاڑھے جھوم رہا تھا۔ سانپ کی آنکھیں غیر معمولی طور پر بڑی تھیں اور انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سانپ کی آنکھوں سے روشنی نکل رہی ہو جو براہ راست سریتا کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس سرخ روشنی میں سریتا کا حسین چہرہ بے حد عجیب لگ رہا تھا۔

یہ صرف چند لمحے کا منظر تھا۔ جو میرے ذہن پر جیسے جم کر رہ گیا تھا۔ معاً میں نے سانپ کو جیسے چونکتے دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کا رخ کھڑکی کی طرف ہو گیا، بالکل اس طرح جیسے اس نے میری موجودگی کو محسوس کر لیا ہو۔ میرے جسم میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی پھر میں نے اس سانپ کو تیزی سے کھڑکی کی طرف آتے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے اب بھی شعلے سے لپک رہے تھے۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس وقت میں گھبرا گیا۔ میں اسی خوف کے زیر اثر انتہائی تیزی کے ساتھ کھڑکی سے ہٹ گیا۔ اب مجھے سانپ کی پھنکار بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں بے حواس سا ہو کر راہداری میں بھاگنے لگا۔ پھر میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر ہی سکون کا سانس لیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ فوراً ہی میری نگاہ کھڑکی کی طرف اٹھی تھی جو بند تھی جس دن سے میں نے عمل شروع کیا تھا کھڑکی بند ہی رہتی تھی۔ وہ

ایسا خوف ہی کا اثر تھا کہ میں یہ بات بھول گیا تھا۔ میرے ملازم ارشاد علی نے مجھے اس طرح بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر یقیناً کچھ سوچا ہو گا، مگر وہ بولا کچھ نہیں۔ پھر بعد میں بھی اس کی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ کچھ پوچھتا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے یہ عجیب بات محسوس کی کہ پہلے مجھے اپنے اعصاب پر بوجھ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ خوف میں بھی بڑی حد تک کمی آ گئی تھی کچھ دیر کے بعد میرے حواس معمول پر آ گئے اور میں گزرے ہوئے پُراسرار واقعے کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ واقعہ یقیناً فریب نظر نہیں تھا اور نہ اس کا کوئی عقلی جواز ہی ممکن تھا۔ میں نے اپنی ملازمہ سریتا کے کمرے میں واضح طور پر ایک فرد کی آواز سنی تھی، مگر جب کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو وہاں سریتا کے سوا مجھے صرف ایک سیاہ سانپ نظر آیا۔ اگر واقعی وہاں کوئی آدمی تھا تو وہ کہاں گیا؟

اسی سوال نے مجھے ایک نئی راہ سجھائی۔ اب تک بہ راہ راست میرے تجربے میں تو کوئی ایسی بات نہیں آئی تھی، ہاں میں نے اس کے متعلق سنا ضرور تھا۔ عموماً یہ قوت جنّات کے متعلق مشہور تھی کہ وہ جس کا جسم چاہیں اپنا لیتے ہیں، خصوصاً جانوروں کا جسم! میں نے سنا تھا کہ جنّات، کتے، بلی اور سانپ کی شکل میں بھی ظاہر ہو جاتے ہیں، لیکن اس کی تصدیق نہیں ہوئی تھی۔ پیش آنے والے واقعے کو میں اسی نہج پر سوچ رہا تھا۔ پہلے میں نے ایک سانپ کو سریتا کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا، پھر لوٹ کر آیا تو اس کے کمرے سے مجھے کسی آدمی کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد مجھے وہاں کوئی آدمی نظر نہیں آیا بلکہ وہی سانپ دکھائی دیا۔ اگر اس مفروضے کو درست مان لیا جاتا کہ پُراسرار قوتیں رکھنے والا کوئی شخص، سانپ بن کر وہاں آیا تھا تو کوئی الجھن نہیں رہتی تھی۔ وہ سانپ کی جون میں وہاں آیا اور پھر کمرے میں پہنچ کر دوبارہ اپنے اصل جسم میں ظاہر ہو گیا۔ پھر جب سریتا غصّے میں اس کی طرف بڑھی تو سریتا کو خوف زدہ کرنے کے لیے وہ دوبارہ سانپ بن گیا۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر وہ کون تھا جس کی آواز میں نے سنی تھی؟ اس سے قطع نظر سریتا کے اور اس کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی، اس سے بھی یہی ظاہر ہوا تھا کہ اس شخص کے پاس کچھ پُراسرار اور غیر معمولی قوتیں ضرور ہیں جس کا اس نے دعویٰ بھی کیا تھا۔

سریتا کے ماضی کے بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں تھا اور نہ میں نے اس کی کبھی ضرورت محسوس کی تھی۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ بنگال کے کسی گاؤں کی ہے۔ اب سے کئی سال پہلے میرا ملازم خاص ارشاد علی اسے لے کر آیا تھا اور میں نے اسے پسند کر لیا تھا۔

ارشاد علی کو علم تھا کہ میں بدصورت ملازماؤں کو پسند نہیں کرتا اس کے علاوہ وہ اور بہت کچھ بھی جانتا تھا۔ اسے میرے ذوق اور پسند کا پورا اندازہ تھا۔

اب سریتا کی جو کہانی مجھ پر ظاہر ہوئی تھی، وہ مختصراً" یہ تھی کہ وہ کسی نوجوان شنکر سے عشق کرتی تھی جسے ایک بوڑھے شخص شمبھو نے رقابت میں قتل کردیا تھا۔ سریتا اس بوڑھے سے نفرت کرتی تھی اور یہ نفرت اب بھی برقرار تھی۔ شنکر کے قتل کے بعد مجھ تک وہ کیسے پہنچی اور درمیان میں کتنا عرصہ گزرا، اسے کیا واقعات پیش آئے، کن حالات سے گزرنا پڑا یہ سب کچھ تاریکی میں تھا۔ درمیانی کڑیاں غائب تھیں۔ ان کڑیوں کو جوڑنے کی صورت صرف یہی تھی کہ میں اس سلسلے میں سریتا سے استفسار کرتا۔ اس استفسار کی ضرورت یوں بھی تھی کہ اس شخص نے سریتا سے ایک ایسی بات بھی پوچھی تھی جو مجھے کھٹک گئی تھی۔ اس کے یہ الفاظ اب میرے کانوں میں گونج رہے تھے کہ کہیں اس شیخ کے بچے نے تجھے خراب تو نہیں کردیا؟ اگر اس نے ایسا کیا ہے تو پھر وہ میرے انتقام سے نہیں بچ سکے گا۔ یہ صورت حال بہرحال میرے لیے تشویش ناک تھی۔ پھر میرے لیے یہ بات بھی ایک معما تھی کہ میری موجودگی کو محسوس کرکے وہ وہاں مزید کیوں نہیں ٹھہرا، میری طرف کیوں لپکا؟

بیٹھے بیٹھائے خواہ مخواہ میرا ایک دشمن پیدا ہوگیا تھا اور اگر میرے اندازے درست تھے تو وہ دشمن میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا، خصوصاً" ایسی صورت میں جب کہ میرا عمل ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ اگر ہمزاد دوبارہ میرے قابو میں آجاتا تو یقیناً میں اس سے نمٹ سکتا تھا، مجھے اس کی طرف سے خوف زدہ ہونے کی اتنی ضرورت نہیں تھی، مگر فی الحال صورت مختلف تھی۔ اسی دوران میں فجر کا وقت ہوگیا۔ میں نے نماز پڑھی اور پھر ہلکا سا ناشتا کرکے سونے کو لیٹ گیا۔ سریتا سے گفتگو کو میں نے سو کر اٹھنے تک موقوف کردیا تھا۔ میں ابھی لیٹا ہی تھا کہ ارشاد علی نے ڈاکٹر امتیاز کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ میری ہدایت پر صبح ہی صبح آجاتا تھا تاکہ میری نیند خراب نہ ہو وہ ڈریسنگ کرکے چلا گیا تو مجھے سونے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ رات بھر جاگ کر یوں بھی جلد ہی نیند آجاتی ہے۔

دوپہر کو سو کر اٹھنے کے بعد حسب معمول میں نے نہایا، لباس تبدیل کیا، نماز پڑھی، کھانا کھایا، پھر کچھ دیر آرام کیا، اس کے بعد ارشاد علی کو بلایا۔ ارشاد علی کیوں کہ رات کے وقت کمرے کے دروازے پر متعین رہتا تھا اس لیے اس نے اپنے معمولات بھی وہی رکھے تھے جو میرے تھے۔ وہ نہایت خدمت گزار اور فرماں بردار تھا اور میں اسے خدمت گزاری کا پورا صلہ بھی دیتا تھا۔ آواز دینے کے بعد وہ فوراً" ہی اندر آگیا۔

"ذرا سریتا کو بلا کر لاؤ۔" میں نے اسے حکم دیا۔

"جی.... جی.... جناب!" وہ کچھ متعجب سا ہو کر بولا اور پھر مڑ گیا۔ اسے کے تعجب کی یہی وجہ رہی ہوگی کہ میں نے خود ہی پہلے اسے یہ حکم دیا تھا کہ کسی بھی ملازمہ کو میرے کمرے میں داخل نہ ہونے دے۔ اسی سبب میرے کمرے کی صفائی بھی ان دنوں وہی کرتا تھا۔

کچھ دیر بعد ارشاد علی پھر کمرے میں داخل ہوا مگر اس کے ساتھ سریتا نہیں تھی۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے میں ہی پوچھ بیٹھا۔ "سریتا نہیں آئی؟"

"وہ تیز بخار میں تپ رہی ہے جناب، اور اس قابل نہیں کہ اپنے پیروں پر چل کر یہاں آسکے۔" اس نے جواب دیا۔

"بخار میں تپ رہی ہے!" میں بڑبڑایا، پھر بولا۔ "اس کے لیے کوئی دوا لے کر آیا؟"

"یہ.... یہ میں نہیں پوچھ سکا جناب!"

"ٹھیک ہے، میں خود اس کے کمرے میں جا کر اسے دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں، بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر جلد ہی میں، سریتا کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اسے واقعی تیز بخار تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بستر سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"لیٹی رہو!" میں بولا اور پھر سب سے پہلے اس سے دوا کے بارے میں پوچھا۔

"جی صاحب منگالی تھی، حال کہہ کے" وہ بولی۔

"پی بھی یا نہیں؟" میں نے سوال کیا۔ میرے لہجے میں محبت تھی۔ دراز قد اور نازک سی وہ لڑکی مجھے حقیقتاً بہت پسند تھی۔ اس کا "صاحب جی" کہنا تو مجھے اور بھی اچھا لگتا تھا۔ بڑا بھولپن ہوتا تھا، اس کی آواز میں!

"دو خوراک پی ہے پر ابھی کوئی فرق نہیں پڑا صاحب جی!" اس نے میرے سوال کا جواب دیا۔ شہر میں اتنے دن رہ کر وہ بڑی صاف اردو بولنے لگی تھی۔ اس کی وجہ میری صحبت بھی تھی کیوں کہ میں اسے ٹوکتا رہتا تھا۔

اس وقت کمرے میں میرے اور اس کے سوا کوئی نہیں تھا، پھر بھی میں نے اٹھ کر دروازہ بند کردیا۔ جب میں پلٹا تو وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

میں اس بار اسی کے بستر پر بیٹھ گیا اور پھر گفتگو شروع کی "مجھے معلوم ہے سریتا کہ تمہیں بخار کیوں آگیا ہے! تم یقیناً اس عجیب واقع سے خوف زدہ ہوگئی ہو جو تمہیں صبح ہونے سے کچھ پہلے پیش آیا تھا۔ مجھے ابھی تک تمہارے چہرے پر خوف نظر آرہا ہے۔"

خوف!... نہیں تو صاحب جی! میں خوف زدہ نہیں ہوں؟ وہ حیران سی ہو کر بولی۔

"آپ کس واقعے کا ذکر کر رہے ہیں؟ مجھے تو کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔"

"مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ سریتا! مجھے سب معلوم ہو چکا ہے" میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیا صاحب جی؟... میں تو کچھ نہیں سمجھی۔" وہ بڑی معصومیت سے بولی۔

"سنو اس نے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "تم میری ہو اور میری ہی رہو گی۔ تمہاری حفاظت کی ذمے داری بھی میری ہے۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"مگر کون صاحب جی؟" اس کے لہجے میں اب بھی حیرت تھی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جھوٹ بولتے ہوئے بھی وہ اتنی معصوم کیوں نظر آ رہی ہے!

"تمہیں یقیناً یہ خبر نہیں ہو گی کہ جب وہ تمہارے کمرے میں تھا تو میں نے اس کی گفتگو سن لی تھی۔"

"کس کی گفتگو صاحب جی؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میرے سمجھ میں تو بھگوان کی قسم کچھ بھی نہیں آ رہا۔" وہ زچ سی ہو کر بولی۔

اب مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ "تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا یا تم سمجھنا نہیں چاہتیں!" میرے لہجے میں ہلکی سی سختی تھی۔

"آپ اس طرح ناراض ہو کر تو بات نہ کریں صاحب جی! آپ بتائیں تو سہی کہ آخر بات کیا ہے! یقیناً آپ کو میری طرف سے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ مجھ پر شک ہو گیا ہے آپ کو! یقین کریں صاحب جی، میرے کمرے میں کوئی نہیں تھا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "کیا آپ... آپ کو صاحب جی مجھ پر بھروسا نہیں؟ آپ... آپ کے سوا صاحب جی میں نے کسی دوسرے مرد کا منہ نہیں دیکھا۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو سریتا!" میں نے اپنا لہجہ بدل دیا۔ "میں تم پر کوئی الزام نہیں لگا رہا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اس سے نفرت کرتی ہو اور اپنے کانوں سے اس کی وجہ بھی سن چکا ہوں۔ تم اسی لیے اس سے نفرت کرتی ہو، ناکہ اس نے تمہارے محبوب کو قتل کر دیا تھا! یہی بات چھپائی ہے نا؟"

"میرے... محبوب کو... اس نے قتل کر دیا تھا۔" اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ پھر وہ مجھے حیران حیران سی نظروں سے دیکھنے لگی اور اس کے ہونٹ اس طرح کانپنے لگے جیسے کچھ کہنا

چاہتی ہو۔

"ہاں ہاں، کہو کہو! ڈرو مت!" میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"مگر یہ بات... اس بات کو تو برسوں بیت گئے اور... اور میں نے اس کا ذکر بھی کبھی کسی سے نہیں کیا۔ پھر... پھر..." اس کا انداز اب بھی خود کلامی کا سا تھا۔ "پھر کسی کو صاحب جی کو کیسے یہ بات معلوم ہو گئی" شنکر وہ اسے تو میں... میں نے بھول جانا چاہا تھا، پھر... پھر..."

"اور شمبھو کے بارے میں کیا خیال ہے سریتا؟"

میرا یہ سوال سن کر وہ ایک دم چونک اٹھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں اور خود مجھے بھی اس کے اس رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔ میں اسے بتا چکا تھا کہ سب کچھ اپنے کانوں سے سن چکا ہوں پھر اس قدر حیرت زدہ ہونے کی وجہ کیا تھی!

"آپ... صاحب جی، شمبھو کو کیسے جانتے ہیں؟" بالآخر اس کے لبوں کو حرکت ہوئی۔

"دیکھو سریتا، تمہیں بتا چکا ہوں کہ تم دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو میں نے سن لی ہے، پھر تم یہ سوال کیوں کر رہی ہو؟" اس کے بعد میں نے تفصیل کے ساتھ وہ سارا واقعہ بیان کر دیا، صرف اس میں ایک ترمیم ضرور کر دی تھی۔ اس کا سبب یہ کہ کوئی بھی مرد، عورت کے سامنے اپنی بزدلی کا اعتراف نہیں کرتا۔ میں سانپ والے معاملے کو گول کر گیا تھا ورنہ وہ مجھ سے پوچھ سکتی تھی کہ میں نے اسے خطرے میں کیوں چھوڑ دیا؟ یا اگر پوچھتی بھی نہیں تو دل میں یہ ضرور آتا کہ میں بزدل ہوں۔ میں نے اس سے صرف گفتگو سن لینے کا اقرار کیا تھا وہ بھی وہاں تک جب اسے شمبھو پر غصہ نہیں آیا تھا میرا مقصد یہ تھا کہ مجھ سے وہ تمام باتیں سن کر اور یہ جاننے کے بعد کہ مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے وہ پردہ داری سے کام نہ لے۔ میں نے اسی دوران میں یہ بات محسوس کی کہ وہ میری باتوں کو بڑی دلچسپی اور حیرت سے سن رہی تھی جیسے وہ باتیں اس کے لیے نئی ہوں۔ اگر وہ اداکاری کر رہی تھی تو یقیناً کمال درجے کی اداکاری تھی۔

میں پورا واقعہ بیان کر چکا تو اس نے شدید حیرت کا اظہار کیا اس کے چہرے پر بھی حیرت اور الجھن کے آثار تھے۔

"مجھے تو کچھ خبر نہیں صاحب جی! ہاں یہ ضرور تعجب کی بات ہے کہ میں سوئی تو بستر پر تھی، لیکن جب آنکھ کھلی تو میں زمین پر تھی۔"

"سریتا!" میرے لہجے میں سختی آ گئی۔ "کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ کیا یہ غلط ہے کہ

تم کسی شنکر سے محبت کرتی تھیں؟ اور کیا یہ بھی غلط ہے کہ اسے شمبھو نے قتل کر دیا تھا؟"

"یہی.... یہی تو مجھے حیرت ہے صاحب جی کہ.... کہ یہ باتیں سچ ہیں، مگر شمبھو.... وہ.... وہ تو رات کو میرے پاس نہیں آیا۔"

سریتا کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی، مگر جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا تھا، اسے کیا کرتا! پھر یہ کہ سریتا ان باتوں کی تصدیق بھی کر رہی تھی، ماضی میں اس کے محبوب کو قتل کیا گیا تھا۔ میرا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ سریتا کو آخر مجھے جھٹلانے کی ضرورت بھی کیا تھی!

"آپ کو شاید میری بات پر یقین نہیں آیا صاحب جی!" معاً سریتا بول اٹھی۔ اس کے لہجے سے دکھ کر اظہار ہو رہا تھا۔ "میں نے سوچا تھا آپ کے پاس آ کر صاحب جی کہ.... کہ سب کچھ بھول جاؤں گی۔ بھلا دوں گی سب کچھ، پر شاید.... شاید میرا ماضی مجھے ایک بار پھر.... پھر میرا ماضی.... میری رُوح میں نشتر اتارنا چاہتا ہے صاحب جی!" اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

میں اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے چہرے پر وہی معصومیت اور حسن تھا جس کا میں دیوانہ تھا۔

"ٹھیک ہے سریتا!" میں نے طویل سانس لیا۔ "بھول جاؤ ان باتوں کو جو ابھی میں نے تم سے کی ہیں تم آرام کرو، میں چلتا ہوں۔"

"نہیں صاحب جی... آپ.... ابھی نہ جائیں۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "مجھے.... مجھے معلوم ہے کہ آپ کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔ بھگون کے بعد اس دھرتی پر آپ.... آپ صاحب جی، مجھے سب سے پیارے ہیں۔ میں آپ کی سوگند کھاتی ہوں صاحب جی کہ شمبھو رات کو میرے کمرے میں نہیں آیا۔" یہ کہتے ہوئے اس کی بڑی بڑی آنکھوں چھلک اٹھیں۔

"میں نے کہا نا سریتا تم سے کہ اس واقعے کو بھول جاؤ!" مجھے اس پر محبت آنے لگی "ممکن ہے بیماری کے سبب اس وقت تمہارا حافظہ کام نہ دے رہا ہو اور تمہیں بعد میں ساری باتیں یاد آ جائیں اس لیے فی الحال اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو"

"بھگوان کرے ایسا ہی ہو۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "پھر.... پھر آپ مجھے جھوٹا تو نہیں سمجھیں گے نا صاحب جی!"

"جھوٹا تو میں تمہیں اب بھی نہیں سمجھ رہا۔ ہاں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"کیا صاحب جی؟" اس نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"یہی سمجھ جاتا تو پھر جھگڑا کیا تھا!" میں آہستہ سے اس کی دل جوئی کے لیے ہنسا، پھر بولا "اب تو جانے دو نا!"

"ہاں ایک بات اور بتا دیں صاحب جی!"

"بولو!"

"یہ آپ نے ارشاد علی سے کہا کہ وہ... وہ مجھے آپ کے کمرے میں نہیں آنے دیتا۔ کیا آپ نے...."

"صرف تمہارے لیے نہیں، سبھی کے لیے میں نے کہا تھا۔"

"مگر کیوں صاحب جی؟ کیا اب... اب آپ کا جی بھر گیا ہے مجھ سے؟"

"پھر تم اپنی بات کرنے لگیں! میں نے سبھی کے لیے کہا ہے۔"

"اس کی کوئی وجہ تو ہو گی نا صاحب جی!"

"ہاں وجہ ہے۔"

"کیا؟" اس نے اپنی عادت کے مطابق بھولپن سے پوچھا۔

"کچھ دن کی بات اور ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"پھر وہی شب و روز ہوں گے جو پہلے تھے۔" ظاہر ہے کہ میں اسے اصل وجہ نہیں بتا سکتا تھا۔

پھر وہ مزید سوالات کرنے لگی کہ میں راتوں کو جاگ جاگ کر کیا اور کیوں پڑھتا ہوں، اس کے بعد مہ پارہ کی لاش کے بارے میں دریافت کرنے لگی جو اس نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ وہ کافی دن بعد تنہائی میں مجھ سے ملی تھی اس لیے اس کے ذہن میں جو تجسس تھا، اسے دور کرنا چاہتی تھی۔

"سریتا! فی الحال مجھ سے کوئی سوال نہ کرو، میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا۔" میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا، پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس بار سریتا نے مجھے نہیں روکا اور میں اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

وہاں سے اپنے کمرے میں آنے کے بعد میں نے دیوان حافظ نکالا اور اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ حافظ کا کلام مجھے بہت پسند تھا۔ اسے پڑھ کر طبیعت میں ایک فرحت و تازگی محسوس ہونے لگتی تھی، مگر اس وقت میرا دل اس کے مطالعے میں بھی نہ لگا۔ میرا ذہن ایک بار پھر حالیہ

واقعے کی طرف منتقل ہو گیا اور میں نے دیوان بند کر کے رکھ دیا۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کے باوجود مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سریتا مجھ سے جھوٹ بول سکتی ہے۔ وہ لڑکی ایسی نہیں تھی، لیکن اس نے سچ بولا تھا تو پھر میں اپنے مشاہدے کو کس طرح جھٹلاتا!

معاً" میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ شمبھو بہرحال پُراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ پردہ پوشی کی خاطر اس نے سریتا کے ذہن سے اس واقعے کو کھرچ دیا ہو تاکہ سریتا کے حافظے میں یہ واقعہ ہی موجود نہ ہو اور اس سلسلے میں وہ کسی کی مدد حاصل نہ کر سکے۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ کسی کو ہپناٹائز کر کے اس کے ذہن میں جو بات بٹھا دی جائے، ہوش میں آنے کے بعد وہی بات ذہن میں رہتی ہے۔ کسی معمول کو یہ حکم دیا جا سکتا ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد وہ موجودہ واقعے کو بھول جائے گا اور پھر ایسا ہی ہوتا ہے عامل اگر ٹیلی پیتھی بھی ہے تو یہ حکم ذہنی طور پر دیا جا سکتا ہے اور اگر نہیں تو زبانی وہ یہ کام انجام دے سکتا ہے۔ میرے موجودگی میں شمبھو نے سریتا کو کوئی ایسا زبانی حکم نہیں دیا تھا۔ ممکن ہے میرے وہاں سے آنے کے بعد اس نے ایسا کیا ہو یا پھر یہ کہ وہ ٹیلی پیتھی بھی ہو۔ یہ ناممکن بات بہرحال نہیں تھی۔ اگر میرے مفروضیات درست تھے تو اس معاملے میں کوئی پیچ نہیں تھا۔ اس معاملے پر سوچ بچار سے یہ ضرور ہوا کہ میرا ذہن ایک نتیجے تک پہنچ گیا اور اس سے مجھے سکون محسوس ہوا، مگر شمبھو کا معاملہ اپنی جگہ تھا۔ وہ بہرحال میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ ایک ایسا مجسم خطرہ تھا جسے اب تک میں نے آنکھوں سے دیکھا بھی نہیں تھا۔

عمل کا ورد کر کے اور آئینہ بینی سے فارغ ہو کر جب میں آئندہ شب اپنے کمرے سے نکلا تو بہت چوکنا تھا۔ میں حسب معمول چوراہے پر روٹی رکھنے جا رہا تھا۔ صدر دروازے تک پہنچنے کے لیے مجھے اسی راہداری سے گزرنا تھا جس میں سریتا کا کمرا تھا میں محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا اس راہداری تک پہنچا اور غیر ارادی طور پر میری نظر کمرے کی طرف اٹھ گئی۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ آج کمرے میں تاریکی تھی۔ ابھی میں چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ مجھے اپنے پیروں کے قریب سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ وہاں نیم تاریکی تھی۔ راہداری میں کم پاور کا ایک بلب روشن تو ضرور تھا مگر اس جگہ سے کافی فاصلے پر، جہاں میں تھا۔ سرسراہٹ محسوس کرتے ہی میرے اعصاب تن گئے اور میں نے غور سے فرش کا جائزہ لیا۔ دوسرے ہی لمحے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے اپنے پیروں کے قریب ایک سانپ نظر آیا اور پھر وہ سانپ تیزی کے ساتھ میرے دونوں پیروں سے لپٹ گیا۔ اب میرے لیے قدم اٹھانا دوبھر

تھا۔ چند ہی لمحوں میں میرا جسم پسینے پسینے ہو گیا۔ سانپ کی گرفت اتنی سخت تھی کہ جیسے میرے پیروں کو کسی نے مضبوط رسی سے باندھ دیا ہو۔ یقیناً وہی سانپ تھا جو میں نے گزشتہ شب دیکھا تھا۔ اس کا رنگ بھی سیاہ تھا اور آنکھیں بھی غیر معمولی طور پر بڑی تھیں۔ اسی کو میں نے سریتا کے کمرے میں بھی دیکھا تھا۔

مجھے نہیں معلوم، کیسے میرے ذہن میں یہ بات آ گئی کہ اس ابتلا سے بچنے کے لیے ہمزاد کے عمل کا ورد کرنا چاہیے! شاید اس کا سبب یہ ہو کہ عموماً" کڑے لمحات میں ہمزاد ہی کی مجھے یاد آتی تھی اور وہی ہمیشہ میری مدد کرتا تھا، مگر اس وقت ہمزاد میرے قابو میں نہیں تھا۔ غالباً" اسی لیے میری توجہ ہمزاد کے عمل کی طرف مبذول ہو گئی۔ عمل کے یہ وہی الفاظ تھے جو میں حصار میں بیٹھ کر پڑھتا تھا۔ چوراہے پر روٹی رکھ کر واپس آنے تک بہرحال عمل کا وقت تھا۔ اس دوران میں مجھ پر کوئی سحر اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا، شرط صرف یہ تھی کہ میں اپنے ہوش و حواس برقرار رکھتا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سحر کے سوا کچھ نہیں۔

پھر یوں ہوا کہ ادھر میری زبان سے عمل کے الفاظ ادا ہوئے، ادھر سانپ کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ میں عمل کا ورد کرتا رہا اور چند ہی لمحوں میں میرے دونوں پیر اس کی گرفت سے قطعی آزاد ہو گئے۔ اچانک میری سماعت سے ایک تیز پھنکار ٹکرائی اور پھر میں نے اس سانپ کو تیزی سے ایک جانب رینگتے دیکھا۔

میں وہاں مزید رکے بغیر آگے بڑھ گیا۔ احتیاطاً" اب بھی زیر لب میں عمل کا ورد کر رہا تھا کہ کہیں وہ دوبارہ مجھ پر حملہ نہ کر دے!

روٹی رکھ کر واپس آتے ہی جب میں نے کوٹھی کے گیٹ میں قدم رکھا تو میرے اعصاب ایک تیز نسوانی چیخ سن کر جھنجھنا اٹھے۔ میں تیزی سے عمارت کی طرف دوڑا۔ چیخیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں جیسے کوئی انتہائی کرب کے عالم میں چیخ رہا ہو۔

دوڑتے ہوئے میں نے سمت کا اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ چیخیں کدھر سے آ رہی ہیں چیخنے والی یقیناً سریتا ہی تھی۔ میں نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔ خطرے کا احساس ہونے کے باوجود نہ معلوم وہ کون سی قوت تھی جو مجھے دوڑنے پر مجبور کر رہی تھی!

میں دوڑتا ہوا وہاں پہنچا تو سریتا کے کمرے کا دروازہ بند تھا، البتہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اپنے سانس کو قابو میں رکھتے ہوئے میں نے کھڑکی سے اندر جھانکا۔ وہ منظر اتنا ہی اذیت ناک اور حیران کن تھا کہ چند لمحے کو میں گم صم کھڑا رہ گیا۔

سریتا فرش پر پڑی تھی اور وہی سانپ اسے بار بار ڈس رہا تھا۔ سانپ کا ہدف سریتا کے

رخسار و لب تھے۔ کبھی وہ سریتا کے ہونٹوں پر پھن مارتا کبھی رخساروں کو نشانہ بناتا۔ سریتا کے چہرے کی جلد نیلی پڑ گئی تھی اور وہ مجھے بڑی عجیب نظر آ رہی تھی۔ سانپ کی آنکھوں سے نکلنے والی سرخ روشنی اس کے نیلے چہرے پر مرکوز تھی۔ اب سریتا کی چیخیں دم توڑتی جا رہی تھیں مجھے یقین تھا کہ میرے علاوہ کم از کم ارشاد علی نے وہ چیخیں ضرور سنی ہوں گی۔ پھر وہ اس طرف کیوں نہیں آیا؟ کوئی اور نہیں تو ارشاد علی یقیناً اس وقت بیدار تھا کیوں کہ وہ مجھے ناشتا کرانے کے بعد سوتا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کروں تو کیا کروں! میری عقل جیسے گم ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر معاً یاد آیا کہ ہمزاد کے عمل کے ورد سے میں اسکو ایک مرتبہ زیر کر چکا ہوں اور یہ اب سے کچھ دیر پہلے ہی کی بات تھی جب وہ میرے پیروں سے لپٹ گیا تھا۔ اس وقت میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات نہیں تھی کہ اب عمل کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ عمل کے الفاظ میرے زبان پر آ گئے، مگر اس بار کچھ نہ ہوا۔ ہاں میں نے اتنا ضرور محسوس کیا کہ اب وہ سانپ میری طرف متوجہ ہو چکا ہے۔ یہ دیکھ کر خوف کی ایک لہر سی میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ دوسرے ہی لمحے سانپ کی آنکھوں سے شعلے سے لپکے۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری آنکھیں گویا اس کی آنکھوں سے ملی ہوئی تھیں۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور پھر جیسے میں ساکت ہو گیا۔ سریتا کے کمرے میں جو عجیب سی غیر مانوس روشنی تھی اچانک غائب ہو گئی اور ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔

میں نے اپنے اعصاب پر شدید بوجھ محسوس کیا۔ خوف کے سبب میں نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا، مگر اپنے جسم کو حرکت نہ دے سکا۔ مجھے علم تھا کہ عموماً خوف کی زیادتی میں بھی ایسا ہوتا ہے، مگر میرے جسم کا حرکت نہ کرنا کسی اور ہی سبب تھا۔ اس کا سبب غالباً سانپ کی آنکھوں سے نکلنے والی وہ سرخ روشنی تھی جو براہِ راست میرے آنکھوں پر پڑی تھی۔ میں اس عالم میں سوچ سکتا تھا، دیکھ اور سن سکتا تھا مگر اپنے جسم کو حرکت دینے سے قاصر تھا۔ میں اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ سریتا یقیناً ختم ہو چکی ہے کیوں کہ کمرے میں اب مکمل سکوت تھا۔

پھر نہ معلوم کتنی دیر میں اس حال میں رہا! میں چونکا اس وقت جب میں نے راہداری میں کسی کے قدموں کی چاپ سنی۔ غیر ارادی طور پر میں نے اس طرف مڑ کر دیکھا اور اس بار میرا جسم حرکت کرنے سے قاصر نہیں تھا، گویا اب میں سحر کے اثر سے آزاد ہو چکا تھا۔

سامنے سے آنے والا ارشاد علی تھا۔ میرا خوف اب خاصا کم ہو چکا تھا اور یوں بھی ایک سے دو ہوں تو زیادہ خوف نہیں رہتا۔

"تم کہاں تھے؟" میں نے ارشاد علی سے سوال کیا۔

"آپ کے کمرے کے دروازے پر جناب!" اس نے جواب دیا، پھر خود ہی بتانے لگا۔ "یہ وقت آپ کے لیے ناشتا بنانے کا ہوتا ہے، میں ناشتا بنانے جا رہا تھا۔"

"تم نے سریتا کی چیخیں سنی تھیں؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"چیخیں!" وہ حیرت سے بولا۔ "نہیں جناب!"

مجھے اس کا جواب سن کر حیرت ہوئی۔ جب مجھے سریتا کی چیخیں کوٹھی میں داخل ہوتے ہی سنائی دینے لگی تھیں اور جب کہ میں اس کے کمرے سے کافی دور تھا تو پھر ارشاد علی کو کیوں وہ چیخیں سنائی نہیں دی تھیں؟ میں سوچنے لگا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ ارشاد علی مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔

"سنو!" معاً کچھ سوچتے ہوئے میں نے ارشاد علی کو مخاطب کیا۔ "تم کھڑکی کے راستے سریتا کے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ کھول دو! اور ہاں کمرے کا بلب بھی روشن کر دینا۔"

"جی.... جی جناب!" اس نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر آگے بڑھا۔ شاید اس کے ذہن میں یہ ہوگا کہ کمرے کا دروازہ دستک دے کر بھی کھلوایا جا سکتا تھا، مگر اسے کیا خبر تھی کہ کمرے کا دروازہ کھولنے والی اب اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔

میں ایک طرف ہٹ گیا اور ارشاد علی میری ہدایت پر عمل کرنے لگا۔ وہ کھڑکی کے راستے اندر کود گیا اور پھر چند لمحے بعد ہی کمرے میں روشنی ہو گئی۔ اس کے بعد ارشاد علی اندر سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔

میں لپک کر کمرے کے دروازے تک پہنچا، مگر فوری طور پر اندر داخل نہیں ہوا۔ میں نے سریتا کو بہ دستور فرش پر پڑا ہوا دیکھا اور میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے مردہ ہی نظر آئی تھی، لیکن دوسرے ہی لمحے میں چونک اٹھا تھا۔ میں نے اس کے جسم کو خفیف سی حرکت سے سانس کی آمد و شد کو محسوس کر لیا تھا، گویا ابھی وہ زندہ تھی پھر میری توجہ اس کے چہرے کی طرف ہو گئی تو مجھے اور بھی حیرانی ہوئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اب نیلا نہیں تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا اور قریب جا کر پھر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے چہرے پر مجھے کوئی نشان بھی نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے جھک کر اس کا شانہ ہلایا اور پھر اسے آواز دی۔ ارشاد علی بھی اب میرے قریب آ کر کھڑا ہوا تھا۔ آواز دینے اور جھنجھوڑنے کے باوجود بھی وہ بیدار نہیں ہوئی۔

میں ارشاد علی کی طرف پلٹا اور کہا۔ "تم اسے اٹھا کر بستر پر ڈال دو۔" پھر میں نے مزید

حکم دیا۔ "اس کے بعد تم کمرے کی بتی بجھا کر دروازہ باہر سے بھیڑ کر، میرے لیے ناشتا بنا کے لے آنا۔ یہ کہہ کر اپنے کمرے میں آ کر میں نے لباس تبدیل کیا اور وضو کے بعد فجر کی نماز پڑھی۔ پھر ارشاد علی ناشتا لے آیا۔ عموماً" وہ ناشتا دے کر کمرے سے باہر چلا جاتا تھا، مگر اس وقت ایسا نہیں ہوا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اس کے چہرے سے تجسس کا اظہار ہو رہا تھا۔

"سرتا... اسے کیا ہوا جناب؟ وہ... وہ جاگ کیوں نہیں رہی؟ اور آپ نے مجھ سے اسکی چیخوں کے بارے میں"

"ارشاد علی!" میں نے سختی کے ساتھ اس کی بات کاٹ دی۔ "اپنے کام سے کام رکھو اور ان باتوں میں اپنا دماغ نہ لڑاؤ! سمجھ گئے!"

"جی... جی جناب، سمجھ... سمجھ گیا" وہ سر ہلانے لگا اور پھر کمرے سے نکل گیا۔

مجھے یہ جان کر یقیناً خوشی ہوئی تھی کہ سرتا زندہ تھی، لیکن ابھی میری فکر اس کی طرف سے کم نہیں ہوئی تھی۔ آواز دینے اور جھنجھوڑنے کے باوجود اس کا بیدار نہ ہونا میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

میں نے ناشتا کر لیا تو ارشاد علی برتن اٹھا لے گیا۔ اب صبح ہو چکی تھی اور میں ایک بار پھر سرتا کے کمرے میں جانا چاہتا تھا، مگر اس سے پہلے ڈاکٹر امتیاز آ گیا۔ جب وہ میرے گردن کے زخم کی ڈریسنگ کر رہا تھا تو کہنے لگا۔ "شیخ صاحب! حیرت ہے کہ اب تک زخم جوں کا توں ہے ذرا بھی نہیں بھرا۔"

میں اس کی بات کا کیا جواب دیتا، صرف ہوں ہاں کر کے رہ گیا۔

"تقریباً" ایک مہینہ ہو گیا۔ کچھ تو فرق پڑنا چاہیے تھا۔" ڈاکٹر پھر بولا۔

"آپ اپنا کام کیے جائیں، شفا دینا اللہ کے اختیار میں ہے" میں نے بات کو ٹالنے کے لیے کہا۔ ظاہر ہے کہ میں اس سے یہ تو کہہ نہیں سکتا تھا کہ جب تک عمل پورا نہیں ہو جائے گا، یہی حال رہے گا، ڈریسنگ تو محض اس جھتے کو بن رکھنے کے لیے کرائی جا رہی تھی۔

"ہاں یہ تو ہے" ڈاکٹر امتیاز میری بات کے جواب میں بولا، پھر پوچھا۔ "آپ دوائیں تو وقت پر رکھا رہے ہیں؟"

"بالکل" میں نے کہا۔ "میں اس معاملے میں کوتاہی نہیں کرتا۔" پھر جانے کیسے میری زبان پر دل کی بات آ گئی۔ "بس کچھ روز کی بات اور ہے ڈاکٹر صاحب! انشاء اللہ آپ مجھے

صحت یاب دیکھیں گے۔"

"آپ کے یقین اور خود اعتمادی حیرت انگیز ہے شیخ صاحب!" وہ بولا اسی خود اعتمادی سے آپ نے بیماری کو شکست دے رکھی ہے۔"

"ہاں شاید یہی وجہ ہے۔ میں زندگی سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

اس دوران میں وہ ڈریسنگ کر چکا تھا۔ ڈریسنگ سے کم از کم یہ فائدہ ضرور تھا کہ میں انتہائی شدید جسمانی کرب و اذیت سے بچ گیا تھا جو یقیناً میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔

ڈاکٹر امتیاز کے جانے کے بعد میں کمرے سے نکلا۔ ہرچند کہ یہ میرے سونے کا وقت تھا مگر سرتا کی طرف سے میں بہت فکر مند تھا۔ مجھے اس کی طرف سے تسلی ہو جاتی تو پھر سکون سے سوتا۔

کمرے کا دروازہ مجھے بند نہیں ملا، اس کا مطلب یہی تھا کہ سرتا اب تک اسی حال میں تھی۔ میں نے اندر داخل ہو کر دیکھا تو وہ اب تک بے سدھ پڑی تھی۔

"سرتا!... سرتا!" میں نے بستر کے قریب پہنچ کر اسے آواز دی۔

"اوں... ہوں!"

اس کی آواز سن کر میرا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔ میں نے تیزی سے جھک کر اسے جھنجھوڑ دیا۔

"ہوں... ہوں! کیا ہے؟... کیا ہوا؟" وہ آنکھیں کھولتے ہی حیرت سے بولی۔ اس کی حسین آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ "صاحب جی! آپ... آپ!" وہ ایک دم اٹھ بیٹھی اور پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر بڑی توبہ شکن انگڑائی لی۔ اس کا نازک سا جسم کسی کمان کی طرح کھنچ گیا تھا اور اس کمان سے نکلے ہوئے تیر میرے سینے میں ترازو ہو گئے تھے۔

میرے جذبات کی دنیا زیر و زبر ہونے لگی۔ میں نے محسوس کیا اگر اس وقت مزید وہاں ٹھہرا تو شاید خود پر قابو نہیں رکھ سکوں گا اور یہ انتہائی خطرناک بات تھی۔ یہ سوچتے ہی میں پلٹا اور پھر تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔

"صاحب جی!" کیا ہوا؟" اس نے مجھے آواز دی۔

میں اسے کیا بتاتا کہ کیا ہوا! "کچھ نہیں۔ میں بس تمہیں دیکھنے آیا تھا کہ تمہارا بخار اترا یا نہیں!" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر رک کر کہا۔

"تو... تو بیٹھیں نا صاحب جی!" اس کی دل کش آواز مجھے جیسے اپنی طرف کھینچنے لگی۔

"نہیں، اب میں چلوں گا، میرے سونے کا وقت ہے۔" یہ کہہ کر میں اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر کمرے سے نکل آیا۔

میرے جذبات کا ہیجان اب بھی کم نہیں ہوا تھا۔ رہ رہ کر میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم رہا تھا جب اس نے ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لی تھی۔ پھر اور بہت سے منظر یاد آنے لگے جو اس کی اور میری خلوتوں کے امین تھے۔ میری حالت ایک ایسے شخص کی تھی جو دریا کنارے پیاسا کھڑا ہوا۔ اپنے کمرے کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے مجھے یگانہ چینگیزی کا ایک شعر یاد آنے لگا جو میرے حسب حال تھا۔

بندہ وہ بندہ جو دم نہ مارے
پیاسا کھڑا ہو دریا کنارے

جذباتی ہیجان میں مبتلا ہونے کا بڑا سبب یہ تھا کہ ان دونوں ہمزاد کے عمل کی وجہ سے مدح لب و عارض سے کنارہ کشی کر لی تھی ورنہ اپنی جنوں خیزیاں تو مثال تھیں کون ایسا ماہ رو ہو گیا جو نظر میں چڑھ کر نظر سے چھپ گیا ہو اور میں نے اس کے حضور میں حدیثِ عشق نہ کہی ہو۔ اگر میرا یہ حال نہ ہوتا تو شاید میں ابھی کچھ اور سریتا کے پاس رکتا۔ میں کبھی کبھی اسے از رہِ تفنن طبع بنگال کا بولتا جادو بھی کہتا تھا۔ جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے اور اول اول ایسا ہی ہوا تھا۔ اس جادو سے میں نے اپنی خلوتوں کو بہت آباد کیا تھا، اتنا کہ طبیعت سیراب ہو گئی تھی، مگر پھر یہ آج مجھے کیا ہو گیا تھا؟ میں اپنے کمرے میں بستر پر دراز ہو کر اسی سوال کا جواب تلاش کر رہا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ تو وہی تھی جو میں ابھی بیان کر چکا ہوں، یعنی بہ وجوہ دانستہ گریز ار دوسری وجہ تشنگی اور اس لمحے کا جادو تھا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ پڑھی ہوئی کہانیاں اور بار بار سنے ہوئے شعر بھی اچھے لگتے ہیں، اتنے اچھے کہ آدمی جھومنے لگے۔

میں کچھ دیر وہاں اور ٹھہر گیا ہوتا تو یقیناً سریتا سے یہ ضرور پوچھتا کہ کیا آج رات کی بھی کوئی بات اس کے حافظے میں نہیں۔ مگر مجھے کم ہی یقین تھا کہ اسے کچھ یاد ہوتا۔ میں اپنی آنکھوں میں ایک دیکھے ہوئے خواب کی حسرت لیے سو گیا، سریتا ایک دیکھا ہوا خواب ہی تھی اور اس خواب کے رنگ بارہا میرے وجود کو اپنی پناہ میں لے چکے تھے۔

اس روز دوبارہ میں، سریتا سے نہیں ملا۔ ہاں مجھے اس کی طرف سے فکر ضرور تھی کہ آنے والی رات کے دامن میں اس مجبور اور بے بس لڑکی کے لیے جانے کتنے عذاب ہوں۔ مجھے شمبھو سے سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی جو اس عذاب کا ذمے دار تھا۔ میرے نزدیک وہ خام کاروں میں سے تھا۔ عشق تو ایثار اور محبت کا گداز ہوتا ہے، اس میں آزار کہاں، اگر شمبھو

کو واقعی سریتا سے عشق ہوتا تو وہ اسے اذیت نہ پہنچاتا، اتنی اذیت کہ سریتا چیخ اٹھتی یقیناً یہ ظلم تھا۔ میری بدقسمتی یہ تھی کہ فی الحال شمبھو کے ظلم سے سریتا کو بچانے کا کوئی راستہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

رات کو کھانا کھا کر عموماً میں ٹہلتا تھا۔ اس رات ٹہلتے ہوئے بھی میں سریتا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سریتا میرے گھر کی چار دیواری میں تھی، وہ میری پناہ میں تھی۔ اس کی حفاظت میری ذمے داری تھی۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اس سوال کے جواب کی تلاش میں میرے قدم جیسے خود بہ خود سریتا کے کمرے کی طرف اٹھنے لگے۔ ابھی تو مجھے شمبھو کی دشمنی کا واضح سبب بھی معلوم نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ مجھے سریتا کے ماضی کا کچھ علم ہو جاتا تو شاید میں کوئی راہ نکال سکتا۔

میں وہاں پہنچا تو اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بتی جل رہی تھی، مگر وہ کمرے میں نہیں تھی۔ میں نے کمرے سے نکل کر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو مجھے ایک ملازم نظر آیا۔ وہ باورچی خانے سے نکل رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس راہداری سے باورچی خانے کا دروازہ نظر آتا تھا۔ ملازم قریب آ گیا تو میں نے اس سے سریتا کے بارے میں پوچھا۔

"میں نے اسے نہیں دیکھا جناب۔" ملازم نے ادب سے جواب دیا، پھر بولا۔ "شاید رکمنی کے کمرے میں ہو۔" رکمنی بھی میری ایک ملازمہ ہی کا نام تھا۔ میں اپنی ملازماؤں کو ملازمائیں بنا کر نہیں مالکائیں بنا کر رکھتا تھا۔ اسی لیے انہیں الگ الگ کمرے دے رکھے تھے اور حقیقتاً وہ تھیں بھی میرے دل کی مالکائیں۔

"تم اسے دیکھ کر آؤ۔" "میں یہاں اندر کمرے میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے ملازم سے کہا اور پھر سریتا کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

جانے کیوں اندر پہنچ کر مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ مجھے اعصاب پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا، ایسا ہی بوجھ جس کا تجربہ پہلے بھی دو بار ہو چکا تھا۔ میں نے چوکنا انداز میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی، مگر مجھے وہاں کوئی غیر معمولی چیز نظر نہیں آئی۔ ذرا ہی دیر میں طبیعت پر اتنی وحشت سوار ہوئی کہ میرا بیٹھنا دوبھر ہو گیا۔ مجبوراً میں اٹھ کھڑا ہوا۔

ابھی میں دروازے تک پہنچا تھا کہ سریتا تیز تیز قدم اٹھاتی آتی دکھائی دی۔ اس نے دھانی رنگ کی ساڑھی باندھ رکھی تھی۔

"صاحب جی! معاف کرنا، مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ....." وہ یہ کہتے ہوئے قریب

آ گئی۔

"کوئی بات نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" میں یہ کہتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔

وہ خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ اپنی تمام ہی ملازماؤں کو میں نے بے تکلفی کے باوجود ایک خاص حد تک رکھا تھا تاکہ وہ اس بے تکلفی کا فائدہ اٹھا کر حد ادب سے تجاوز نہ کر جائیں۔ ہرچند کہ سریتا مجھے بہت عزیز تھی، مگر وہ بھی میرے اور اپنے درمیان ایک فاصلہ قائم رکھتی تھی اور میرے نزدیک یہ فاصلہ بہت ضروری تھا یہی وجہ تھی کہ وہ میرے ساتھ ساتھ نہیں، پیچھے چل رہی تھی۔ اسے علم تھا کہ میں بے ادبی پسند نہیں کرتا۔ میں اسی کا نہیں سبھی ملازماؤں کا پورا خیال رکھتا تھا اور ان کے ساتھ مساوی سلوک کرتا تھا۔ میں انہیں بہتر سے بہتر خوراک، ہر طرح کا آرام و آسائش اور عمدہ سے عمدہ لباس فراہم کرتا تھا۔ کام کے وقت کے سوا ان کے جسموں پر اچھے سے اچھا لباس ہوتا اور وہاں کام تھا بھی کیا۔ اسی لیے آج تک میری کسی ملازمہ نے مجھ سے نوکری چھوڑ کر جانے کو نہیں کہا تھا۔ ان میں سے کئی کے عزیز رشتے دار بھی ملنے آتے رہتے تھے، مگر کبھی سریتا سے ملنے کوئی نہیں آیا تھا اور نہ میں نے اس سے آج تک اس سلسلے میں کچھ پوچھا تھا۔ میرا رویہ ان کے ساتھ ایسا ہی تھا۔ میں کبھی ان میں سے کسی کے ماضی کو کریدنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ میرے ان کے درمیان جو فاصلہ تھا، اس کی وجہ سے کبھی ان میں بھی یہ ہمت نہیں ہوتی تھی۔

سریتا کے کمرے سے نکل آنے کے بعد اب مجھے اپنے اعصاب پر کوئی بوجھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا پھر وہ میرے اشارے پر بیٹھ گئی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ "سریتا! میں نے تم سے آج تک تمہارے ماضی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا، لیکن اب..... اب مجھے اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

"وہ..... وہ کیوں صاحب جی؟ کیا کسی نے آپ سے میرے بارے میں کچھ کہا ہے؟"

"نہیں۔" میں بولا، پھر اس کے فکر مند چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے مزید کہا۔ "کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ تم گھبرا جاؤ۔ بس میں تم سے مختصراً پوچھنا چاہتا ہوں۔"

میری بات سن کر اس نے طویل سانس لیا جیسے اس کی فکر کم ہو گئی ہو۔ پھر اس نے کہا۔ "پوچھیں صاحب جی، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"شمبھو کے بارے میں تم جو کچھ بھی جانتی ہو، مجھے تفصیل کے ساتھ بتا دو۔" میں نے کہا۔

وہ چونک اٹھی، پھر بڑبڑائی۔ "شمبھو....." پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ "آپ صاحب جی، کل بھی شاید اس کا ذکر کر رہے تھے، آخر مجھے بھی بتائیں کہ بات کیا ہے؟"

"دیکھو سریتا! میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "میں اگر تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں تو یقیناً اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔ جو فی الحال تمہیں بتانا مشکل ہے، تم مجھ سے سوال نہ کرو اور جو میں پوچھ رہا ہوں، اس کا جواب دو۔"

"ٹھیک ہے صاحب جی، اب میں کچھ نہیں پوچھوں گی۔" سریتا نے کہا اور پھر ٹھنڈا سانس بھر کے بولی۔ "مجھے نہیں معلوم صاحب جی کہ شمبھو ہمارے گاؤں میں کہاں سے آیا تھا! میں گاؤں کے چھوٹے سے مندر آتے جاتے اسے دیکھتی تھی۔ اس کی کٹیا، مندر کے قریب ہی تھی، کچی کٹیا۔" سریتا بتانے لگی۔ پھر وہ چند لمحے کو خاموش ہو گئی جیسے بھولی بسری یادوں کو اپنے حافظے میں تازہ کر رہی ہو۔ میں نے اس دوران میں اسے نہیں ٹوکا۔ اس کی نگاہیں بس ایک طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ذرا دیر کے بعد وہ پھر اپنے ماضی کے اوراق پلٹنے لگی۔ "اس کی کٹیا میں اکثر بڑے جوگی یوگی اور سادھو سنت آیا جایا کرتے تھے۔ ایک بار یہ ہوا کہ میری سب سے چھوٹی بہن بیمار ہو گئی۔ میرے بابا نے بساط بھر اس کا علاج کرایا۔ وہ میری بہن کو شہر لے جاتے تھے، جیسور!! وہاں انہوں نے اسے ہسپتال میں دکھایا۔ اس کی بیماری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ جانے کس نے ایک دفعہ شمبھو کا ذکر کیا کہ اس کے پاس کچھ جڑی بوٹیاں اور دوائیں ہیں۔ وہ خود جنگل میں جا کے جڑی بوٹیاں تلاش کرتا ہے اور پھر ان سے دوائیں بناتا ہے۔ کئی لوگوں کو اس کی دوا سے فائدہ ہو چکا تھا۔ میرے بابا بہت بوڑھے تھے۔ ان سے میری بہن اٹھتی نہیں تھی۔ وہ جیسور بھی جاتے تھے تو میرے کسی بھائی کو ساتھ لے جاتے تھے۔ سو جب انہوں نے شمبھو کی کٹیا پر جانے کا فیصلہ کیا تو بہن کو گود میں لینے کے لیے مجھ سے کہا جو یوں تو آٹھ نو برس کی تھی مگر بیماری نے اسے گھلا دیا تھا۔ میں نے آسانی سے اسے اٹھا لیا کیوں کہ میں جوان تھی۔ شمبھو نے میری بہن کو دیکھا اور پھر دوا بھی دی۔ اسی دوران میں وہ بار بار میری طرف بھی دیکھتا رہا، میرے بابا کی نظر بچا کر! پھر اس نے کہا کہ بچی کو روز لانا پڑے گا۔ اس کے بعد وہ براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا، تمہارے بابا، بوڑھے ہیں تم لے آیا کرنا اپنی بہن کو۔ میں ہامی بھرنے کے سوا کیا کرتی۔ تو اس دن سے میں اس کی کٹیا پر اپنی بہن کو لے جانے لگی۔ ایک دن اس نے میری بہن کے ماتھے اور کنپٹیوں پر جانے کیسی دوا لگائی کہ وہ اونگھنے لگی۔ وہ مجھ سے بولا کہ اسے لٹا دو، یہ دوا کا اثر ہے۔ ابھی میں اس کے لیے ایک اور دوا بنا رہا ہوں، وہ لے کر جانا۔ اس کے بعد وہ کوئی دوا کوٹنے لگا۔ پھر دوا کوٹتے کوٹتے ایک دم اٹھا اور اندر سے کٹیا کا دروازہ بند کر دیا۔ اس وقت

تک میری بہن سو چکی تھی۔ پھر..... پھر صاحب جی اس نے مجھ سے ایک ایسی بات کہی کہ میں نے غصے سے اس کے منہ پر تھوک دیا اور پھر اپنی سوئی ہوئی بہن کو اٹھا کر وہاں سے چلی آئی۔"

یہ کہہ کر وہ ذرا رکی۔

میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر پوچھ لیا۔ "کیا اس نے تمہیں روکنے کی کوشش نہیں کی؟"

"ہاں کی تھی اور میری بانہہ بھی پکڑ لی تھی' مگر میں نے اسے ایسا دھکا دیا کہ وہ دور جا کے گرا۔ اس کا سر کسی چیز سے ٹکرا گیا تھا۔ پھر جب تک وہ اٹھتا' میں اس کی کٹیا سے نکل گئی۔ ہاں میں یہ تو بتانا بھول ہی گئی کہ مجھے شنکر سے پریم تھا۔ ہم دونوں اکثر ندی کنارے ملتے تھے۔ اس واقعے کے بعد کئی بار اس نے..... شمبھو نے مجھے اور شنکر کو اکیلے میں دیکھا تھا۔ وہ جانے کدھر سے نکل کر اچانک ہمارے سامنے آجاتا تھا اور ہاں اس واقعے کے بعد میں کبھی شمبھو کی کٹیا پر نہیں گئی تھی۔" سریتا کہتی رہی۔ "میں نے گھر والوں کو کچھ نہیں بتایا تھا' اور بتاتی بھی کیسے ایسی شرم کی بات! پھر ایک روز شمبھو مجھے راستے میں مل گیا۔ اس وقت میں اکیلی تھی۔ اس نے پھر مجھ سے وہی بے حیائی کی باتیں کیں اور کٹیا پر آنے کو کہا۔ میرے منہ میں جو آیا' اسے سنا دیا۔ یوں بھی وہ بوڑھا تھا اور میرے بابا کی عمر کا تھا۔ جواب میں اس نے مجھے دھمکی دی اور یہ بھی کہا کہ تو جس سے پریم کرتی ہے' وہ میری بددعا سے جلد ہی مرجائے گا۔ تو میرے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ میرا تو خون کھول اٹھا صاحب جی! پھر اس سے پہلے کہ میں اس کا اور اپنا خون ایک کر لیتی' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا مندر کی طرف چلا گیا۔ اس دن کے بعد میں نے شمبھو کو اس کی کٹیا کے باہر سادھوؤں کی طرح آسن جمائے بیٹھے ہوئے تپسیا کرتے دیکھا۔ میں مندر آتے جاتے اسے بھور سے اسی حال میں دیکھتی۔ پھر کچھ ہی دن بعد وہ..... وہ واقعہ ہو گیا جس کے متعلق سن کر شنکر ہنس پڑا تھا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا کہ شمبھو کتنا کمینہ ہے اور اس نے مجھ سے کیا کہا ہے۔ شنکر کو پہلی بار یہ سب کچھ سن کر بہت غصہ آیا تھا اور وہ اپنی جھونپڑی سے گنڈاسا نکال لایا تھا اور کہا تھا کہ میں ابھی شمبھو کے ٹکڑے کیے دیتا ہوں' اس نے تجھ سے ایسی بات کہی تو کیسے کہی! بڑی مشکل سے میں نے اسے روکا تھا اور اپنے پیار کی قسم دے کر وعدہ لیا تھا کہ وہ شمبھو سے نہیں بھڑے گا۔ پھر اس کے بعد شمبھو نے مجھے یہ دھمکی دی تھی کہ..... کہ میرا شنکر اس کی بددعا سے مرجائے گا۔ شنکر نے یہ سن کر اسے موٹی سی گالی دی تھی' پھر ہنسنے لگا تھا اور کہا تھا کہ وہ الو کا پٹھا کیا خود کو بھگوان کا اوتار سمجھتا ہے اور پھر صاحب جی' وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ شنکر کو اس کی جھونپڑی میں سانپ نے ڈس لیا اور.....

اور وہ..... وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ گیا' مگر نہیں..... نہیں صاحب جی' مجھے یقین ہے کہ شمبھو ہی نے اس کی جھونپڑی میں زہریلے سانپ کو چھوڑا ہو گا۔ یہ صدمہ میرے لیے اتنا شدید ثابت ہوا کہ سچ مچ میں اپنے حواس کھو بیٹھی۔ پھر میں کب اور کس طرح اس پاگل پن میں اپنے گاؤں سے نکل کر دربدر بھٹکتی رہی' مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں کہاں گئی' کس کے پاس رہی اور مجھ پر کیا بیتی مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ پھر میرے حواس واپس آئے تو میں نے خود کو ڈھاکہ میں دیکھا۔ اسی سے مجھے معلوم ہوا کہ میں اسے سفر کے دوران میں ایک ٹرین کے ڈبے میں ملی تھی اور یہ واقعہ پچھلے برس کا تھا۔ وہ بوڑھا بہت شریف تھا۔ اس نے مجھے اپنی بیٹی بنا لیا تھا اور ہسپتال میں میرا علاج بھی کرایا تھا۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں صاحب جی! وہ غریب ضرور تھا پر اس کا دل امیر تھا۔ اس نے میری بپتا سنی تو اسے بڑا دکھ ہوا۔ اس نے پیسا پیسا جوڑ کر کرائے کا بندوبست کیا اور..... اور پھر مجھے لے کر میرے گاؤں پہنچا تاکہ میرے گھر والوں کے حوالے کر دے' مگر..... مگر صاحب جی!....." اس کی آواز بھرا گئی۔

میں نے کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کیا اور اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کی پلکوں کے گوشے بھیگ گئے تھے جب وہ خاموش ہی رہی تو مجبوراً میں نے اسے ٹوکا۔

"صاحب..... صاحب جی! وہ..... وہ میرا گاؤں نہیں تھا۔" یہ کہہ کر وہ سسک اٹھی۔

"وہ تمہارا گاؤں نہیں تھا۔" میں حیرت سے بولا۔

"ہاں صاحب جی!" وہ اپنی ساری کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔ "وہ..... وہ جو میرا گاؤں تھا نا صاحب جی..... وہ تو پچھلے سال باڑھ میں بہہ گیا تھا اور..... اور اسی کے ساتھ میرا گھر' میرے بابا' بھائی' ماں اور بہن سبھی کچھ بہہ گیا تھا۔ ان میں سے کسی کی لاش بھی نہیں ملی تھی۔ اب تو وہ گاؤں میرے لیے بالکل نیا اور اجنبی تھا۔ وہاں اب اور ہی لوگ رہنے لگے تھے' اور ہی گھر تھے وہاں کچھ بھی تو نہیں تھا وہاں! پھر اس بوڑھے نے اگر میرے سر پر باپ بن کر ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو شاید..... شاید صاحب جی' میں..... میں پھر پاگل ہو جاتی۔"

"تو پھر تم اپنے اس محسن کے ساتھ ڈھاکہ واپس آگئیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"تمہیں یاد ہے کہ جب تم اپنے گاؤں پہنچی تھیں تو کیا وہاں شمبھو تھا؟" میں نے اپنی دانست میں ایک اہم سوال کیا۔

"میں اپنوں کی تلاش میں وہاں گئی تھی صاحب جی' دشمنوں کی تلاش میں نہیں۔" اس نے جواب دیا اور اس کا جواب قطعی درست تھا۔

"پھر بھی ممکن ہے کہ آتے جاتے اس پر تمہاری نظر پڑی ہو۔" میں نے کہا۔ "گاؤں کی آبادی ہی کتنی ہوتی ہے۔"

"نہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" وہ بولی۔ "اگر شمبھو وہاں رہا بھی ہوگا تو میں نے اسے نہیں دیکھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے، وہ پاپی بھی باڑھ میں بہہ گیا ہوگا۔"

میں، سریتا کو کیسے بتاتا کہ وہ پاپی باڑھ میں نہیں بہا بلکہ ابھی زندہ تھا۔ سریتا کی اس بات سے یہ بھی ظاہر ہوگیا تھا کہ گزشتہ شب کا ہولناک واقعہ بھی اس کے ذہن میں محفوظ نہیں ہے، مگر اس سلسلے میں کچھ دریافت کرنے سے پہلے مجھے ایک اور بات یاد آگئی کہ ابھی اس کی داستان حیات کا آخری باب باقی ہے۔ یہی سوچ کر میں نے کہا۔ "تم اپنے محسن کے ساتھ ڈھاکہ میں تھیں تو پھر چاٹگام کب اور کیسے آگئیں؟"

"رحیم بابا کے ساتھ ہی میں چاٹگام آئی تھی۔" اس نے بتایا۔ "ڈھاکہ میں بابا بہت پریشان تھا۔ کبھی اسے کوئی کام مل جاتا اور کبھی چھوٹ جاتا۔ اس کے کسی دوست نے اسے چاٹگام جانے کا مشورہ دیا کہ وہاں گودی میں خاصا کام ہے۔ بابا مجھے ساتھ لے کر کچھ دن کے بعد چاٹگام آگیا وہ بوڑھا تھا اور اس سے زیادہ بوجھ نہیں اٹھتا تھا، مگر اپنے اور میرے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے اسے بوجھ اٹھانا پڑتا تھا۔ میں اس سے بہت ضد کرتی کہ مجھے بھی وہ محنت مزدوری کرنے دے، مگر وہ نہ مانتا اور کہتا کہ جب تک باپ زندہ ہے اور اس کی بوڑھی ہڈیوں میں بوجھ اٹھانے کا دم ہے، بیٹی کو کام نہیں کرنے دے گا۔ رحیم بابا نے واقعی باپ بن کر دکھا دیا اور...... اور پھر...... پھر وہ خون تھوک تھوک کر مر گیا، میں ایک بار پھر بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی صاحب جی، پھر میں اپنا پیٹ بھرنے کے لیے مچھلیاں بیچنے لگی۔ گودی کے قریب ہی بابا نے جھونپڑی ڈال لی تھی۔ اور ہم وہیں رہتے تھے۔ وہاں اور بھی جھونپڑیاں تھیں۔ تازہ مچھلیاں خریدنے لوگ انہی جھونپڑیوں کے قریب چھوٹے سے بازار میں آتے تھے۔ یہیں پہلی بار میری ملاقات ارشاد علی سے ہوئی اور...... اور پھر وہ مجھے یہاں لے آیا۔"

سریتا کی داستان کا آخری باب ختم ہوگیا تو میں نے طویل سانس لیا۔ ارشاد علی واقعی جوہر شناس تھا۔ مجھے یاد ہے کہ پہلی بار سریتا کو میلے کچیلے کپڑوں میں دیکھنے کے باوجود بھی میں نے پسند کر لیا تھا کیوں کہ لعل تو گدڑی میں بھی نہیں چھپتے۔ ہاں مجھے اس کے جسم سے مچھلیوں کی بو ضرور آئی تھی۔ میں نے ارشاد علی کو حکم دیا تھا کہ اسے نہانے کے لیے خوشبودار صابن دے اور اچھے کپڑوں کا بندوبست کرے۔ پھر جب خوب نہا دھو کر اور نئی ساری باندھ کر میرے پاس آئی تھی تو میں اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ میری زمانہ شناس آنکھوں نے اسے دیکھتے ہی

بھانپ لیا تھا کہ وہ ابھی خراب نہیں کی گئی۔ ارشاد علی نے مجھے اس کے بارے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ مچھلیاں بیچتی ہے۔ وہ لڑکیاں جو محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھرتی ہیں عموماً خراب نہیں ہوتیں ورنہ انہیں محنت مزدوری کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مجھے علم تھا کہ ایسی لڑکیاں بہت جلد رام نہیں ہوتی انہیں بہت احتیاط، محبت اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کا دل محبت سے جیتا جا سکتا ہے، کسی اور طرح نہیں۔ پھر میں نے ایسا ہی کیا تھا، جلد بازی اور بے صبرا پن نہیں دکھایا تھا۔ میں نے اسے ایک گھر دیا تھا، آسائش دی تھی، عزت اور محبت دی تھی۔ ایک محروم لڑکی کو اور کیا چاہیے بھی کیا وہ اسی لیے جلد ہی مجھ پر جان چھڑکنے لگی تھی اور اب اس کی جان کو شدید خطرہ لاحق تھا۔ اس کا ماضی اسے ایک بار پھر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ خدا جانے شمبھو کیسے زندہ رہ گیا تھا اور کس طرح اسے یہ خبر ہو گئی تھی کہ سریتا کہاں ہے؟ اب سے پہلے اسے سریتا کے بارے میں کچھ خبر کیوں نہیں ہوئی؟ یہ سوالات میرے لیے تشنہ جواب تھے۔ میں اس وقت سریتا کی داستان حیات سن کر انہی سوالوں میں الجھا ہوا تھا۔

"آپ کیا سوچنے لگے صاحب جی؟" سریتا مجھے خاموش دیکھ کر کچھ دیر بعد بولی۔

"میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، پھر کہا۔ "سریتا کل رات تم سکون سے تو سوئی تھیں؟" میں نے براہ راست وہ سوال نہیں کیا جو میرا مقصد تھا۔

"ہاں صاحب جی۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اب میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے، بڑے مزے کی نیند آئی تھی اور پھر میں صبح دیر سے اٹھی تھی۔ ہاں ایک بات۔" وہ رکی، پھر کہنے لگی۔ "صاحب جی! آپ کی ہدایت ہے نا کہ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے سویا کرو، میں نے کیا تو ایسا ہی تھا، دروازہ بند کر کے ہی سوئی تھی، مگر جب اٹھی تو چٹخنی کھلی ہوئی تھی۔"

"تم رات کو چٹخنی لگانا بھول گئی ہوگی۔" میں نے دانستہ کہا حالانکہ میرے ہی کہنے پر ارشاد علی نے کھڑکی کے ذریعے اندر کود کر اس کے دروازے کی چٹخنی کھولی تھی۔ ذرا توقف کے بعد میں نے مزید کہا۔ "اور سنو سریتا، تم کھڑکی بند کر کے نہیں سوتیں؟" بات میں نے بے سبب نہیں کی تھی۔ سانپ کو میں نے کھڑکی کے ذریعے اندر کود کر اس کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔

"مجھے گھٹن سی لگتی ہے صاحب جی! جب تک ہوا کا گزر نہ ہو، مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"مگر کمرے میں روشن دان بھی تو ہے۔" میں بولا۔

"ہاں یہ تو میں بھول ہی گئی۔" اس نے بڑے بھولپن سے چونک کر کہا۔ "آپ کہتے

ہیں تو ہیں کھڑکی بھی بند کر لیا.....“

”بالکل۔“ میں نے زور دے کر کہا‘ پھر بولا۔ ”اور اگر تم رکمنی کو بھی اپنے کمرے میں سلا لیا کرو تو اور بھی اچھا ہے۔“

رکمنی کو سلا لیا کروں۔“ وہ حیرت سے بولی۔ ”مگر کس لیے صاحب جی۔“

”اس لیے کہ ان دنوں تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ بیماری میں کسی نہ کسی کا ساتھ رہنا ضروری ہوتا ہے۔“ میں نے گویا اسے سمجھایا۔

”لیکن اب تو میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے صاحب جی۔“

”ٹھیک ہے طبیعت۔“ میں محبت آمیز لہجے میں ہنس کر بولا۔

چہرہ پیلا پڑ رہا ہے اور کہہ رہی ہو کہ بالکل ٹھیک ہے طبیعت“

”آپ تو بس یوں ہی ذرا ذرا بات کی فکر کرنے لگ جاتے ہیں۔ صاحب جی! خیر آپ کہتے ہیں تو بھلا میں آپ کا حکم کیسے ٹال سکتی ہوں۔“ وہ مسکرانے لگی۔ اس کے چہرے پر محبت کا نور پھیل گیا تھا اور وہ مجھے بڑے نچھاور ہونے کے انداز میں دیکھنے لگی تھی۔

”اے شیخ! خطرہ! کسی نے میرے اندر جیسے سرگوشی کی۔ اس سریتا کا میرے پاس مزید رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں جو جاننا چاہتا تھا‘ جان چکا تھا اس لیے فوراً بول اٹھا۔ ”اچھا اب تم جاؤ‘ آرام کرو۔“

اس نے چلتے چلتے مجھے بڑی قاتل نظروں سے دیکھا‘ مگر میں نے اس کی طرف سے نگاہ پھیر لی۔ وہ بہرحال ایک بھرپور اور جوان لڑکی تھی۔ اس کے دل میں بھی کچھ خواہشیں تھیں۔ جنہیں میں بخوبی سمجھتا تھا‘ لیکن ان دنوں تو خود میری خواہشیں مصلوب تھیں۔ میں صبر کے علاوہ اور کیا کرتا۔

میری کوٹھی میں ملازماؤں کے علاوہ ملازم بھی تھے اسی لیے پوری احتیاط سے کام لیتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اپنی تمام ملازماؤں کو سختی سے تاکید کی ہوئی تھی کہ وہ سونے سے پہلے اپنے کمروں کے دروازے اندر سے بند کر لیا کریں۔ ہر چند کہ میں نے مرد ملازمین کو خوب چھان پھٹک کر ملازم رکھا تھا اور ان میں سے اکثر بوڑھے تھے‘ مگر پھر بھی احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ میں چوکنا رہوں۔

سریتا سے میں نے بالواسطہ جو سوال کیا تھا کہ وہ سکون سے سوئی یا نہیں‘ اس کا مقصد یہی تھا کہ اگر اسے گزشتہ شب کا واقعہ یاد ہو تو بیان کر دے۔ اس کا جواب اثبات میں تھا‘ اس کا یہی مطلب تھا کہ اسے بھی معلوم نہیں‘ کہ اس کے ساتھ کیا گزری ہے‘ اس سلسلے میں اسے

کچھ بتا کر میں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسی لیے ارشاد علی کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ گزشتہ شب کے واقعے کے متعلق سریتا کو نہ بتایا جائے۔

اب میرا عمل پورا ہونے میں صرف ہفتہ بھر رہ گیا تھا‘ گویا بس اب پلکوں کی سوئیاں نکالنا رہ گئی تھیں۔ مہ پارہ کا آخری حربہ بھی میں نے ناکام بنا دیا تھا کہ بلدیہ میری کوٹھی کو مسمار کرا دے۔ وہ تاریخ گزر چکی تھی اور اب ری اسیسمنٹ ہو رہا تھا۔ ایڈووکیٹ چودھری نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ دس مارچ سے پہلے کوئی کارروائی نہیں ہونے دے گا۔ اس کے علاوہ نصیرالدین کے کیس کی بھی نئی تاریخ مل گئی تھی جو دس مارچ کے بعد ہی کی تھی‘ گویا نصیرالدین کی طرف سے اب مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے اگر کوئی فکر تھی تو وہ بس شمبھو کی طرف سے تھی جسے ابھی میں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس ایک ہفتے کے دوران میں وہ میرے لیے کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مہ پارہ کی طرف سے بھی کسی نئے حملے کا خطرہ بہرحال تھا۔ میری دانست میں وہ اتنی جلدی شکست قبول کرنے والی نہیں تھی۔ مجھے اس پر حیرت تھی کہ اس کی طرف سے خاموشی کیوں ہے! مہ پارہ کی قوت و طاقت کا مجھے پورا اندازہ تھا۔ آدمی کو اگر اپنے دشمن کی قوت کا اندازہ ہو تو وہ اس سے بچنے کی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتا ہے‘ مگر جس کے بارے میں کچھ علم ہی نہ ہو‘ اس کے حربوں سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شمبھو کے معاملے میں میرے ساتھ ایسا ہی تھا۔ اس رات عمل کا وقت شروع ہونے سے پہلے مجھے اسی کی طرف سے فکر لاحق رہی کہ آج رات جانے کیا نیا ہنگامہ برپا ہو۔

صبح ہونے سے پہلے جب میں صدر دروازے تک جانے والی راہداری سے گزر رہا تھا تو پوری طرح چوکنا تھا میرے حکم پر اب راہداری میں زیادہ پاور کا بلب لگا دیا گیا تھا اور وہاں نیم تاریکی نہیں تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے میری نگاہ راہداری کے فرش پر تھی کیوں کہ گزشتہ شب یہیں وہ سانپ میرے پیروں سے لپٹ گیا تھا۔ دور تک راہداری روشن اور فرش صاف تھا۔ یہ دیکھ کر میرے دل کو تسلی ہوئی پھر جب میں‘ سریتا کے کمرے کے قریب سے گزرا تو پھر نظر کھڑکی پر پڑی۔ کھڑکی آج بند تھی‘ مگر کمرے کے اندر سے کسی کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی اور کھڑکی میں لگے ہوئے شیشوں سے خفیف سی روشنی بھی جھلک رہی تھی۔ ہنسی کی وہ آواز مردانہ تھی جسے سن کر میں کانپ اٹھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ شمبھو آج بھی کھڑکی بند ہونے کے باوجود کسی طرح کمرے کے اندر پہنچ گیا تھا‘ میرے قدم جیسے آپ ہی آپ رک گئے۔ ہنسی کی آواز آنا بند ہو چکی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے اب کچھ کہا جا رہا ہو۔ کھڑکی اور دروازہ بند ہونے کی وجہ سے آواز دھیمی تھی۔ میں نے کھڑکی کے قریب ہو کر اس سے کان لگا دیا۔ اب مجھے وہ

مردانہ آواز مدہم ہونے کے باموجود صاف سنائی دے رہی تھی۔

"..... سمجھ رہی ہوگی کہ کھڑکی بند ہو جائے گی تو میں یہاں نہیں آسکوں گا۔ اب میں یہ جھگڑا ہی ختم کروں گا۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اب تجھے اپنے ساتھ لے جانے کی بجائے اس کوٹھی پر قبضہ کرلوں گا۔ میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا۔" مردانہ آواز سنائی دے رہی تھی اور میں نے اس آواز کو پہچان لیا تھا یہ شمبھو ہی کی منحوس آواز تھی۔ "کل تک میں یہاں سے سب کو بھگادوں گا پھر تو ہوگی یہاں اور میں۔"

"تو کمینہ ہے..... ذلیل ہے تو۔" "معا" سریتا کی تیز آواز سنائی دی۔

"پھر باز نہیں آئی تو۔ بھول گئی کل کی سزا! پھر چیخے گی، کسی ذبح ہوتی بکری کی طرح!"

"ہاں میں باز نہیں آؤں گی۔ بھگوان کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دے شمبھو۔ یہاں تو مجھے چین سے رہنے دے۔"

"چین سے تو میرے ساتھ ہی رہے گی! آخر تجھے مجھ سے اتنی نفرت کیوں ہے؟"

"اس لیے کہ تو اسی قابل ہے۔"

"دیکھ اگر میں چاہوں تو تجھے اپنی شکتی کے بل پر خود سے محبت کرنے پر مجبور کر سکتا ہوں۔ تو میرے پیچھے کسی پالتو کتیا کی طرح دم ہلاتی پھرے گی، مگر میں مٹی کے ڈھیر کو گلے لگانا نہیں چاہتا۔ اس میں کوئی مزہ نہیں۔ مجھے تو اسی حال میں چاہیے 'جیتی جاگتی اور..... اور....."

پھر وہ خبیث ایسی باتیں کرنے لگا جنہیں ضبط تحریر میں لانا کم از کم میرے لیے ممکن نہیں۔

مجھے یقین تھا کہ سریتا نے آج رات رکمنی کو بھی اپنے کمرے میں سلایا ہوگا۔ میں نے اسے یہی ہدایت کی تھی۔ پھر وہ کہاں گئی؟ اور اگر رکمنی بھی کمرے ہی میں موجود تھی تو بیدار کیوں نہیں ہوئی؟ میری ساری احتیاط اور دور اندیشی بیکار ثابت ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ اور کھڑکی بند ہونے کے باوجود شمبھو اندر پہنچ گیا تھا۔ اسی وقت مجھے روشن دان کا خیال آیا اور میں اپنی عقل پر ماتم کر کے رہ گیا۔ کبھی کبھی سامنے کی چیزوں پر آدمی دھیان نہیں دیتا۔ شاید اس بھول کی لاشعوری وجہ یہ رہی ہو کہ میں، شمبھو کو بہرحال ایک آدمی ہی سمجھ رہا تھا۔ اگر شمبھو واقعی جون بدلنے پر قادر تھا تو پھر اس کے لیے یہ مشکل نہیں تھا کہ روشن دان کے ذریعے سانپ بن کر اندر پہنچ جاتا۔ یہی سوچتے ہوئے میری نگاہ کمرے کے دروازے پر پڑی۔ دروازے کے کواڑوں کے نیچے بھی اتنی جگہ تھی کہ کوئی سانپ اندر جا سکتا تھا۔

ہر حال میں مجھے صبح ہونے اور سورج نکلنے سے پہلے اپنے ہمزاد کے لیے چوراہے پر

روٹی رکھ کر واپس آنا تھا یہ سوچ کر میں آگے بڑھ گیا۔ سریتا کے کمرے میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس پر بہرحال میرا کوئی بس نہیں تھا۔ میں اسے فی الحال شمبھو کے شر سے بچانے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں مجھے شمبھو کی اس بات نے ضرور فکر مند کر دیا تھا کہ کل تک میری کوٹھی پر اس کا قبضہ ہو جائے گا اور وہ یہاں سے سب کو بھگا دے گا۔ ظاہر ہے کہ میں بھی ان "سب" میں شامل تھا۔ کم از کم عمل پورا ہونے تک تو میرا اس کوٹھی میں قیام انتہائی ضروری تھا۔ اسی کی خاطر تو میں سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چوراہے کی طرف جا رہا تھا کہ "معا" چونک اٹھا۔ پیچھے سے کسی نے چھوٹا سا کوئی پتھر مارا تھا۔ جو میری پشت پر لگا تھا۔ فطری طور پر ایسے مواقع پر آدمی ایک دم مڑ کر پیچھے دیکھتا ہے۔ میرے دل میں بھی لمحہ بھر کو یہی خواہش ابھری، مگر میں نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ مجھے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا تھا۔ میں رکے بغیر چلتا رہا۔ دوسرا پتھر میرے سر پر آکر لگا اور میری آنکھوں کے آگے ستارے سے ناچ گئے، مگر میں اسے بھی برداشت کر گیا یہ سنگ زنی کون کر رہا تھا، کون نہیں، اس سے مجھے کچھ غرض نہیں تھی۔ میرے لیے تو وہ سنگ زنی، بارش گل تھی کہ اسی سے گزرنے کے بعد مجھے میری منزل ملتی۔ چوراہے تک پہنچتے پہنچتے کئی بار میرے منہ سے کراہیں نکل گئیں کیوں کہ مجھ پر مسلسل پتھر برستے رہے تھے، مگر میں بھی اپنی دھن کا پکا تھا۔ میرے لیے یہ تجربات نئے نہیں تھے۔ میں برسوں پہلے ان سے گزر چکا تھا۔ ہمزاد کو قابو میں کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں، یہ جان والوں کا کام ہے اور مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی۔

چوراہے پر روٹی رکھنے کے بعد میں واپس ہوا تو مجھے اپنے عقب میں بڑی خوف ناک آوازیں سنائی دیں جیسے بھوکے درندے مجھ پر حملہ کرنے والے ہوں۔ بڑے سے بڑے دل گردے والا یہ خوف ناک آوازیں سن لیتا تو اس کا پتا پانی ہو جاتا اور وہ دہشت کے مارے وہیں ڈھیر ہو جاتا، مگر میں آگے بڑھتا رہا اور بالآخر اپنی کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہو گیا جہاں دوسرے عذاب میرے منتظر تھے۔ جیسے ہی میں نے آگے بڑھنا چاہا، کسی نادیدہ قوت نے مجھے پیچھے دھکیل دیا۔ میرا سر بڑی زور سے کوٹھی کے گیٹ کے ساتھ ٹکرایا اور پھر میں گر پڑا۔ اسی وقت مجھے ایک تیز پھنکار سنائی دی۔ میں نے اٹھتے ہوئے اپنے بالکل سامنے شعلے سے لپکتے دیکھے، یوں جیسے شعلے رقص کر رہے ہوں۔ وہ شعلے میری راہ میں حائل تھے۔ میں نے ذرا ہٹ کر اور ان شعلوں سے بچ کر گزر جانا چاہا، مگر کامیاب نہ ہوا۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت کر کے پھر میرے سامنے آگئے تھے۔ مجھے فوراً شمبھو کا خیال آیا جس نے سریتا سے کہا تھا کہ کل تک سب کو

کوٹھی سے بھگا دے گا یقیناً اس نے اپنی شیطانی کارروائی ابھی سے شروع کر دی تھی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ یقیناً اب تک سر پر پیر رکھ کر وہاں سے بھاگ چکا ہوتا' مگر میں اتنی جلدی شکست قبول کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ میں خود متعدد حیرت انگیز اور پُراسرار واقعات سے گزر چکا تھا' پھر بھلا کیسے جی ہار بیٹھتا۔ معاً میرے ذہن میں کوٹھی کے عقبی دروازے کا خیال آیا۔ میں اس طرف سے بھی کوٹھی کے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ یوں بھی میرا کمرہ کوٹھی کے عقبی حصے ہی میں تھا۔ میں بہ آسانی وہاں سے اپنے کمرے تک پہنچ سکتا تھا۔ اس میں صرف ایک قباحت تھی کہ عقبی دروازہ اندر سے کھولتا کون؟ میں عقبی چھوٹا پھاٹک تو عبور کر کے کسی طرح اندر پہنچ سکتا تھا۔ مگر عمارت کا عقبی دروازہ کسی بھی طرح نہیں کھول سکتا تھا جس میں اندر سے تالا پڑا رہتا تھا اور اس تالے کی چابی ارشاد علی کے پاس رہتی تھی۔ ممکن ہے کہ وہاں پہنچ کر کوئی راہ نکل آئے' یہ سوچ کر میں مڑا اور کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ پھر میں ایک لمبا چکر کاٹ کر کوٹھی کی عقبی سمت پہنچا۔ وہاں گہری تاریکی اور سناٹا تھا۔ میں نے کچھ دیر سن گن لی اور اسی وقت مجھے ایک تیز نسوانی چیخ سنائی دی۔ اسی کے بعد "بچاؤ بچاؤ" کی تیز آوازیں آئیں۔ اس چیخ اور تیز آواز نے میرے اعصاب کو جھنجوڑ دیا کیوں کہ وہ آواز میرے لیے نئی نہیں تھی۔ یہ مہ پارہ کی آواز تھی' مگر مجھے حیرت اس پر تھی کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے۔ میں نے سوچا کہ جتنی جلدی اپنی کوٹھی کے اندر پہنچ جاؤں میرے حق میں بہتر ہے۔ یہ سوچتے ہوئے میں تیزی کے ساتھ کوٹھی کے عقبی گیٹ پر چڑھنے لگا۔ اسی لمحے مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر میں ابھی گیٹ کے اوپر پہنچا تھا اور اندر نہیں کود سکا تھا کہ کسی نے میرا پیر پکڑ کر مجھے گھسیٹ لیا۔ اس کے بعد ہی میرے سر پر بھاری ڈنڈے کی ضرب پڑی اور سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا۔ ہوش کھونے سے پہلے میں نے اس شخص کی ایک جھلک دیکھ لی تھی جس نے مجھ پر "طبع آزمائی" کی تھی۔ وہ پولیس والا تھا جو یقیناً رات کے وقت اس طرف گشت پر رہا ہوگا۔ اسے مہ پارہ کی چیخ ہی نے اس طرف دوڑ کر آنے پر مجبور کیا ہوگا' گویا اس کا چیخنا بے سبب نہیں تھا۔

میرے جسم پر صرف ایک کپڑا تھا۔ میں عمل کے دوران میں صرف ایک انگوچھا باندھ لیتا تھا اور پھر جب چوراہے پر روٹی رکھ کر آجاتا تھا تو لباس تبدیلی کرتا تھا۔ اس حالت میں اور رات کے وقت کسی کوٹھی کے عقبی پھاٹک پر چڑھنے والا سپاہی کی نظر میں کوئی چور ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ اسی لیے ایسا سلوک کیا تھا۔

ہوش آنے کے بعد میں کچھ دیر سمجھ ہی نہ سکا کہ کہاں ہوں۔ مجھے سامنے ہی ایک

دروازہ نظر آرہا تھا۔ جس میں موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ دروازہ بند تھا۔ پھر میرے حواس ذرا بجا ہوئے تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں تھانے میں ہوں اور مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا ہے۔ معاً میرے سر میں ٹیس سی اٹھی اور بے اختیار میرا ہاتھ وہاں تک پہنچ گیا۔ مجھے ہلکی سی چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ ضرب یقیناً شدید تھی اور اس جگہ بڑا سا ابھار بھی تھا۔ سر کی کھال پھٹ گئی تھی' مگر شاید زیادہ نہیں ورنہ خون بہہ رہا ہوتا۔

نہ وہ تھانہ میرے لیے نیا تھا' نہ تھانے والے۔ ان سے پیچھا چھڑانا میرے لیے زیادہ مشکل نہ ہوتا۔ یہی سوچ کر میں نے حوالات کے سامنے ٹہلتے ہوئے سپاہی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"کیا ہے بے؟" سپاہی نے بڑی رعونت سے مجھے جواب دیا۔ غالباً اسے بھی بتا دیا گیا ہوگا کہ میں چور ہوں اور عین موقع پر ایک کوٹھی میں گھستے ہوئے پکڑا گیا ہوں۔

"ملک صاحب نہیں آئے ابھی؟" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے پولیس والے سے تھانے کے ایس ایچ او کے بارے میں پوچھا۔

"کیوں..... کیا باوا ہیں ملک صاحب تیرے۔ رعب میں لے رہا ہے صاحب کا نام لے کر۔" اس نے سلاخوں کے قریب آکر مجھ پر آنکھیں نکالیں۔

جب آدمی کا وقت بگڑتا ہے تو دو پیسے کا آدمی بھی اس کی بے عزتی کر دیتا ہے' میں نے سوچا اور اس پولیس والے کو بے بسی سے دیکھنے لگا جو سیدھے منہ بات کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ غالباً میری ظاہری حالت بھی تھی۔ میرے جسم پر صرف انگوچھے کی بجائے صرف اچھے کپڑے ہوتے تو شاید وہ یوں پیش نہ آتا۔ موجودہ صورت حال میں صبر کرنے کے سواء کوئی چارہ نہیں تھا' سو میں نے صبر کیا۔

کچھ ہی دیر بعد اچھی طرح دن نکل آیا اور تھانے کے صحن میں دھوپ پھیل گئی۔ اس کے ساتھ میری مشکل بھی آسان ہو گئی۔ ایک سپاہی مجھے حوالات سے نکال کر ایس ایچ او کے کمرے سے ملحق نسبتاً بڑے کمرے میں لے گیا۔ وہاں میری ملاقات اسی سب انسپکٹر سے ہوئی جس نے مجھے نرس مس نادرہ کے معاملے میں گرفتار کیا تھا وہ مجھے دیکھ کر اس طرح پلکیں جھپکانے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ حوالات میں بند کرنے کی بجائے ایک رات کے لیے مجھے گھر جانے کی اجازت دینے کے سلسلے میں وہ بھی مجھ سے رشوت لے چکا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر آشنائی کے آثار دیکھے تو فوراً اپنا تعارف کرایا۔ "میرا نام شیخ کرامت ہے جناب آپ سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔"

"ہاں ہاں یاد آ رہا ہے مجھے۔" وہ پنسل اپنی کنپٹی پر رکھتے ہوئے بولا۔ "تم وہی ہو نا جو ایک نرس پر مجرمانہ حملہ کرنے کے سلسلے میں....."

"جی..... جی ہاں۔" میں نے جلدی سے سرہلایا' پھر بولا۔ "اور وہ الزام غلط ثابت ہوا تھا۔"

"خیر اس بات کو چھوڑو کہ الزام غلط تھا یا صحیح' فی الحال تو یہ بتاؤ کہ تم کسی کے گھر میں کودنے کی کوشش کیوں کر....."

"کسی کے گھر میں نہیں جناب' اپنے گھر میں۔" میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"کیا مطلب؟ اس نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔"

"جی ہاں' میں اپنی ہی کوٹھی میں داخل ہو رہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن گیٹ پر چڑھ کر اور وہ بھی کوٹھی کے پچھلے حصے سے۔" اس نے مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں تو اس پولیس والے سے بلا کر پوچھ لیں۔ جس نے مجھے ڈنڈا مار کر گرایا تھا کہ یہ واقعہ کہاں پیش آیا۔" میں نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے دلیل دی۔

"تم نے نہیں دیکھا' اس پولیس والے کو؟"

"بس ایک ہلکی سی جھلک دیکھی تھی' بے ہوش ہوتے ہوتے۔"

"اے ادھر آؤ تم۔" اس نے ذرا فاصلے پر کھڑے ہوئے ایک پولیس والے کو اشارہ کیا۔

پولیس والا قریب آ گیا تو میں نے اس کے چہرے پر کچھ گھبراہٹ سی دیکھی۔

"انہیں تم نے کہاں اور کس حالت میں پکڑا تھا؟" سب انسپکٹر نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔ "جھوٹ بالکل نہیں' سچ سچ بتانا۔"

"میں گشت پر تھا جناب عالی کہ مجھے ایک عورت کی چیخ سنائی دی۔ وہ بچاؤ۔ بچاؤ کی آوازیں لگا رہی تھی جیسے جناب عالی کوئی اس کے ساتھ....."

زیادہ منظر کشی کی ضرورت نہیں۔" سب انسپکٹر نے اسے ڈانٹ دیا۔ "سیدھے سیدھے الفاظ میں وقوعہ بیان کرو۔"

"جی جناب عالی۔" اس نے سعادت مندی سے سرہلایا' پھر وہی سب کچھ بیان کر دیا جو مجھ پر گزری تھی۔ اس کے ساتھ اس نے میری کوٹھی کا محل وقوع بھی بیان کر دیا تھا۔

"جگہ تو وہی معلوم ہوتی ہے' میں گیا ہوں وہاں۔" سب انسپکٹر سرہلا کر کہنے لگا' پھر غالباً کچھ سوچتے ہوئے اس نے سرہلایا۔ "ٹھیک ہے' میں خود اس معاملے کی تفتیش کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا' پھر اس سپاہی کو اشارہ کیا۔ "تم بھی اس جگہ کی نشان دہی کرنے میرے ساتھ چلو گے۔"

"جی جناب عالی۔" سپاہی فوراً بولا۔

سب انسپکٹر نے مجھے بھی اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھا۔

میں اس سب انسپکٹر اور سپاہی کے ساتھ تھانے سے نکل آیا۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ سب انسپکٹر اس معاملے میں کیوں اتنی فرض شناسی' کا ثبوت دے رہا تھا اور عموماً پولیس والے یہ رویہ اختیار نہیں کرتے۔ میری کوٹھی وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ جلد ہی ہم وہاں پہنچ گئے اور سپاہی نے میرے بیان کی تصدیق کر دی۔ اس وقت ہم کوٹھی کے عقبی گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔

"اچھا تم تھانے پہنچو میں آتا ہوں۔ ابھی۔" سب انسپکٹر نے سپاہی سے کہا۔

"بہتر جناب عالی۔" سپاہی اٹینشن ہو کر واپسی کے لیے مڑ گیا۔

سپاہی کے جاتے ہی سب انسپکٹر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "یہ تم نے ان دنوں چکر کیا چلا رکھا ہے' کبھی اطلاع ملتی ہے کہ تمہاری کوٹھی میں کسی لڑکی کی لاش پڑی ہے' کبھی کوئی لڑکی تھانے میں آ کر رپورٹ درج کراتی ہے کہ تم نے اس پر مجرمانہ حملہ کیا ہے اور کبھی تمہاری کوٹھی سے بچاؤ بچاؤ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ سپاہی کا بیان ہے کہ اس نے بھی کسی لڑکی ہی کی چیخ سنی تھی اور اس طرف دوڑا تھا۔" وہ مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ "ہر معاملے میں کوئی نہ کوئی لڑکی ضرور ملوث ہے۔ آخر کوئی تو وجہ ہو گی اس کی۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمارا یہاں کھڑے رہ کر باتیں کرنا کچھ مناسب نہیں ہے لوگ اس گلی میں آ جا رہے ہیں۔" میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا اور اسی وقت مجھے شبھو کا خیال آ گیا کہ وہ اب بھی کوٹھی میں ہو گا یا نہیں۔ یہ خیال آتے ہی میں کچھ فکر مند سا ہو گیا۔

"زیادہ وقت نہیں ہے میرے پاس' مگر تم سے ابھی کچھ ضروری بات کرنا ہے اس لیے چلو۔" سب انسپکٹر میری بات سن کر معنی خیز لہجے میں بولا۔

"مجبوراً میں اسے ساتھ لیے چکر کاٹ کر کوٹھی کے بیرونی گیٹ پر پہنچ گیا اور اندر نظر پڑتے ہی چکرا کر رہ گیا۔ عمارت اور گیٹ کے درمیان جو سرسبز و شاداب درخت تھے' وہ جھلس

کر رہ گئے تھے۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آرہی تھی۔

اس بات کو اس سب انسپکٹر نے بھی محسوس کر لیا اور بولا۔ ”ابھی کچھ دن پہلے ہی تو میں یہاں آیا تھا‘ اس وقت تو یہاں بڑی ہریالی تھی‘ اب تو تمہاری کوٹھی آسیب زدہ سی معلوم ہو رہی ہے کیا ہوا؟“

میں اس کی بات کا جواب دیئے بغیر آگے بڑھا اور پھاٹک کھولنا چاہا جسے میں کھلا ہوا چھوڑ گیا تھا۔ پھاٹک نہیں کھلا۔ کسی نے اسے اندر سے بند کر دیا تھا۔ پھاٹک کے ساتھ ہی گھنٹی کا بٹن تھا میں نے اس پر انگلی رکھ دی۔ گھنٹی بجنے کی آواز باہر تک سنائی دی۔ بہ ظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوٹھی میں کوئی نہ ہو۔ میں پھاٹک کی آہنی جالیوں سے اندر جھانکنے لگا۔ عمارت کا صدر دروازہ اب تک بند تھا ایک بار پھر میں نے بٹن پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا اور دیر تک انگلی نہ ہٹائی۔

”کیا تمہارے ملازم گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔ سب انسپکٹر نے قدرے ناگوار لہجے میں کہا۔

”سمجھ میں نہیں آتا کیا بات ہے؟“ میں انجان بن گیا۔

لان کی گھاس‘ پیڑ پودے سبھی اندر جھلسے اور مرجھائے ہوئے نظر آرہے تھے‘ ایک ویرانی سی ویرانی تھی میں وقفے وقفے سے گھنٹی بجا رہا تھا۔

”آخر میں کب تک یہاں تمہارے ساتھ احمقوں کی طرح کھڑا رہوں۔“ سب انسپکٹر سے صبر نہ ہو سکا۔

اسی وقت دائیں جانب مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

اور میں نے اس طرف دیکھا۔ ارشاد علی تقریباً دوڑتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔

”کہاں مر گئے تھے؟“ میں اسے دیکھتے ہی چیخا۔ اور تم کہاں سے آرہے ہو۔؟“ وہ قریب آکر اب اپنے سانس درست کر رہا تھا۔

”جج..... جناب میں..... میں اندر ہی تھا۔“ اس نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔

”اندر تھے کوٹھی میں؟“ میری بجائے سب انسپکٹر نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”جی ہاں..... میں پچھلی..... پچھلے دروازے سے گھنٹی کی آواز سن کر آیا ہوں۔“

سب انسپکٹر اسے اس طرح دیکھنے لگا جیسے ارشاد علی کی دماغی صحت پر اسے شبہ ہو۔ ”دی ہو تم بھی“ سب انسپکٹر ناگواری سے بولا ”اتنا لمبا چکر کاٹ کر تو آگئے اور سیدھے آکر.....“

”چلیئے آیئے آپ۔“ میں نے سب انسپکٹر کی بات کاٹ کر اس سے کہا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے ورنہ ارشاد علی اتنا احمق نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر یقیناً بلا سبب ہوائیاں نہیں اڑ رہی تھیں۔

”کہاں چلیئے؟“ سب انسپکٹر حیرت اور خفگی سے بولا۔

”اب تو مجبوراً پچھلی طرف سے ہی جانا پڑے گا کیوں کہ اس سے حماقت سرزد ہو گئی ہے۔“ میں نے بات بنائی۔ ”آپ کو یوں بھی جلدی ہے۔“

”عجیب پاگلوں سے پالا پڑا ہے۔“ سب انسپکٹر بڑبڑاتا ہوا میرے ساتھ ہو لیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھ سے اب تک کیوں چپکا ہوا ہے یقیناً وہ مجھے ”چھیلے“ بغیر ٹلنے والا نہیں تھا۔ یہ محض اس نے اپنی اہمیت جتانے کے لیے کہا تھا کہ میرے پاس وقت کم ہے۔

کچھ دیر بعد ہی میں‘ سب انسپکٹر کو ساتھ لیے عقبی پھاٹک سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس طرف بھی پیڑ لگے ہوئے تھے‘ مگر یہاں کا منظر مختلف تھا۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ یہ بھی میرے لیے حیرت انگیز امر تھا۔ عقبی دروازے سے میں اندر داخل ہوا تو ارشاد علی نے مجھے اشارہ کیا۔ وہ غالباً مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ سب انسپکٹر نے بھی اسے اشارہ کرتے ہوئے شاید دیکھ لیا تھا اسی لیے مشتبہ سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی پروا کئے بغیر ارشاد علی کو لے کر ذرا ایک طرف ہو گیا۔

”ہاں کہو کیا بات ہے؟“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”اوھ..... انہیں ادھر ڈرائنگ روم کی طرف نہ لے جایئے گا۔“ اس نے سرگوشی کی۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سبب پوچھے بغیر سر ہلایا اور پھر سب انسپکٹر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”آیئے جناب‘ اوھ..... اس طرف آجایئے۔“ میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

سب انسپکٹر منہ بناتا ہوا میرے ساتھ کمرے میں آگیا ارشاد علی کو میں نے باہر ہی رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ سب انسپکٹر کو کرسی پر بٹھا کر میں سیدھا باتھ روم میں گھس گیا تاکہ لباس تو کم از کم تبدیل کر ہی لوں۔ مجھے سب انسپکٹر کے سامنے صرف انگوچھا باندھے ہوئے بڑی خجالت محسوس ہو رہی تھی۔ پھر جب میں لباس تبدیل کر کے باتھ روم سے نکلا تو بڑی حد تک اپنے منتشر حواس پر قابو پا چکا تھا۔

”جی اب فرمائیں۔“ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”فرمانا کیا ہے۔ میں تمہیں دراصل یہ بتانا چاہتا تھا کہ یہ معاملہ اتنی آسانی سے ختم

نہیں ہوگا۔" اس کے چہرے میں عیاری جھلک رہی تھی۔

"کون سا معاملہ؟" مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ وہ مجھ سے رقم اینٹھنے کے لیے ذرا سی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا تھا۔

"یہی اور کون سا معاملہ؟" وہ بولا۔ اب تم اتنے بھولے بھی نہیں ہو کہ میری بات نہ سمجھ سکو۔ اس ہوا میں نہ رہنا کہ تم اب تھانے میں نہیں ہو۔ میری رعایت کا غلط مطلب نہ لو۔" اس نے آنکھیں بدل لیں۔ "میں تمہیں پھر حوالات کی ہوا کھلا سکتا ہوں۔"

"مگر کس جرم میں؟" میرے لہجے میں تیزی آگئی۔ "کیا اپنے ہی گھر میں داخل ہونا بھی جرم ہے؟"

"یہ تو تمہارا بیان ہے نا۔" وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔ "جائے وقوعہ بدل بھی سکتی ہے اور ابھی میری تفتیش جاری ہے، ایک گھر ادھر یا ایک گھر ادھر اب آیا کچھ سمجھ شریف میں کہ نہیں۔" اس کا لہجہ بہ دستور طنزیہ رہا۔ "پھر تم اس لڑکی کو کیوں بھول رہے ہو جس کی چیخیں سن کر سپاہی موقع پر پہنچا تھا۔ اچھا یہ سب بھی چھوڑو کیا میں تمہیں رات کے وقت مشتبہ حالت میں آوارہ گردی کے جرم میں اندر نہیں کر سکتا۔"

میں چند لمحے خاموش رہا۔ فی الحال اس سے الجھنا بے سود ہی تھا۔ وہ کچھ لیے دیئے بغیر ٹلنے والا ہرگز نہیں تھا۔ اس نے مجھ پر ظاہر کر دیا تھا کہ وہ کس کس طرح مجھے پھانس سکتا ہے اور چکر دے سکتا ہے۔ اس سے مصلحت ہی میں بہتری تھی بعد میں اس سے اچھی طرح نمٹا جا سکتا تھا۔ پولیس والوں نے مجھے جو چرکے دیئے تھے، میں بھولا نہیں تھا۔ وقت آنے پر میں ایک ایک حساب چکانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"آپ تو ناحق بگڑنے لگے جناب۔" میں نے ایک دم اپنا رویہ اور لہجہ بدل لیا۔ "میں تو آپ لوگوں کا دیرینہ خادم ہوں۔" یہ میں ہی جانتا ہوں کہ ان الفاظ کو ادا کرنے کے لیے میں نے خود پر کتنا جبر کیا تھا۔

"کیوں نکل گئے سب کس بل۔" اس نے گویا چڑایا۔

"اجی ہم غریبوں کے کیا کس بل خادم ہیں آپ کے۔" میں نے عاجزانہ انداز اختیار کر لیا۔

"اب آئے نہ گھاٹ پر۔" وہ مسکرایا اور پھر مطلب کی بات پر آگیا۔

"وہ مطلب کی بات۔" مجھے دو ہزار روپے میں پڑی۔ اس سے کم پر وہ راضی نہیں ہوا تھا۔

سب انسپکٹر کے جاتے ہی میں نے ارشاد علی کو بلالیا۔ وہ اب تک وحشت زدہ سا نظر آرہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "کیا بات ہے ارشاد علی، تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟" میں نے بظاہر اطمینان سے سوال کیا حالانکہ میرے اندر ایک ہیجان برپا تھا۔



"سمجھ میں نہیں آتا صاحب کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے! میری تو عقل حیران ہے۔" وہ تقریباً" روہانسے لہجے میں بولا۔

"کچھ ارشاد علی تفصیل کے ساتھ مجھے واقعات بتانے لگا جو میری عدم موجودگی میں پیش آئے تھے۔ میرے جانے کے کچھ دیر بعد ارشاد علی نے بڑی خوفناک آوازیں سنی تھیں جیسے کوٹھی میں درندے گھس آئے ہوں۔ وہ بڑے دل گردے کا آدمی تھا۔ مگر ان آوازوں نے اسے خوف زدہ کر دیا اور وہ گھبرا کر میرے کمرے میں بند ہو گیا۔ وہ آوازیں آنا بند ہوئیں تو کچھ ہی دیر بعد کمرے کے دروازے کو کسی نے پیٹنا شروع کر دیا۔ ارشاد علی نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور دیکھا کہ میرے سارے مرد ملازمین باہر کھڑے تھے۔ انہوں نے ارشاد علی کو بتایا کہ وہ کوٹھی چھوڑ کر جا رہے ہیں کیوں کہ اب کسی حال میں وہاں نہیں رہ سکتے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ انہیں اس بڑے کمرے میں سانپ نظر آیا تھا جہاں ان میں سے تین افراد کا قیام تھا۔ وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگے تھے۔ بقیہ دو نے بھی سانپ ہی کا ذکر کیا۔ انہوں نے بھی خوف ناک آوازیں سنی تھیں جن کی وجہ سے ان کی آنکھ کھلی تھی۔ ارشاد علی نے انہیں اس وقت تک کے لیے روکنا چاہا جب تک میں واپس نہ آ جاؤں، مگر کوئی نہ مانا۔ وہ سبھی انتہائی خوف زدہ تھے۔ ارشاد علی نے خاص طور پر اس بات کا ذکر کیا کہ ان کے ساتھ میری کوئی ملازمہ نہیں تھی۔ وہ سب چلے گئے تو ارشاد علی کو ملازماؤں کی فکر ہوئی کہ آخر وہ کیوں بیدار نہ ہوئیں۔ پھر یہ کہ اسے میری بھی فکر تھی کیوں کہ میں اس وقت تک لوٹ آتا تھا۔ وہ بری ہمت کر کے میرے کمرے سے نکلا۔ اس وقت تک صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تھے تاریکی کی نسبت اجالے میں آدمی کو اتنا خوف محسوس نہیں ہوتا۔ ارشاد علی کے ہمت پکڑنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ اس نے سوچا کہ جب تک میں لوٹوں اس وقت تک وہ کم از کم میرے لیے ناشتا ہی تیار کر لے اور ملازماؤں کی خیر خبر بھی لے لے۔ اسی غرض سے وہ آگے بڑھا اور ڈرتے

جھجکتے اس نے پہلے رکمنی کے کمرے کا رخ کیا جو وہاں سے نسبتاً" قریب تھا۔ اس نے ابھی برآمدے میں قدم رکھا ہی تھا کہ جیسے کسی نادیدہ قوت نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ اسی کے ساتھ اسے برآمدے کے فرش سے لے کر چھت تک ایک شعلہ سا رقص کرتا نظر آیا۔ یہ منظر دیکھ کر اس پر اتنی دہشت بیٹھی کہ کچھ دیر اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا پھر اسے جتنی آیتیں یاد تھیں۔ یکے بعد دیگرے پڑھنے لگا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ اس کا خوف کچھ کم ہو گیا اور وہ زمین سے اٹھ کر دوبارہ میرے کمرے کی طرف آ گیا۔ وہ برآمدہ گویا بقیہ عمارت اور اس حصے کے درمیان حد فاصل تھا جہاں میرا کمرہ تھا اور میرے ہی کمرے سے ملحق ارشاد علی کا کمرا تھا۔ وہ حصہ گویا عمارت سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر گزری تھی کہ ارشاد علی نے گھنٹی کی آواز سنی۔ ہمت کر کے میرے کمرے سے نکلا اور عقبی دروازے سے باہر آ گیا۔ اب دن نکل آیا تھا۔ گھنٹی پھر بجی جو اسے باہر آنے کے باوجود سنائی دے رہی تھی۔ بہرحال وہ عقبی پھاٹک کھول کر کوٹھی کے بیرونی گیٹ تک پہنچا اور وہاں ڈاکٹر امتیاز کو دیکھا جو میری ڈریسنگ کرنے آیا تھا۔

ارشاد علی نے ڈاکٹر امتیاز کو بتایا کہ میں کوٹھی میں نہیں ہوں۔ پھر اس نے احتیاط" ڈاکٹر سے اس کے گھر کا پتا لکھوا لیا۔ ڈاکٹر واپس چلا گیا اور چلتے ہوئے کہہ گیا کہ جب میں آ جاؤں تو اسے بلوا لیا جائے۔ اسی وقت ارشاد علی کی نظر کوٹھی کی طرف اٹھی اور اسے وہی منظر نظر آیا جو اس نے دیکھا تھا۔ اس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس طرف سے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے۔ ڈاکٹر امتیاز نے بھی اس پر حیرت ظاہر کی تھی اور کوئی تسلی بخش جواب نہ پا کر الجھا الجھا سا واپس چلا گیا تھا۔ اس کے بعد ارشاد علی دوبارہ عقبی سمت سے کوٹھی میں آ گیا تھا۔ اسے بڑی بے چینی سے میرا انتظار تھا۔

اس سے تمام واقعات سننے کے بعد میں نے کہا۔ "دیکھو ارشاد علی، اس میں کوئی لحاظ یا مروت والی بات نہیں۔ اگر تم بھی مجھے ان حالات میں دوسروں کی طرح چھوڑ کر جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو، میں ہرگز برا نہیں مانوں گا۔"

"یہ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب! میں..... میں آپ کو چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں! جہاں آپ..... وہیں میں۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "موت زندگی اللہ کے ہاتھ ہے۔ اگر جس طرح لکھی ہے تو کون روک سکتا ہے! ویسے میں..... میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں جناب کہ یہ کہ جب سے آپ نے وظیفہ شروع کیا ہے، یہ..... یہ مصیبتیں آ رہی ہیں۔"

"تم ٹھیک سمجھ رہے ہو ارشاد علی!" میں نے اسے اعتماد میں لینے کے لیے کہا۔ اسے کسی نہ کسی طرح مطمئن کرنا ضروری تھا ورنہ اس کے بغیر مجھے بڑی پریشانی ہو جاتی۔ یوں تو میں

نے اسے آزمانے کے لیے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ بھی جانا چاہے تو جاسکتا ہے' مگر دل سے میں
چاہتا تھا۔ میں نے اسے مزید مطمئن کرنے کی غرض سے کہا۔ "وظیفہ پورا ہونے میں بس
روزہ رہ گئے ہیں ارشاد علی' اس کے بعد سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔"

"مگر جناب میں نے سنا ہے کہ کبھی کبھی وظیفہ الٹا بھی ہو جاتا ہے' کہیں ایسا ہی تو نہیں
ہے، جو یہ سارا چکر شروع ہو گیا ہے!"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم فکر نہ کرو! اور ابھی تو چند
باقی ہیں۔ وظیفہ پورا ہونے کے بعد ہی تو معلوم ہو گا کہ وظیفہ الٹا ہو گیا یا....."

"خدا نہ کرے جناب کہ ایسا ہو۔" وہ بول اٹھا۔

"خیر اب تم کوٹھی کے اس حصے میں جانے کی کوشش نہ کرنا!" میں نے کہا' پھر
سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "ایسا کرو کہ عارضی طور پر اپنے کمرے کے سامنے کھانے پکانے کا
بندوبست کر لو۔ میں تمہیں پیسے دیئے دیتا ہوں' جس جس چیز کی ضرورت سمجھو لے آؤ۔"

"مگر جناب سب..... سبھی سامان لانا پڑے گا۔ سب کچھ تو باورچی خانے میں تھا'
بھاڑے اور....."

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" میں نے الماری کھولی اور اس میں سے بڑے نوٹوں کی
آخری گڈی نکال لی۔ اس میں سے میں نے سب انسپکٹر کی "خدمت" کی تھی۔ "لو یہ
اپنے پاس رکھ لو' جو بچیں واپس دے دینا۔" میں نے پلٹ کر اس کی طرف نوٹوں کی گڈی
بڑھائی۔

"یہ تو بہت ہیں جناب!" اس نے نوٹوں کی گڈی لیتے ہوئے کہا۔

"سامان بھی تو بہت لانا ہے تمہیں۔" میں نے مسکرا کر اس کی شانہ تھپکا۔ "اطمینان
سے اپنے کمرے میں جا کر سامان کی فہرست بنا لو اور جتنی جلد ممکن ہو سامان خرید کر لے
جاؤ۔ آمدورفت کے لیے ہم وقتی طور پر عقبی دروازہ ہی استعمال کریں گے۔ ہاں سنو' اگر
ہو تو ڈاکٹر امتیاز کی طرف بھی ہوتے آنا اور انہیں بتا دینا کہ وہ پیچھے سے آئیں اور گیٹ بھی
جانا باہر سے!"

"ٹھیک ہے جناب!" اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ "میں ڈاکٹر صاحب سے
دوں گا کہ آپ آ گئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ میرے کمرے سے نکل گیا۔

اس ہنگامہ آرائی کی وجہ سے فجر کی نماز قضا ہو گئی تھی۔ میں نے وضو کر کے پہلے
پڑھی۔ پھر بستر پر دراز ہو کر گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ ارشاد علی

میں نے جیسے تیسے مطمئن کر دیا تھا مگر خود میرے دل کو اطمینان نہیں ہوا تھا۔ شبھو کے کہے
ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے جو اس نے سریتا سے کہے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں
کوئی قباحت نہیں ہوئی تھی کہ اس نے صرف میرے مرد ملازمین کو خوف زدہ کر کے کوٹھی
سے کیوں بھگا دیا تھا اور ملازمائیں کیوں فرار نہیں ہوئی تھیں! یقیناً ان میں سے ہر ایک حسن کا
شاہکار تھی اور شبھو ان کے درمیان راجا اندر بن کر رہنا چاہتا ہو گا۔ اس نے اسی لیے
ملازماؤں کو خوف زدہ کر کے بھگانے کی ضرورت نہیں سمجھی ہو گی۔ اس نے سریتا سے جو کچھ کہا
تھا تقریباً "سچ کر دکھایا تھا" لیکن میرے لیے الجھن کا سبب ایک اور بات تھی۔ آخر اس نے
کوٹھی کے اس حصے کو کیوں نظر انداز کر دیا تھا۔ جہاں میرا قیام تھا؟

یقیناً اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی جو میرے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ رات بھر
جاگنے کی وجہ سے ذہن پر بھی بوجھ تھا اس لیے کچھ سوچنا لاحاصل ہی تھا۔ میں کسی نتیجے تک نہ
پہنچ سکا۔ اب مجھے ارشاد علی کا انتظار تھا کہ وہ آ جائے تو میں سو جاؤں۔ مجھے بھی ناشتہ بھی کرنا تھا
اور زخم کی ڈریسنگ بھی کرانا تھی۔

ارشاد علی کی واپسی تک میں نے اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ ذہن میں کوئی خیال آیا
بھی تو اسے دانستہ جھٹک دیا۔ فی الحال ذہنی سکون کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔ ذہن میں
خیالات کا ہجوم ہو اور بہ ظاہر کوئی راہ بھی نظر نہ آئے تو خواہ مخواہ دماغ پر زور ڈالنے سے سوائے
پریشانی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

میری توقع سے کچھ پہلے ہی ارشاد علی لوٹ آیا۔ وہ سارا ضروری سامان لے آیا تھا۔
ناشتا کرتے ہوئے مجھے ڈاکٹر امتیاز کا خیال آیا تو میرے استفسار پر ارشاد علی نے بتایا۔ "میں ان
سے آنے کے لیے کہہ آیا ہوں جناب!" اب ارشاد علی کے چہرے کی وحشت بڑی حد تک کم
ہو چکی تھی۔

"گھر مل گیا تھا ان کا' آسانی سے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ پتہ لکھوانے کے علاوہ میں نے ان سے زبانی بھی پوچھ لیا تھا جناب! فریسکو
ہوٹل سے کچھ پہلے اسی طرف ایک گلی....!"

وہ مجھے پورا پتہ سمجھانے لگا تو میں بات کاٹ کر بولا۔ "کچھ پوچھ تو نہیں رہے تھے وہ'
میرے بارے میں؟"

"نہیں جناب!"

"کہہ دیا تھا ان سے پچھلی طرف سے آئیں؟"

"جی۔"

"اچھا اب چائے اور بنا لاؤ، پھر تم بھی ناشتہ کر لینا، اس دوران میں شاید ڈاکٹر بھی آ جائے۔" میں نے ناشتے کے برتن سرکاتے ہوئے پانی پینے کے لیے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"جی بہتر ہے۔" ارشاد علی نے برتن اٹھائے اور پھر کمرے سے نکل گیا۔

پھر کچھ دیر بعد جب میں چائے پی رہا تھا تو ڈاکٹر امتیاز آ گیا۔ میں نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ "آئیے ڈاکٹر صاحب! معاف کیجئے گا، آج آپ کو دو مرتبہ زحمت کرنا پڑی۔"

"کوئی بات نہیں شیخ صاحب!" وہ خوش اخلاقی سے بولا اور کرسی پر بیٹھ گیا، پھر ڈریسنگ کے لیے اپنا بیگ کھولنے لگا، ڈریسنگ کا سامان نکال کر قریبی میز پر رکھتے ہوئے وہ پھر بول اٹھا۔ "شیخ صاحب مجھے کوئی حق تو نہیں پہنچتا کہ آپ کے ذاتی معاملات میں مداخلت کروں، لیکن پھر بھی کوٹھی کی حالت دیکھ کر حیرت......"

"ارے وہ!" میں ایک دم ہنس پڑا۔ "وہ کوئی خاص نہیں۔" میں اس بات کو ہنسی سے اڑا دینا چاہتا تھا کیوں کہ میرے پاس کوئی مناسب جواب نہیں تھا۔ "بس کچھ دن کی بات ہے، سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔" پھر میں موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر بولا۔ "ڈاکٹر صاحب ایک بات پوچھنا تھی آپ سے۔"

"ہاں کہیں۔" وہ میری گردن سے پٹی کھولنے لگا۔

"پہلے آپ ڈریسنگ کر لیں، پھر عرض کروں گا۔" میں نے خوب صورتی سے بات ٹال دی اس لیے کہ حقیقتاً مجھے اس سے کچھ بھی نہیں پوچھنا تھا۔ میں تو اصل معاملے کی طرف سے اس کی توجہ ہٹانا چاہتا تھا۔ وہی کیا، اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو اس کے دل میں یقیناً تجسس پیدا ہوتا۔

ڈاکٹر امتیاز خاموشی سے ڈریسنگ کرتا رہا۔ ڈریسنگ کرنے کے بعد اس نے سامان سمیٹتے ہوئے کہا۔ "آپ کچھ پوچھنا چاہتے تھے مجھ سے!"

"ہاں..... کوئی بات تو تھی، ذہن ہی سے نکل گئی۔" میں آہستہ سے ہنس دیا۔ "خیر پھر سہی۔" پھر میں نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ "کچھ دن آپ کو پچھلے گیٹ ہی سے آنا پڑے گا۔ سارے ملازمین کو بھی میں نے جواب دے دیا ہے اس لیے کہ میرا زیادہ تر وقت عبادت میں گزرتا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے، زیادہ بھیڑ بھاڑ ایسے میں ٹھیک نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے میں نے خود کو کوٹھی کے اسی حصے تک محدود کر لیا ہے۔"

معلوم نہیں کہ ڈاکٹر امتیاز میری بات سے مطمئن ہوا یا نہیں، بہرحال وہ مزید پوچھ گچھ

کیے بغیر ٹل گیا۔ ممکن ہے، وہ یہ سمجھا ہو کہ میں اسے کچھ بتانا نہیں چاہتا یا اس کے ذہن میں کوئی اور بات آئی ہو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے تو بس چند دن مزید اس کی ضرورت تھی، جب تک میرا عمل پورا نہ ہو جاتا۔ عمل پورا ہونے میں بس اب آٹھ دن رہ گئے تھے اور تم جانتے ہو شمیم نوید کہ ان آٹھ دن کی میری زندگی میں کتنی اہمیت ہے! میں نے تمہیں جب اپنی داستان حیات سنانا شروع کی تھی تو میرے مرنے میں صرف آٹھ رہ گئے تھے۔ میرا ہمزاد مجھے بتا چکا تھا کہ میری زندگی اب ختم ہونے والی ہے۔ سو سال کی مدت پوری ہو رہی تھی جس کے لیے میں نے ہمزاد کو قابو میں کیا تھا، لیکن خلاف توقع صورت حال بدل گئی ورنہ آج میں تمہیں اپنی زندگی کی داستان کا دوسرا باب نہ سنا رہا ہوتا۔ مستقبل میں کس کے لیے کیا ہے، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ ہاں ہم اپنی عقل کے مطابق قیاس ضرور کرتے ہیں۔ یہ قیاس کبھی درست ثابت ہو جاتا ہے اور کبھی غلط۔ سو میں نے بھی قیاس کیا تھا کہ اب کھیل ختم ہو گیا، بساط الٹ گئی، اب چل چلاؤ ہے، مگر ابھی خاک دان وجود میں کوئی چنگاری باقی تھی۔ ابھی بہت سے موسم دیکھنا تھے، بہت الم اٹھانا تھے، بہت سے خواب آنکھوں میں سمونا تھے۔ ہر چند کہ مجھے تھکن نہیں تھی، مگر کار ہستی اتنا آسان بھی نہ تھا۔

میں یہ سب کچھ تم سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے علم ہے، تم میرے الم سمجھتے ہو، تمہیں میری زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب معلوم ہے۔ میں تمہیں ایمان داری اور سچائی کے ساتھ سبھی کچھ بتا چکا ہوں۔ میں نے تم سے کچھ نہیں چھپایا اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم نے کبھی میری داستان حیات رقم کی تو تم بھی کچھ نہیں چھپاؤ گے۔ میرا خبث، میرا کھوٹ، میرا جھوٹ، میری منافقت تم سبھی کچھ لکھ دو گے کہ آدمی بہرحال آدمی ہوتا ہے، فرشتہ نہیں، میں کسی دوسرے پر حکم لگانے کا مجاز نہیں، لیکن اپنی حد تک یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جھوٹ نفرت، انتقام اور جتنے بھی منفی جذبات ہیں، میری زندگی کا حصہ رہے ہیں۔ اسے تم میرا اعتراف بھی کہہ سکتے ہو، ایک سچے آدمی کا اعتراف! شاید آدمی مرتے وقت جھوٹ نہیں بولتا اور یہی کیفیت میری بھی ہے۔ اب پھر وہی آٹھ دن باقی ہیں جن کے بعد کچھ طے نہیں، کیا ہو! ہاں جینے کی تمنا اب بھی ہے اور شاید زندگی کے آخری لمحے تک میرے دل میں یہ تمنا باقی رہے۔

ہاں تو میں تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ ان آٹھ دنوں میں مجھ پر کیا گزری! تمہیں شاید میری گزشتہ زندگی کی روشنی میں یہ یقین نہ آئے کہ اس عرصے میں ایک نئے ہی شیخ کرامت نے جنم لیا۔ وہ شیخ کرامت گیا جس نے سو سال کے لیے ہمزاد کو قابو میں کیا تھا تاکہ عیش و نشاط کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ میں تمہیں تفصیل کے ساتھ بتاتا ہوں کہ اس دوران میں مجھے کیا

واقعات پیش آئے اور میرے اندر اتنا بڑا انقلاب کیسے آ گیا!

عمل کے دوران میں دن کے وقت میرا سونا ضروری تھا تاکہ رات کو نیند کا غلبہ نہ ہو اس لیے اس روز بھی ذہن سے تمام خیالات جھٹک کر میں سو گیا۔ ڈاکٹر امتیاز کے جاتے ہی میں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا تھا اور ارشاد علی بھی میرے کہنے پر اپنے کمرے میں سونے چلا گیا تھا۔ وہ بھی میری طرح رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔

معلوم نہیں میں کتنی دیر سویا ہوں کہ ایک تیز چیخ نے میرے اعصاب کو جھنجوڑ دیا۔ میری آنکھ کھل گئی' مگر میں بستر پر ہی لیٹا رہا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں کچھ نہ آ سکا تھا کہ کیا ہوا اور وہ چیخ کس کی تھی! میری نگاہ دروازے کی طرف اٹھی تو دیکھا' اندر سے چٹخنی بہ دستور لگی ہوئی تھی۔ چیخ پھر سنائی رہی اور اس بار میں سمجھ گیا کہ چیخنے والا کون ہے! یقیناً ارشاد علی ہی چیخ رہا تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ وہ میرا وفادار ملازم تھا۔ میرے سارے ملازمین مجھے چھوڑ گئے تھے' مگر وہ نہیں گیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی کہ ارشاد علی کسی مشکل میں گرفتار ہے' میں ایک دم بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پھر میں نے جیسے ہی چٹخنی گرا کر دروازہ کھولا' ٹھٹک کر رک گیا۔ دروازے کے بالکل سامنے ایک سانپ پھن کاڑھے لہرا رہا تھا۔ یہ سانپ نہیں بلا ہے! کسی نے جیسے میرے اندر سرگوشی کی۔ اسی کے ساتھ خود بہ خود میرے ذہن میں وہ آیات آنے لگیں جو رَدِّ بلا کے لیے پڑھی جاتی ہیں۔ میں بہ آواز بلند وہ آیات پڑھنے لگا۔ میری نگاہ' سانپ پر جمی ہوئی تھی جو کسی بھی لمحے مجھ پر حملہ کر سکتا تھا۔ چند ہی لمحے بعد خلاف توقع میں نے سانپ کو کچھ مضطرب سا محسوس کیا۔ اس کا لہرانا بند ہو چکا تھا اور اب اس کا پھن آہستہ آہستہ زمین کی طرف جھکتا جا رہا تھا۔ میں نے "قل اعوذ برب الناس" کا ورد اور اور تیز کر دیا۔ اس وقت میری تمام تر توجہ کا مرکز سانپ تھا اور ارشاد علی کو جیسے بھی بھول ہی گیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے سانپ کا پھن زمین پر آ رہا۔ یوں جیسے اس پر غشی سی طاری ہو۔ پھر میں نے اسے ایک دم بل کھاتے دیکھا۔ اس کے بعد وہ جیسے تڑپ کر تیزی سے رینگتا ہوا برآمدے کی طرف چلا گیا۔

سانپ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو معاً مجھے ارشاد علی کا خیال آیا۔ میری نگاہ اس کے کمرے کی طرف اٹھی۔ کمرے کا دروازہ قدرے کھلا ہوا تھا۔ میں اس طرف لپکا۔ ارشاد علی کو میں نے کمرے کے فرش پر بے ہوش پڑا ہوا دیکھا۔ میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو کافی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ پھر چیخنے والا تھا کہ میں نے اسے جھنجوڑ دیا۔

"ہوش میں ارشاد، ارشاد علی!" میں تیز آواز میں بولا۔

"آ..... آپ تو..... زندہ ہیں..... جناب!" وہ ہکلایا۔

"اٹھو!..... اٹھ کر بیٹھو!" میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے اٹھنے کے لیے سہارا دیا۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔

میرے سہارا دینے سے وہ کانپتا ہوا اٹھا اور پھر اپنے بستر پر آ گیا۔

"لیٹ جاؤ اور اپنے ذہن سے ہر خوف کو جھٹک دو!" یہ کہہ کر میں قریب رکھی ہوئی صراحی کی طرف بڑھا۔

پانی پینے کے بعد ارشاد علی کے حواس قدرے درست ہوئے۔

"ہاں اب کہو' کیا بات تھی؟ تم ایک دم کیوں چیخنے لگے تھے؟" میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھنے لگا تو میں نے اسے دوبارہ لٹا دیا۔ "لیٹے رہو اور جو میں پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔"

"میں ..... میں جناب شاید کوئی خواب دیکھ رہا تھا' بڑا بھیانک خواب!..... پھر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ خواب میں' میں نے ایک سانپ کو دیکھا تھا جس نے آپ..... آپ کو ڈس لیا تھا اور ..... اور آپ کا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔" ارشاد علی بتانے لگا۔ "پھر ایک دم آپ مجھے پکارنے لگے تھے۔ اس سے میری آنکھ کھلی تھی۔ آنکھ کھلنے کے بعد بھی مجھے آپ کے پکارنے کی آواز سنائی دی تو میں سمجھا کہ یہ کوئی خواب نہیں' حقیقت ہے۔ میں دروازہ کھول کر جیسے ہی باہر نکلا تو میری نظر اس سانپ پر پڑی۔ وہی سانپ میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ سانپ مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکا اور میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں پلٹ کر بھاگا اور گھبراہٹ میں گر پڑا۔ سانپ اب میرے قریب آ چکا تھا۔ اسے اپنے قریب دیکھ کر میرے منہ سے پھر چیخ نکل گئی اور..... اور پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔ شاید..... شاید میں دہشت کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ پھر جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں نے آپ کو اپنے پاس دیکھا۔" ارشاد علی یہ کہہ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

جو واقعہ پیش آیا تھا' اسے سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ شمبھو کے سوا یہ کسی اور کی حرکت نہیں ہو سکتی تھی۔ یقیناً اب وہ کوٹھی کے اس حصے پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا' اس کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ میں بھی کوٹھی چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ اس نے ابتداء کر دی تھی۔

یہ مسئلہ میرا تھا' غریب ارشاد علی کا نہیں۔ گیہوں کے ساتھ خواہ مخواہ گھن بھی پس رہا تھا۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میرے ضمیر پر بوجھ سا رہتا۔ وہ میرا ایک وفادار ملازم ہی تھا۔ اب تک وہ ہر طرح سے میرا ساتھ دیتا آ رہا تھا۔ شمبھو سے بعید نہیں کہ اگر مجھ پر بس نہیں چل رہا تو اسے کوئی نقصان پہنچا

دے۔ میں نے سوچا اور پھر ارشاد علی کو سمجھانے لگا۔ اس بار میں خلوص دل سے یہ چاہتا تھا کہ وہ چلا جائے۔ اس پر کچھ تو میرے سمجھانے کا اثر ہوا' کچھ وہ خود ہی خوف زدہ تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ مان گیا۔

"بس چند دن کی بات ہے ارشاد علی!" میں نے اسے تسلی دی۔ "یہ آٹھ دن کہیں گزار لو پھر آجانا۔"

وہ اس وقت میرے کہنے پر اپنا مختصر سا سامان باندھ رہا تھا۔ اس نے آبدیدہ ہو کر میری طرف دیکھا' مگر کچھ بولا نہیں۔ اس کے پاس اخراجات کے لیے جو رقم رہتی تھی' چلتے وقت میری طرف بڑھانے لگا۔

"رکھ لو' اسے اپنے پاس ہی رکھ لو' میں تمہیں ہمیشہ کے لیے جدا نہیں کر رہا جو تم رقم واپس کر رہے ہو۔" میں نے اس کا شانہ تھپکا۔

اس مرتبہ بھی ارشاد علی نے کچھ نہیں کہا۔ کچھ کہنے کے لیے ہمیشہ لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس نے لفظوں کا سہارا لیے بغیر بھی مجھ سے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ میں اسے اس لیے بھی عقبی دروازے تک چھوڑنے آیا تھا کہ اندر سے کوٹھی کا پھاٹک بند کر لوں۔

"خدا حافظ جناب!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور گیٹ سے باہر نکل گیا۔

"خدا حافظ!" میں نے جواب دیا اور اندر سے گیٹ بند کرنے لگا۔

اپنے کمرے کی طرف واپسی میں مجھے وہ زمانہ یاد آ رہا تھا جب میں بدایوں کی آبائی حویلی میں تنہا رہا کرتا تھا۔ وہ کھنڈر ایسی حویلی میرا مسکن تھی جہاں میں اپنی گزر اوقات کے لیے محلے کے بچوں کو پڑھاتا تھا۔ اس وقت میں اکیلا ہی سب کچھ کرتا تھا۔ وہی زمانہ شاید پھر لوٹ آیا تھا۔ میں یہی سب کچھ سوچتا ہوا اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔

برسوں میں نے ہنگامہ خیز زندگی گزاری تھی اور آج پہلی بار خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا' میں خود اپنے گھر میں رہ کر اجنبی بن گیا تھا' ظہر کا وقت ہو رہا تھا اس لیے میں نے وضو کیا اور پھر مصلیٰ بچھا کر بیٹھ گیا۔ جب وقت ہو گیا تو میں نے نماز پڑھی اور پھر میرے ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے۔ میں نے انتہائی مشکل اور سنگین حالات میں کبھی حوصلہ نہیں ہارا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ اس وقت بھی ایسا نہیں تھا کہ میں نے ہمت ہار دی ہو' مگر اس کے باوجود جانے کیوں دعا مانگتے ہوئے مجھ پر رقت سی طاری ہو گئی۔ پہلی بار مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں واقعی اپنے خدا کے حضور گڑگڑا رہا ہوں۔ یہ کیفیت مجھ پر بہت دیر تک طاری رہی۔ اس کیفیت کے دوران میں مجھ یہ احساس ہی نہ ہو سکا کہ کب میں نے دعا ختم کی' کب مصلے سے اٹھا اور کب بستر پر جا کے لیٹ گیا! جب میں اپنے حواس میں آیا تو میرا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

اس وقت میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور میرا وجود اس میں کسی تنکے کی طرح گردش کر رہا تھا۔ میرے اندر ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی' سب کچھ بدل رہا تھا تند و تیز خیالوں کی لہریں مجھے اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہی تھیں۔ یہ خود احتسابی کے لمحے تھے۔ میں فرد حساب ماہ و سال پڑھ رہا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا۔ "روز قیامت میرا اعمال نامہ' میرے دائیں ہاتھ میں نہیں' بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا..... ہاں ایسا ہی ہو گا کیوں کہ..... کہ میں نے اپنے اندر چھپے ہوئے شیطان کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ میں اسی قابل ہوں کہ مجھے جہنم میں جھونک دیا جائے' ہاں..... ہاں میں..... میں ایسا ہی ہوں۔"

جانے کب تک میں بڑبڑاتا رہا' اپنی گزری ہوئی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب کرتا رہا اور خود پر ملامت کرتا رہا۔ خدا نے مجھے اپنی رحمت سے نوازا تھا۔ مجھے ایک غیر معمولی قوت عطا کی تھی' مگر میں اسے خیر کی جستجو میں صرف نہیں کیا بلکہ مجسّم شر بن گیا۔

کیا میں اب بھی ایسا ہی نہیں کر رہا؟ خود کو دھوکا نہیں دے رہا؟ میری نمازیں منافقت نہیں ہیں؟ کیا میں اس طرح وقتی طور پر اپنی غرض کی خاطر شرافت و عبادت کا لبادہ نہیں اوڑھ لیا؟ کیا میرا مقصد وہی نہیں جو پہلے تھا؟ کیا میں گناہ سے باز آ جاؤں گا؟ کیا میں دوبارہ اپنے ہمزاد کو اسی لیے قابو میں نہیں کرنا چاہتا کہ جہنم کماؤں؟ عیش و نشاط کی محفلیں سجاؤں؟ مجھ پر سوالوں نے جیسے یورش کر دی۔ ان سب سوالوں کے جواب اثبات میں تھے۔

پھر یوں ہوا کہ سینے کی دکھن کم ہونے لگی' آنکھوں کی جلن میں ٹھنڈک سی اترنے لگی' جلتے سلگتے ہوئے جذبوں پر نئے احساسات کی شبنم برسنے لگی۔ میرا جذباتی ہیجان ایک راہ پا کر سکون آشنا ہونے لگا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ ایسا نہیں ہو گا جو ہو چکا ہے۔ میں اب خود کو دھوکا نہیں دوں گا' منافقت چھوڑ دوں گا۔ میرا ظاہر اور باطن ایک ہو گا۔ اگر میں جی گیا تو اب اپنی زندگی کا رخ بدل دوں گا۔ یقیناً اسی فیصلے نے مجھے قلبی سکون فراہم کیا تھا۔ درد دل پر اب مجھے نئی دستکیں سنائی دے رہی تھیں۔ کوئی میرے اندر سرگوشیاں سی کر رہا تھا کہ اے شیخ کرامت! یہ تمہارا نیا جنم ہے اور اس میں بھی تمہیں بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا۔ تمہارے امتحان کا اصل وقت اب شروع ہوا ہے۔ مجھے اب ہر آزمائش' ہر امتحان قبول تھا' سو میں یہ سرگوشیاں سنتا رہا اور مسکراتا رہا اور اسی حالت میں میری آنکھ لگ گئی۔

جب میں بیدار ہوا تو عصر کا وقت نہیں نکلا تھا۔ اب مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی کیوں کہ صبح کا ناشتا کیے ہوئے تھا۔ پہلے میں نے نماز پڑھی اور پھر پیٹ کی آگ بجھانے کے

لے کمرے سے نکلا۔ اب مجھے کھانے کے لیے خود ہی کچھ نہ کچھ پکانا تھا۔ ارشاد علی کو بہرحال اتنا موقع نہیں مل سکا تھا کہ وہ کھانا پکا کر جاتا۔

اپنے کمرے سے نکلتے ہی مجھے تعفن و بدبو کا سا احساس ہوا۔ ارشاد علی نے میرے کہنے پر اپنے کمرے کے سامنے والی مختصر سی جگہ میں کھانے پکانے کا بندوبست کر لیا تھا۔ میں اس طرف بڑھا تو بدبو اور بڑھ گئی۔ قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہاں ہر طرف غلاظت پھیلی ہوئی تھی اور سارا سامان تتر بتر پڑا تھا۔ میرا جی متلانے لگا۔ اسی وقت مجھے اپنے عقب سے ایک زہریلا قہقہہ سنائی دیا اور میں اچھل پڑا۔ مڑ کر دیکھا تو مجھے دور برآمدے میں ایک عجیب الخلقت شخص کھڑا نظر آیا۔ اس کی داڑھی بے حد بڑھی ہوئی تھی اور سر کے بال جٹاؤں کی شکل میں شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ جسم کی رنگت سیاہ تھی اور وہ گیروے رنگ کا ایک کپڑا اپنے اوپر لپیٹے ہوئے تھا جو اس کے استخوانی جسم کو چھپانے کے لیے ناکافی تھا۔ اس کے سارے وجود میں اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں سب سے نمایاں تھیں ۔۔۔ جیسے بس آنکھوں میں زندگی اور حرارت ہو۔ چہرے پر سیاہ کھال جیسے منڈھی ہوئی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آ گئی اس نے یقیناً میری بے بسی پر قہقہہ لگایا تھا مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ وہ کون ہو سکتا ہے! وہ ایک بار پھر زور سے ہنسا اور پھر مجھے مخاطب کیا۔ اس کی آواز نے میرے یقین کی تصدیق کر دی۔ وہ شمبھو ہی تھا' وہی شمبھو اب تک میں نے جس کی آواز ہی آواز سنی تھی۔ آج پہلی بار وہ اپنے اصل وجود میں میرے سامنے آیا تھا۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ "شیخ اگر تو زندہ رہنا چاہتا ہے تو چلا جا یہاں سے! میں تیرا یہ قصور بھی معاف کرنے کو تیار ہوں کہ تو نے میری محبوبہ کو خراب کر دیا۔"

اس کا آخری جملہ میرے احساس پر جیسے بجلی بن کر گرا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ سریتا پر فتح پا چکا ہے یا پھر سریتا نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں طیش کے عالم میں اس کی طرف لپکا۔

"رک جا! وہیں رک جا!" مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ "اپنی موت کو آواز نہ دے اور مجھ سے ٹکرانے کی کوشش نہ کر!"

میں نے اس کی آواز سنی تو ضرور' مگر رکا نہیں۔ مجھ پر تو اس وقت ایک جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ برآمدے تک پہنچتے ہی جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے مجھے پیچھے دھکیل دیا حالانکہ شمبھو مجھ سے دور کھڑا تھا۔ میں سنبھلتے سنبھلتے بھی اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور فرش پر گر پڑا۔ اسی وقت میں نے اپنے اور شمبھو کے درمیان ایک رقصاں شعلہ دیکھا۔

"اٹھ! پھر کوشش کر!" اس نے مجھے چڑایا۔

میں نے غصّے کے باوجود اپنے حواس کو بے قابو نہیں ہونے دیا کیوں کہ میں' اس کا مقصد سمجھ گیا تھا۔ گرنے کی وجہ سے میری کہنی میں ہلکی سی ضرب آئی تھی۔ میں اسے سہلاتا ہوا فرش سے اٹھا' مگر آگے نہیں بڑھا۔

"کیوں' ہمت جواب دے گئی؟" اس نے میرے زخموں پر نمک چھڑکا۔ میں خاموشی سے اسے گھورتا رہا تو وہ پھر بولا "اگر میں چاہتا تو تجھے اسی وقت جلا کر خاک بھی کر سکتا تھا' مگر ایسا نہیں کیا۔"

"بکواس کرتا ہے تو!" میں بالآخر پھٹ پڑا۔ "اگر یہ تیرے بس میں ہوتا تو کبھی کا تو ایسا کر چکا ہوتا اے بڑبولے؟"

"پوچھ.... پوچھ کہ میں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟" وہ بولا۔

مجھے تجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں' سمجھ گیا!" میں نے غصّے میں کہا۔

"نہیں پوچھتا تو تجھے خود بتاتا ہوں کہ سریتا نے مجھ سے وچن لیا ہے' میں تجھے قتل نہ کروں۔ اگر تجھے میری بات پر یقین نہیں تو میں اسے یہاں بلاتا ہوں۔" یہ کہہ اس نے بلند آواز میں سریتا کو پکارا۔

چند ہی لمحے بعد میں سریتا کو اس کے قریب کھڑے ہوئے دیکھا اور میری روح میں جیسے کوئی نشتر سا اتر گیا۔ وہ جو کبھی میری تھی' میرے دشمن کے پہلو میں کھڑی تھی اور میں بے بس تھا۔ اسے اپنے دشمن کی گرفت سے آزاد نہیں کرا سکتا تھا۔ میں اسے تحفظ نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی سیاہ دراز زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں' دھانی رنگ کی ساری جگہ جگہ سے مسلی ہوئی تھی' آنکھوں کا کاجل پھیلا ہوا تھا' ہونٹوں کی سرخی اڑی اڑی تھی' عارضوں کی شادابی بجھی بجھی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی سوگواری تھی اور آنکھوں میں جیسے رتجگے کی تھکن تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور یہ جھکی ہوئی نظریں مجھ سے بہت کچھ کہہ رہی تھیں' وہ جو میں سننا نہیں چاہتا تھا!

"نہیں!" میں ایک دم چیخ اٹھا۔

میں اس وقت وہ منظر دیکھ کر شاید ایک بار پھر اپنے حواس گنوا بیٹھا تھا۔

"میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا...... زندہ نہیں چھوڑوں گا شمبھو!" میں آپے سے باہر ہو کر چیختا ہوا اس کی طرف دوڑا۔ میں اس لمحے جیسے سب کچھ بھول بیٹھا تھا۔ مجھے یہ ہوش نہیں رہا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان ایک شعلہ رقصاں ہے۔

مجھے صرف اتنا ہی یاد ہے کہ میرا وجود جیسے شعلوں میں گھر گیا تھا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا کہ کیا ہوا! ہوش کھونے سے پہلے میں نے سریتا کی آواز ضرور سنی تھی۔ "یہ تو نے کیا کیا شمبھو.... کیا کیا؟ تو نے تو مجھے وچن دیا تھا کہ ....." اس سے زیادہ میں کچھ نہیں سن سکا تھا۔

"اَللہُ اَکْبَر..... اَللہُ اَکْبَر.....!" یہ وہ الفاظ تھے جو مجھے عالم بے ہوشی سے ہوش کی دنیا تک کھینچ لائے۔ کسی قریبی مسجد سے اذن کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

میں کچھ دیر سمجھ ہی نہ سکا کہ کہاں اور کس حال میں ہوں! بے ہوشی کے بعد جب آدمی ہوش میں آتا ہے' تو عموماً" ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ میرے حواس معمول پر آ گئے اور مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں شعلوں میں گھر گیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی مجھے اپنے جسم میں سوزش اور جلن کا احساس ہوا' مگر یہ احساس لمحاتی تھا۔ جسمانی طور پر مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ سریتا مجھے شعلوں میں گھرا ہوا دیکھ کر یقیناً یہ سمجھ بیٹھی ہو گی کہ شمبھو مجھے ہلاک کر دینا چاہتا تھا' مگر یہ اس کے سحر کا حصہ تھا۔ اس کا مشاہدہ میں پہلے بھی کر چکا تھا۔ سریتا کو بھی اس نے وقتی طور شدید اذیت دی تھی' یہاں تک کہ سریتا کا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ بہ ظاہر مجھے ایسا ہی لگا تھا کہ وہ بچ نہیں سکے گی' لیکن بعد میں سحر کا اثر ختم ہوتے ہی وہ معمول پر آ گئی تھی۔ میرے ساتھ بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

میں ابھی تک برآمدے کے قریب زمین پڑا ہوا تھا اور شعلے برآمدے میں بہ دستور موجود تھے' مگر وہاں نہ اب شمبھو تھا اور نہ سریتا نظر آ رہی تھی۔ ہر طرف نیم تاریکی اور سناٹا تھا جیسے میرے سوا کوٹھی میں کوئی نہ ہو۔

حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ.... حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ..... حَیَّ عَلَی الْفَلَاح..... حَیَّ عَلَی الْفَلَاح..... اَللہُ اَکْبَر..... اَللہُ اَکْبَر..... "میں موذن کی آواز سن رہا تھا۔

آؤ نماز کی طرف.... آؤ نماز کی طرف..... کامیابی کی جانب آؤ..... کامیابی کی جانب آؤ.....

اللہ بہت بڑا ہے...... اللہ بہت بڑا ہے......

موذن کیا کہہ رہا ہے اور کس کی طرف بلا رہا ہے' میں خوب سمجھ رہا تھا۔ وہ جن کے لیے لفظ صرف لفظ ہوتے ہیں اور جو لفظوں کے معنی پر غور نہیں کرتے' ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا' لیکن وہ جو آگہی کی منزلوں سے گزرتے ہوں ان پر بہت کچھ گزر جاتی ہے۔ اس سے قطع نظر آدمی کے اندر کی کیفیت بھی اس ضمن میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ سارا قصہ قبولیت کا ہے ورنہ تو دن میں پانچ بار موذن یہی صدا لگاتا ہے' پھر اتنا اثر کیوں نہیں ہوتا؟ اثر پزیری کا تعلق آدمی کے باطن سے ہے جو اسے آدمی کے انسان کی سطح تک لے جاتی ہے۔ میں بھی شاید انہیں مراحل سے گزر رہا تھا اس

لیے مجھ پر یہ صدا اثر انداز ہوئی اور میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر میرے قدم جیسے خود بہ خود اپنے کمرے کی طرف اٹھنے لگے۔

ابھی مکمل طور پر تاریکی نہیں پھیلی تھی' اس کا مطلب یہی تھا کہ مغرب کا وقت ہوا ہے اور مجھ پر زیادہ دیر بے ہوشی طاری نہیں رہی۔ کمرے میں آ کر روشنی کر دی کیوں کہ باہر کی نسبت وہاں اندھیرا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ کمرے کی کھڑکیاں بند رہتی تھیں اور ان پر پردے پڑے ہوئے تھے۔

نماز پڑھ کر میرے دل کو قدرے سکون تو مل گیا' مگر جب بستر پر دراز ہوا تو پھر وحشت سی ہونے لگی۔ میرے ہی گھر کے در و دیوار میرے لیے آشنا ہونے کے باوجود اجنبی بن گئے تھے۔ اب یہ گھر جیسا اور جس حال میں بھی تھا' اسے میرا گھر نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہاں یہ میرا گھر نہیں رہا تھا' یہ شمبھو کا گھر تھا۔ اب سے پہلے مجھے ان در و دیوار سے کبھی اتنی وحشت نہیں ہوئی تھی حالانکہ میں یہاں ایک عرصے سے رہ رہا تھا۔ بار بار میری آنکھوں میں سریتا کا چہرہ گھوم رہا تھا اور سماعت میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔ "صاحب جی! صاحب جی!....." اور سریتا ہی کیا' دوسری بھی تو تھیں۔ ان پر بھی جانے کیا گزری ہو گی! ان کا قصور یہی تو تھا کہ انہوں نے ہر طرح میری خدمت کی تھی۔ ان پر توڑے جانے والے ممکنہ ستم کا ذمے دار بھی میں خود ہی کو سمجھ رہا تھا۔ وہ میری ہی وجہ سے شمبھو کے چنگل میں پھنس گئی تھیں جو میرے خیال میں اذیت پسند تھا' ذہنی طور پر ایک بیمار شخص! ایسا شخص جو کسی کو اذیت پہنچا کر خوش ہو۔ سریتا کے معاملے میں یہ تماشا خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جو کچھ میں نے دیکھا' وہ بھی میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا اور جو نہیں دیکھا' اسے سوچ کر بھی میرے دل میں نشتر سے ٹوٹ رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے مجھے سریتا جس حال میں نظر آئی تھی' اسے شاید میں ایک شعر کے حوالے سے زیادہ بہتر طور پر بیان کر سکا ہوں۔

یہ کھلے کھلے سے گیسو یہ اڑی اڑی سی رنگت
تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

جن حالات سے میں گزر رہا تھا' ان میں مایوسی کی جذبات کا غالب آ جانا کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ مجھ پر بھی اسی سبب مایوسی غالب آنے لگی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ جینا تو کوئی جینا نہ ہوا۔ اس سے تو موت بہتر تھی۔ یوں اپنی ہی نظر میں گرتا تو نہ پڑتا' سینے سے دھواں تو نہ اٹھتا' دل میں کرچیاں تو نہ بکھرتیں' کوئی اس طرح تو میری بے بسی پر قہقہے نہ لگاتا۔ جینے کی آرزو بہت رسوا کرتی ہے۔ بہت ظلم ڈھاتی ہے۔ شاید میں نے غلط کیا کہ زیادہ جینے کے لیے اپنے ہمزاد کو دوبارہ تسخیر رہا ہوں۔

لمحے قطرہ قطرہ دجلہ وقت کا حصہ بنتے رہے اور میری روح اس کی بے رحم موجوں میں ڈوبتی

ابھرتی رہی۔ ہر چند کے یہ ساعتیں گنتی کی تھیں، مگر دکھ کی ایک ساعت بھی ایک جگ معلوم ہوتی ہے گویا۔

آنکھ سے پھر ایک آنسو ٹپکا اور پھر ایک جگ بیت گیا۔

انہی اداسی کے لمحات میں نہ جانے کیسے مجھے یہ خیال آگیا کہ کہیں یہ بھی میرے دشمن کے سحر کا اثر نہ ہو جو میں زندگی سے اس قدر گریز کر رہا ہوں! پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا، پھر آج یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ وہاں میرے سوا اور تھا ہی کون جس سے میں سوال کرتا اور جو میرے الم سن کر ان کا تجزیہ کرتا یا میری ڈھارس بندھاتا سو میں خود ہی سوالی تھا اور خود ہی جواب دہ! میں نے یہی سوچا کہ بہر حال یہ ممکن نہیں ہے، اگر واقعی ایسا ہی ہے تو پھر اس کا تدارک کیا ہو؟ اس کا حل یہی تھا کہ میں مایوسی سے بچنے کی شعوری کوشش کرتا اور اپنے اوپر مایوسی کے جذبات کو غالب نہ آنے دیتا۔ پھر میں اسی اضطراب کے عالم میں بستر سے اٹھ گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اب میں زیر لب کہہ رہا تھا۔ ”نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔! میں موت کو شکست دے دوں گا..... میں اتنی آسانی سے نہیں مروں گا!“

میں نے نفسیات کی کتابوں میں پڑھا تھا کہ اس طرح کی خود ترغیبی بہتر نتائج مرتب کرتی ہے۔ میں اسی پر عمل کر رہا تھا۔ اس کا یہ اثر تو ہوا کہ شدید مایوسی کے جذبات بڑی حد تک ختم ہو گئے، مگر طبیعت کی وحشت کم نہ ہوئی۔ بہ قول غالب۔

در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

جب در و دیوار کی یہ حالت ہو تو آدمی کا یہی جی چاہے گا کہ کہیں دور کھلی فضا میں سانس لے۔ عمل رات کے بارہ بجے سے شروع ہونا تھا اور اس میں ابھی بہت دیر تھی۔ پھر یہ کہ عمل کے لیے اتنی خلوت نشینی بھی ضروری نہیں تھی جتنی میں نے خود پر مسلط کر رکھی تھی۔ میں گھر سے نکل کر کہیں کھلی فضا میں تنہا بیٹھ سکتا تھا۔ نتیجتہ“ میں نے لباس تبدیل کیا اور گلے میں ایک بڑا سا رومال اس طرح ڈال لیا کہ ڈریسنگ نظر نہ آئے۔ اپنے کمرے کو مقفل کر کے میں باہر نکلا تو بدبو کا احساس ہوا۔ میں نے باہر کی بتی جلا دی اور دانستہ برآمدے کی طرف نہیں دیکھا۔ برابر والا کمرا ارشاد علی کا تھا جس کے سامنے غلاظت اب بھی یقیناً“ اسی خبیث شمبھو کی تھی جس کے سبب اب تک میں صبح سے بھوکا تھا۔ اس حصے میں باہر بھی ایک باتھ روم تھا۔ میں وہاں سے بالٹی میں پانی بھر کے لایا اور اس غلاظت کو موری میں بہا دیا۔ پھر میں عقبی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

عقبی دروازے سے باہر آ کے میں نے اس میں بھی تالا ڈال دیا۔ اس کے بعد میں نے پھاٹک کی راہ لی۔ عمارت سے باہر آ کر مجھے ذرا سکون کا احساس ہوا اور میں نے کھلی فضا میں

گہرے گہرے سانس لیے۔ عقبی پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول کر میں باہر آیا اور پھر اسے بند کر دیا۔ اب میں اپنی کوٹھی کی پچھلی گلی میں تھا۔ اس گلی سے نکل کر میں سڑک پر آ گیا۔ زندگی پورے زور و شور کے ساتھ اپنے ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔

جلد ہی مجھے ایک اوسط درجے کا ہوٹل نظر آ گیا اور پہلے میں نے پیٹ کی آگ بجھانے کا فیصلہ کیا۔ اگر میں گھر سے نہ نکلتا تو شاید آج رات بھوکا ہی سونا پڑتا۔ ظاہر ہے کہ ہوٹل میں پرہیزی کھانا تو کیا ملتا، بس جیسے تیسے چائے، بسکٹ اور ڈبل روٹی وغیرہ پر گزارہ کر لیا۔

چاٹگام بڑا پر فضا اور ہرا بھرا شہر ہے۔ سمندر کے کنارے آباد یہ شہر مجھے اچھا لگا تھا اسی لیے وہاں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ہوٹل سے نکل کر ٹہلتا ہوا میں ایک پارک تک پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ وہاں زیادہ لوگ نہیں اور نہ ہی روشنیوں کا ہجوم تھا۔ کافی کافی فاصلے سے بجلی کے کھمبے لگے ہوئے تھے۔ مجھے کسی ایسے گوشے کی تلاش تھی جہاں آس پاس کوئی نہ ہو اور میں کھلی فضا میں تنہا بیٹھ سکوں مجھے اس تلاش میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہاں تک نہ زیادہ روشنی پہنچ رہی تھی اور نہ کوئی نظر آ رہا تھا۔ سرسبز و شاداب گھاس پر میں، رومال بچھائے بغیر بیٹھ گیا۔ میرے عقب میں گھنے پیڑوں کا سلسلہ تھا۔

وہاں بیٹھ کر مجھے فرحت و تازگی محسوس ہوئی۔ طبیعت کی وحشت اب تقریباً“ ختم ہو چکی تھی۔ گھر سے نکلنے کا نسخہ کارگر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ بقیہ جو دن رہ گئے ہیں، میں اس طرح گزاروں گا۔

میرے نزدیک اب صرف پلکوں کی سوئیاں رہ گئی تھیں۔ اپنے چلے کا بڑا حصہ میں نے کسی نہ کسی طرح پورا کر لیا تھا۔ یہاں آنے کے باوجود میرا ذہن حالات کی گرفت سے آزاد نہیں تھا۔ مجھ پر جو کچھ گزر رہا تھا وہ ایسا نہیں تھا کہ آسانی سے بھلا دیا جائے۔

میں اپنے خیالوں میں کھوا ہوا وہاں بیٹھا تھا کہ معاً“ مجھے اپنے عقب میں نسوانی سرگوشی کا احساس ہوا، پھر ایک مردانہ آواز سنائی دی جو مدھم سی تھی۔ کچھ دیر پہلے بھی مجھے کئی بار ایسا شبہہ ہوا تھا، مگر اسے اپنا وہم سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ پھر یہ کہ آدمی جب اپنے ہی خیالوں کا اسیر ہو تو ارد گرد سے غافل ہو جاتا ہے۔ میں فطری طور پر اس طرف متوجہ ہو گیا۔ غالباً“ ان دونوں کے درمیان کس مسئلے پر بحث ہو رہی تھی اور یہ بحث اب ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی کہ احتیاط کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ میں یوں ہی تفریح طبع کی خاطر ان کی سرگوشیاں سننے لگا۔

”ہر وقت بچے بچے! اگر ایسا ہی تھا ثمینہ تو تمہیں میرے ساتھ نہیں آنا چاہیے تھا۔“

"تم یہ کیوں بھول جاتے ہو زاہد کہ میں ایک ماں بھی ہوں۔"
تو گویا مرد کا نام زاہد ہے اور عورت کا نام ثمینہ! میں نے سوچا۔
"میں نے اس سے کب انکار کیا ہے! لیکن تمہیں بھی تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ محض تمہارے عشق میں 'میں نے بھی تو اپنا گھربار چھوڑا ہے۔"
"تو کیا مجھے تم سے عشق نہیں؟" ثمینہ کا لہجہ شکایتی تھا۔ "کیا میں نے قربانی نہیں دی؟ میں اپنے شوہر اور بچوں کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ نہیں آئی؟"
"کس کافر کو انکار ہے تمہارے عشق اور تمہارے قربانی سے!" زاہد بولا "میں تو صرف تم سے اتنا کہتا ہوں کہ اپنے ماضی کو بھول جاؤ۔ یہ ڈھاکہ نہیں چاٹگام ہے اور یہاں ہم میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے ہیں۔"
"آہستہ بولو۔"
"یہاں میرے اور تمہارے سوا اور ہے کون! اسی لیے تو میں تمہیں یہاں لے کر آیا تھا۔"
"یعنی یہ کہنے کہ میں اپنے بچوں کو بھی بھلا دوں!"
"ایمان داری سے کہو' کیا وہ تمہارے بچے لگتے ہیں؟ کالے کلوتے ..... بالکل تمہارے شوہر پر گئے ہیں۔"
"مگر انہوں نے میری ہی کوکھ سے جنم لیا ہے اور وہ میرا ہی خون ہیں۔"
"ثمینہ! تم بحث کیوں کرنے لگتی ہو؟"
"اور تم ہر بات کو بحث کا نام کیوں دے دیتے ہو؟" ثمینہ بھی ترکی بہ ترکی بولی۔
"دیکھو ان سوال جواب سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر تمہیں اپنے کیے پر پچھتاوا ہے تو تم اب بھی لوٹ سکتی ہو۔"
"لوٹ سکتی ہوں ..... کیا کہہ رہے ہو تم؟ ..... اگر لوٹنا ہی ہوتا تو گھر سے باہر قدم کیوں رکھتی' تمہاری بات کیوں مانتی!" ثمینہ کی آواز سے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔
زندگی کے اسٹیج پر یہ کھیل نیا تھا۔ میں ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتا رہا جس سے مجھے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ چاٹگام میں ان کا قیام کہاں تھا؟ ڈھاکہ میں وہ لوگ کہاں رہتے تھے؟ عورت اور مرد کی عمروں میں کتنا فرق تھا! اور یہ کہ اس "عشق" کے پس پردہ میں کیا عوامل کار فرما تھے۔
خوب صورت عورتیں چاہے شادی شدہ ہوں یا بچے والی' ناپختہ ذہن رکھنے والے

نوجوانوں کے لیے بڑی کشش رکھتی ہیں۔ زاہد بھی ایک ایسی ہی نوجوان تھا۔ چڑھتی جوانی کے جوش میں وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بھول گیا تھا۔ وہ ابھی کنوارا تھا اور اپنی گفتگو سے کسی باعزت خاندان کا فرد معلوم ہوتا تھا۔ ثمینہ کا مسئلہ زاہد سے مختلف تھا' ان معنوں میں کہ وہ شادی شدہ تھی اور تین بچوں کی ماں بھی تھی۔ اس کی شادی کو دس سال کے قریب ہو چکے تھے' اس کا شوہر چڑچڑا' بد مزاج اور بد صورت تھا۔ وہ ان مردوں میں سے تھا جو عورت کو پیر کی جوتی سمجھتے ہیں۔ وہ گھر میں بھی خود کو سرکاری افسر ہی سمجھتا تھا۔ ثمینہ نے اسے ذہنی طور پر کبھی قبول نہیں کیا تھا حالانکہ عام حالات میں عورتیں زندگی سے سمجھوتا کر لیتی ہیں۔ ممکن ہے ثمینہ کی زندگی میں زاہد نہ آتا تو وہ بھی حسن کی دھوپ ڈھل جانے کے بعد ہتھیار ڈال دیتی۔
وہ دونوں ایک دوسرے سے شکوے شکایتیں کر رہے تھے۔ اپنے اپنے ماضی کو دہرا رہے تھے اور شاید انہیں آگے کے لیے کوئی راہ نہیں مل رہی تھی۔ ان کی گفتگو سے مجھ پر یہ بھی ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ اخلاق و شرافت کی حدود سے تجاوز کر چکے ہیں اور اس سلسلے میں کسی ایک کو قصوروار نہیں کہا جا سکتا تھا۔ شادی اس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک ثمینہ کو طلاق نہ ہو جاتی۔ وہ زاہد کی یہ بات ماننے پر آمادہ نہیں تھی کہ بغیر طلاق لیے اس سے دوسرے شادی کر لے۔ اس کے علاوہ بچے بھی اس کا ایک بڑا مسئلہ تھے۔ جذباتی ہیجان کا شکار ہو کر وہ اپنے بچوں کو چھوڑ تو آئی تھی' مگر اب اس کی مامتا جاگ گئی تھی۔
دوسروں کے دکھ سکھ سن کر آدمی کچھ دیر کو اپنے رنج و الم بھول جاتا ہے' شاید یہ سوچ کر دنیا میں ایک وہی دکھی نہیں' کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ میرا خیال بھی ایسا ہی تھا ورنہ شاید میں ان دونوں کی گفتگو میں اتنی دلچسپی نہ لیتا۔ ان کا قصہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ دلچسپی کے باوجود میں نے اٹھنے کا فیصلہ کیا کہ مجھ کو پرائی کیا پڑی' اپنی نبیڑ تو! اسی وقت مجھے کھانسی اٹھ آئی۔
"چپ ہو جاؤ' کوئی ہے۔" ثمینہ کی سہمی سہمی سی آواز آئی اور میں نے وقتی طور پر دم سادھ لیا۔ بہر حال مجھ سے ایک اخلاقی جرم سرزد ہوا تھا کہ دانستہ ان کی گفتگو سنی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کا شک یقین میں بدلے۔
"ہاں کسی کے کھانسنے کی آواز تو میں نے بھی سنی ہے' مگر....."
"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں شوکت کا ماموں زاد بھائی ارشد نہ ہوا!" ثمینہ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ شوکت اس کے شوہر کا نام تھا۔
"تمہیں تو بس ہر وقت خوف رہتا ہے۔ یہ پارک ہے' کوئی گذر گیا ہو گا کھانستا ہوا ادھر سے۔" زاہد نے اسے سمجھانا چاہا۔

"نہیں، میں نے قریب ہی سے آواز سنی ہے۔ وہ..... وہ یقیناً ارشد ہو گا اور..... اور اسے شوکت نے خط لکھ دیا ہو گا۔"

"اور ارشد ہمیں تلاش کرتا ہوا یہاں آ گیا ہو گا! یہی نا؟ یہی کہنا چاہتی ہو نا تم؟"

"ہاں..... ہاں یہی۔" ثمینہ جلدی سے بولی۔

"پاگل ہو تم! خدا بچائے عورتوں سے پر کا کوا بنا لیتی ہیں۔"

"دیکھ لو اٹھ کر تو تمہارا کچھ بگڑ جائے گا! ارشد بھی تو یہیں چاٹگام میں رہتا ہے نا!"

"پھر وہی ارشد!"

"اچھا تو پھر گھر چلو۔ میں اب مزید یہاں نہیں بیٹھ سکتی۔" ثمینہ نے فیصلہ سنا دیا۔

"ہم یہاں جھک مارنے نہیں آئے تھے، کوئی فیصلہ کرنے آئے تھے! وہاں گھر میں تمہیں یہ خوف کھائے جاتا ہے کہ کوئی پڑوسی نہ سن لے، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں تمہیں آج کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہی پڑے گا! مجھ سے شادی کرنے پر راضی ہو یا نہیں؟"

"اچھا ٹھیک ہے!..... مگر اتنی بات تو مان لو میری کہ..... کہ اٹھ کر دیکھ لو۔" ثمینہ نے ملتجی لہجے میں کہا۔ "اور یہاں ادھر..... ادھر سے آواز آئی تھی، مگر تم..... تم ادھر سے جاؤ، گھوم کر تاکہ ارشد ہی ہو تو..... تو تم پر اس کا نظر....."

"اتنی عقل مجھ میں بھی ہے!" زاہد ناگواری سے بولا۔ "گھوم کر ہی جاؤں گا۔ ویسے تمہارے اطمینان کے لیے دیکھے لیتا ہوں ورنہ مجھے یقین ہے، ہو گا کوئی نہیں۔" اسی کے ساتھ مجھے قدموں کی دور ہوتی چاپ سنائی دی۔

یہ موقع غنیمت تھا کہ میں خاموشی کے ساتھ وہاں سے اٹھ جاتا۔ میں بہت احتیاط سے کھڑا ہو گیا اور پھر دبے قدموں آگے بڑھنے لگا تاکہ وہ عورت خوف زدہ ہو کر چیخ کر نہ اٹھے۔ ابھی میں چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ عقب سے اسی عورت کے چلانے کی آواز سنائی۔ ٹھہرو!..... ٹھہر جاؤ! مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ!"

میں یہی سمجھا کہ وہ مجھے نہیں اپنے نوجوان عاشق کو پکار رہی ہے۔ شاید وہ نیم تاریکی اور تنہائی میں ڈر گئی ہو گی۔ میں نے اپنی رفتار اور بڑھا دی۔ گھاس کا وہ قطعہ میں جلد سے جلد عبور کر کے روشنی میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔

"میں کہتی ہوں رک جاؤ ورنہ میں شور مچا دوں گی!" اس بار اس کی آواز مجھے اور نزدیک معلوم ہوئی۔ "تم مجھے یہاں چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتے!" اسی کے ساتھ قدموں کی چاپ بھی سنائی دی۔

وہ اتنی زور زور سے چیخ رہی تھی کہ لوگ، پارک کے کونوں کھدروں سے نکل کر اس طرف دوڑنے لگے۔

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ رات کے وقت کوئی عورت اس طرح پارک میں چیخنے لگے تو ظاہر سی بات ہے، کیا صورت حال پیش ہو آ سکتی ہے۔ معلوم نہیں اس کا عاشق نامراد کہاں مر گیا تھا اور وہ کم بخت کیوں بولا گئی تھی! بہرحال میرے حق میں یہ بہتر نہیں تھا۔ لوگ مجھی پر شک کرتے اور مجھی کو تختہ مشق بنانے کی کوشش کرتے کیوں کہ وہاں میرے اور اس عورت کے سوا کوئی نہیں تھا۔

پارک میں ایک ہنگامہ سا ہو گیا تھا۔ سامنے سے بھی لوگ بھاگے چلے آ رہے تھے اور ادھر ادھر سے بھی میرے لیے کوئی راہ مفر نہیں، یہ سوچ کر میں رک گیا۔ ایسے میں بھاگ اٹھنا خود کو مشتبہ بنانے کے مترادف تھا۔ رکتے ہی میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک دراز قد عورت میرے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ ساری باندھے ہوئے تھی اور واقعی قابل دید تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ تین بچوں کی ماں ہو گی، مگر یہ وقت اس کے حسن کی نیرنگیوں کے جائزے کا نہ تھا۔ میں نے اس لیے بھی اسے مڑ کر دیکھا تھا کہ اگر وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہے تو اس کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

"دماغ درست ہے تمہارا؟" مجھے اس پر غصہ آ گیا اور جھٹکا دے کر اپنا بازو چھڑانے لگا۔ مگر اس کی گرفت سخت تھی۔ میں اپنا بازو چھڑانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ وہ یقیناً ہنگامے سے خوف زدہ ہو گئی تھی اور اب شاید مجھے اپنا آلہ کار بنانا چاہتی تھی۔

اسی دوران میں لوگ ہم دونوں تک پہنچ چکے تھے۔

"چھوڑو میرا بازو!" میں نے لوگوں کی پروا نہ کرتے ہوئے سخت لہجے میں اس سے کہا۔ میں کسی طرح کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کر کے لوگوں کی نظر میں مجرم ثابت ہونا نہیں چاہتا تھا۔

"اے! یہ عورت کیوں چیخ رہی تھی؟ کیا کر رہے تھے تم یہاں؟" ایک شخص نے براہ راست مجھے انتہائی ناشائستہ لہجے میں مخاطب کیا۔

"مجھے کیا خبر کیوں چیخ رہی تھی!" میں نے بھی ناگواری سے جواب دیا۔

یہ ویسے ہی تمہارا بازو پکڑے کھڑی ہے!" کوئی اور سر پھرا بولا۔ "بتاؤ کون ہے یہ تمہاری؟"

"کوئی نہیں۔ میں جانتا ہے! یہ خواہ مخواہ میرے گلے پڑ رہی ہے کیوں کہ اسکا....."

"کوئی نہیں ہوں میں تمہاری!" وہ تقریباً چیخ اٹھی۔ "خواہ مخواہ گلے پڑ رہی ہوں تمہارے! تم..... تم اسی لیے مجھے ڈھاکے سے بھگا کر لائے تھے!"

"بھگا کر لایا تھا!" کئی حیرت زدہ آوازیں ابھریں۔

اب میری قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ اپنی گلو خلاصی کے لیے مجھے ہدفِ ملامت بنا رہی تھی۔ پہلے میرے دل میں اس کے لیے ایک ماں ہونے کے ناتے جو ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے تھے، ان پر افسوس ہوا۔ وہ بہت عیّار عورت تھی۔ میں نے غصے میں یہ خیال بھی نہیں کیا کہ وہ صنفِ نازک ہے، اس کے ساتھ یہ سلوک مناسب نہیں، اسے دھکا دے کر اپنا بازو چھڑا لیا۔

پھر تو جیسے قیامت آ گئی۔ لوگوں کی "غیرت" اور مردانگی بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتی ہے کہ ان کے سامنے کسی حسین اور خوب رو عورت کو یوں دھکا دے دیا جائے!

"ابے تو بڑا بے غیرت ہے مردود!"

"ایک تو اس عورت کو بھگا کر لایا ہے، اس پر حرمزدگی دکھا رہا ہے!"

"کوئی عورت اسے معاملے میں جھوٹ بول سکتی ہے، اس کا کمینہ پن معلوم ہوتا ہے!"

ہر طرف سے جیسے مجھ پر آوازوں کے پتھر برسنے لگے اور ادھر اس عورت پر ایک جنونی کیفیت سی طاری ہو گئی، اس نے جھپٹ کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ "میں تمہارا اور اپنا خون ایک کر لوں گی، مگر تمہیں بھاگنے نہیں دوں گی۔ تم نے مجھے دنیا کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا! اور اب ..... اب تم مجھے یہاں بٹھا کر، دھوکا دے کر خاموشی سے بھاگ جانا چاہتے تھے! اسی کے ساتھ اس نے میرے گریبان کو جھٹکا دیا۔

بھیڑ ہی میں سے کسی پولیس کو بلانے کا مشورہ دیا اور میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

"ٹھہریں! بات سنیں میری۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "میں بتاتا ہوں آپ لوگوں کو اصل معاملہ کیا ہے!"

"تم کیا بتاؤ گے، میں ہی بتائے دیتی ہوں، اب چھپانا کیا!" میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھی۔

"ہم اسے بھاگنے نہیں دیں گے، اس کا گریبان چھوڑ دو۔" کسی نے اس عورت سے کہا۔ شاید اسے میری حالت پر رحم آ گیا تھا۔

عورت نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے گریبان سے چھوڑ دیا۔ پھر کہنے لگی۔

"اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ چاٹگام چل کر تم سے شادی کر لوں گا۔ ایک مہینہ ہو گیا ٹالتے

ہوئے۔ میں بھی کوئی ایسی ویسی نہیں ہوں، قبر تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی!" وہ اب مزید جارح ہو گئی تھی اور بے حجاب بھی۔ "میں نے ایسے بہت قصّے اخباروں میں پڑھے ہیں ...... میں اس انتظار میں تھی کہ کب یہ میرے ساتھ ایسا چکّر چلائے اور کب میں اسے ذلیل و رسوا کروں! میں تو اسے خود تھانے تک لے جاؤں گی!"

"شیر کی بچی لگتی ہے، یہ نہیں چھوڑے گی اسے!" کسی نے تبصرہ کیا۔

"جھوٹ بولتی ہے یہ، بکواس کرتی ہے!" میں چیخ اٹھا۔ "میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ آج سے پہلے میں نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس کا نوجوان عاشق اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہے تو یہ میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ میں تو یہاں ....." پھر اس عورت کے بار بار مداخلت کرنے کے باوجود میں نے لوگوں کو جیسے تیسے اصل کہانی سنا ہی دی۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ کچھ میرے ہم نوا بھی ہو گئے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ بھلا ایسی حسین و خوب صورت عورت کو قبول کرنے سے کون کافر منہ پھیرے گا!

"جھوٹا ہے یہ! ..... بہت جھوٹا ہے!" وہ چیخنے لگی۔ اسی کے ساتھ اس نے عورتوں کا وہ مخصوص ہتھیار بھی استعمال کیا جو مردوں کی عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ پھر اس نے جو کچھ کہا۔ اسے سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "پوچھیں اس سے ..... قسم لے کر پوچھیں، کیا اس کا نام شیخ کرامت نہیں ہے؟ ..... یہ کہہ رہا تھا نا ابھی کہ ..... کہ اس نے مجھے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا! ..... پوچھیں اس سے!"

اب مجھے معاملے کی سنگین نوعیت کا احساس ہوا، میں اب تک غلط خطوط پر سوچتا رہا تھا۔ معاملہ وہ نہیں تھا جو بہ ظاہر نظر آ رہا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسے میرا نام ہرگز معلوم نہ ہوتا۔

"بول میاں! ٹھیک ہے یہ بات؟" کوئی مجھ سے بولا۔ "تیرا نام یہی ہے نا؟"

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولوں، وہ پھر چیخنے لگی۔ "یہ بھی پوچھیں اس سے کہ کیا یہ بدایوں کا رہنے والا نہیں ہے؟ اور یہاں یہ کہاں رہتا ہے، کہاں رکھا ہے مجھے یہ بھی ....."

"بس بس! ہمیں یقین آ گیا کہ یہ فراڈیا ہے! تم اسے تھانے لے چلو، ہم بھی چلتے ہیں ساتھ!" ایک نوجوان نے گویا فیصلہ سنایا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں بول اٹھا۔ میرے لہجے میں خجالت کا عنصر تھا۔ "غلطی میری ہی ہے۔" یہ کہہ کر میں، عورت سے مخاطب ہوا۔ "ثمینہ! مجھے معاف کر دو۔ میں تمہیں خدا کا واسطہ دیتا ہوں۔"

"نہیں، میں تمہیں ہرگز معاف نہیں کرسکتی!" وہ اکڑ کر بولی۔ "تم دھوکے باز ہو!"

"جو چاہے سزا دے لو، مجھے ہر سزا منظور ہے، مگر.... مگر معاف کردو مجھے!" میں نے دانستہ اپنی آواز میں رقت پیدا کرلی۔

لوگ بڑی حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ میرے اور اس کے درمیان جو سرد جنگ جاری تھی، اسے میں ہر حال میں جیتنا چاہتا تھا۔

"یہ دونوں ہی آوارہ لگتے ہیں، لعنت پڑھو ان پر!" کسی ادھیڑ عمر شخص نے زور سے لاحول پڑھی اور وہاں سے چل دیا۔ دو ایک آدمی اس کے ساتھ بکتے جھکتے اور چل دیئے، مگر ظاہر ہے کہ نوجوان بھلا کیسے وہاں سے ٹل جاتے! وہ تو اس کہانی کا آخری منظر دیکھنے کے آرزو مند تھے اور ضرورت پڑنے پر، "ایک مجبور بے بس حسینہ" کی ہر طرح مدد کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اب اس تماشے سے مزہ بھی لے رہے تھے۔

ثمینہ کی آنکھوں میں اب مجھے کچھ الجھن اور پریشانی کے سے آثار نظر آرہے تھے اور میں مسلسل اس کی خوشامد کیے جا رہا تھا، یوں جیسے کوئی اپنے روٹھے ہوئے محبوب کو منا رہا ہو۔ ثمینہ کچھ کھوئی کھوئی سی دکھائی دے رہی تھی۔ میری ساری کوشش یہ تھی کہ وہاں موجود افراد کی ہمدردیاں حاصل کرلوں۔

"مان جاؤ، مان جاؤ!" کسی نے ثمینہ کی طرف دیکھ کر ہانک لگائی۔ "مرد بچے کو اتنا نہیں ستاتے۔"

"اس نے بھی تو مجھے ستایا ہے! میں اسے کیسے معاف کردوں!" وہ پھر بپھرنے لگی، مگر اس بار اس کی "آہ و بکا" کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ "میں اسے نہیں چھوڑوں گی!"

"تو وہ کب تمہیں چھوڑ رہا ہے! راضی تو ہے، اور کیا چاہیے تمہیں؟"

"نہیں، میں اسے پولیس کے حوالے کیے بغیر نہیں رہوں گی۔"

"تم بھی پھنس جاؤ گی۔ وہ تمہیں بھی بند کردیں گے۔" کسی نے سمجھایا۔ "تم شاید جانتی نہیں پولیس والوں کو!"

"کروادیں بند!" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا، پھر ذرا توقف سے بولی۔ "تم لوگ بھی میرے ساتھ چلو تھانے۔"

تھانے کا نام سن کر ایک آدھ نوجوان تو راضی ہو گیا بقیہ بغلیں جھانکنے لگے میں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ "پولیس والے اکثر گواہوں کو بھی حوالات کی سیر کرا دیتے ہیں، یہ خیال رکھنا!" اس کے بعد میں نے ثمینہ سے کہا۔ "بات نہ بڑھاؤ ثمینہ میں کل ہی تم سے

شادی کرلوں گا۔"

میری دھمکی کا اچھا اثر ہوا، کچھ اور لوگ چھٹ گئے۔

"میں لعنت بھیجتی ہوں شادی پر اور تم پر بھی!"

"تم جانو۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "اگر تم تھانے ہی چلنا چاہتی ہو تو چلو، میں تیار ہوں چلنے پر!"

"ہاں چلو!" اس نے میرے بازو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میں بھاگا نہیں جا رہا جو تم مجھے پکڑ رہی ہو! تم بھی تماشا بنو گی اور میں بھی! تھانے ہی چلنا ہے تو سیدھے سیدھے چلی چلو۔" میں ذرا ہنستے ہوئے بولا، پھر تماشائیوں سے مخاطب ہوا۔ "تم میں سے جو بھی تھانے چلنا چاہتا ہے، چلے!"

"جھگڑا تم دونوں کا ہے، ہم کیوں جائیں تھانے! ہماری بلا سے جہنم میں جاؤ تم!" یکے بعد دیگرے اسی طرح کے جملے سنائی دیئے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بس ایک ہی "شیر دل" نوجوان تھانے تک چلنے پر آمادہ ہوا۔ وہ "شیر دل" بھی ایسا تھا کہ پھونک مارو تو ہوا میں اڑ جائے۔ ایک ہاتھ کا نہیں تھا اور عمر بھی تیئس چوبیس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ وہ بڑی میٹھی میٹھی نظروں سے ثمینہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا معاملہ بھی ثمینہ کے نوجوان عاشق زاہد سے مختلف نظر نہیں آتا تھا۔ ثمینہ کے ایما پر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں اس کی حماقت پر دل ہی دل میں ہنس دیا۔ وہ اس طرح ثمینہ کی طرف بار بار نظر اٹھا رہا تھا جیسے اپنی "بہادری" کی داد وصول کرنا چاہتا ہو۔

"چلو!" ثمینہ مجھ سے مخاطب تھی اور اس نوجوان سے بھی۔

میں کسی احتجاج کے بغیر ان دونوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ویسے بھی اب رات زیادہ ہو چکی تھی، پارک میں اکا دکا آدمی ہی نظر آرہا تھا۔ کوئی ہمارے طرف متوجہ نہیں ہوا۔ میں یہی چاہتا بھی تھا۔ پارک سے نکل کر ہم سڑک پر آگئے۔ علاقے کا تھانہ وہاں سے دور تھا، مگر یہ بات غالباً اس نوجوان کو معلوم نہیں تھی۔ وہ اس لیے ثمینہ سے مخاطب ہوا۔ "کدھر چلنا ہے؟..... تھانہ معلوم ہے آپ کو؟"

"ہاں معلوم ہے۔" ثمینہ خلاف توقع بولی اور میں ایک بار پھر چونک اٹھا۔ ثمینہ کے اس جواب نے میرے اس خیال پر مہر تصدیق ثبت کردی تھی کہ اس وقت وہ کسی کی آلہ کار بنی ہوئی ہے، اور وہ ہستی کون ہو سکتی ہے، یہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا پھر ثمینہ نوجوان کی رہنمائی کرنے لگی۔ میں خاموش رہا۔ "اس طرف..... ادھر..... اس گلی میں!" ثمینہ صحیح

راستے پر لے جا رہی تھی۔

ثمینہ اور اس کے عاشق کی گفتگو سے مجھے یہ علم ہو چکا تھا کہ کم از کم ثمینہ کے لیے چاٹگام ایک اجنبی شہر ہے' لیکن اس وقت ایسا قطعی معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ نوجوان بھی اتنا گھامڑ تھا کہ اس نے اس سلسلے میں ثمینہ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں اس تمام کھیل کا مقصد اچھی طرح سمجھ رہا تھا' اسی کے ساتھ یہ بھی طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے! اس مصیبت سے کس طرح جان چھڑانا ہے! یہ معاملہ پولیس تک پہنچ جاتا تو میرے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ نرس نادرہ کے سلسلے میں بھی مجھے اسی سے ملتی جلتی صورت حال پیش آ چکی تھی۔ پولیس سے جان بچانے کے لیے مجھے بڑے پاپڑ بیلنا پڑے تھے۔ پولیس کو بار بار اس معاملے میں ملوث کرنے کا بس ایک ہی مقصد تھا کہ کسی طرح میں کوئی رات حوالات میں گزارنے پر مجبور ہو جاؤں۔ اسی میں میرے دشمن کی فتح تھی۔ یا پھر میں وقت پر عمل نہ کر سکوں۔ اب تک میں اپنی خود اعتمادی اور بیدار مغزی کے سبب اس کے ہر حربے کو ناکام بناتا آ رہا تھا۔ میں نے یقیناً گھر سے نکل کر غلطی کی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ شبھو نے میری عقل خبط کر لی تھی اور میں اپنی اصل دشمن مہ پارہ کو بھول گیا تھا۔ اب مجھے یقین آ چکا تھا کہ ثمینہ کے معاملے میں مہ پارہ ہی نے موقع سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں وہ عورت قطعی بے قصور تھی' بالکل اسی طرح جیسے نرس نادرہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ جب ثمینہ' مہ پارہ کے سحر سے آزاد ہو جاتی تو خود اسے اپنے کیے پر ندامت ہوتی۔ ثمینہ کے نوجوان عاشق زاہد کو بھی مہ پارہ ہی نے بھٹکا دیا ہو گا۔ معلوم نہیں' اس وقت وہ کہاں اپنی محبوبہ' دل نواز کو تلاش کرتا پھر رہا ہو! یہی سب کچھ سوچتا ہوا میں ان دو اجنبیوں کے ساتھ چلتا رہا جنہیں حقیقتاً مجھ سے کوئی پرخاش نہیں تھی اور نہ ہی انہیں اصل معاملے کا علم تھا۔

تھانہ اب زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا اس لیے مجھے جو کچھ کرنا تھا' اب اس میں تاخیر نقصان دہ ہو سکتی تھی۔ اس وقت موقع بھی تھا۔ میری بائیں جانب جو علاقہ تھا' میرا دیکھا بھالا تھا۔ میرے ذہن میں پہلے سے یہی جگہ تھی کہ یہاں تک پہنچ کر میں کوئی داؤ دکھا سکتا ہوں۔ ہم ایک چھوٹی سی سڑک سے گزر رہے تھے جس پر کچھ دور چلنے کے بعد دائیں جانب اس علاقے کا تھانہ تھا۔ میں دانستہ بائیں طرف چل رہا تھا۔ میرے ساتھ وہ نوجوان تھا جو اب تک شاید اپنی دانست میں میرے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ اسی کے ساتھ ثمینہ قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔

اچانک چلتے چلتے میں نے جھٹکا دے کر نوجوان سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پھر اسے ثمینہ کی

طرف دھکیل دیا۔ یقیناً وہ اس افتاد کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ وہ تو شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ میں سیدھے سبھائے تھانے جا رہا ہوں اور یہ کہ میں نے ثمینہ کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں' مگر جب یہ صورت حال پیش آئی تو اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی اور یہی حال ثمینہ کا ہوا۔

وقت ضائع کیے بغیر میں بائیں جانب ایک پتلی سی گلی میں گھس کر دوڑنے لگا۔ مجھے اپنے عقب سے ثمینہ کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔

"پکڑو..... پکڑو!..... وہ بھاگا جا رہا ہے!"

"پکڑو پکڑو" کے شور کا لوگوں نے کچھ اور ہی مطلب لیا وہ یقیناً سمجھے ہوں گے یہ کوئی چوری چکاری کا معاملہ ہے۔

میں نے اپنے عقب میں لوگوں کے دوڑنے کی آوازیں سنیں۔ دوڑتے ہوئے وہ "چور چور" کی آوازیں بلند کر رہے تھے۔ یہ صورت حال میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی اسی لیے خود میں بھی "چور چور" چیختا ہوا بھاگنے لگا۔ چور عموماً ایسے موقعوں پر یہی کرتے ہیں۔ میں ایک گلی سے دوسری گلی میں اور دوسری سے تیسری میں بھاگ رہا تھا۔ گلیوں میں بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ جو بھی کسی گھر سے نکلتا بس بغیر کچھ پوچھے گچھے احمقوں کی طرح منہ اٹھا کر بھاگنے لگتا۔

ایک گلی میں پہنچ کر میں نے اپنی رفتار ذرا آہستہ کر دی اور اپنے پیچھے دوڑنے والوں کو دانستہ قریب آنے دیا۔ آگے جا کر گلیوں کا ایک تراہا سا تھا۔ میں اب بھی لوگوں کی آواز میں آواز ملائے چیختا ہوا بھاگ رہا تھا۔

پھر میں نے وہی کیا جو ایسے مواقع پر چور کرتے ہیں۔ چور کی تلاش میں قریب آ جانے والوں کے استفسار پر میں نے انہیں ایک طرف دوڑا دیا اور خود دوسری گلی میں مڑ گیا۔ اب میں دوڑنے کی بجائے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ عموماً لوگ اس طرف متوجہ ہوتے ہیں جدھر شور سنائی دے رہا ہو اس لیے مجھے اطمینان تھا اور یہ اطمینان غلط ثابت نہیں ہوا۔

میں جلد سے جلد گلیوں کے اس جال سے نکل کر ایک سڑک پر پہنچ گیا اور پھر مجھے اپنی کوٹھی تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ مہ پارہ کا حربہ پورے طور پر ناکام ہو چکا تھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے اور عمل شروع کرنے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔

عقبی پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول کر اپنے حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے میں نے "احتیاطاً" ردِ بلا کی آیات کا ورد شروع کر دیا۔ اپنے کمرے تک پہنچتے ہوئے بہ ظاہر مجھے کوئی تبدیلی

محسوس نہیں ہوئی' سب کچھ جوں کا توں تھا۔ برآمدے کی طرف بھی میری نظر گئی تھی مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ عمارت میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ کپڑے تبدیل کر کے میں باہر آ گیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد میں نے چولہے کو ہاتھ لگایا تو عجیب سا محسوس ہوا۔ کھانا پکائے مجھے برسوں ہو گئے تھے' لیکن اپنے ہمزاد کے لیے تو مجھے روٹی ڈالنا ہی تھی جو صبح کے وقت میں ایک قریبی چوراہے پر جا کے رکھ آتا تھا۔

روٹی ڈالنے کے بعد احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے آٹا' گھی اور دیگر ضروری اشیاء وہاں سے اٹھا کر اپنے کمرے میں رکھ دیں۔ اس خبیث شبھو سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ مجھے تنگ کرنے کی خاطر مزید کوئی گڑبڑ کر دیتا۔ ابھی مجھے عمل شروع کرنے میں کچھ وقت درکار تھا اس لیے تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا کیوں کہ رات بھر جاگنا تھا۔ کمرے کا دروازہ ابھی میں نے بند نہیں کیا تھا۔

شبھو نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں کوٹھی چھوڑ کر چلا جاؤں اور یہ آج ہی کی بات تھی۔ اس وقت میں اسی دھمکی پر غور کر رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ عمل کے دوران میں یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ اگلا قدم کیا اٹھا سکتا ہے؟ یہ ممکن تھا کہ سریتا نے اس سے میری جان بخشی کی التجا کی ہو اس لیے کہ وہ لڑکی بہرحال مجھ سے محبت کرتی تھی' مگر شبھو میرے نزدیک اتنا شریف نہیں تھا جو اپنے عہد کی پاس داری کرتا۔ وقتی طور پر اپنی مطلب براری کے لیے تو وہ سریتا سے کوئی ایسا وعدہ کر سکتا تھا لیکن اس کا وعدے پر قائم رہنا ضروری نہیں تھا۔

کافی غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جو لوگ کچھ کرنے پر قدرت رکھتے ہیں' انہیں دھمکیاں دینے کی ضرورت نہیں ہوتی' انہیں جو کرنا ہوتا ہے' کر گزرتے ہیں۔ کوٹھی کے اس حصے پر تصرف نہ ہونے کا ایک ہی سبب میری سمجھ میں آتا تھا' وہ کہ میں یہاں ہمزاد کا عمل کر رہا تھا اور میرا عمل رحمانی تھا۔ میں یہاں قرآنی آیات کا ورد کرتا تھا۔ میں اب تک اپنے دشمنوں کے مقابل اسی لیے جما ہوا تھا اور میرے دشمن اسی لیے مجھے زیر نہ کر سکے تھے کہ میں شیطان سے کہیں بڑی اور عظیم طاقت کی پناہ میں تھا۔ مہ پارہ بھی شیطانی علوم کی ماہر تھی اس لیے اس کی روح عذاب میں تھی' بھٹکتی پھر رہی تھی اور شبھو وہ بھی میرے نزدیک شیطان ہی کا دوسرا روپ تھا۔ اس نتیجے پر پہنچ کر مجھے اطمینان قلب حاصل ہوا اور میں بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہمزاد کے عمل کا وقت قریب آ پہنچا تھا۔ میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

اس رات عمل کے دوران میں صرف اتنا ہوا کہ مجھے سریتا اور دوسری ملازماؤں کے چیخنے اور چلانے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں جن پر میں نے کان نہیں دھرا۔

دو روز اور بغیر کسی قابل ذکر واقعے کے گزر گئے۔ میں اس دوران میں اپنی پناہ گاہ سے نہیں نکلا کیوں کہ ایک تلخ تجربے سے گزر چکا تھا۔ ثمینہ ابھی تک میرے حافظے میں تھی۔ خدا جانے اس پر کیا بیتی ہو گی! اگر وہ مجھے عام حالات میں ملی ہوتی اور میں نے گناہوں سے توبہ نہ کی ہوتی تو وہ ایسی نہیں تھی کہ اسے نظرانداز کیا جا سکے۔ اتنا حسن ہر ایک کے حصے میں نہیں آتا' لیکن شاید اصل چیز انسان کے اندر کا حسن ہے! اور اس کے اندر کا یہ حسن' کردار اور عمل کا مرہون منت ہوتا ہے۔ اب تک میں ظاہری حُسن پر جان نچھاور کرتا رہا تھا' مگر شاید میں غلطی پر تھا۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور اس غلطی کو دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے دانستہ ثمینہ کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ یقیناً وہ اندر سے حسین نہیں رہی ہو گی ورنہ گناہ کے راستے پر قدم رکھتے ہوئے اسے ایک بار یہ ضرور خیال ہوتا کہ وہ ماں بھی ہے۔ پھر شاید اس کے قدم رک جاتے۔ اگر اسے شوہر سے سکھ نہیں ملا تھا تو وہ اپنے بچوں میں اپنی خوشیاں تلاش کر لیتی۔ میرے نزدیک مجرم اس کا شوہر بھی تھا جس نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ ایک عورت انتہائی فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کے باوجود جانے کیوں میری یہ خواہش تھی کہ زندگی کے کسی موڑ پر اس عورت سے میری ملاقات ہو اور میں اسے راہِ راست پر لا سکوں۔ گھر بسنے میں بہت دیر لگتی ہے مگر اجڑنے میں وقت نہیں لگتا۔ لمحوں میں کیا ہوا کوئی غلط فیصلہ برسوں کے لیے عذاب جان بن جاتا ہے۔

یہ واقعہ تیسرے دن صبح کا ہے کہ ڈاکٹر امتیاز کو رخصت کر کے میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ قریبی تھانے کا ایس ایچ او ملک آدھمکا۔ اس کے ساتھ اے ایس آئی اور ایک پولیس والا بھی تھا۔ اے ایس آئی کے کہنے پر وہ عقبی سمت سے آیا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ میں ان سب کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ اب تک دانستہ میں نے ان سے آمد کا سبب دریافت نہیں کیا تھا۔

کرسی پر آرام سے پھیل کر بیٹھنے کے بعد ایس ایچ او نے مجھے اس طرح گھور کر دیکھا جیسے پہلی بار اس سے ملاقات ہو رہی ہے۔ سپاہی' کرسی ہونے کے باوجود دروازے کے قریب کھڑا رہا تھا۔

''تم مجھ سے پوچھ نہیں رہے کہ میں کیوں آیا ہوں!'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یقیناً آپ کو مجھ سے کوئی کام ہو گا!" میں نے اس کے لہجے کی چبھن کو نظرانداز کرتے ہوئے نرمی اختیار کی۔

"کام ہوتا تو تمہیں تھانے بھی بلوا سکتا تھا' مجھے یہاں آنے کی ضرورت نہیں تھی!" اس نے بے تکی سی بات کی' پھر کہنے لگا۔ "تم نے یہاں کتنی لڑکیوں کو حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے؟" اس نے بہ راہ راست یہ سوال میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کیا تھا۔ اس کے چہرے پر سختی تھی۔

"کسی کو نہیں۔ شاید آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے ملک صاحب!" میں بہ دستور نرمی اختیار کیے رہا۔

"زیادہ فری ہونے کی کوشش نہ کرو!" اس نے اپنے گول گول دیدے گھماتے ہوئے منہ بگاڑ کر کہا۔ "جو پوچھ رہا ہوں' اس کا جواب دو!"

"میں نے عرض تو کیا ناجناب کہ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"اسے وہ درخواست دکھاؤ جو محلے والوں نے ایس پی صاحب کی خدمت میں بھیجی تھی۔ اس نے اے ایس آئی کو مخاطب کیا جس کی بغل میں کوئی فائل دبی ہوئی تھی۔

اے اس آئی" فائل کھول کر مطلوبہ درخواست نکالنے لگا۔ اس کیس میں تم نہیں بچ سکتے؟ ایس ایچ او نے گویا مجھے دھمکایا۔ "بہت ہو گئی! میں نے یہ سوچ کر تمہارا بہت خیال کیا کہ تم شریف آدمی ہو گے' مگر اب..... اب میں کوئی بات نہیں سنوں گا! تم نے تو میری نوکری خطرے میں ڈال دی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اے ایس آئی سے مخاطب ہوا۔ "ملی درخواست؟"

"جی سر! یہ..... یہ رہی۔" اس نے فائل سے درخواست نکالتے ہوئے ایس ایچ او کی طرف بڑھائی۔

"مجھے نہیں' اسے دکھاؤ!" ایس ایچ او نے اے ایس ائی کی طرف دیکھ کر آنکھیں نکالیں۔

"جی..... جی سر! اس نے یہ کہہ کر درخواست میری طرف بڑھادی۔

میں اس سے وہ درخواست لے کر پڑھنے لگا۔ درخواست علاقے کے ایس پی کے نام تھی اور اس کی ایک نقل آئی جی کو بھی بھیجی گئی تھی۔ ایس ایچ او گویا غلط نہیں کہہ رہا تھا کہ اس کی نوکری خطرے میں پڑ گئی تھی۔ یہ معاملہ تھانے کی حد سے نکل کر پولیس کے اعلیٰ حکام تک پہنچ چکا تھا۔ یقیناً اسے اوپر سے لتاڑ پڑی تھی اس لیے گرم تھا۔ مجھے علم تھا کہ تھانے کی حد تک کوئی ایس ایچ او جو بھی چاہے کرلے' مگر جب کوئی معاملہ حکام بالا کے علم میں بھی آ

جاتا ہے تو وہ مستقل مفاد پر عارضی مفاد کو قربان کر دیتا ہے۔ مستقل مفاد سے میری مراد نوکری کا تحفظ ہے اور عارضی مفاد میں نے "اوپری آمدنی" کو کہا ہے۔ یہی سوچتے ہوئے میں درخواست پڑھنے لگا کہ اس چکر سے کس طرح نمٹا جائے؟

درخواست میں لکھا گیا تھا کہ روز رات کے وقت میری کوٹھی سے عورتوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انہیں زدوکوب کیا جا رہا ہو۔ اس سے محلے والوں کا سکون ختم ہو گیا تھا اور رات کے وقت آرام سے نہیں سو پاتے تھے۔ درخواست میں میرے کردار پر بھی گہرے شک وشبے کا اظہار کیا گیا تھا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ پولیس سے میرے مراسم ہیں اور اکثر پولیس والوں کو میرے یہاں آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔ آخر میں ایس پی سے درخواست کی گئی تھی کہ اس معاملے کی چھان بین کرائے اور علاقے کے معزز شہریوں کو اس عذاب سے نجات دلائے۔ اس درخواست پر خاصے افراد کے دستخط تھے۔

کئی دن سے عمل کے دوران میں مجھے واقع چیخ پکار سنائی دے رہی تھی' مگر میں اسے فریب سماعت ہی سمجھا تھا۔ اب یہ درخواست پڑھ کر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ شمبھو واقعی میری ملازماؤں پر تشدد کر رہا تھا کیوں کہ چیخنے چلانے کی آوازیں دوسروں نے بھی سنی تھیں۔ درخواست پڑھ کر میں نے واپس کر دی اور نہایت پرسکون آواز میں بولا۔ "اس درخواست میں جو کچھ لکھا ہے سراسر غلط ہے۔" "بہت خوب!" ایس ایچ او نے طنز کیا۔ "تم نے تو سارا مسئلہ ہی حل کر دیا۔"

"آپ خود سوچیں' ان لوگوں نے لکھا ہے کہ تھانے کی پولیس سے میرے مراسم ہیں۔ کیا یہ بات غلط نہیں ہے؟" میں نے گویا اپنے حق میں دلیل پیش کی۔

"بکواس نہ کرو زیادہ!" وہ سخت لہجے میں بولا۔ "تم جیسے نہ جانے کتنے میں نے اپنی ٹانگ کے نیچے سے نکال دیے ہیں۔ چلا ہے بڑا بھولا بننے! کیا میں تجھے جانتا نہیں کہ تو کتنے پانی میں ہے! کبھی یہ چکر' کبھی وہ چکر! اب میں چکر میں نہیں آ سکتا' مجھے!" اس کے رویہ میرے ساتھ بالکل مجرموں ایسا تھا۔ اس کے منہ میں جو آ رہا تھا' کہے جا رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے بولا۔ "چلو اٹھو!"

"مگر کہاں؟ میں نے سوال کیا۔ میں خوف زدہ ہو گیا تھا کہ کہیں وہ مجھے تھانے لے جا کر حوالات میں بند نہ کر دے!

ابھی ڈرو مت' تھانے چلنے کی باری ابھی نہیں۔" اس نے جیسے میرے چہرے کے تاثرات اور گھبراہٹ سے اندازہ کر لیا میں کیا سوچ رہا ہوں! اس نے مزید کہا۔" پہلے میں

تمہاری کوٹھی سے ان لڑکیوں کو برآمد کروں گا جنہیں تم نے حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے! چل کر خود نشان دہی کرو کہ انہیں تم نے کہاں چھپایا ہے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ ابھی تک تم نے میری نرمی ہی نرمی دیکھی ہے ورنہ میں کھال اتار دیتا ہوں! بڑے بڑے اچھے خاں میرے سامنے ناک رگڑ چکے ہیں۔"

مجبوراً مجھے اٹھنا ہی پڑا۔ "میری کوٹھی میں ملازماؤں کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ آپ خود چل کر دیکھ سکتے ہو اور آج کل تو میں کوٹھی کے اس حصے میں انہیں آنے بھی نہیں دیتا کیوں کہ اس سے میری عبادت میں فرق پڑتا ہے۔" میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"بڑا عبادت گزار بن رہا ہے ......" یہ کہہ کر اس نے مجھے گالی دی۔ "ابھی تیری ساری پارسائی نکالے دیتا ہوں' بدمعاش کہیں کا! مجھے پٹی پڑھا رہا ہے!"

اپنی اس توہین پر مجھے غصہ تو بہت آیا' مگر میں بے بس تھا۔ کرتا بھی کیا! سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہیں۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

میری کوٹھی کے جس حصے میں ملازمائیں تھیں۔ میرے نزدیک وہاں پولیس نہیں پہنچ سکتی تھی کیونکہ اس پر شمبھو کا قبضہ تھا۔ یہ سوچ کر کہ خود ابھی ایس ایچ او کے سارے کس بل نکل جائیں گے' میں تن بہ تقدیر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہاں میں نے یہ فیصلہ ضرور کر لیا تھا کہ پہلے خود برآمدے میں قدم نہیں رکھوں گا۔ میرے خیال میں ایس ایچ او کی ساری اکڑفوں کچھ دیر میں نکلنے والی تھی۔ شمبھو بھلا یہ کیسے گوارا کر لیتا کہ اس کی خلوت میں کوئی مخل ہو!

برآمدے کے قریب پہنچتے پہنچتے میں غیر محسوس انداز میں ذرا پیچھے ہو گیا تھا۔ مجھ سے ذرا آگے ایس ایچ او تھا۔ برابر میں اے ایس آئی اور پیچھے کانسٹیبل۔ معلوم نہیں کیسے اے ایس آئی نے یہ بات محسوس کر لی کہ میں آگے بڑھتے ہوئے جھجک رہا ہوں' یوں بھی ایسے مواقع پر پولیس والے عموماً" ملزموں کو آگے رکھتے ہیں۔ اس نے مجھے آگے بڑھنے کے لیے ٹھوکا دیا۔ برامدہ اب بالکل نزدیک آ چکا تھا۔ میرے قدم رکنے لگے تو ایس ایچ او پلٹا اور کڑک کر بولا۔

"کیوں' اب پیروں میں جان نہیں رہی! چل آگے!"

"تم ...... مجھے ذرا باتھ روم جانا ہے۔" مجھے اس کے سوا مفر کی کوئی اور صورت نظر نہیں آتی تھی۔

"باتھ روم جانا ہے!" ایس ایچ او نے دانت پیس کر کہا اور پھر پیچھے سے میری قمیض کا کالر پکڑ کر آگے کھینچ لیا۔ "باتھ روم تو میں ابھی تمہیں بھیجتا ہوں!" یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے برآمدے کی طرف دھکا دیا۔

وہ اچھے خاصے تن و توش کا آدمی تھا۔ میں سنبھلتے سنبھلتے بھی اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اس لمحے میرے جسم کے تمام اعصاب تن گئے تھے کہ اب وہ شعلہ نمودار ہوا جو مجھے جھلسا کر رکھ دے گا' مگر کچھ بھی نہ ہوا میں برآمدے کے فرش پر گر پڑا اور اس دوران میں پولیس والے بھی برآمدے میں آ گئے۔

"کوئی بہانہ نہیں چلے گا! اٹھو!" ایس ایچ او نے مجھے ٹھوکر مارنے کے لیے پیر اٹھایا۔ وہ یقیناً" اب مشتعل ہو گیا تھا۔ اس کے نزدیک شاید میں مجرموں کی طرح بہانے بازی سے کام لے رہا تھا۔

میں ٹھوکر سے بچنے کے لیے ایک دم کروٹ لے کر اٹھنے لگا۔ مجھے انتہاوی حیرت تھی کہ آخر شمبھو اس وقت کیوں غافل ہو گیا ہے! کیا وہ میری طرف سے بالکل مطمئن ہو گیا تھا کہ میں اب اس طرف آنے کی ہمت نہیں کروں گا! وہ شاید ایسا سوچنے میں حق بہ جانب بھی تھا اس لیے کہ میں کئی بار اس کوشش میں ناکام ہو چکا تھا اور مجھے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا تھا۔

"اب زیادہ ٹسُن نہ دکھا! سیدھے سیدھے اُدھر چلا چل جہاں تو نے لڑکیوں کو رکھا ہے!"

میں اٹھ کھڑا ہو گیا تو ایس ایچ او نے اپنی بغل میں دبا ہوا بینت ہاتھ میں لے لیا' یوں جیسے مجھے دھمکانا چاہتا ہو۔

اس وقت جو نہ ہو جاتا' تھوڑا تھا۔ مجھ سے مجرموں ایسا سلوک کرنے کے لیے اس کے پاس مناسب جواز موجود تھا۔ میں قہراً و جبراً آگے بڑھنے لگا' مگر ہر لحہ مجھے یہی خیال تھا کہ کسی بھی وقت شمبھو کی طرف حملہ ہو سکتا ہے' اور حقیقت تو یہ ہے کہ اب اس وقت کو دیکھتے ہوئے خود میری یہ خواہش تھی۔ مجھ پر تو جو گزرتی' وہ گزرتی مگر پولیس والوں کے دماغ درست ہو جاتے۔

برآمدے سے زر کر صحن میں پہنچتے ہی ایک طرف سے کراہنے کی آواز سنائی دی اور میں چونک اٹھا۔ یہ آواز یقیناً" پولیس والوں نے بھی سنی تھی۔

"اُدھر۔ اُس طرف سر!" اے ایس آئی نے فوراً ہی اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایس ایچ او کو مخاطب کیا۔

"میں نے تم سے پہلے سن لی ہے کہ کراہنے کی آواز!" ایس ایچ او نے آنکھیں نکالیں اور پھر تیزی سے دائیں جانب بنے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ کر بولا۔ "آؤ میرے پیچھے!"

میں بھی حیران و سرسیمہ سا اے ایس آئی کے ساتھ اس طرف چلنے لگا۔ اس نے اب میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

اس کمرے کا دروازہ نیم وا تھا اور مجھے علم تھا کہ وہاں میری کس ملازمہ کی سکونت تھی!

ایس ایچ او نے کمرے کا پورا اور دروازہ کھول دیا اور اور اندر کے منظر دیکھ کر میرے فرشتے کوچ کر گئے۔ سامنے ہی ایک کرسی پر رکمنی، رسیوں سے بندھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ایس ایچ او کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز سن کر اے ایس آئی بھی میرا ہاتھ تھامے مزید آگے بڑھا تاکہ اس دل دوز منظر کا قریب سے نظارہ کر سکے۔ کرسی کے قریب ہی فرش پر چمڑے کا ایک ہنٹر پڑا ہوا تھا۔ رکمنی کی حالت بہ ظاہر خراب معلوم ہو رہی تھی۔ وہ کراہتے ہوئے نیم وا آنکھوں سے مجھے اور پولیس والوں کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"دیکھ کیا رہے ہو! کھولو اسے!..... جلدی!" ایس ایچ او نے اے ایس آئی کی طرف پلٹ کر تیز لہجے میں کہا۔

ایس ایچ او کے حکم پر اے ایس آئی فوراً ہی میرا ہاتھ چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھا۔

"ہتھکڑی ڈال دو اس کے!" ایس ایچ او نے دوسرا حکم سپاہی کو دیا۔ اب گویا اس کی دانست میں میرے مجرم ہونے میں کوئی شک نہیں رہا تھا۔

مجھے احساس بھی نہ ہوا کہ کب سپاہی نے میرے ہتھکڑی لگا دی، میں اس وقت جیسے کہیں اور ہی تھا اب مجھ پر بڑی حد تک حقیقت واضح ہو چکی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میرے خلاف کیا چال چلی گئی ہے! شمبھو نے مجھے یا پولیس والوں کو کوٹھی کے اس حصے میں داخل ہونے سے کیوں نہیں روکا! اس بھرپور حربے کا کوئی توڑ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اس طرح قانون کی گرفت سے پھانس دیا گیا تھا کہ مفر کی کوئی صورت نہ رہے۔

اس کے بعد بقیہ چار ملازمائیں بھی کوٹھی کے مختلف کمروں سے برآمد ہو گئیں البتہ سریتا نہیں ملی اور نہ ہی شمبھو نظر آیا۔ ان سبھی کی حالت ناگفتہ تھی۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ ان پر کیا گزری ہے! ایس ایچ او کے حکم پر ان سب کو نشست گاہ میں لے آیا گیا۔ وہ سبھی نڈھال اور بے حال نظر آ رہی تھیں۔ سب کے جسموں پر زود کوب کیے جانے کے آثار موجود تھے۔ پانی وانی پی کر گویا اب ان کے حواس قدرے درست معلوم ہو رہے تھے۔ ان کو نشست گاہ کے فرش پر بچھے ہوئے قالین پر بٹھا دیا گیا۔ ایس ایچ او ایک صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ میں اس کے سامنے ہتھکڑی پہنے مجرموں کی طرح کھڑا تھا اور میرے پیچھے کانسٹیبل اٹینشن حالت میں مجسمے کے مانند ایستادہ تھا۔ اے ایس آئی میری ملازماؤں کے قریب کھڑا ہوا گویا اپنے افسر کے حکم کا منتظر تھا۔ ایس ایچ او کی گردن اس طرح اکڑی ہوئی تھی جیسے اس نے ساری دنیا فتح کر لی ہو اور اب اپنی محکوم رعایا کی قسمت کا فیصلہ سنانے والا ہو۔

"ہاں بھئی شیخ کرامت بول اب! تو تو بڑا پارسا بن رہا تھا نمازی، پرہیزگار، عبادت گزار!" اس کے ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اس کا سلوک میرے ساتھ ایسا تھا جیسے بلی، چوہے سے کھیلتی ہے۔

"میں اب بھی یہی کہوں گا جناب کہ بے قصور ہوں۔" میں اس کے تمسخرانہ لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔

"بے قصور!..... بے قصور تو تجھے تھانے چل کر بتاؤں گا کہ کسے کہتے ہیں! ذرا ان لڑکیوں کے بیان ہو جائیں۔" وہ دانت پیسنے لگا۔

"بیان لے لیں آپ! خود معلوم ہو جائے گا آپ کو کہ ان پر میں نے ظلم نہیں کیا۔ میں تو خود آپ سے یہ کہنے والا تھا جناب!" میں نے ایک موہوم سی امید کے تحت کہا۔

"جناب کا بچہ!" وہ منہ بگاڑ کر بولا۔ "خود کہنے والا تھا مجھ سے! جیسے مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں!" یہ کہہ کر وہ اے ایس آئی سے مخاطب ہوا۔ "بیان لکھو، ان کے باری باری!" ایس ایچ او اس وقت کچھ زیادہ ہی لہر میں آ گیا تھا یا اسے میری خوب صورت نشست گاہ پسند آ گئی تھی ورنہ یہ بیان بازی تھانے چل کر بھی ہو سکتی تھی۔ عموماً ایسا ہوتا بھی ہے۔ پولیس والے، مجرم یا ملزم کو گواہوں سمیت تھانے لے جاتے ہیں اور وہیں ساری کارروائی مکمل کرتے ہیں۔

اے ایس آئی وہیں قالین پر فائل کھول کر بیٹھ گیا۔ وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ اس وقت اس کا افسر، تیس مار خان بنا ہوا ہے، اگر وہ صوفے پر بیٹھا تو ڈانٹ کھانا پڑے گی۔

پہلا بیان رکمنی کا ہوا، جب وہ بولنے والی تھی تو میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"میں دیناج پور کی رہنے والی ہوں۔ یہاں میں اپنے مالک کے ساتھ رہتی ہوں اور بھرے گھروں میں کام کاج کر کے اپنا پیٹ بھرتی تھی۔ باپ مر چکا ہے اور ماں، ماما کے پاس رہتی ہے۔ میں اس گھر میں بھی کام کرنے آتی تھی۔ مجھے تنخواہ کا لالچ دے کر کہا گیا کہ کوٹھی ہی میں رہنے لگوں۔ میں اپنے ماما اور ماں کی اجازت سے یہاں رہنے لگی۔ شروع شروع میں شیخ صاحب نے مجھ سے ہنسی مذاق شروع کیا، پھر اور بے تکلف ہونے لگے اور اس کے بعد پیسوں کا لالچ دینے لگے، مگر....." رکمنی یوں بولے جا رہی تھی جیسے حالت خواب میں ہو۔ اس نے مجھ پر اپنے بیان میں بڑے سنگین الزامات لگائے۔ اس بیان سے میں ایک اذیت پسند جنونی اور بدکردار شخص ثابت ہوتا تھا۔

"جب تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہو رہا تھا، تم پر تشدد کیا جا رہا تھا، تم بے آبرو ہو رہی تھیں تو یہاں سے بھاگ کیوں نہیں گئیں؟" اے ایس آئی نے یہ سوال کر کے گویا اپنی

قابلیت کا اظہار کیا۔

"اوئے بس کر!" ایس ایچ او نے اسے ڈانٹ دیا۔ "زیادہ قابل بننے کی ضرورت نہیں' سمجھے اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہ بیٹھتی کہ اسے دھمکی دی گئی ہوگی' کسی سے کچھ کہا یا بھاگنے کی کوشش کی تو قتل کر دیا جائے گا۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر' بالکل یہی بات ہوگی؟ اس ایس آئی نے فوراً اپنے افسر کی تائید کی۔ مگر اس کے باوجود ڈانٹ کھانے سے نہ بچ سکا۔

وہ جو میرے دل میں موہوم سی امید پیدا ہوئی تھی۔ اس نے دم توڑ دیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ اس وقت میری ملازماؤں میں سے کوئی ایک بھی اپنے ہوش میں نہیں اور سبھی سحر میں گرفتار ہیں۔ بقیہ کے بیانات بھی رکمنی سے مختلف نہیں ہو سکتے تھے۔ میرا ذہن اس وقت کسی نہ کسی حل کی تلاش میں تھا حالانکہ بہ ظاہر گلو خلاصی کی کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ رکمنی کے بیان کے بعد اے ایس آئی میری ایک اور ملازمہ کا بیان لینے والا تھا تو بالآخر کچھ سوچتے ہوئے میں نے ایس ایچ او کو مخاطب کیا۔ "جناب! میں آپ سے تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں!" وہ سختی سے بولا۔ "اب کوئی چکر نہیں چلے گا۔ میں پہلے تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہو چکا ہوں۔ خاموش کھڑے رہو اور سرکاری کارروائی میں مداخلت بے جا نہ کرو!"

"آپ صرف میری بات سن لیں' پھر جو چاہے کیجئے گا۔ میں باز نہ آیا اور باز بھی کیسے آتا کہ میری تو جان پر بنی ہوئی تھی۔

"تنہائی بہت ضروری ہے کیا؟" اس نے مجھے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی.... جی ہاں جناب!" میں اسے رام ہوتے دیکھ کر جلدی سے بولا۔

"یہ بتادوں میں تمھیں کہ مجھ سے کوئی نرمی کی امید نہ رکھنا' ہاں!" یہ کہتے ہوئے وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا' پھر اے ایس آئی سے مخاطب ہوا۔ "تم جب تک ان کے بیانات لو' میں اس کی بکواس سن کر آتا ہوں ابھی!" اس کے بعد ایس ایچ او نے کانسٹیبل کو ہتھکڑی کھولنے کے لیے کہا اور بولا۔ "یہ مجھ سے زیادہ جان دار نہیں ہے' بھاگے گا تو چٹنی بنا دوں گا۔"

کانسٹیبل نے ہتھکڑی کھول دی اور پھر میں ایس ایچ او لیے ہوئے اپنے کمرے میں آ گیا۔

"تشریف رکھیں۔" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"زیادہ مسکا لگانے کی ضرورت نہیں' ہاں!" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ان باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا!"

وہ ناحق اینٹھے چلا جا رہا تھا۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں کس طرح اپنی تذلیل برداشت کر رہا تھا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ جناب میرے کچھ دشمنوں نے میرے خلاف یہ سازش تیار کی ہے۔" میں نے گفتگو شروع کی۔

"تو کیا سارے محلے والے دشمن ہیں تمہارے؟ اور یہ لڑکیاں بھی جھوٹ بول رہی ہیں؟ کیا! یہی کہنے کے لیے تم مجھے یہاں لائے تھے؟" وہ لال پیلا ہونے لگا۔

"وہ لڑکیاں اپنے ہوش میں نہیں ہیں اور...."

"اچھا تو تو ایک ہوش میں ہے!" اس نے میری بات کاٹ دی۔

اس کی بار بار مداخلت' تمسخر اور ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی بات کہہ ہی دی۔

"تو جو یہ چکر چلا رہا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ میں تیری باتوں میں آ جاؤں گا تو میں اتنا بڑا بے وقوف نہیں ہوں!" وہ ساری بات سن کر کہنے لگا۔ "تیرا کہنا کہ تو کوئی عمل کر رہا ہے اور کچھ لوگ نہیں چاہتے کہ تیرا عمل پورا ہو' مگر وہ لوگ ہیں کون اور ہیں کہاں؟ میں صرف تیری بکواس پر تو یقین نہیں کر سکتا۔"

"وہ لوگ نظر نہیں آتے اور چھپ کر وار کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور بس تجھے نظر آتے ہیں؟ کیوں خواہ مخواہ مجھے غصہ دلا رہا ہے بار بار' اقبالی بیان لکھوا دے اور زیادہ ادھر ادھر اڑنے کی کوشش نہ کر!"

"اگر میں نے ایک رات بھی عمل نہیں کیا جناب تو وظیفہ الٹا ہو جائے گا اور پھر مجھے مرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔" میں التجا آمیز لہجے میں بولا۔

"تو ضرورت کیا پڑی ہے کسی کو تجھے بچانے کی! جیسی کرنی ویسی بھرنی۔"

وہ کسی طرح گھاٹ پر نہ آیا تو میں نے ایک اور داؤ آزمایا۔ "دیکھیے جناب' اگر آپ ان ساری جھوٹی باتوں کو سچ بھی مان لیں تو یہ کوئی ایسا جرم نہیں ہے کہ جس کے مجرم کی ضمانت نہ ہو سکے۔ عدالت بھی مجھے ضمانت پر رہا کر دے گی۔ میں دراصل یہ چاہتا تھا کہ...."

"ضمانت پر رہا کر دے گی کا بچہ!" وہ ایک دم بگڑ گیا۔

"آپ سنیے تو سہی! میں کچھ اور کہنا...."

"مجھے کچھ نہیں سننا اب!.... قابل ضمانت! میں بتاؤں گا تجھے کسے کہتے ہیں ضمانت! قتل عمد کی دفعہ لگاؤں گا تجھ پر تین سو دو! پھر دیکھوں گا' کیسی ہوتی ہے تیری ضمانت! اس کے علاوہ حبس بے جا میں رکھنے اور....." وہ دفعات گنوانے لگا جو مجھ پر لگائی جاسکتی تھیں' پھر بولا۔ "رگڑ کر رکھ دوں گا تجھے! سمجھ کیا رہا ہے تو اپنے آپ کو!"

میری ذرا سی غلطی نے اسے مشتعل کر دیا تھا اور مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ پہلے ہی اس سے وہ بات کیوں نہ کہہ دی جو اس پر کچھ اثر کرتی۔ بہرحال وہ بڑی خوشامد اور عاجزی سے ٹھنڈا ہوا۔ میں نے موقع پاتے ہی جو سوچا تھا نہایت نرمی کے ساتھ اس سے کہہ دیا۔

"یہ کوٹھی ہے بھی تیرے نام کہ ایسے ہی چکر دے رہا ہے؟" وہ آہستہ سے بولا۔

"میں آپ کو اس کے کاغذات دکھا سکتا ہوں۔" میں اٹھنے لگا۔ "ابھی الماری سے نکال کر....."

"اچھا اچھا!" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

اس کی ضرورت نہیں مگر....." یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگا۔

میں اپنی گلوخلاصی کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا سکتا تھا۔ میری وسیع و عریض کوٹھی کی قیمت اس زمانے میں بھی ایک لاکھ سے کم نہیں ہوگی اور یہ کوئی ایسی معمولی رقم نہیں تھی کہ ایس ایچ او سوچنے پر مجبور نہ ہو جاتا۔ نقد رقم اب میرے پاس براہ نام رہ گئی تھی اس لیے میں نے یہ بات ہی نہیں کی۔ ایس ایچ او ایسی کوٹھی میں رہنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میری نگاہ اس کے چہرے پر تھی جس سے تذبذب کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس موقع پر میں نے خاموش رہنا مناسب نہ سمجھا اور بول اٹھا۔ "صرف تین دن کی مہلت چاہیے مجھے بس میں اپنا عمل پورا کرلوں' اس کے بعد میں آپ سے کچھ نہیں کہوں گا۔ پھر آپ چاہیں مجھے حوالات میں بند کیجئے گا یا جیل بھجوا دیجئے گا۔"

میری بات سن کر وہ چونک اٹھا اور اس طرح مجھے دیکھنے لگا جیسے میں جھوٹ بھول رہا ہوں۔ "صرف تین دن!" اس نے گویا مجھ سے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں تین دن کے اندر اندر میرا عمل پورا ہو جائے گا۔ میں جلدی سے بولا۔ "پھر اور کچھ ہو تو میری زندگی خطرے میں نہیں پڑے گی۔" میں نے اسے اپنے عمل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ ہمزاد کو قابو کرنے کا عمل کر رہا ہوں اور نہ ہی اس نے تفصیل جاننا چاہی تھی۔ اسے خاموش دیکھ کر میں نے پھر التجا کی۔ "مجھے بس تین دن دے دیں' اس کے بعد آپ جو کارروائی چاہیں کیجئے گا۔"

"کارروائی تو ہو چکی ہے اور مجھے اس سلسلے میں اوپر والوں کو بھی جواب دینا ہے۔" یہ کہہ کر وہ انکار میں گردن ہلانے لگا۔ "بہت مشکل ہے یہ بات ایس پی صاحب کے علم میں ہے کہ میں یہاں چھاپہ مارنے یہاں آیا ہوں۔" یہ کہنے کے بعد وہ پھر سوچنے لگا۔ شاید پوری سروس کے دوران میں اسے اتنی بڑی رشوت کی پیش کش کبھی نہیں کی گئی ہوگی۔ چند لمحے بعد وہ مجھ سے ایک دم مخاطب ہوا' یوں جیسے اس نے سوچتے سوچتے کوئی راہ نکال لی ہو' کہنے لگا۔ "تین دن کے لیے تم فرار ہو جاؤ!"

میں نے ٹھنڈا سانس بھرا' پھر بولا۔ "یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے مجھے یہیں اسی کمرے میں رہ کر اپنا عمل پورا کرنا ہے۔"

تو پھر صبر کرو' اس کے سوا میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں اگر میں نے کوئی اور قدم اٹھایا تو میری نوکری خطرے میں پڑ سکتی ہے جو مجھے قطعی منظور نہیں۔" اس نے دو ٹوک جواب دے دیا۔ یہ کہتے ہوئے بہرحال اس کے چہرے سے افسوس کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

جس طرح گہری تاریکی میں اچانک روشنی کی کوئی کرن نظر آجائے یہی اس وقت میرے ساتھ ہوا یہ خیال ایک دم ہی میرے ذہن میں در آیا تھا۔ اس کا سبب غالباً یہ ہو کہ پہلے بھی میں اس پر عمل کر چکا تھا۔

"ایک اور راستہ بھی ہے جناب!" میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اس طرح آپ کی نوکری بھی خطرے میں نہیں پڑے گی اور میرا مقصد بھی حل ہو جائے گا۔"

"تو پھر بک دو نہ جلدی سے!" وہ منہ بنا کر بولا یقیناً وہ اس طویل گفتگو سے جھنجلا گیا تھا جس سے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔

پھر میں نے اس کے سامنے جو تجویز پیش کی اس میں رنگ چوکھا ہی چوکھا آنے کے صدفی صد امکانات تھے۔ اس نے بہت کوشش کی کہ چہرے سے اظہار نہ ہو کہ تجویز پسند آئی ہے' مگر اس کوشش میں کامیاب نہ ہوا۔ اس کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔

"چلو یہ تو ہو جائے گا' اب معاملے کی بات کرو!" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے اس لیے بولا۔ "اس کے لیے تو مجھے اور آپ کو کچہری چلنا پڑے گا پہلے تاکہ کوٹھی کی رجسٹری آپ کے نام..."

"نہیں!" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

"پھر؟" میں نے پوچھا۔

"کوٹھی میرے نام نہیں ہوگی۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا' پھر آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ "ہاں.... یہ ٹھیک رہے گا.... مگر..... خیر بعد میں اس سے بیگم کے نام کرالوں گا۔" وہ گویا بہ آواز بلند سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "تم ایسا کرو کہ فی الحال اس کوٹھی کے تمام کاغذات میرے حوالے کردو۔"

مجھے بہرحال اس کے وعدے پر ہی یقین کرنا تھا اور ہر طرح اسی کے رحم و کرم پر تھا اس لیے الماری سے کاغذات نکال کر اس کے حوالے کردیے۔ اس کا کاغذات کو موڑ ماڑ کر کسی طرح اپنی پینٹ کی جیب میں ٹھونس لیا اور پھر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب تم سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو کہ میں کیا کرتا ہوں! بہرحال تمہارا کام ہو جائے گا۔" اس نے مجھے یقین دلایا۔

"بس یہی چاہئے مجھے جناب!" میں نے اس پر اعتماد کا اظہار کیا۔

وہ مجھے اپنے ساتھ لیے دوبارہ نشست گاہ میں آگیا۔ اس وقت تک اے ایس آئی میری ملازماؤں کے بیانات لے چکا تھا۔ اس نے اپنے افسر کو اور مجھے بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ وہ بھی اس تحیلی کا چٹا بٹا تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا شاید کچھ نہ کچھ سودے بازی ہوگئی ہے ورنہ اتنی دیر نہ ہوتی۔

"دیکھو ان لڑکیوں کو ڈاکٹری کے لیے اسپتال بھجوانا ہے۔" ایس ایچ او نے اے ایس آئی کو حکم دیا تو اس کے چہرے پر لحہ بھر کو حیرت نظر آئی اور پھر وہ "یس سر" کی گردان کرنے لگا۔ غالباً اس کے نزدیک یہ حکم اس بات کی دلیل تھا کہ میرے اور اس کے افسر کے درمیان معاملہ طے نہیں ہوسکا۔ دوسرا حکم اس نے یہ دیا کہ مجھے ہتھکڑی پہنادی جائے۔ اب تو گویا کوئی شک ہی نہیں رہا تھا کہ بات نہیں بنی۔

پھر کچھ ہی دیر بعد یہ سارا قافلہ' تھانے کی طرف جارہا تھا' میری کوٹھی کو مقفل کردیا گیا تھا اور چابیاں پولیس کی تحویل میں تھیں۔ اس بات کا علم صرف مجھے اور ایس ایچ او کو تھا کہ عقبی پھاٹک' عمارت کے عقبی دروازے اور میرے کمرے میں پڑے ہوئے تالوں کو چابیاں خاموشی اور رازداری کے ساتھ میری جیب میں پہنچ چکی تھیں۔

تھانے پہنچ کر مجھے حوالات میں بند کردیا گیا۔ اس سے پہلے ایس ایچ او کے حکم پر حوالات کی اس کوٹھری کو صاف کردیا گیا تھا اور اوڑھنے بچھانے کے لیے مجھے دو کمبل بھی فراہم کردیے گئے تھے' اس کے علاوہ ایک لوٹا اور مصلٰی بھی فراہم کردیا تھا۔ اب میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں رہا تھا اس لیے آرام سے کمبل زمین پر بچھا کر لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا

اس لیے میرا سونا بہت ضروری تھا اور اب سونا ہی چاہتا تھا۔ آنکھ لگنے والی تھی کہ میں نے حوالات کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور چونک کر چہرے سے کمبل ہٹایا۔ ایک سپاہی' دروازہ کھول رہا تھا۔

"چلو اٹھو' ایس پی صاحب کے پاس طلبی ہے تمہاری!" سپاہی نے مجھ سے کہا۔

میں ذرا گھبرایا اور اس سے پوچھا۔ "ملک صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ بھی بڑے صاحب کے کمرے میں ہیں۔" سپاہی نے بتایا۔

"اچھا۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ بات مجھے پہلی بار معلوم ہوئی تھی کہ ایس پی بھی اسی تھانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس تھانے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی ایس پی کا کمرہ تھانے کی عقبی سمت میں تھا۔ میں سپاہی کے ہمراہ وہاں تک پہنچ گیا۔ بڑی سی میز کے پیچھے بڑی سی کرسی پر وہ دہان پان سا عمر رسیدہ باوردی شخص بیٹھا تھا۔ چہرے مہرے سے وہ بنگالی معلوم ہوتا تھا اور رنگ سے بھی' آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک اور اس کے چہرے سے سختی کا اظہار ہوتا تھا۔ میز کے سامنے اور دائیں بائیں کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دائیں جانب ایک کرسی پر ایس ایچ او ملک بیٹھا ہوا تھا۔ سپاہی نے مجھے سامنے لے جا کر کھڑا کردیا تو ایس پی نے اپنی عینک نیچے سرکاتے ہوئے اس کے اوپری حصے سے بہ غور مجھے دیکھا' پھر ٹوٹی پھوٹی اردو میں گویا منمنایا۔ "تم سالا لوگ اور گوڑ بڑ گھٹالا کرتا! تمہارے خلاف اتنا سارا رپوٹ ہے! ام تم کو اسی لیے اور دیکھنے کو بلایا۔ ابی بولو تم اسے سب کچ کیوں کرتا؟"

"یہ کیا بولے گا سر!" ایس ایچ او بول اٹھا۔ "اسے تو میں فرفر بولنے پر مجبور کردوں گا!" یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے کچا چبا جائے گا۔

"اس کا بیان دیا ہے؟" ایس پی ایس ایچ او سے پوچھا۔

"یہ لوگ اتنے سیدھے نہیں ہوتے سر ان کی تو کھال ادھیڑنا پڑتی ہے' جب قبولتے ہیں سب کچھ!"

"فر تم ادیڑو اس کا کھال مالک! ام کو آئی جی صاحب بی فون پر بولا کہ اور گول مال نئیں مانگتا۔!"

دو چار روز تو لگیں گے نا سر' اسے سیدھا کرنے میں۔" ایس ایچ او نے کہا۔

"اتا روز؟"

"سر! اس نے تو ہر بات سے انکار کردیا ہے' کچھ مان کر ہی نہیں دیتا۔"

"تم کیسا پولیس والا اے! ام جوان تھا تو دو منٹ نائیں لگتا تھا جو بان کھلوانے میں!"

"آپ کی کیا بات ہے سر!" ایس ایچ او' ایس پی کو بانس پر چڑھانے لگا۔ "ہم لوگ تو ابھی آپ کے سامنے طفلِ مکتب ہیں۔"

ایس پی کے مرجھائے ہوئے اور چرمرے سے چہرے پر رونق سی آگئی' مگر دوسرے ہی لمحے وہ پوچھ بیٹھا۔ "یہ تم طفل مکتب کیا بولا؟"

"اسکول کے بچے سر!" ایس ایچ او نے وضاحت کی۔

"اے مالک! ام تم کو کئی بار بولا! اتنا گاڑا اکسپیم کا اُردو اور نہ چلاؤ پر تم سمجھتا نئیں!" ایس پی نے گویا سرزنش کی۔

"آئندہ خیال رکھوں گا سر!" ایس ایچ او سعادت مندی سے کہا

اس کے بعد ایس پی نے مجھ پر انتہائی سختی کے احکام دے کر گویا اجلاس برخاست کر دیا۔ سپاہی نے مجھے لا کر پھر حوالات میں بند کر دیا۔ میں ذہن سے ہر خیال کو جھٹک کر دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا اور جلد ہی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ دوبارہ آنکھ اس وقت کھلی جب سپاہی نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ میں اتنی ہی گہری نیند سویا تھا کہ حوالات کا دروازہ کھلنے سے بیدار نہیں ہوا تھا اور نہ سپاہی کے آوازیں دینے سے جاگا تھا۔ سپاہی سے معلوم ہوا کہ اس مرتبہ ایس ایچ او کے پاس میری طلبی ہے۔

"ٹھہرو ذرا میں منہ دھو لوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے انگڑائی لے کر کہا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ایس ایچ او نے اپنے عملے کو میرے سلسلے میں خصوصی ہدایات ضرور دی ہوں گی' کسی قسم کی سختی نہ کی جائے۔ کم از کم اس حد تک تو وہ "حق نمک" ادا کر ہی سکتا تھا۔

میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ سپاہی نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ دوپہر ہو رہی تھی اس لیے میں نے صرف منہ دھونے کی بجائے وضوع کر لیا تاکہ ظہر کا وقت قریب ہو تو لوٹ کر نماز بھی پڑھ لوں۔

ایس ایچ او کے ساتھ وہ گویا میری "کلوز ڈور میٹنگ" تھی۔ کمرے میں اس کے اور میرے سوا کوئی نہیں تھا اور دروازہ بھی بند کر دیا گیا تھا۔ اس نے اپنے عہدے اور تعلقات سے فائدہ اٹھا کر تمام کاغذات مکمل کرا لیے تھے اور مجھے کچہری جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ ان کاغذات کے مطابق اب سے دو ماہ قبل میں نے گویا کسی ظفر حمید کو ستر ہزار روپے کے عوض اپنی کوٹھی فروخت کی تھی۔ وہ بہت سیانا تھا اس لیے دو ماہ قبل کی تاریخ لکھوائی تھی۔ ظفر حمید اس کا سالا' بھائی یا کوئی بہت قریبی عزیز ہی ہو سکتا تھا۔ جس پر اسے پورا اعتماد ہو گا اور بعد میں اس سے کوٹھی کو اپنے یا اپنی بیوی کے نام کروا سکے گا۔ میں نے اسی لیے ظفر

حمید کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا کہ یہ کون ہے؟ کہاں اس نے کہا۔ میں نے اپنے دستخط کر دیے۔

میں نے ان کاغذات پر دستخط کر دیے تو اس نے اپنی میز کی دراز سے مزید کچھ کاغذ نکالے' پھر ایک کاغذ میرے سامنے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اس پر بھی دستخط کر دو۔"

وہ ظفر حمید اور میری درمیان کرائے نامے کا معاہدہ تھا۔ اس کی رو سے میں نے تین ماہ کے لیے گویا اپنی ہی کوٹھی کا عقبی حصّہ کرائے پر لیا تھا۔ بس یہیں وہ غچہ کھا گیا تھا۔ لمحے بھر کو میں نے سوچا کے اچھا ہے۔ آئندہ یہ معاہدہ میرے ہی حق میں کام آئے گا' مگر اسی کے ساتھ یہ بات بھی میرے ذہن میں آئی کہ جو کچھ میں نے سوچا ہے' خود اس کے ذہن میں بھی آ سکتا ہے۔ پھر وہ مجھ سے دوسرے معاہدے پر دستخط کرا لے گا اور معاہدہ پھاڑ دے گا۔ اس کے علاوہ کوئی اور بھی اسے یہ نکتہ سمجھا سکتا تھا۔ ایسی صورت میں اس کی مزید ہمدردی اور تعاون حاصل کرنے کے لیے خود مجھے غلطی کی نشان دہی کر دینا چاہیے۔ یہی سوچ کر میں نے اس سے سوال کیا۔ "یہ ظفر حمید صاب آپ کے کون ہیں۔"

"کیوں؟" اس کی تیوریوں میں بل پڑ گئے۔ "تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے! تم بس دستخط کر دو۔"

"کوئی وجہ تھی جو میں نے یہ سوال کیا تھا جناب!"

"تم مجھ سے زیادہ قانون نہیں جانتے!" وہ اینٹھ گیا" یہ قانونی معاملات ہیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گے' دستخط کرو تم!"

"دستخط کرنے سے مجھے انکار نہیں' لیکن یہ عرض کر دوں کہ تھوڑی بہت مجھے بھی قانون کی شدبد ہے۔ آپ نے یہ کرایہ نامہ اسی لیے تو لکھوایا ہے کہ کوٹھی فروخت کر دینے کے بعد وہاں میرے قیام کو جواز فراہم کر سکیں؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"ہاں..... پھر؟" اس کے چہرے کا تناؤ بہ دستور قائم رہا۔ "اسی لیے تو میں دستخط نہیں کر رہا۔"

"میری سمجھ سے باہر ہے کہ تم نے کوٹھی فروخت کرنے کے کاغذات اور رقم کی وصولی کی رسید پر تو بغیر کسی حجر مجر کے دستخط کر دیے اور اب کرائے نامے پر دستخط کرتے ہوئے چالاکی دکھا رہے ہو؟ آخر اس سے میں کیا سمجھوں!"

میرا جی چاہا کہ وہ خود پھنس رہا ہے تو اسے پھنس جانے دوں' مگر پھر نظر انداز کر گیا۔

بعد میں اسے بھی میں ناکوں چنے چبوانے کا ارادہ تو کر چکا تھا‘ لیکن اس کے ہزار رستے ہو سکتے تھے۔ وہ میری ایک جھپٹ کا نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے میری عزّت نفس پر شدید ضربیں لگائی تھیں اور بہت مجروح کیا تھا‘ لیکن یہ اور وقت تھا۔ اس وقت مجھے اس کے تعاون کی ضرورت تھی۔ یہی سوچ کر میں نے کہا۔ ”آپ غلط سمجھ رہے ہیں جناب! میں کوئی چالاکی نہیں دکھا رہا بلکہ آپ کو مشکلات سے بچانا چاہتا ہوں۔“

”مجھے تم مشکلات سے بچانا چاہتے ہو‘ تم!“ اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ ”تم تو اس وقت خود میرے رحم و کرم پر ہو۔“

”آپ بجا فرما رہے ہیں۔“ میں نے اپنے غصّے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”مگر ظاہر ہے کہ یہ ظفر حمید صاحب آپ کے کوئی قریبی عزیز ہی ہوں گے۔“

”ہیں پھر؟ تمہیں اس سے کیا غرض؟“

”غرض یہ ہے کہ آپ ان کے ساتھ اچھا نہیں کر رہے یا پھر معاملے کو سمجھ نہیں رہے۔“ یہ کہہ کر رکے بغیر میں مزید بولا۔ ”کرائے نامے کے معاہدے کی رو سے مجھے گزشتہ دو ماہ سے کوٹھی کا نصف عقبی حصّہ کرائے پر دیا گیا ہے جب کہ پولیس کے ریکارڈ میں یہ بات محفوظ ہے‘ پوری کوٹھی میرے تصرف میں رہی ہے۔ گزشتہ دنوں میرے خلاف جو رپورٹس تھانے میں کی گئیں ان سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ اگر انہیں بھی نظرانداز کر دیا جائے تو مجھ پر جو یہ نیا کیس قائم ہوا ہے‘ اس کی ذمے داری بھی ظفر حمید کے سر آجاتی ہے کیوں کہ معاہدے کی رو سے میں صرف کوٹھی کے عقبی حصّے پر....“ میں نے اسے پوری وضاحت سے ساری بات سمجھا دی۔

وہ میرا استدلال سن کر چونک اٹھا‘ پھر بولا۔ ”تم تو واقعی بہت دور کی کوڑی لائے۔ ایسی صورت میں پوری کوٹھی تمہارے ہی تصرف میں ہونا چاہئے۔ ٹھیک کہتے ہو تم! خیر میں دوسرا معاہدہ لکھوا لوں گا۔“ پھر وہ غالباً اپنی خفت مٹانے کے لیے بولا۔ ”بات دراصل یہ تھی کہ میں کل ہی تمہاری کوٹھی میں منتقل ہو جانا چاہتا تھا۔ صحن اور عقبی حصّے کے درمیان جو دروازہ ہے‘ برآمدے کے بعد اسے میں بند کر دیتا۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ کم از کم تین دن تو تمہیں عقبی حصے میں رہنا ہی ہے‘ پھر یہ کہ اس دوران میں وہاں جو واقعات ہوئے ہیں ان کی ذمے داری تم ہی پر ہے۔ یہی سوچ کر....“

اور پرانی تاریخ میں اس لیے کوٹھی خریدنے کے کاغذات تیار کرائے ہیں کہ رشوت کی لین دین پر پردہ پڑا رہے۔ میں نے یہ سوچا تو ضرور مگر منہ سے نہ کہا۔ میں تو اس وقت اپنے

ہی چکر میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے اپنے گردن کے زخم کا خیال آگیا تھا جس کی ڈریسنگ روزانہ ضروری تھی۔ میں نے اپنا یہ مسئلہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ کوئی مسئلہ نہیں۔“ وہ نرمی سے بولا۔ ”صبح میں کسی سپاہی کی ڈیوٹی لگا دوں گا۔ وہاں کہ اس ڈاکٹر کو یہاں تھانے لے آئے۔ وہ روز یہیں تمہاری ڈریسنگ کر جایا کرے گا۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیے ورنہ جب تم پر کیس چلتا تو عدالت میں یہ نکتہ بھی اٹھایا جا سکتا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”واقعی تم نے مجھے ایک مشکل سے بچا لیا۔“ پھر کہنے لگا۔ ”ویسے اس کا جواز بھی پیش کیا جا سکتا تھا کہ تمہیں کرائے پر تو صرف کوٹھی کا عقبی حصّہ دیا گیا تھا‘ لیکن تم ناجائز طور پر پوری کوٹھی کو استعمال کر رہے تھے کیوں کہ وہ خالی تھی۔ اس کے باوجود یہ زیادہ بہتر ہے کہ کرائے نامے کے معاہدے میں ترمیم کر دی جائے۔ تین ماہ کی بجائے مدت دو ماہ لکھی جائے اور عقبی حصّے کی بجائے پوری کوٹھی کا کرائے نامہ ہو۔“

”مگر یہ جو تین دن ہیں!“ میں نے اعتراض کیا۔

”کیوں‘ کیا کوئی قانونی طور پر اس کا مجاز نہیں اپنے گھر میں کتنی ہی مدت کے لیے کسی کو بغیر کرایہ وصول کیے رکھ سکے!“ وہ بری عیّاری سے بولا۔

میں سمجھ گیا کہ اس طرح وہ مجھ پر اپنی بالادستی قائم رکھنا چاہتا ہے۔ میں اسی لیے مزید کچھ نہیں بولا۔ اس کے بعد ”کوزڈور میٹنگ“ ختم ہو گئی۔ مجھے پھر حوالات میں پہنچا دیا گیا۔

نماز کے اوقات کو چھوڑ کر میں نے وہ دن سوتے ہوئے ہی گزرا۔ عشاء کے بعد ہی حوالات کے اندر جو بلب روشن تھا‘ اسے دانستہ بجھا دیا گیا۔ اس سپاہی کی ڈیوٹی بھی بدل گئی تھی جو حوالات کے سامنے دن بھر پہرا دیتا رہا تھا۔ بالآخر وہ وقت آہی گیا جس کا مجھے بہت بے چینی سے انتظار تھا۔ ٹھیک گیارہ بجے رات کو سپاہی نے بہت احتیاط اور آہستگی کے ساتھ حوالات کا دروازہ کھول دیا۔ اس سے پہلے سپاہی نے برآمدے کی روشنی بھی گل کر دی تھی۔ میں نے اپنے چہرے کا بڑا حصّہ کمبل میں چھپا لیا تھا۔ نہ سپاہی کچھ بولا نہ میں نے اس سے کچھ کہا۔ خاموشی کے ساتھ میں حوالات سے نکل کر تھانے کے عقبی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ یہ تمام معاملات پہلے ہی ایس ایچ او سے طے ہو چکے تھے۔

تھانے سے نکلتے ہی مجھے عقب میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی‘ مگر میں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری نگرانی کی جا رہی ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ میں فرار نہیں ہو سکتا‘ ایس ایچ او کو اپنی نوکری عزیز تھی۔ پولیس کسٹڈی سے کسی ایسے مجرم یا ملزم کا

فرار ہو جانا جس کی گرفتاری کا علم اعلیٰ حکام کو بھی ہو' ایس ایچ او کی نوکری کو خطرے میں ڈال سکتا تھا۔ غالباً" یہی سوچ کر اس نے میری نگرانی کا فیصلہ کیا تھا اور خود مجھے بھی اس کا اندازہ تھا۔ گرفتاری سے پہلے اگر میں فرار ہو جاتا تو اس کے ذمے داری ایس ایچ او پر نہ آتی۔ لیکن اب میں اس کی تحویل میں تھا۔ میرے فرار کے صورت میں اس سے جواب طلب کیا جا سکتا تھا۔

میں کسی قسم کی عجلت کا مظاہرہ کیے بغیر سکون کے ساتھ اپنی کوٹھی کے عقبی پھاٹک تک پہنچ گیا۔ میں اس دوران میں قرآنی آیات کا ورد کرتا رہا تھا۔ کہ میرے لیے پناہ وہیں تھی۔ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ اپنی کوٹھی سے باہر میں قطعی غیر محفوظ ہوں۔ میرے ساتھ کوئی بھی ایسا واقعہ پیش آ سکتا ہے کہ اپنی کوٹھی تک نہ پہنچ سکوں۔

عقبی پھاٹک کا قفل کھول کر میں اندر پہنچا اور اسے احتیاطاً" اندر سے مقفل کر دیا۔ پھر ایسا ہی میں نے عمارات کے عقبی دروازے کو کھولنے کے بعد کیا۔ اب گویا میں اپنی دانست میں محفوظ تھا۔

اپنا کمرا کھول کر میں نے ضروری سامان نکلا اور ہمزاد کے لیے روٹی ڈالنے لگا۔ اس میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ عمل کا وقت اب قریب آتا جا رہا تھا۔ میں نے لباس تبدیل کر لیا۔ ہر طرف اس وقت گہرا سکوت طاری تھا۔ اب تو وہاں شمبھو بھی نہیں تھا۔ کم از کم میرا قیاس یہی تھا۔ وہ سریتا کو اپنے ساتھ لے کر جانے کہاں چلا گیا تھا! جب تک میرا عمل پورا نہ ہو جاتا اور ہمزاد دوبارہ میرے قابو میں نہ آ جاتا' شمبھو اور سریتا کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ سریتا پر بہرحال ظلم ہوا تھا اور اس ظلم کے ذمے دار میں تھا۔ میں اگر اسے تحفظ دینے کے قابل ہوتا تو شمبھو کی گرفت میں نہ آتی۔ اس سے قطع نظر یہ بات میرے ذہن میں اب کھٹک رہی تھی کہ شمبھو وہاں سے فرار کیوں ہوا؟ کیا وہ بھی یہ چاہتا تھا کہ میرا عمل پورا نہ ہو! وہ تو پہلے پوری کوٹھی پر قبضہ کرنا چاہتا تھا' پھر اس نے اپنا ارادہ کیوں بدل دیا؟

ان سوالوں نے اب مجھے ایک اور ہی نہج پر سوچنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ حالات و واقعات کسی اور ہی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ سریتا کی تلاش میں شمبھو کا اتنے عرصے بعد میری کوٹھی تک پہنچ جانا' پھر انہی دنوں میں جب کہ میں ہمزاد کا عمل کر رہا تھا' بے معنی نہیں تھا۔ "شمبھو اب سے پہلے سریتا کی تلاش میں کیوں کامیاب نہیں ہو سکا تھا؟" میں بے خیالی میں بڑبڑانے لگا۔

اس وقت پونے بارہ بج رہے تھے اور مجھے ٹھیک بارہ بجے عمل شروع کرنا تھا اس لیے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا۔

عین اسی وقت میری سماعت سے ایک زہریلا قہقہہ ٹکرایا اور میں تقریباً اچھل پڑا۔ سامنے ہی دیوار کے قریب مجھے اپنی جان مہ پارہ کا چمکیلا ہیولا نظر آ رہا تھا۔

"شیخ! تم آخر اصل معاملے کی تہ تک پہنچ ہی گئے۔" ہیولے کے لب ہلے۔ "میں بتاتی ہوں تمھیں کہ شمبھو کو میں نے ہی یہاں تک پہنچایا ہے ورنہ اپنی تمام قوتوں کے باوجود وہ کبھی سریتا کو تلاش نہ کر پاتا' مگر اس وقت میں تمھیں یہ بتانے نہیں آئی تھی۔ میں تمہیں ایک اور خوش خبری سنانے آئی تھی!" اس کے لہجے میں بڑی چبھن تھی۔ "مجھے اعتراف ہے کہ تم نے اب تک انتہائی خود اعتمادی اور ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ تمہاری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو اب تک میرے سامنے ٹک نہ پاتا' مگر اس کے باوجود تمہاری حیثیت میرے سامنے ایک حقیر کیڑے کی سی ہے۔ بالآخر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہوں۔ اب میری رُوح کو قرار آ جائے گا۔ شاید اب مجھے تمہارے پاس آنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ تم خود میرے پاس آ چکے ہو گے! کیوں کہ یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہے!"

پھر اس سے پہلے کہ مہ پارہ سے میں کوئی سوال کرتا' کچھ کہتا اس کا ہیولا غائب ہو گیا۔

"میری زندگی کی آخری رات!" میں بے چینی کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔

میرے اضطراب میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اب رات کے بارہ بجنے میں صرف چند منٹ رہ گئے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں یہی چند منٹ تو فیصلہ کن نہیں ہیں؟ کیا آج عمل شروع کرنے سے پہلے میری زندگی کا چراغ گل ہو جائے گا؟



الجھی ہوئی ساری گتھیاں ایک ایک کر کے سلجھ گئی تھیں۔ پس پردہ کون تھا' ظاہر ہو چکا تھا۔ کچھ دیر پہلے مہ پارہ خود اعتراف کر چکی تھی کہ اسی نے شمبھو کو میرے پیچھے لگایا تھا۔ اپنی مقصد براری کے لیے وہ شمبھو کو اشاروں پر نچا رہی تھی۔ شمبھو کے سامنے وہ کھل کر آئی تھی یا نہیں' فی الحال میں اس سے لاعلم تھا' مگر یہ سارے مسئلے بعد کے تھے۔ اس وقت تو میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ میرے نزدیک مہ پارہ کی دھمکی بے معنی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ یہ میرے زندگی کی آخری رات ہے۔ یقیناً وہ مجھ پر اپنا کوئی آخری حربہ آزمانا چاہتی تھی' ایسا حربہ کہ میری اب تک کی ریاضت پر پانی پھر جائے۔ دھمکیاں وہ پہلے بھی دیتی رہتی تھی لیکن اس بار صورت حال کچھ مختلف نظر آ رہی تھی۔

ایک ایک لمحہ مجھ پر عذاب بن کر گزر رہا تھا کہ جانے کب کیا ہو جائے! عمل شروع کرنے سے پہلے میرے لیے ذہنی یکسوئی ضروری تھی۔ میں نے اسی لیے' یعنی اطمینان قلب کی خاطر قرآنی آیات کا ورد شروع کر دیا۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ شدید ہیجانی کیفیت میں کلام الٰہی سے میرے دل کو سکون آ گیا تھا۔ اس وقت بھی مجھے مایوسی نہیں ہوئی' میں نے ہر خطرے کو ذہن سے جھٹک کر خدا سے لو لگا لی۔

میرا یہ قیاس غلط ثابت ہوا کہ عمل شروع کرنے سے پہلے ہی میری زندگی کا چراغ گل کر دیا جائے گا کیوں کہ اب ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔ میں حصار کھینچ کر ہمزاد کا عمل شروع کر چکا تھا۔

میں نے پڑھا تھا کہ خدا' آدمی کے ظاہر کو نہیں' باطن کو دیکھتا ہے۔ جگہ جگہ ہر معاملے میں آدمی کی نیت پر زور دیا گیا ہے' وضو کے لیے نیت' نماز کی نیت' روزے کی نیت' کار خیر کی نیت وغیرہ! کچھ دن قبل میری نیت مختلف تھی' لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی۔ اب میرے دل سے کھوٹ دور ہو چکا تھا۔ تسخیر ہمزاد کا مقصد اپنی زندگی کے تحفظ کے سوا کچھ نہیں

ا اور خدا نے بھی زندگی کے تحفظ کا حکم دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ خود غرضی نہیں' خدا کے م کی تعمیل تھی۔ جب آدمی کی نیت صاف ہو تو یوں بھی خدا اسے ہمت دے دیتا ہے۔ آدمی ت کرتا ہے تو خدا اس کی مدد کرتا ہے۔ ایسے میں شر کی قوتیں اس کا راستہ ضرور روکتی ہیں' ر خیر میں بڑی قوت ہے۔ خیر یقیناً شر کے مقابل بالآخر فتح یاب ہوتا ہے۔ آج کی رات ہمزاد کا ل شروع کرتے ہوئے میرے ذہن میں یہی خیالات تھے۔ میں نہایت سکون قلب کے ساتھ ل کا ورد کر رہا تھا۔

رات کے آخر ہوتے ہوتے وہ واقعہ پیش آ ہی گیا جس کی مجھے توقع تھی' مگر اس قدر یں! میں نے اتنی تباہی کا تصور بھی نہیں کیا تھا اور میرا زندہ بچ جانا واقعی حیرت کی بات تھی۔ مگر ے اللہ رکھے' اسے کون چکھے۔

ہوا یوں کہ عمل کے آخری لمحات میں اچانک ایک زبردست دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا یقیناً دوق کی گولی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سے میرے کان جھنجھنا گئے تھے اور لمحے بھر کو یوں گا تھا جیسے میرے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہوں۔ ابھی چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ وسرا خوف ناک دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا مجھے نسبتاً" قریب محسوس ہوا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کمرے کی دیواریں مجھ پر آ رہیں گی۔ ایسے میں حواس پر قابو رکھنا انتہائی مشکل مرحلہ تھا۔ یہ ین ممکن تھا کہ بے حواسی میں عمل کا ورد چھوٹ جاتا' مگر ایسا نہیں ہوا۔ نہ میں نے عمل کا ورد چھوڑا نہ کسی طرف دیکھا۔ میری نگاہ سامنے دیوار پر جمی رہی جہاں میرا سایہ پڑ رہا تھا۔ ان چند لحوں کے دوران میں مجھے لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی سنائی دیں جو یقیناً انہی دھماکوں کا رد عمل تھیں۔

میں ایک زمانے میں انگریزوں کے خلاف چلنے والی ایک زیر زمین تحریک سے بھی وابستہ رہ چکا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب برصغیر کو آزادی نہیں ملی تھی۔ میں اپنی سرگزشت کے پہلے حصے میں تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر کر چکا ہوں۔ یہاں یہ ذکر یوں آ گیا کہ ان دھماکوں نے مجھے برسوں پہلے کی یاد دلا دی تھی۔ یقیناً یہ دستی بموں کے دھماکے تھے۔ اس سے قطع نظر کہ یہ حرکت کس کی تھی' یہ امر یقینی تھا کہ ان سے بڑی تباہی پھیلی ہو گی۔ میری کوٹھی کا شاید ہی کوئی حصہ سلامت بچا ہو' میں یہ سوچتا ہوا اپنا عمل ختم ہونے پر حصار سے باہر آ گیا اور اپنے کمرے کی دیواروں پر نگاہ ڈالی۔ دیواروں میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ ان دستی بموں سے میرے کمرے کے محفوظ رہ جانے کا سبب' اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ ابھی میری زندگی کے دن پورے نہیں ہوئے تھے۔ خدا مجھے دشمن کے حملے سے بچانا چاہتا تھا ورنہ تو

میری زندگی ختم ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی تھی۔ حالات کیوں' کیسے اور کس طرح پیش آئے ہوں گے' اس کے لیے مہ پارہ نے کسے آلہ کار بنایا ہو گا؟ یہ ساری باتیں بعد میں سوچنے کی تھیں۔ اس وقت تو مجھے کچھ اور ہی فکر تھی۔ مجھے عمل کی شرط کے مطابق قریبی چوراہے پر روٹی کو رکھنا تھا اور بقیہ ضمنی شرائط پوری کرنا تھیں۔ چوراہے تک پہنچتے ہوئے مجھے کسی سے گفتگو نہیں کرنا تھی' پھر واپسی میں چالیس قدم تک اسی پر عمل کرنا تھا اور اس دوران میں آتے جاتے مڑ کر بھی نہیں دیکھنا تھا۔ اس کے بعد مجھے سیدھے تھانے پہنچنا تھا۔ جسم پر مختصر لباس کی قید صرف حصار کے اندر تک تھی اس لیے میں نے پورا لباس پہن لیا کیوں کہ مجھے اب یہاں واپس نہیں آنا تھا۔

میں روز جس راستے سے قریبی چوراہے تک جاتا تھا' آج بھی مجھے وہی راستہ اختیار کرنا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ روٹی ہاتھ میں لیے اپنے کمرے سے نکلا تو مجھے اصل تباہی کا اندازہ ہوا۔ میری کوٹھی کھنڈر میں تبدیل ہو گئی تھی۔ کہیں ملبا تھا' کہیں ٹوٹی ہوئی دیواریں! صرف وہی کمرا پوری طرح سلامت تھا جہاں میں عمل کر رہا تھا۔ میں ملبے کے درمیان سے گزرتا ہوا آگے بڑھا تو دور ہی سے مجھے لوگوں کا ہجوم نظر آگیا۔ یقیناً یہ محلے پڑوس والے تھے جو دھماکوں کی آوازیں سن کر وہاں جمع ہو گئے تھے۔ کچھ درخت گرنے سے رہ گئے تھے' میں ان کی آڑ لیتا ہوا اپنی راہ ہو لیا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ کسی کی نگاہ مجھ پر نہ پڑے۔ معلوم نہیں میں اپنی اس کوشش کی تھی کہ کسی کی نگاہ مجھ پر نہ پڑے۔ معلوم نہیں میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا' لیکن کسی نے نہ مجھے روکا نہ ٹوکا' نہ غالباً میری طرف اشارہ کیا۔ اس کا ایک سبب شاید یہ بھی تھا کہ وہ لوگ منتشر نہیں تھے بلکہ ایک ہی جگہ جمع تھے۔ پھر یہ کہ ابھی اندھیرا ہی تھا۔ میں ہجوم سے بچ کر گزر گیا تھا۔

چوراہے پر روٹی رکھ کر تھانے کے عقبی حصے تک پہنچتے ہوئے مجھے کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ عقبی پھاٹک پر گزر کر میں دبے پاؤں حوالات کی طرف بڑھ گیا۔ تھانے میں مجھے اس وقت غیر معمولی نقل و حرکت نظر آئی اور میں اس کی وجہ سمجھ گیا۔ تھانہ میری کوٹھی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یقیناً دھماکوں کی آوازیں وہاں تک بھی پہنچی ہوں گی۔ حوالات کے باہر برآمدے کا بلب ابھی تک بجھا ہوا تھا' مگر قریب پہنچ کر میں نے اس سپاہی کے ہیولے کو محسوس کر لیا۔ جس نے بغیر کچھ کہے میرے لیے حوالات کا دروازہ کھول دیا تھا۔ میں نے جیسے ہی حوالات کے اندر قدم رکھا' اس نے آہنی دروازہ بند کر دیا۔ یوں جیسے وہ میرا ہی منتظر تھا۔

حوالات کے اندر پہنچ کر جیسے میرے ذہن کا سارا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ میں ایک سخت

آزمائش سے گزر کر بہرحال اپنی منزل تک پہنچ گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے نماز فجر ادا کی اور پھر زمین پر بچھے ہوئے کمبل پر دراز ہو گیا' لیکن نیند ابھی آنکھوں سے اوجھل تھی۔ گزرے ہوئے سنسنی خیز لمحات کے تصور کو فوری طور پر اپنے ذہن سے جھٹک دینا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اب میرے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں تھا کہ میری دشمن جاں مہ پارہ کی دھمکی بے سبب نہیں تھی۔ اس نے اپنی دانست میں میری موت کا پورا بندوبست کر دیا تھا۔ خود میں بھی ایک بار تقریباً ایسا ہی حربہ اس پر استعمال کر چکا تھا' مگر وہ بھی بچ گئی تھی اور میں بھی زندہ تھا۔ میری اور اس کی ٹکر تقریباً برابر کی تھی۔ ہاں ان دنوں صورت حال مختلف تھی۔ ایک بھٹکی ہوئی روح کے شر سے بچنا نسبتاً مشکل کام ہوتا ہے۔

اب عمل پورا ہونے میں صرف دو ہی راتیں تو رہ گئی ہیں' اس کے بعد میں ہمیشہ کے لیے مہ پارہ کی روح کے شر سے آزاد ہو جاؤں گا۔ میں نے اپنے دل کو تسلی دی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی اور پھر میں خود نہیں جاگا۔ مجھے بیدار کرنے والا ایک سپاہی تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"صاحب کے پاس پیشی ہے تمہارا؟" سپاہی نے میری سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔

تھانے کے صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے اندازہ لگایا کہ دن خاصا چڑھ چکا ہے۔ آنکھوں کی جلن اور بوجھل ذہن بتا رہا تھا کہ میں زیادہ دیر نہیں سو سکا۔ منہ پر پانی کا چھپکا مار کر کمبل سے منہ پونچھتا ہوا میں' سپاہی کے ساتھ ہو لیا۔

ایس ایچ او ملک کے پاس اس کے کمرے میں ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ایس ایچ او نے اس ادھیڑ عمر شخص کو مخاطب کیا۔ "اچھا عثمانی صاحب' میں کوشش کروں گا کہ آپ کا کام ہو جائے' مگر وعدہ نہیں کرتا۔ دراصل اس وقت میں ایک اہم کیس ڈیل کر رہا ہوں۔ آپ دو ایک دن بعد پھر مجھ سے مل لیجیے گا"۔

ادھیڑ عمر شخص غالباً سمجھ گیا کہ اس وقت ایس ایچ او اس سے مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتا اس لیے وہ "بہت بہت شکریہ"۔ کہتا ہوا اٹھ گیا۔

وہ شخص کمرے سے نکلا تو ایس ایچ او نے سپاہی کو ہدایت دی۔ "اب کسی کو اندر نہیں آنے دینا! سمجھ گئے؟"

"جی صاحب!" سپاہی نے فرماں برداری سے سر ہلایا اور مڑ گیا۔

"دروازہ بھیڑتے جانا!" ایس ایچ او نے ہانک لگائی۔

سپاہی نے باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ میں اب تک اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ سا تھا کہ اس نے کیوں بلایا ہوگا! لیکن خاصی دیر وہ کچھ نہیں بولا' بس مجھ اپنی گول گول آنکھیں گھما کر گھورتا رہا۔ اس نے مجھ بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ اس کا رویہ میرے لیے الجھن آمیز تھا۔ میں اسی لیے بولے بغیر نہ رہ سکا۔ "کیا بات ہے جناب' جناب...... آپ کچھ ناراض...."

"ناراض کا بچہ!" وہ جیسے ایک دم پھٹ پڑا۔

"مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے جناب"؟ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں!" اس نے یہ کہہ کر ہونٹ بھینچ لیے' پھر پھنکارا۔ "غلطی تو مجھ سے ہوئی ہے کہ تیری جھوٹی سچی باتوں پر یقین کر لیا میں نے"! یہ کہہ کر اس نے گہرا سانس لیا۔

"میں کچھ بھی نہیں سمجھا جناب"!

"سمجھاؤں گا تو میں تجھے"! اس کی ناک کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا تھا تو نے کہ تیرا تعلق کسی تخریب کار گروہ سے ہے"؟ اس نے مجھے یوں آنکھیں نکال کر گھورا جیسے کچا چبا جائے گا۔

"تخریب کار گروہ!..... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ جناب!" میں گڑبڑا گیا۔ معلوم نہیں یہ کیا نیا قصہ شروع ہو گیا تھا!

"تو پھر کیا ان سے میری رشتے داری تھی جنھوں نے تیری کوٹھی پر دستی بم پھینکے تھے!" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اب بھی جناب کمال کرتے ہیں' میرا بھلا کسی تخریب کار گروہ سے کیا تعلق! کوٹھی بھی میری ہی تباہ ہوئی اور....."

"تیری کوٹھی!" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "تھی کبھی تیری اب وہ...." کچھ کہتے کہتے وہ رک گیا۔

اب میں واضح طور پر سمجھ گیا کہ اس کے غصے کا سبب کیا ہے! مجھے یہ بھی یاد آگیا کہ گزشتہ روز وہ مجھ سے کوٹھی میں منتقل ہونے کی بات بھی کر رہا تھا۔ کوٹھی کی تباہی گویا اس کا ذاتی نقصان تھا۔ شاید اسی کھولن میں وہ تخریب کاروں سے میرا رشتہ جوڑ رہا تھا۔

پھر ذرا ہی دیر میں اس نے وہ سب کچھ اگل دیا۔ جو اس کے دل میں تھا۔ گزشتہ شب کے واقعے کی روشنی میں وہ حقیقتاً یہ سمجھ رہا تھا کہ میں کسی تخریب کار گروہ کا سرغنہ ہوں اور کسی دوسرے گروہ سے میری ٹھن گئی ہے میری کوٹھی کو اسی لیے تباہ کیا گیا ہے۔ مجھے اس

کے انداز فکر پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ عموماً" پولیس والے اسی انداز میں سوچتے ہیں۔ اس نے موجودہ واقعے کی روشنی میں جو مفروضہ قائم کیا تھا' وہ واقعے کے پیش نظر بہ ظاہر معلوم نہیں ہو رہا تھا اس لیے کہ معمولی غنڈے اور بدمعاشوں کے پاس دستی بم نہیں ہوتے۔ اس واقعے نے اس کی نظر میں میری حیثیت کو مزید مشتبہ بنا دیا تھا۔ وہ اسی لیے اب میرے سچ کو بھی جھوٹ سمجھ رہا تھا۔

"یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ پورا تھانہ معطّل ہو سکتا ہے! اس سے پہلے کہ میں تیری کھال ادھیڑ دوں' زبان کھول دے!" اس نے مجھے دھمکی دی۔

مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ معاملہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ یہی سوچ کر میں عاجزی پر اتر آیا۔ میری پوری کوشش تھی کہ کسی طرح اسے میری بے گناہی کا یقین آجائے۔ میری عاجزی اور گریہ زاری پورے طور پر رائگاں نہیں گئی۔ اسی سے کم از کم یہ ضرور رہا کہ اس کے چہرے کا تناؤ ختم ہو گیا۔

"اگر تو سچا ہے تو پھر میں ایس پی صاحب کو کیا جواب دوں؟ انہوں نے میری ناک میں نکیل ڈال رکھی ہے!" اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

مجھے اندھیرے میں روشنی نظر آئی تو فوراً بول اٹھا۔ "آپ ان سے بس تین دن کی مہلت لے لیں' وہ تخریب کار آپ کے قدموں میں ہوں گے"۔

"کیا"؟ وہ ایک دم چونک اٹھا۔ "کیا تو انہیں جانتا ہے"؟

"نہیں"۔

"پھر؟..... پھر کیا جادو کی چھڑی ہے تیری پاس کہ مجرم خود چل کر تھانے آجائیں گے"؟

"بس میرا عمل پورا ہو جائے' پھر میں دو منٹ میں مجرموں کا سراغ لگا لوں گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر جو چور کی سزا وہ میری!" میں نے بہت اعتماد سے کہا۔

"رہنے دے بس! زیادہ ڈون کی نہ لے۔ تو ایسا ہی پہنچا ہوا ہوتا تو حوالات میں نہ سڑ رہا ہوتا! چلا ہے مجھے گھسّا دینے"! وہ منہ بنا کر بولا' پھر کہنے لگا۔ "بس اب میں تجھے حوالات سے نہیں نکلنے دوں گا۔ ایک رات کے لیے چھوڑا تھا تو یہ گل کھلا دیا تو نے' مزید......"

"ایسا نہ کہیں جناب"! میں بول اٹھا۔ "اس سے تو بہتر ہے کہ آپ مجھے شوٹ کر دیں۔ خود گولی مار دیں مجھے' تاکہ میں سسک سسک کر تو نہ مروں"! میں پھر آہ و بکا پر اتر آیا۔ اس وقت اسی کی ضرورت تھی۔ میں جس قدر عمدہ اداکاری کا مظاہرہ کرتا' اس پر اتنا ہی اثر

ہوتا۔ میں اس کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔ "آپ نے .... آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ روز رات کے وقت ....." میں اسے وہ زبانی معاہدہ یاد دلانے لگا جو اس کے اور میرے مابین ہوا تھا۔ "اسی کی خاطر تو جناب میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا' یہاں تک کہ اپنی کوٹھی ...."

"بس بس مزید بکواس کی ضرورت نہیں! اب میں دعویٰ کس پر کروں گا' اس کوٹھی کی تباہی کا؟ اب وہاں رہ کیا گیا ہے سوائے زمین کے!"

"لیکن .... لیکن جناب اس میں میرا..... میرا تو کوئی قصور نہیں۔ میں نے اس وقت کوٹھی کے کاغذات آپ کے سپرد کر دیے تھے جب....."

"زیادہ صفائیاں نہ دے مجھے سمجھا! اس میں بھی کوئی چال ہوگی.... ہاں!" وہ منہ بگاڑ کر بولا۔ "سارے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔ فون پر فون آ رہے ہیں افسران کے! اور تو مجھے الٹی پٹیاں پڑھانے کی کوشش کر رہا ہے"!

"میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میرا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں۔ میری زندگی تو خطرے میں پڑ گئی تھی۔"

"تو کیا تو یہ سمجھ رہا ہے کہ تیرے مرنے سے ہماری جان چھوٹ جاتی! افسران پوچھتے نہیں مجھ سے کہ جو بندہ حوالات میں تھا' وہ کہاں گیا؟ اور اس کی لاش حوالات سے باہر موقع واردات پر کیسے پائی گئی""؟

پھر بڑے بحث مباحثے اور منت سماجت کے بعد وہ اپنے وعدے پر قائم رہنے کے لیے آمادہ ہوا۔ اسے بھی میں خدا کی طرف سے مدد ہی کہوں گا کہ جس نے اس کے دل میں نیکی ڈال دی ورنہ تو میں گھبرا گیا تھا۔ یوں بھی قانونی طور پر مجھ سے جواب طلبی کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا کیوں کہ میں بہرحال پولیس کسٹڈی میں تھا۔ ابھی میں اسی کے کمرے میں تھا کہ معاً میری گردن میں شدید تکلیف شروع ہو گئی۔ اسی کے ساتھ مجھے یاد آیا کہ آج گردن کے زخم کی ڈریسنگ نہیں ہو سکی۔

"کیا ہوا تمہیں""؟ میرے چہرے پر غالباً تکلیف و اذیت کے آثار دیکھ کر اور میری کراہ سن کر ایس ایچ او نے پوچھا۔

"کل .... کل آپ نے .... فرمایا تھا کہ ڈاکٹر...." میں رک رک کر بہ مشکل بول رہا تھا۔ "آپ نے .... کہا تھا کہ صبح کسی سپاہی کو میری کوٹھی بھیج دیں گے اور وہ ڈاکٹر کو یہاں

"اچھا!.... یہ تو میں بھول گیا تھا"۔ اس نے اس طرح کہہ دیا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ

ہو۔

اپنی تکلیف کے احساس پر قابو پاتے ہوئے میں نے اس سے التجا کی کہ میرے بتائے ہوئے پتے پر وہ اسی وقت کسی سپاہی کو بھیج دے۔

"ابھی جائے گا وہ ڈاکٹر؟..... میرا مطلب ہے کہ پیسے ویسے تم نے اسے...."

"وہ میں پیشگی دے چکا ہوں۔ آپ بس مجھ پر اتنی مہربانی..... کر دیں کہ ..... کہ کسی سپاہی...." میں بات ادھوری چھوڑ کر پھر کراہنے لگا۔ تکلیف لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

"پتہ بتاؤ!"

میں نے اسے پتہ بتا دیا اور اس نے لکھ لیا۔

"ٹھیک ہے' میں ابھی کسی سپاہی کو بھیج دیتا ہوں"۔ وہ بولا۔ شاید اسے میری حالت پر رحم آ گیا تھا۔ "تمہیں تکلیف کیا ہے؟ بیٹھ جاؤ کرسی پر! کیا کوئی پرانا زخم ہے""؟

"جی..... جی ہاں..... بہت..... بہت پرانا!" یہ کہہ کر میں کراہتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی گردن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی کند چھری سے میری گردن کاٹ رہا ہے۔

"تمہارا چہرہ تو پسینے میں بھیگ گیا ہے! ٹھہرو' میں بلاتا ہوں کسی سپاہی کو"۔ یہ کہہ کر اس نے وہیں سے کسی سپاہی کو اس کا نام لے کر پکارا۔

"جی سر!" سپاہی دروازہ کھول کر اندر آتے ہی اٹینشن ہو گیا۔

"اسے حوالات میں لے جا کر بند کر دو اور پھر میرے پاس آؤ"۔

"جی جناب!" سپاہی نے فرمانبرداری میں سر ہلایا' پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

میں پہلے ہی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ گردن کی تکلیف میرے لیے ناقابل برداشت ہوئی جا رہی تھی۔ اسی کی وجہ سے میرا جسم کانپنے لگا تھا۔ سپاہی نے غالباً میری حالت کا اندازہ لگا کر میرا بازو پکڑ لیا اور چلنے کو کہا۔

ایس ایچ او کے کمرے سے نکل کر حوالات تک جاتے ہوئے راستے ہی میں میری حالت اتنی بگڑ گئی کہ قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا۔ درد کی لہریں جیسے اب میرے سارے جسم میں دوڑ رہی تھیں۔ گردن سے خون رس رس کر اب میرے سینے کو بھگو رہا تھا۔

"کیا ہوا رک کیوں گئے!؟ چلو!" سپاہی نے میرا بازو کھینچا۔

"نن ..... نہیں"۔ میری زبان بھی لڑکھڑانے لگی اور اسی وقت مجھے چکر آ گیا۔ پھر میں سنبھلتے سنبھلتے بھی زمین پر گر پڑا۔

اس کے بعد کیا ہوا‘ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میری آنکھ حوالات میں کھلی تھی اور ڈاکٹر امتیاز میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔

"شیخ صاحب! اچھے تو ہیں اب آپ؟" میں نے آنکھیں کھولیں تو اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "اب تو تکلیف محسوس نہیں ہو رہی؟"

"نہیں"۔ یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کر بیٹھنے لگا۔

"لیٹے رہیں"۔ اس نے آہستگی سے میرے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی کچھ دیر آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ میں نے بینڈیج کر دی ہے۔ دراصل آج کیوں کہ وقت پر ڈریسنگ نہیں ہو سکی اس لیے دوا کا اثر ختم ہو گیا تھا۔ آپ فکر نہ کریں‘ کل میں یہیں وقت پر آجاؤں گا۔ تھانیدار صاحب سے بات ہو گئی ہے میری"۔

ڈاکٹر امتیاز یقیناً اپنے سینے میں گداز دل رکھتا تھا اور اپنے پیشے سے بھی مخلص تھا ورنہ سبھی ڈاکٹر ایسے نہیں ہوتے۔ اسے میں نے احسان مند نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری حالت کے پیش نظر اس نے اب تک مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں تجسس ضرور ہوگا کہ میں حوالات میں کیسے نظر آ رہا ہوں‘ مگر اظہار نہیں کیا اور اپنا بیگ اٹھا کر چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ میری بے ہوشی کے بعد جو کچھ ہوا‘ اسے سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ میں ڈاکٹر کا پتہ پہلے ہی ایس ایچ او کو بتا چکا تھا۔ اس نے کسی سپاہی کو بھیج کر ڈاکٹر کو بلوا لیا ہوگا۔

چلتے چلتے ڈاکٹر امتیاز نے صرف اتنا کہا۔ "میں حسب معمول آپ کی کوٹھی پر گیا تھا‘ مگر ....."

"ہاں مجھے معلوم ہو چکا ہے۔" میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "کسی نے میری کوٹھی کو دستی بموں سے اڑا دیا ہے۔"

"جی یہی معلوم ہوا تھا مجھے۔" اس نے تصدیق کی‘ پھر بولا۔ "اچھا خدا حافظ! آپ جتنا زیادہ آرام کر سکیں‘ بہتر ہے آپ کے لیے"۔ یہ کہتا ہوا وہ اپنا بیگ اٹھائے ہوئے حوالات کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

حوالات کا دروازہ‘ سپاہی نے مقفل نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر امتیاز کو دروازے کی طرف آتے دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور پھر میں نے ڈاکٹر کو جاتے دیکھا۔ سپاہی نے اس کے نکلتے ہی دروازے پر تالا ڈال دیا۔ اب واقعی تکلیف ختم ہو چکی تھی‘ ہاں کمزوری ضرور تھی‘ مگر اتنی بھی نہیں کہ میں چل پھر نہ سکوں۔

ہر چند کہ ایس ایچ او نے اپنے وعدہ پر قائم رہنے کا اقرار کر لیا تھا‘ اس کے باوجود مجھے سارے دن فکر رہی ایسے لوگوں کا کچھ بھروسا نہیں ہوتا ہے کہ کب اپنی زبان سے پھر جائیں! مگر ایسا نہیں ہوا۔ گذشتہ رات کی طرح آج بھی وہی سب کچھ ہوا اور میں نے اپنی کوٹھی کے کھنڈر میں پہنچ کر مقررہ وقت پر عمل شروع کر دیا۔ وہ رات خیریت سے گزر گئی اور مجھے اس پر شدید حیرت ہوئی۔ ذہنی طور پر میں آج بھی مہ پارہ کی جانب سے کسی حملے کا منتظر تھا۔

آخری دن میرا اضطراب عروج پر تھا۔ میں عمل پورا کر کے حوالات میں پہنچ چکا تھا۔ اب آنے والی رات باقی تھی۔ ڈاکٹر امتیاز حسب وعدہ وقت مقررہ پر آگیا۔ ایک طرف میرے دل میں اضطراب تھا‘ دوسری یہ خوشی بھی کہ آنے والا دن میری زندگی کا نیا دن ہوگا۔ جو کچھ مجھ پر گزری ہے‘ میں نے جتنے دکھ جھیلے ہیں‘ ان کا سدِباب ہو جائے گا‘ مجھے میرا ہمزاد مل جائے گا! یہی سبب تھا کہ جب ڈاکٹر امتیاز میری گردن کی ڈریسنگ کر رہا تھا تو میں نے اس سے کہا۔ "کل سے آپ کو زحمت نہیں ہوگی"۔

"جی!" وہ حیرت سے بولا۔

"جی ہاں کل سے آپ کو ڈریسنگ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی"۔ میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا"۔

"مگر..... مگر شیخ صاحب‘ آپ..... آپ کے زخم کی حالت تو....."

"جی ہاں مجھے معلوم ہے"۔ میں مسکرایا‘ پھر بولا۔ "آپ عقائد پر تو یقین رکھتے ہوں گے نا؟"

"جی..... جی بالکل! میں بہ حمد اللہ مسلمان ہوں اور صاحب عقیدہ بھی"۔ اس نے کہا۔

"عقیدے میں بڑی قوت ہے اور عقیدے ہی سے آدمی یقین کی منزل تک پہنچتا ہے۔ آپ نے ابھی پریکٹس شروع کی ہے۔ لازماً آیندہ زندگی میں آپ کو اس کے تجربات ہوں گے کہ یقین ہی زندگی اور موت کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ غالباً ایک مثال سے میری بات زیادہ واضح ہو سکے۔ یوں سمجھیں کہ ایک مریض کو یقین آچکا ہے کہ وہ اب زندہ نہیں بچے گا تو پھر اسے بچانا آپ کے لیے تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔ آدمی جو کچھ سوچتا ہے اس کا اثر جسم بھی قبول کرتا ہے فوری طور پر اس کا جسم‘ دماغ کے زیر اثر ان محسوسات کو قبول کرنے لگتا ہے جو حقیقتاً ہوتے نہیں۔ قلبی اور دماغی امراض میں عموماً یہ صورتحال پیش آتی ہے نفسیات کے روسے بھی یہ ناممکن بات نہیں۔ ارادے کی قوت‘ یقین ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ غالباً آپ میرا

مطمع نظر سمجھ رہے ہیں"۔

"شیخ صاحب! آپ کی باتیں سن کر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ آپ کا مطالعہ یقیناً بہت وسیع ہے"۔ اس نے میری گردن کی ڈریسنگ مکمل کرتے ہوئے مرعوب لہجے میں کہا۔ "مجھے آج سے پہلے اندازہ نہیں تھا کہ آپ صاحب علم آدمی ہیں۔ بہرحال خدا کرے وہی ہو جو آپ نے کہا ہے۔ ہم لوگ تو صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں اور اپنے تھوڑے بہت علم کے مطابق علاج تجویز کرتے ہیں' مگر اس کے باوجود شفا دینا خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ آپ کا حکم ہو تو میں کل سے نہیں آؤں گا"۔

"انشاء اللہ میں خود جلد ہی آپ سے ملوں گا"۔ میں بولا۔ "آپ نے جس ذمے داری اور خلوص کے ساتھ اپنا فرض ادا کیا ہے' اس کے لیے میرے پاس شکریے کے سوا کوئی اور لفظ نہیں' مگر جو خدمت ممکن ہوئی ضرور کروں گا"۔

وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور کہنے لگا۔ "نہیں شیخ صاحب میں نے کیا ہی کیا ہے! آپ نے پیشگی معاوضہ ادا کر دیا تھا' مجھے مزید کچھ نہیں چاہیے"۔

"خلوص کا کوئی معاوضہ نہیں ہوتا۔ خیر یہ بعد کی باتیں ہیں۔ میں آپ سے ملوں گا ضرور تاکہ میرے یقین کو آپ عملی صورت میں بھی دیکھ سکیں"۔

"یقیناً یہ میری زندگی کا بہت بڑا تجربہ ہو گا"۔ وہ اپنا بیگ بند کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "بسر و چشم جب بھی چاہیں غریب خانے پر تشریف لائیں' مگر....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"یہ سب چند دن کی باتیں ہیں۔ کچھ غلط فہمیاں ہو گئی ہیں' پولیس والوں کو میری طرف سے"۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا بات کہتے کہتے رک گیا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس کے چہرے سے بھی ہو گیا تھا۔ "جلد ہی یہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی"۔

اس نے میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور رخصت ہو گیا۔ ڈاکٹر امتیاز نے ابھی زندگی کا گویا آغاز کیا تھا۔ وہ نوجوان تھا اور اس کی آنکھوں میں بھی یقیناً مستقبل کے لیے بہتر خواب ہوں گے۔ میں اسی لیے اسے نظر انداز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہاں بس اتنا تھا کہ ایک رات اور یہ خیریت سے گزر جاتی۔

یہ بھی اسی دن کا ذکر ہے کہ میرے ذہن میں کچھ اور بھولی بسری باتیں آئیں۔ میں اس وقت ہمزاد کی پُراسرار قوتوں کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ وہ عبارت میرے صفحہ ذہن پر الفاظ کی صورت میں نمایاں ہو گئی جو میں نے فارسی زبان کے ایک قلمی نسخے میں پڑھی تھی۔ وہ قلمی نسخہ اب تک میرے پاس موجود تھا۔ وہ الفاظ مجھے ازبر ہو چکے تھے' لیکن اس دن سے پہلے میں

نے ان پر غور نہیں کیا تھا۔ دیگر تمام باتوں سے قطع نظر اس وقت میں جس بات پر غور کر رہا تھا۔" وہ محض چند الفاظ تھے۔

میرے زیر غور اس وقت یہ مسئلہ تھا کہ ان الفاظ کی روشنی میں مجھے سرطان ایسے موذی مرض سے نجات مل سکتی ہے؟ اگر ایسا ہو جاتا تو پھر مجھے جسم تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ممکن ہے' میں نے اس بات پر پہلے غور کر لیا ہوتا تو اتنی اذیتوں سے نہ گزرتا۔ یہ مہ پارہ کے سحر کا نتیجہ تھا کہ اس نے مجھے ایسے خطرناک مرض میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کا مقصد محض یہ تھا کہ میں سکون کے ساتھ زندگی بسر نہ کر سکوں۔

اب میری منزل بالکل قریب آ گئی تھی تو مجھے یہ ساری باتیں یاد آ رہی تھیں' میں اپنے ہمزاد کو ایک بار پھر تسخیر کرنے والا تھا۔

پھر وہ اضطراب و تجسس کا دن بھی گزر گیا۔ اس دن کوشش کے باوجود میں زیادہ دیر نہ سو سکا اور میرا زیادہ وقت عبادت الٰہی میں گزرا۔ رات ہوئی تو میرے دل کی دھڑکنوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا کہ جانے آج رات کیسی گزرے؟ رہ رہ کر مجھے مہ پارہ کا خیال آ رہا تھا۔ وہ خاموش کیوں ہے؟ کیا اس نے اپنی شکست قبول کر لی؟ کیا اس نے ہمیشہ کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دیا؟ اگر واقعی ایسا ہے تو کیوں؟ ابھی تو وقت باقی ہے' پھر کیوں وہ کوئی حربہ نہیں آزما رہی؟ ذہن میں یہی سوال گردش کرتے رہے اور وقت گزرتا رہا۔

وقت مقررہ پر میں آج رات بھی خاموشی کے ساتھ حوالات سے نکل گیا۔ ایس ایچ او ابھی تک اپنے وعدے پر قائم تھا۔ ہاں آج رات گزرنے کے بعد جو چاہتا' میرے ساتھ سلوک کرتا اور میں اس کے لیے تیار تھا۔ آج فیصلے کی رات تھی' ادھر یا ادھر' زندگی یا موت!

حوالات اور تھانے سے نکل کر اپنی حویلی کی طرف جاتے ہوئے مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ میرے قدم زندگی کی طرف بڑھ رہے ہیں یا موت کی طرف! بہرحال میں آیات قرآنی کا ورد کرتا ہوا اپنی منزل تک پہنچ ہی گیا۔ ہر طرف سکوت اور اندھیرا تھا۔ ملبے کے درمیان اور ٹوٹی ہوئی دیواروں کے قریب سے گزرتا ہوا میں اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ پھر جیسے ہی میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا میری آنکھوں میں چکا چوند سی ہو گئی۔

اندھیرے سے ایک دم تیز اور چبھتی ہوئی روشنی کے مقابل آ کر میری آنکھیں بند ہو گئیں اسی وقت مجھے ایک آشنا آواز سنائی دی۔ "آنکھیں کھولو شیخ! آخری نظارہ کر لو۔ پھر شاید تم مجھے کبھی نہ دیکھ سکو"۔ یہ آواز میری دشمن جاں مہ پارہ کی تھی۔

اس افتاد نے وقتی طور پر میرے حواس کو متاثر ضرور کیا' مگر اس قدر نہیں کہ میں

سنبھل نہ پاتا۔ یقیناً اس تیز روشنی کا مقصد مجھے بوکھلا دینا ہی تھا' مہ پارہ نے دانستہ یہ حرکت کی تھی۔

"روشنی سے ڈرتے ہو!" مہ پارہ کی آواز میں نے پھر سنی اور اسی کے ساتھ وہ زور نے سے ہنس پڑی۔

"تم اب چاہتی کیا ہو؟" میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں میرے بالکل مقابل ایک چمکیلا غبار رقصاں تھا جس کے درمیان مہ پارہ کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ تھی۔

"میں کیا چاہتی ہوں! بتا دوں؟ ..... بس یوں سمجھ لو کہ جو میں چاہتی تھی' وہ پورا ہو گیا"۔

"اسے میں تمہاری شکست کی آواز سمجھوں یا دھمکی؟" میں نے جرات کا مظاہرہ کیا۔

"دھمکی' نہ شکست کی آواز! اسے تم حقیقت سمجھ سکتے ہو"۔ اس نے بڑے سکون اور اعتماد سے جواب دیا۔

مدتوں بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس سے ہم کلام تھا۔ اس سے پہلے ہمیشہ وہ میرے عمل کے دوران میں ہی آتی رہی تھی یا ایک بار عمل کے وقت سے پہلے آئی تھی تو فوراً ہی دھمکی دے کر غائب ہو گئی تھی۔ میں کچھ کہنے کی حسرت لیے ہی رہ گیا تھا' مگر آج یہ موقع تھا اور عمل کا وقت شروع ہونے میں بھی ابھی دیر تھی میں اسی لیے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے بولا۔ "پرسوں رات بھی تم نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ میری زندگی کی آخری رات ہے!" میرے لہجے میں کاٹ تھی۔

"ہاں میں نے دعوی کیا تھا اور وہ دعوی غلط نہیں تھا' مگر..... مگر کسی ان دیکھی قوت نے تمہیں بچالیا۔ میں نے اپنی دانست میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی کہ تم زندہ بچ سکتے' لیکن یہ ان ہونی ہو گئی۔ اس کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کر تمہیں ہلاک کرنا' ممکن نہیں۔ مجھے تمہارے لیے کچھ اور ہی بندوبست کرنا پڑے گا کیوں کہ اب تمہارے اور میرے درمیان ہمیشہ کے لیے رابطہ ختم ہونے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ میں اسی لیے کل رات غائب رہی اور میں نے تمہارے لیے جو کچھ سوچا تھا' اسے عملی شکل دے دی۔ اس طرح میں اپنی بیشتر قوتوں سے محروم تو ہو چکی ہوں' مگر مجھے اس کا کوئی ملال نہیں۔ اسی سبب اب میری بھٹکتی ہوئی روح ہمیشہ کے لیے قید ہو جائے گی' لیکن یہ قید میں نے خود قبول کی ہے۔ اب میں اس دنیا میں کبھی نہ آسکوں گی۔ میں نے اسی لیے کچھ دیر قبل تم سے کہا تھا کہ آخری نظارہ کرلو۔ میں جانتی ہوں کہ

تم ایک عرصے میرے لیے تڑپتے رہے ہو اور خود بھی میں نے تمہیں تڑپایا ہے۔ میں نے اسی وجہ سے موت کو گلے لگا لیا تھا تاکہ تم زندگی بھر ایک شکست کا زخم سینے میں لیے سلگتے رہو۔ شیخ! ابھی میرے انتقام کی آگ بجھی نہیں اور بجھ بھی کیسے سکتی ہے کہ تمہاری ہی وجہ سے میں نے موت کو قبول کیا تھا اور اب ....." وہ کچھ کہتے ہوئے رک گئی۔

میں پوری توجہ اور انہماک سے اس کی باتیں سن رہا تھا' لیکن وہ چپ ہو گئی تو مجبوراً مجھے بولنا پڑا تاکہ وہ اصل بات جو اس نے نہیں بتائی' اس کی زبان پر آجائے۔ میں نے کہا۔ "تم نے اس بندوبست کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جس کے لیے اتنی تمہید باندھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھی محض تمہاری بڑ ہے"۔ میرا مقصد اسے غصہ دلانا تھا۔ غصے میں عموماً اصل بات منہ پر آجاتی ہے۔

خلاف توقع غصے میں آنے کی بجائے وہ عجیب سے انداز میں ہنس پڑی' پھر بولی۔ "بہت چالاک ہو تم! میں اس سلسلے میں ہرگز تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گی"۔

میری نگاہ اسی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اگر وہ سب کچھ سچ تھا جو اس نے کہا تھا تو یقیناً میں اسے آخری بار دیکھ رہا تھا۔

اس نے بھی غالباً میری وارفتگی کو محسوس کر لیا اور خوابیدہ سی آواز میں بولی۔ "دیکھ لو شیخ!..... صرف چند لمحے اور دیکھ لو! کاش تم نے میری انا پر ضرب نہ لگائی ہوتی ..... کاش تمہیں اپنی قوت پر غرور نہ ہوتا اور ..... اور کاش تم مجھ سے نہ ٹکرائے ہوتے۔ پھر ..... پھر شاید زندگی مجھ سے یوں نہ روٹھتی اور تم ..... تم بھی عذابوں کے سفر میں تنہا نہ ہوتے"۔ اس کی آواز لمحہ بہ لمحہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ چمکیلا غبار ماند پڑتا جا رہا تھا۔ اب اس کا ہیولا دھندلا گیا تھا۔

مجھ پر بھی اس وقت ایک ناقابل بیان سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اسی کیفیت میں اسے پکارا۔ "مہ پارہ! ..... مہ پارہ!"

"جانے والوں کو آواز نہیں دیا کرتے شیخ! ..... وقت گزر چکا ہے۔ خدا حافظ ..... ہمیشہ کے لیے خدا حافظ!" اس کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے سنائی دی اور اسی کے ساتھ کمرے میں تاریکی پھیل گئی۔ چمکیلا غبار اور مہ پارہ کی روح کا ہیولا غائب ہو چکا تھا۔

کچھ دیر میں عجیب سے عالم میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ دشمنی کی بھی اپنی الگ ایک قدر ہوتی ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے۔ مہ پارہ کا شمار یقیناً دانا دشمنوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ایسے دشمن بھلائے نہیں بھولتے۔

وہاں مجھے احساس ہوا کہ کہیں عمل کا وقت نہ گزر جائے۔ میں نے جلدی سے آگے

بڑھ کر چراغ روشن کر دیا۔ اس وقت بارہ بجنے میں صرف دو منٹ باقی تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر بہ عجلت عمل کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

ہمزاد کے عمل کی وہ آخری رات بغیر کسی ہنگامے کے گزر گئی۔ معلوم نہیں مہ پارہ نے مجھ سے انتقام لینے کی کیا صورت نکالی تھی، لیکن عمل میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی۔

پہلی مرتبہ جب میں نے ہمزاد کا چلّہ پورا کیا تھا تو وہ فوری طور پر میرے سامنے نہیں آیا تھا اور مجھے بڑی آزمائشوں میں ڈالا تھا جن کا ذکر تفصیلی طور پر کر چکا ہوں۔ اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا اور اس کا سبب تھا۔ اب ہمزاد خود مسخر ہونا چاہتا تھا۔ ایک طویل عرصے ساتھ رہ کر مجھے اس سے اور اسے مجھ سے لگاؤ ہو گیا تھا کیوں کہ وہ میرا ہی پرتو تھا۔ ادھر میں نے اپنا عمل ختم کیا، ادھر وہ ظاہر ہو گیا۔

"اے شیخ! مبارک ہو آپ کو کہ آپ نے اپنے جسم لطیف کو پھر مسخر کر لیا"۔ میں نے ہمزاد کی آواز سنی۔ یہ میری ہی آواز تھی، بالکل میری آواز! وہ تھا بھی میرا ہی ہم شکل۔

میں اسے کوئی جواب دینے کی بجائے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا جیسے مجھے اپنی بصارت پر یقین نہ آ رہا ہو۔ انتہائی مسرّت کے احساس نے گویا میری قوّت گویائی سلب کر لی تھی۔ پھر جانے مجھے کیا ہوا کہ میں زور زور سے ہنسنے لگا، قہقہے لگانے لگا۔ ہمزاد میرے سامنے مودب کھڑا رہا۔

چالیس دن کے دوران میں میرے دل پر جو جو زخم لگے تھے جیسے وہ سب کے سب ایک ساتھ لو دینے لگے تھے۔ میری عزّت نفس کو جس طرح مجروح کیا گیا تھا، مجھے جو آزار پہنچائے گئے تھے، غالباً انہی کے ردِّعمل طور پر میں اس وقت قہقہے لگا رہا تھا اس لیے کہ اب میں صاحب اقتدار تھا۔ میری کھوئی ہوئی قوت مجھے واپس مل چکی تھی۔ اب میں ایک ایک زخم کا حساب بہ آسانی چکا سکتا تھا۔

پہلی بار ہمزاد کے اور میرے درمیان جو شرائط طے ہوئی تھیں، ان میں صرف ایک جگہ جھول رہ گیا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے ہمزاد کا عمل دوبارہ کرنا پڑا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اسے سو برس کے بعد آزاد کر دوں گا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ تھا کہ اگر میں جیا بھی تو زیادہ سے زیادہ سو برس جیوں گا۔ میں نے اسی لیے یہ شرط مان لی تھی۔ اب پھر وہی مرحلہ تھا۔ تمام شرائط جوں کی توں برقرار رہیں، صرف یہ شرط کہ میں نے اسے کتنی مدت کے لیے مسخر کیا ہے؟ اس میں تبدیلی ہوئی۔ میں نے اس سے کہا۔ "مدت کی قید اس بار نہ لگاؤ! یہ مدت کم بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ بھی۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو، میں جب چاہوں گا، تمہیں آزاد کر دوں گا"۔

اس نے کسی حجت کے بغیر میری بات مان لی۔

"میں نے تمہاری قوتوں کے بارے میں یہ بھی پڑھا تھا کہ تم سخت اور مہلک بیماریوں کے علاج بھی تجویز کر سکتے ہو"۔ میں نے ہمزاد سے کہا۔ "پھر کیا وجہ ہوئی کہ تم مجھے سرطان ایسے مرض سے بچا نہ سکے؟ یقیناً اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہو گی؟"

"ہاں وجہ تھی"۔ ہمزاد نے جواب دیا۔ "اول تو خود آپ نے اس خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ دوم یہ کہ اگر آپ مجھ سے ایسا کہتے بھی تو میں اس کا مشورہ نہ دیتا"۔

"وہ کیوں؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"اس لیے کہ آپ کی دشمن مہ پارہ پھر کوئی اور خطرناک حربہ آزماتی جس کا تجربہ پہلے بھی آپ کو ہو چکا ہے۔ ایک مرتبہ اس نے آپ کو دونوں ٹانگوں سے معذور کر دیا تھا۔ یہ بھی ہوا تھا کہ آپ کے ہاتھ بیکار ہو گئے تھے۔ میرے نزدیک سرطان کم عذاب تھا۔ اس میں کم از کم فوری طور پر آپ کو جسم تبدیل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی جو بہ ہر حال ایک مسئلہ ہوتا۔" ہمزاد نے تفصیل کے ساتھ میرے سوال کا جواب دے کر مجھے مطمئن کر دیا۔

"خیر اب صورت حال بدل چکی ہے"۔ میں طویل سانس لے کر بولا۔ "مجھے گویا نئی زندگی مل گئی ہے اور میں نے تمہیں بھی دوبارہ حاصل کر لیا ہے"۔ یہ کہہ کر میں، ہمزاد کو ان باتوں سے آگاہ کرنے لگا جو میرے اور مہ پارہ کے درمیان آج رات ہوئی تھیں۔ اس کے بعد میں نے کہا۔ "اب وہ ہمیشہ کے لیے میرا پیچھا چھوڑ چکی ہے۔ باقی تمام باتوں سے قطع نظر فی الحال میں یہ چاہتا ہوں کہ مکمل طور پر صحت یاب ہو جاؤں۔ نئی زندگی ملنے کے بعد اسے تم میری پہلی خواہش بھی سمجھ سکتے ہو"۔

"یہ کوئی مشکل کام نہیں"۔ اس نے کہا۔ "آپ سات دن کے اندر اندر اس موذی مرض سے مکمل طور پر نجات حاصل کر لیں گے"۔

"اس کے لیے مجھے کیا کرنا پڑے گا؟"

"کچھ نہیں۔ یہ میرا مسئلہ ہے۔ میں آج ہی کسی وقت دوا فراہم کر دوں گا"۔

"دوا؟" میں حیرت سے بولا۔

"ہاں۔ وہ دوا چند جڑی بوٹیوں اور مخصوص قسم کے ایک خود رو پودے کی پتیوں پر مشتمل ہو گی۔ یہ خود رو پودا اونچے پہاڑوں کی چٹانوں کے درمیان نسبتاً نرم جگہ میں اُگتا ہے جہاں کسی انسان کی رسائی نہیں ہوتی۔ یہ قدرت کے راز ہیں۔ اس نے جو مرض بھی پیدا کیا ہے، اس کا علاج بھی رکھا ہے، سوائے موت کے! اور موت کا سبب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

بہرحال میں وہ بوٹیاں اور مخصوص پودے کی پتیاں لے آؤں گا۔ آپ انہیں پیس کر سفوف بنالیں، پھر اس سفوف کے سات حصے کرلیں۔ روزانہ آپ کو ایک خوراک سوتے وقت پانی سے کھانا ہے انشاء اللہ آپ کو شفا ہو جائے گی"۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تم یہ جڑی بوٹیاں اور پتیاں زیادہ تعداد میں لے آؤ تاکہ ...."

"میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ کا مقصد کیا ہے! آپ یقیناً خلق خدا کی بھلائی کے لیے یہ دوا زیادہ مقدار میں تیار کرنا چاہتے ہیں، لیکن میں آپ کو اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔" ہمزاد بولا۔

"کیوں، اس میں حرج بھی کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"ممکن ہے کہ اس طرح وہ دوا اپنی تاثیر کھو بیٹھے"۔ ہمزاد وضاحت کرنے لگا۔ "اس سے ایک خطرہ یہ پیدا ہو جائے گا کہ پھر وہ آپ کو بھی فائدہ نہ کرے۔ دوا تو ایک ذریعہ ہے ورنہ شفا دینے والی ذات خدا کی ہے۔ دوا میں تاثیر بھی اسی ذات نے پیدا کی ہے اور وہ اس کی تاثیر ختم کرنے پر بھی قادر ہے۔ یہ دوا صرف اسی کے لیے کارگر ثابت ہو سکتی ہے جو اپنے ہمزاد کو مسخر کرلے۔ غالباً میں نے اپنی بات پوری طرح سمجھا دی ہے۔ بغیر جدوجہد اور بغیر کوشش کے کچھ نہیں ملتا"۔

میں نے اس کی وضاحت سن کر طویل سانس لیا، پھر بولا۔ "اگر ایسا ہے تو پھر مجبوری ہے۔ بہرحال میرے لیے وہ جڑی بوٹیاں اور پتیاں لا دینا"۔

اس نے اقرار میں گردن ہلادی، پھر کہنے لگا۔ "اجازت ہو تو اب میں جاؤں؟"

"نہیں"۔ میں نے جواب دیا، پھر خود ہی اجازت نہ دینے کی وضاحت کی۔ "دراصل تمہارے بغیر چالیس دن یوں گزرے ہیں جیسے چالیس برس ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آج تو تم زیادہ سے زیادہ وقت میرے ساتھ رہو"۔

"جو آپ کا حکم"۔

"چلو اب تھانے چلتے ہیں"۔ میں نے کہا۔ "اس وقت تک فجر کا وقت بھی ہو جائے گا۔ نماز پڑھ کر میں کچھ دیر کے لیے سو جاؤں گا، پھر سوچوں گا، کیا کرنا ہے۔ اس دوران میں تم میرے لیے جڑی بوٹیاں وغیرہ لے آنا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"بہتر ہے"۔

"مجھے تم سے کچھ تفصیلی گفتگو اور مشورہ بھی کرنا ہے، لیکن میں پہلے کچھ دیر آرام کر لینا چاہتا ہوں"۔

"یہ حق تو نہیں مجھے کہ آپ سے کوئی سوال کروں، لیکن فی الحال یہاں بھی تو آرام کیا

جا سکتا ہے"۔ ہمزاد بولا۔ "اب تو کوئی مسئلہ نہیں"۔

"تمہاری غیرموجودگی میں مجھ پر کیا کیا گزر چکی ہے، تمہیں نہیں معلوم"۔ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "فی الحال میں اپنے دشمنوں کو غفلت میں رکھنا چاہتا ہوں۔ ان سے حساب تو چکانا ہے، مگر ذرا سکون و اطمینان کے ساتھ! میں بھی ان کی بے بسی پر اسی طرح ہنسنا چاہتا ہوں، جس طرح انہوں نے میرا تماشا بنا کر مذاق اڑایا تھا۔ آؤ چلیں.... مگر ٹھہرو، میں پہلے کپڑے بدل لوں اور گردن سے لپٹی ہوئی یہ پٹیاں بھی کھول کر پھینک دوں"۔

میرا ہمزاد ادب کے ساتھ ایک طرف کھڑا رہا۔ توقع کے مطابق میری گردن پر اب زخم کا معمولی سا نشان بھی نہیں تھا اور نہ کسی قسم کی تکلیف تھی۔ عمل پورا ہوتے ہی میری گردن اور بقیہ جسم کے درمیان رابطہ بحال ہو چکا تھا۔ پٹیاں کھول کر میں نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور سکون کا گہرا سانس لیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اپنی حویلی کے کھنڈر سے نکل رہا تھا۔ آج فضا کچھ اور تھی، میرے محسوسات مختلف تھے۔ میرے دل میں نہ کوئی خوف تھا نہ اندیشہ! اب میں پھر وہی شیخ کرامت تھا، وہ جس نے کبھی بڑے سے بڑے خطرے کی پروا نہیں کی تھی اور وہ جو پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ ہمزاد میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا، ہمزاد میرا ہی جسم لطیف، میرا ہی عکس، میرا ہی ہم آواز، میرا ہی ہم شکل! وہ اس وقت تک میرے سوا کسی اور کو نظر نہیں آسکتا تھا جب تک میں خود اسے یہ حکم نہ دیتا کہ دوسروں پر بھی اپنے وجود کو ظاہر کردے۔

تھانے کی طرف جاتے ہوئے مجھے بڑی طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ آج میں مجبور نہیں مختار تھا، محکوم نہیں حاکم تھا، بے بس نہیں، صاحب اقتدار تھا۔

میں اس روز بھی حسب معمول تھانے کے عقبی پھاٹک سے گزر کر حوالات کے دروازے تک پہنچا اور سپاہی نے فوراً ہی میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ ہمزاد بھی میرے ساتھ ساتھ حوالات میں داخل ہو گیا۔ اسی وقت کسی قریبی مسجد سے فجر کی اذان سنائی دینے لگی۔ حوالات کا دروازہ باہر سے مقفل کیا جا چکا تھا۔

"اب تم چاہو تو جا سکتے ہو۔ جب ضرورت ہوئی بلا لوں گا"۔ میں نے اپنے ہمزاد سے کہا۔

دوسرے ہی لمحے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ ہمزاد کو مخاطب کرتے ہوئے میری آواز نسبتاً بلند تھی۔ مجھے اس وقت یہ احساس نہیں ہو سکا تھا اور نہ میں اس سپاہی کی طرف متوجہ تھا جو دروازے کی سلاخوں ہی سے لگا کھڑا تھا۔ میں چونکہ اس وقت جب سپاہی نے

مجھے مخاطب کیا۔ "تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟"

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور ہنستے ہوئے سپاہی کی بات کا جواب دیا جو زیادہ غلط بھی نہیں تھا کیوں کہ ہمزاد تو میرے ہی وجود کا حصّہ تھا۔ میں نے جواب میں کہا تھا۔ "میرے بھائی! میں تو خود سے ہی بات کر رہا تھا"۔

"جھوٹ بول رہے ہو تم!" سپاہی کی آواز میں قدرے سختی آگئی۔ "میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے کہ تم کسی سے جانے کے لیے کہہ رہے تھے!" یہ کہتے ہوئے اس نے دیدے گھما گھما کر حوالات کا جائزہ لیا کہ کہیں میرے علاوہ بھی کوئی اور تو وہاں چھپا ہوا نہیں۔

"کیوں میری جان' نظر آیا کوئی؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ خواہ مخواہ مجھ پر رعب گانٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بکواس مت کرو زیادہ!" وہ بگڑ کر بولا۔ "ملک صاحب کا حکم نہ ہوتا تو ابھی سیدھا کر دیتا دو منٹ میں!"

"نہیں بھئی' یقین دلاؤ!" میں نے اسے برہم دیکھ کر مزید چڑایا' پھر آگے بڑھ کر لوٹا اٹھانے لگا تاکہ وضو کر سکوں۔ پھر لوٹے میں گھڑے سے پانی بھرتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ "ویسے اب خود تمہارے ملک صاحب کے سیدھے ہونے کا وقت آگیا ہے۔ تم تو خیر چیز کیا ہو جو اینٹھ رہے ہو' میں تمہارے صاحب بہادر کی دم میں دھاگا باندھ دوں گا"۔

یہ جملے میں نے محض ازرہ تفنّنِ طبع کہہ دیے تھے اس لیے کہ اب میں قطعی طور پر بے خوف تھا۔ سپاہی آپے سے باہر ہو گیا۔ گویا اب اسے میرے خلاف زبان کھولنے کا حق حاصل ہو گیا تھا۔ چاہے وہ خود دل ہی دل میں اپنے افسران کو برا بھلا کہتا ہوں' لیکن بھلا ایک قیدی کی یہ مجال کیسے ہو سکتی تھی! اب تو مجھ پر برسنے کے لیے اس کے پاس نہایت عمدہ اور مضبوط جواز تھا کہ میں نے اس کے افسر کی شان میں گستاخی کی تھی۔

"آجانے دے ملک صاحب کو! تیری کھال نہ اتروا دی تو میرا نام اللہ داد نہیں!" وہ مجھے برا بھلا کہہ کر اور دھمکیاں دینے کے بعد دوبارہ حوالات کے باہر مٹر گشت کرنے لگا۔ غالباً اب اسے بے چینی سے اپنے افسر کی آمد کا انتظار تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ اول تو ایس ایچ او ملک نو ساڑھے نو بجے تھانے نہیں آئے گا اور اگر آ بھی گیا تو سپاہی کی بات کا یقین نہیں کرے گا۔ میں اسی لیے نماز پڑھ کر آرام و سکون کے ساتھ گہری نیند سو گیا۔

میں مشکل سے تین چار گھنٹے ہی سو [illegible]ا۔ مجھے جگانے والا وہ سپاہی [illegible] تھا جو رات کی

ڈیوٹی پر تھا۔ اس کے باوجود اس کا رویہ خاصا بدلا ہوا اور لہجہ درشت تھا۔ "اب اٹھے گا بھی نہیں کہ لات جماؤں کمر پہ!" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی دائیں ٹانگ بھی اٹھالی تھی جیسے مجھے دھمکانا چاہتا ہو۔

غصّے کے ساتھ ہی مجھے شدید حیرت ہوئی کہ ایک دم پولیس والوں کا رویہ میرے ساتھ تبدیل کیوں ہو گیا؟ کچی نیند سے اٹھا تھا اسی لیے ابھی ذہن پر غنودگی چھائی ہی تھی۔

"بات کیا ہے؟ [illegible] کیوں ہو رہے ہو تم اتنے؟" میں نے اپنے غصّے اور حیرت پر قابو پاتے ہوئے اٹھ کر کہا۔

"یہ تو تیرا باپ بتائے گا جسے تو نے [illegible] تھیں اللہ داد کے سامنے!" سپاہی نے انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا' پھر مزید بولا۔ "صاحب نے اللہ داد کو [illegible] روک لیا ہے تاکہ تو مکر نہ جائے"۔

سپاہی کی اس بات نے سارا معمّا حل کر دیا۔ میں نے ایس ایچ او کو گالی نہیں دی تھی۔ معاملے کو بڑھانے اور تمسخر کا بدلہ لینے کی خاطر سپاہی اللہ داد نے یہ جھوٹ بولا تھا۔ گالیوں کے ذکر نے ایس ایچ او کو یقیناً بے مزہ کر دیا ہو گا کیوں کہ وہ بہرحال ان میں سے نہیں تھا جو گالیاں کھا کے بے مزہ نہیں ہوتے اور نہ ہی میرا شمار شیریں دہنوں میں تھا۔ پھر بھلا وہ کیوں نہ بنگ پر چڑھ جاتا۔

جب میں حوالات سے نکل کر ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچا تو میری پہلی نظر سپاہی اللہ داد پر پڑی۔ وہ ایس ایچ او کی میز سے کچھ فاصلے پر دائیں جانب اٹینشن کھڑا تھا۔ اس کے بعد میں نے ایس ایچ او کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور سختی کے ساتھ دانت پر دانت جمانے کے سبب دونوں کلّے پھولے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ وہ بھی میری ہی جانب دیکھ رہا تھا' یوں جیسے اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہوں جو مجھے پل بھر میں جلا کر خاک کر دیں گے۔

"تم نے مجھے اللہ داد کے سامنے گالیاں دی تھیں؟ بولو!" آخری لفظ کہتے ہوئے اس کی آواز خاصی تیز ہو گئی۔ تھانیداری کے سارے رعب کا اظہار وہ اس ایک لفظ "بولو" کے ذریعے کر دینا چاہتا تھا۔

"یہ غلط کہتا ہے' میں نے گالیاں نہیں دیں"۔ میں نے سکون سے جواب دیا۔

"سر! یہ آپ کے سامنے جھوٹ بول ....."

"تم چپ رہو اُلّو کے ....." تھانیدار ملک نے سپاہی کو گالی دی۔ "مجھے اس سے پوچھنے

"-یہ کہہ کر وہ پھر میری طرف پلٹا۔ "اللہ داد نے قسم کھا کر کہا ہے کہ تم نے مجھے گالیاں دی
ں۔ اسے کیا پڑی تھی کہ جھوٹی قسم کھاتا؟"
"میں اب بھی یہی کہوں گا کہ اللہ داد مجھ پر غلط الزام لگا رہا ہے۔ میں نے کچھ اور کہا
۔"

"تا تو کہا کیا تھا تم نے؟" وہ چڑانے والے انداز میں منہ بگاڑ کر بولا۔
"میں نے کہا تھا کہ میں تمہارے صاحب بہادر کی دم میں دھاگا باندھ دوں گا"۔ میں
نے اس طرح کہہ دیا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ یہ کہتے ہی میں نے ہمزاد کو طلب کر لیا تھا۔
"کیا؟"
وہ گلا پھاڑ کر چیخ اٹھا۔ یہی میں چاہتا بھی تھا۔ "میری دم میں دھاگا!"
"ہاں ہاں یہی کہا تھا میں نے!" میں پر سکون آواز میں بولا۔ "دھاگا کوئی گالی نہیں
ہے"۔ میرا مقصد اسے مزید تاؤ دلانا تھا۔
"گالی تو میں تجھے ابھی بتاتا ہوں"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے میز پر رکھا ہوا اپنا بینت اٹھا
یا اور ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار تھے۔
ادھر ایس ایچ او اپنا بینت لہراتا ہوا میری طرف جھپٹا' ادھر میں نے ہمزاد کو اشارہ کر دیا
۔ میرے ہی اشارے کا منتظر تھا۔ دوسرے ہی لمحے ایس ایچ او کے ہاتھ سے بینت نکل کر اللہ
داد کی کھوپڑی پر پڑا۔ یہ اشارہ بھی میں نے ہی کیا تھا تاکہ تھوڑی بہت سزا اللہ داد کو بھی مل
جائے جس نے جھوٹی قسم کھائی تھی۔ وہ "ہائے مرگیا" کہتا ہوا زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ ضرب شاید
زوردار تھی۔
ایس ایچ او کچھ بوکھلا سا گیا۔ غالباً اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر ایک دم ہوا کیا؟
ں ابھی اس سے دور تھا تو پھر اس کے ہاتھ سے کسی نے بینت چھین کر سپاہی اللہ داد کی
کھوپڑی کو نشانہ بنا دیا؟ اسی سبب وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔
"شرافت سے اپنی جگہ بیٹھ جاؤ ملک جی ورنہ تمہاری کھوپڑی کو بھی طبلہ بنا دیا جائے
گا"۔ میں نے خاموشی کو توڑا۔
میرا یہ فقرہ بھی بھس میں چنگاری لگا دینے کے مترادف تھا۔ ایس ایچ او کو جیسے ہوش
گیا اور پھر وہ بے نقط سنانے لگا۔
"چپ ہو جا خبیث کی اولاد ورنہ تیری زبان کھینچ لوں گا!" میں اس کی
گالیاں برداشت نہ کر سکا۔

"میری زبان تو.... تو کھینچے گا!" وہ شدید غصّے کی وجہ سے ہکلانے لگا۔
"پکڑ تو اس حرام زادے کو!" اس نے اللہ داد اور دوسرے سپاہی کو حکم دیا جو مجھے حوالات سے وہاں تک لے کر آیا تھا' پھر دانت پیستے ہوئے کہنے لگا۔ "ابھی میں اس کی چٹنی بناتا ہوں!" اس کے بعد وہ قریب ہی زمین پر پڑا ہوا اپنا بینت اٹھانے آگے بڑھا۔
اللہ داد ابھی تک دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا۔ وہ اپنے افسر کا حکم سن کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ دوسرا سپاہی میرے برابر ہی موجود تھا' اس نے میری کلائی پر ہاتھ ڈال دیا اور اسے یہ کوشش بہت مہنگی پڑی۔ وہ اپنا پیٹ پکڑ کر ڈکراتا ہوا دور جا گرا۔ ہمزاد کا گھٹنا اس کے پیٹ پر پڑا تھا۔ اللہ داد کے بڑھتے ہوئے قدم اچانک رک گئے۔ وہ حیرت سے اپنے ساتھی کو زمین پر پڑے تڑپتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ایس ایچ او نے بھی جھک کر اپنا بینت اٹھاتے ہوئے چونک کر تڑپتے ہوئے سپاہی کو دیکھا اور اسی لمحے ہمزاد اس کے پیچھے پہنچ گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ ایس ایچ او سیدھا کھڑا ہو پاتا' چیختا ہوا اوندھے منہ فرش پر گرا۔ گرتے گرتے اس نے اپنی کہنیاں آگے کر دیں تھیں ورنہ صورت نہ پہچانی جاتی۔
میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے پاس پہنچ گیا اور اسے مخاطب کیا۔
"اور ٹھکائی کی ضرورت ہے یا کافی ہے اتنی ٹھکائی؟"
میری بات کا جواب دیے بغیر وہ کراہتا ہوا اٹھنے لگا۔ اس کی دونوں کہنیوں پر یقیناً شدید چوٹیں آئی تھیں کیوں کہ اس کے بھاری جسم کا سارا بوجھ انھی پر پڑا تھا۔
"اپنے ماتحتوں کے سامنے اور ذلیل ہونے سے بہتر ہے' انہیں یہاں سے چلتا کر دو تاکہ میں اکیلے میں تم سے اپنا حساب چکا سکوں"۔ میں پھر بولا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے ہمزاد کو مخاطب کیا۔ "ان دونوں کو اٹھا کر باہر پھینک دو!"
میرے حکم کی دیر تھی کہ ہمزاد نے ان دونوں سپاہیوں کو بہ یک وقت گردنوں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور پھر وہ گویا فضا میں تیرتے ہوئے باہر جا کے گرے۔ یہ منظر بھی ایس ایچ او کی عقل گم کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں طور پر نظر آنے لگے تھے۔

"دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھا دو!" میں نے ہمزاد کو دوسرا حکم دیا۔
تعمیل حکم میں دیر نہ ہوئی۔ ایس ایچ او نے یقیناً یہی دیکھا ہو گا کہ دروازہ خود بہ خود بند ہوا اور پھر خود ہی چٹخنی چڑھ گئی۔ اب وہ میرے ہی قریب کھڑا ہوا حیرت سے سب کچھ دیکھ رہا تھا اور غالباً حیرت کی زیادتی نے تکلیف کے احساس کو ختم کر دیا تھا۔

"جاکر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ ابھی تمہیں ایک کے دو نظر آنے لگیں گے"۔ یہ جملہ میں نے دانستہ کہا تھا اور اسی کے ساتھ ہمزاد کو ظاہر ہو جانے کا اشارہ کیا تھا۔ ہمزاد میرے قریب ہی ند قدم دور ایس ایچ او کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ میں نے ایس ایچ او کا شانہ تھپتھپایا اور بولا۔ ی نہیں تم نے میری بات!"

اس نے میری طرف دیکھا" پھر اپنے سامنے کھڑے ہوئے ہمزاد پر نگاہ ڈالی اور پھر شت سے چیخ اٹھا۔ "نن.... نہیں!"

"میں کہہ رہا تھا نا تم سے کہ تمہیں ایک کے دو نظر آنے لگیں! اب بھی بیٹھ جاؤ اپنی کرسی پر!"

وہ اتنا بے حواس ہو چکا تھا کہ پلٹ کر لرزتے کانپتے قدموں سے اپنی کرسی کی طرف ھا اور اسی وقت میں نے ہمزاد کو اس کی نظروں سے اوجھل ہو جانے کا اشارہ کر دیا۔ وہ میز کا ارا لیتا ہوا آخر کار اپنی کرسی پر بیٹھ ہی گیا۔

میں اس کی میز کے سامنے کھڑا تھا۔ "اب دیکھو، میں تمہیں ایک ہی نظر آرہا ہوں گا!"

"وہ..... وہ دوسرا..... تمہا..... تمہارا ہم شکل.... کال..... کہاں گیا؟" وہ خوف کے بب ٹھیک طرح بات نہیں کر پا رہا تھا۔

"یہاں تو میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ دراصل تمہارا دماغ چل گیا ہے"۔ یہ کہہ کر میں یز کے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

ایس ایچ او کی حالت اس وقت کسی ایسے خوف زدہ شخص کی سی تھی جسے اپنی جان کا طرہ ہو اور موت اس کے سامنے کھڑی ہو۔ کبھی اس کے رخسار پھڑک رہے تھے، کبھی ونچھیں اور کبھی گول گول دیدے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

اچانک دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔ اسی کے ساتھ ہی مجھے اے ایس آئی کی جانی چانی آواز سنائی دی۔ "دروازہ کھولیے سر!"

میں نے کچھ سوچتے ہوئے اس سے کہا۔ "جاؤ دروازہ کھول دو جا کر اور صرف اس ے ایس آئی کو اندر بلا لو! چلو اٹھو!" میں نے ڈانٹ پلائی، پھر بولا۔ "دروازہ کھول کر اگر بھاگنے کی کوشش کی تو پھر زبردستی اسی کمرے میں لے آئے جاؤ گے! سمجھ ئے!" میں اس کے چہرے پر پائے جانے والے تاثرات سے سمجھ گیا تھا کہ اس کا کیا ارادہ ہو سکتا ہے! اسی لیے دھمکی دی تھی۔

وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا اور پھر باری باری اپنی کہنیاں سہلاتا ہوا کراہنے لگا۔ اسی دوران

میں دوبارہ دستک ہوئی۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا، جن دو سپاہیوں کو ہمزاد نے کمرے سے اٹھا کر باہر پھینکا تھا انہوں نے اندر کا آنکھوں دیکھا حال باہر "نشر" کیا ہو گا۔ اسی سبب دروازے پر دستکیں سنائی دے رہی تھیں۔

"چلو جلدی کرو!" میں پھر سختی سے بولا۔

ایس ایچ او مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اپنی کرسی کو ذرا سا آڑا کر لیا تاکہ دروازہ میری نظر میں رہے۔ ایس ایچ او نے دروازے کے قریب پہنچ کر چٹخنی گرا دی۔ دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا۔ دوسری جانب کھڑے ہوئے لوگوں سے یہ حماقت سرزد ہوئی کہ انہوں نے چٹخنی گرنے کی آواز سنتے ہی ایک دم دونوں پٹ کھول دیے۔ ان کا افسر ابھی دروازے کے سامنے سے ہٹ نہیں سکا تھا کہ یہ واقعہ پیش آ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دروازے کے پٹ اس کی پیشانی پر لگے اور وہ اپنے جسم کا توازن نہ سنبھال سکا اور زمین پر آ رہا۔

دروازہ کھلتے ہی بہت سے پولیس والے بھرّا مار کر اندر آ گئے۔ آگے آگے اے ایس آئی تھا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنے افسر کو اٹھنے میں مدد دی جس کے منہ سے گالیوں کا طوفان ابل رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر بڑا سا گومڑا پڑ گیا تھا۔ غصے کی وجہ سے اس کا خوف غائب ہو گیا تھا۔

"تم سب کو کس نے بلایا تھا نمک حرامو!" ایس ایچ او زمین سے اٹھتے ہوئے چیخنے لگا۔

"سر!..... سر! وہ اللہ داد اور....."

ایس ایچ او نے اے ایس آئی کی بات کاٹ کر سپاہی اللہ داد اور دوسرے سپاہی کو گالیاں دیں، پھر چیخا۔ "نکل جاؤ تم سب میرے کمرے سے!"

"مگر سر!....."

"سر کا بچہ!" اس مرتبہ بھی اس نے اے ایس آئی کی بات پوری نہ ہونے دی۔

سپاہیوں کی کیا مجال تھی کہ اس کے بعد وہاں رک سکتے۔ وہ سب ایک ایک کر کے وہاں سے کھسکنے لگے۔ اے ایس آئی بھی پلٹ کر جانے لگا تو میں چپ نہ رہ سکا۔ "ملک صاحب کو تم سے بات کرنا ہے، تم نہیں جاؤ گے!"

اے ایس آئی نے سوالیہ نظروں سے اپنے افسر کی طرف دیکھا جو اپنی پیشانی کو آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے "ہائے ہو" کر رہا تھا۔ میری آواز سن کر وہ چونکا، پھر اس کا چہرہ دوبارہ تاریک ہونے لگا۔ اس نے مردہ سی آواز میں بات کی تصدیق کر دی۔

"سپاہیوں سے کہہ دو کہ ملک صاحب تفتیش کر رہے ہیں' کوئی ادھر نہ آئے!" میں نے اے ایس آئی سے حکمیہ لہجے میں کہا۔ "اور پھر دوبارہ دروازہ بند کرکے چٹخنی لگا دو!"

اس نے میرے لہجے پر برا سا منہ بنایا اور ایک بار پھر تصدیق طلب انداز میں اپنے افسر کی طرف دیکھا۔

پھر اس سے پہلے کہ ایس ایچ او میرے الفاظ اپنی زبان سے دہراتا' میں بول اٹھا۔ "ابے گھامڑ! میں تجھے جو حکم دے رہا ہوں' وہ تیری عقل میں نہیں بیٹھ رہا اور اپنے ابّا حضور کی طرف احمقوں کی طرح دیکھے جا رہا ہے!"

اس کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا۔ "سس..... سر! آ.... آپ دیکھ رہے ہیں کہ..... کہ یہ شخص....." غصّے کی وجہ سے اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اپنے افسر کی موجودگی میں اس کی یہ ہمت تو نہ ہوئی کہ مجھ سے بہ راہ راست کچھ کہتا' ہاں شکایت کرنے لگا۔

"ابے رشوت خور! تیرا سر کیا بولے گا اور کیا دیکھے گا! جو کہہ رہا ہوں' وہ کرو ورنہ بعد میں پچھتائے گا۔ دیکھ نہیں رہا تیرے سر کے سر پر ایک اور سر نمودار ہو گیا ہے!" میرا لہجہ انتہائی توہین آمیز تھا اور وہ شخص' وہ راشی اسی قابل تھا۔

"جو یہ کہہ رہے ہیں کرو!..... جلدی!" آخر ایس ایچ او کو بولنا ہی پڑا۔ پھر وہ میری طرف ملتجی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "تم.... تم آخر چاہتے کیا ہو؟"

"جلدی کیا ہے' ابھی بتا دوں گا' اپنی کرسی پر تو آ کر بیٹھ میرے چاند!" میں نے مسکراتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اے ایس آئی غالباً سمجھ گیا تھا کہ معاملہ گمبھیر ہے کیوں کہ اس کے سامنے ایس ایچ او کی "کھنچائی" بھی ہو رہی تھی۔ اس نے اسی لیے فوراً" تعمیل حکم کی اور پھر دروازے کو بند کرکے چٹخنی چڑھا دی۔ اس کے بعد وہ میز کی ایک جانب مستعد ہو کر آ کھڑا ہوا۔ اس دوران میں ایس ایچ او اور اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے اے ایس آئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے افسر کو مخاطب کیا۔ "اس نے بھی مجھ سے رشوت لی تھی۔ تمہیں حصّہ دیا تھا؟"

"کب؟..... کب کی بات ہے یہ؟" ایس ایچ او نے مردہ سی آواز میں پوچھا۔

"سر! دراصل اُس..... بہت..... بہت دن کی بات ہے۔ آپ..... آپ اس روز دیر سے آئے تھے میں اسی لیے بھول....." اے ایس آئی اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

"تم چپ رہو اُلّو کی دُم!" میں نے اسے ڈانٹ پلائی اور اسی کے ساتھ ہمزاد کو اشارہ کیا۔

تڑاخ سے اے ایس آئی کے منہ پر چانٹا پڑا اور اس کی گردن گھوم گئی۔ وہ اپنا رخسار سہلاتے ہوئے حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"اب درمیان میں بولے تم تو دوسرے رخسار پر بھی انگلیوں کے نشان بن جائیں گے!" میں نے اے ایس آئی کو گھور کر کہا' اور وہ بدحواس نظر آنے لگا۔ پھر میں ایس ایچ او کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم شاید یہ سمجھ رہے ہو گے کہ میں بے وقوف ہوں' مجھے کچھ خبر نہیں اور تم اسی طرح حرام کا مال ہضم کر جاؤ گے! تم اتنے گرے ہوئے اور گھٹیا آدمی ہو کہ اس غریب نرس نادرہ کو بھی نہیں بخشا۔ تم نے مجھ سے رقم اینٹھی تو اینٹھی' اس غریب پر بھی تمہیں رحم نہیں آیا۔ کان کھول کر سن لو"۔ یہ کہہ کر میں نے اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔ "اور تم بھی اے چھوٹے حرام خور! اب تک میرے سلسلے میں جتنا روپیہ اینٹھا ہے' ایک گھنٹے کے اندر اندر مجھے واپس مل جانا چاہیے! اس کے علاوہ نرس نادرہ کی رقم بھی اسے بھجوانا ہے۔ ایک گھنٹہ گزر جانے کے بعد میں کوئی رعایت نہیں کروں گا' تم لوگوں کے ساتھ! باقی باتیں بعد میں ہوں گی..... اور ہاں وہ تمہارے ابّا جی کی حویلی نہیں تھی جو اب کھنڈر بن چکی ہے' اس کے تمام کاغذات بھی مجھے واپس چاہئیں! اگر اس کے خلاف ہوا یا تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو حشر خراب کر دوں گا! سپاہی کو بلاؤ یہ ایک گھنٹہ میں تمہاری قید ہی میں گزاروں گا۔ مجھے حوالات میں بند کرا دو"۔ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرے لہجے میں چبھن تھی۔ خصوصاً" لفظ قید پر میں نے زور دیا تھا۔

خلاف توقع میرے آخری الفاظ کا اثر ایس ایچ او پر الٹا ہوا۔ اس کی بجھی بجھی سی آنکھوں میں روشنی آ گئی۔ غالباً وہ احمق یہ سمجھ رہا تھا کہ حوالات میں بند کرنے کے لیے کہہ کر گویا میں نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ اس کا ثبوت اس کا چاپلوسانہ انداز بھی تھا اور لہجے کی عیّاری بھی! اس نے بہ ظاہر بڑے خلیقانہ انداز میں نیم تبسم کے ساتھ کہا۔ "جناب! پیسوں کی واپسی کا معاملہ تھا تو پہلے ہی بول دیتے آپ! ہم تو خادم ہیں آپ کے ہمارے لیے آپ سے زیادہ روپیہ تو نہیں ہے نا! میں ابھی اپنے بینک سے روپیہ نکلواتا ہوں"۔ پھر وہ اے ایس آئی سے مخاطب ہوا۔ "تم سے تو میں سمجھوں گا اچھی طرح! ساری رقم اکیلے ہضم کر گئے! یہ بھی نہیں سوچتے تم لوگ کہ شریف شہریوں سے کیا سلوک کرنا چاہیے! اب اگلی دو سارا مال جو ہضم کیا ہے' ہاں!" یہ کہہ کر وہ خود اپنی سیٹ سے اٹھا اور اے ایس آئی کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہی وہ اے ایس آئی سے کُھسر پُھسر کرنے لگا' پھر ایک سپاہی کو

زور سے آواز دی۔

میں اس کی بے وقوفی پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے؟" ہمزاد نے سرگوشی کی۔

"ابھی رہو ساتھ"۔ میں نے جواب دیا۔

"بہت بہتر ہے"۔ اس نے ادب سے کہا۔

وہ میرے اشاروں کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور انہی پر عمل کرتا تھا۔ میرا ہمزاد' میرا مزاج شناس تھا۔ اس کے لیے معمولی سا اشارہ کافی ہوتا تھا کہ میں کب کیا چاہتا ہوں!

ایس ایچ او لوٹ کر آیا تو اے ایس آئی کی بجائے اس کے پیچھے پیچھے ایک سپاہی تھا۔ کمرے میں گھستے ہی اس نے سپاہی سے کہا۔ "یہ سمجھ لو اچھی طرح کہ یہ بہ طور مہمان حوالات میں ہیں انہیں ذرا بھی پریشانی ہوئی یا ان کے آرام میں کوئی کسر رہ گئی تو تم جانتے ہو مجھے!"

"یس سر! حکم کی تعمیل ہو گی جناب عالی!" سپاہی مستعدی سے کھڑا ہو گیا اور ایس ایچ او اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

"انہیں عزت کے ساتھ حوالات تک لے جاؤ"۔ ایس ایچ او نے حکم دیا۔

"میں اٹھ کر کھڑا ہوا' پھر چلتے چلتے کہا۔ "تمہیں یاد ہے نا جو کہا ہے میں نے؟"

"بالکل جناب!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ایک گھنٹے کے اندر اندر سب کام ہو جائے گا۔ آپ بالکل بے فکر رہیں"۔

ایس ایچ او کے کمرے سے نکل کر میں نے فضا میں ایک تناؤ سا محسوس کیا۔ جس چہرے پر بھی نظر پڑی' اس پر کھنچاؤ سا تھا' مگر اے ایس آئی مجھے نظر نہ آیا۔ برآمدے سے گزر کر میں' سپاہی کے ساتھ تھانے کے صحن میں آیا' پھر حوالات کی طرف بڑھنے لگا۔

"ذرا ہوشیار رہنا' کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے"۔ میں نے ہمزاد سے سرگوشی کی۔

"جی ہاں میرا بھی یہی خیال ہے"۔ میرے ساتھ ساتھ چلنے والے سپاہی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"کچھ مجھ سے فرمایا جناب!" میرے ساتھ ساتھ چلنے والے سپاہی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"نہیں"۔ میں نے صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا۔

اب حوالات کا دروازہ سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ سپاہی کے ساتھ دو تین سیڑھیاں چڑھ کر میں برآمدے میں پہنچا اور پھر سپاہی نے آگے بڑھ کر حوالات کا آہنی دروازہ کھول دیا۔

ابھی میں نے حوالات میں قدم رکھا تھا کہ اچانک نہ جانے کدھر سے سات آٹھ پولیس والے لاٹھیاں سنبھالے تیزی سے حوالات میں گھس آئے اور پھر ان کی لاٹھیاں بلند ہوئیں۔ میں ان کے نرغے میں تھا' مگر لاٹھیاں میرے جسم کی بجائے زمین پر پڑیں اور میں ان سے دور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہمزاد نے اگر ایک لمحے بھی تاخیر کی ہوتی تو میں اس وقت لہولہان زمین پر پڑا ہوتا۔ وہ میرے جسم کو اٹھا کر ان کے نرغے سے نکال لایا تھا۔

لمحہ بھر میں ایک ناقابل یقین واقعے نے سپاہیوں کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ پھر میری طرف پلٹے۔

ہمزاد نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ کٹھ پتلیاں ہیں' اور اپنے افسر کے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں اس لیے ان کے لیے معمولی سزا کافی ہے"۔ میں نے ہمزاد سے سرگوشی کی۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور میرے سامنے آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے حوالات میں ایک دلچسپ تماشا شروع ہو چکا تھا اور میں یہ تماشا حوالات کے دروازے کے قریب کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا۔ وہ سب اب ایک دوسرے سے الجھ پڑے تھے۔

ذرا ہی دیر میں دو ایک کے سر پھٹ گئے۔ وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ ایک دوسرے پر لاٹھیاں برسا رہے تھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان پر دیوانگی طاری ہو گئی ہے۔ پھر میں نے ایک کو زخمی ہو کر زمین پر گرتے دیکھا۔

"بس کرو!" میں نے ہمزاد کو حکم دیا۔

معاً یوں لگا جیسے ان سب کو ہوش آ گیا ہو۔ ان کے ہاتھ رک گئے اور پھر اگلے لمحے وہ اس طرح حوالات سے نکل کر بھاگے جیسے موت ان کا پیچھا کر رہی ہو۔ زمین پر پڑا ہوا زخمی بھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے سارے چہرے پر خون پھیلا ہوا تھا جس کے سبب وہ بہت بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بھی گرتا پڑتا حوالات سے نکل گیا۔

حوالات کے باہر اب بھی وہ سپاہی موجود تھا جو مجھے ایس ایچ او کے کمرے سے یہاں تک لایا تھا۔ اس کے چہرے پر دہشت کے آثار تھے۔

"دروازہ باہر سے بند کر کے تالا ڈال دو!" میں نے اسے حکم دیا۔

"جج ...... جی بہ ...... بہتر جناب عالی!" اس نے فوراً ہی میرے حکم کی تعمیل کی اور پھر دروازے سے الگ ہٹ گیا۔ اس کا سبب یقیناً خوف ہی تھا۔ اس نے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا' پھر بھلا اس پر اثر کیوں نہ ہوتا!

میں اطمینان کے ساتھ فرش پر بچھے ہوئے کمبل پہ بیٹھ گیا۔ ہمزاد میرے سامنے مودب کھڑا تھا۔

"ذرا معلوم کرو کہ ایس ایچ او پر کیا ردِ عمل ہوا ہے!..... اور ہاں یہ خیال رکھنا کہ وہ راہ فرار اختیار نہ کرپائے اور وہ اے ایس آئی بھی نہ بھاگنے پائے"۔ میں نے ہمزاد سے کہا۔

"ابھی جو واقعہ پیش آیا اس میں یقیناً ایس ایچ او کا ہاتھ ہے۔ وہ مجھ پر پولیس کے مخصوص حربے آزما رہا ہے۔ بعد میں کہہ دیتا کہ میری زبان کھلوانے کے لیے اس نے مجھ پر تشدّد کیا تھا اور میں اسی دوران میں اللہ کو پیارا ہو گیا یا شدید زخمی ہو گیا۔ بہرحال اس نے یہ حرکت کر کے اپنے ہی لیے گڑھا کھودا ہے، تم جاؤ"۔

ہمزاد غائب ہو گیا اسے قابو میں کرنے کے بعد روپیہ پیسہ یا بڑی سے بڑی دولت میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں میں نے ایس ایچ او، اور اے ایس آئی سے رقم کی واپسی کا مطالبہ اس لیے کیا تھا کہ وہ رقم بہرحال ان دونوں کے لیے ناجائز اور حرام تھی میں وہ رقم کسی بھی ضرورت مند کو بخش سکتا تھا، مگر ان حرام خوروں کے پاس نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ انہوں نے رقم کا بڑا حصّہ یا کچھ رقم خرچ کر دی ہو، مگر مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مجھے پوری رقم مطلوب تھی چاہے وہ کسی بھی طرح اس کا بندوبست کرے۔ میں نے انہیں ایک گھنٹے کی مہلت دی تھی اور میرے نزدیک یہ کافی تھی۔ اب یہ ان پر منحصر تھا کہ وہ اس ایک گھنٹے کی مہلت کو میرے خلاف سازشیں کرنے میں گزارتے یا رقم کا بندوبست کرتے۔

معاً مجھے یہ خیال آیا کہ ہمزاد کہاں ہو گا؟ اور اسی خیال کے ساتھ مجھے اپنے تصور کی قوّت یاد آئی۔ میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔ کیا یہ قوت بھی بے حال ہو چکی ہے؟ تصوّر کی قوّت بھی معمولی نہیں تھی۔ اس سے میں نے بہت سے کام لیے تھے۔ میں آنکھیں بند کر کے جس شخص یا جس جگہ کا بھی تصوّر کرتا، وہ مجھے نظر آنے لگتی۔ نہ صرف یہ بلکہ وہاں ہونے والی گفتگو بھی مجھے صاف سنائی دیتی اور سارا منظر بھی واضح نظر آتا، یوں جیسے میں خود وہاں موجود ہوں۔ اس میں مختصر یا طویل فاصلے کی کوئی قید نہیں تھی۔ اپنی اسی قوت کو آزمانے کی خاطر میں نے آنکھیں بند کر کے ایس ایچ او کا تصوّر کیا کیوں کہ میرے ہمزاد کو اسی کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ اس کے لیے مکمل ذہنی یک سوئی کی ضرورت تھی کہ جو کچھ سوچا جا رہا ہے، اس کے سوا کوئی اور خیال ذہن میں نہ آئے۔ مجھے اس کی مشق تھی۔ ذرا ہی دیر بعد میرے صفحۂ ذہن پر ایس ایچ او ملک کی صورت کے نقوش واضح ہونے لگے۔ پھر جب چند لمحے بعد اس کی شکل مجھے

واضح طور پر نظر آنے لگی تو میں نے اپنے تصوّر کے دائرے کو مزید پھیلا دیا۔

اب میں واضح طور پر سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔ مجھے اپنا ہمزاد بھی وہیں نظر آ گیا تھا۔ اس حالت میں اپنے ہمزاد سے بھی گفتگو کر سکتا تھا جسے کوئی اور نہیں سن سکتا تھا۔ وہ کمرا میرے لیے نیا نہیں تھا جہاں اس وقت ایس ایچ او ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ایس پی کا کمرا تھا جو اس وقت اپنی کرسی پر موجود تھا۔ میرا ہمزاد ایس پی کے قریب ہی کھڑا تھا۔

"نئیں تم جھوٹ بولتا اے"۔ ایس پی کہہ رہا تھا۔

"سر آپ یقین کریں، میری بہن کی طبیعت بہت خراب ہے۔ مجھے آج ہی کی کسی فلائیٹ سے ڈھاکہ پہنچنا ہے"۔ ایس پی کو یقین دلانے کی خاطر ایس ایچ او پر زور لہجے میں بولا۔

"تم کو ال آم ہوا کہ تمہارا ابین کا طوبیعت کھوراب اے؟"

"آج صبح ٹیلی گرام ملا ہے سر!"

"فیر ٹیلی گرام بتاؤ کدر اے!"

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ میرا ہمزاد ایس پی پر مسلط ہے اور وہی ایس پی کے دماغ میں یہ باتیں ڈال رہا ہے اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ایس ایچ او، چاٹگام سے فرار ہونے کا منصوبہ بنا چکا ہے وہ اسی لیے ایس پی کے پاس نظر آ رہا تھا کہ چھٹی لے کر غائب ہو جائے اور میں تلملاتا رہ جاؤں۔

ایس پی نے ٹیلی گرام دکھانے کے لیے کہا تو ایس ایچ او لمحہ بھر کو سٹپٹا گیا، مگر پھر سنبھل کر فوراً ہی بولا۔ "سر! ٹیلی گرام گھر کے پتّے پر آیا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گے تو میں ٹیلی گرام ساتھ لے کر آتا گھر سے!"

"ٹیلی گرام تو تم کو بتانا پوڑے گا! کسی کانسٹیبل کو اودھر بھیج کر مونگا لو"۔ ایس پی نے اسے گھور کر کہا۔ "گوڑ بوڑ گھٹالا نئیں چلے گا سمجھا!"

"ٹھیک ہے سر! ایس ایچ او مردہ سی آواز میں بولا۔ "اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو مجھے ایسی چھٹی نہیں چاہیے!" وہ اپنا جھوٹ چھپانے کے لیے اداسی کی اداکاری کرنے لگا اور پھر ایک دم کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھو ابی! ایس پی کے لہجے میں سختی تھی۔

ایس ایچ او نے اپنے افسر کے تیور دیکھ کر فوراً گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا اور عاجزی کے ساتھ "یس سر" کہتا ہوا دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ابی بوم کا دا ما کا ہوا، تم نے کیا کیا؟ تم موزریم کو گرپتار کیا؟ آئی جی صیب ام کو پھون

پر بولا' آمارا سیمت سب کو ٹرمنیٹ کردے گا! ابی بولو تم کیا بولتا اے!"

"تفتیش جاری ہے سر! یہ کوئی بہت بڑا تخریب کار گروہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ اتنی جلدی ہاتھ نہیں آئیں گے سر! پھر ہمارے پاس نفری بھی کم ہے"۔

"تم اِدر اُدر کا بات کرکے گول مال نئیں کر سکتا۔ نپری میری ام کچھ نئیں سنے گا سمجھا! موزریم مانگتا بس!"

"میں نے ناکہ بندی کر دی ہے سر! وہ بچ کر نہیں نکل سکتے سر! ایک مخبر نے اطلاع دی ہے کہ ان کا اڈا چاٹگام ہلز میں ہے وہ جلد ہی پکڑے جائیں گے۔ الجھی ہوئی ڈور کا سرا مل گیا ہے سر! بس اب چھاپا مارنے کی دیر ہے۔ بس مجھے اطلاع کا انتظار ہے کہ وہ اپنے اڈے پر موجود ہیں"۔

"اُر جس کا کوئی تھا...... سیکھ کو رامت' اس کا تم نے کیا کیا؟ ایس پی نے سوال کیا۔

"سر! وہ بہت پکّا ہے۔ اس نے اب تک زبان نہیں کھولی"۔

ایس پی نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ "ام کو لگتا ہے تم نے اس کو بے کسور بند کیا اے"۔

"نئیں سر' ایسا نہیں ہے اس کے خلاف ہمارے پاس کئی ثبوت موجود ہیں محلے والوں نے اس کے بارے میں جو درخواست بھیجی تھی اس کی تفتیش کے نتیجے میں وہاں سے لڑکیاں برآمد ہوئی ہیں ان پر تشدد کیا گیا تھا۔ انہیں حبس بیجا میں رکھا گیا تھا سر! اور...... اور سر ان کی عزت بھی......"

"تم نے بیان لیا ان کا؟"

"یس سر! ان سب کے بیان موجود ہیں"۔

"کیس کی فائل موںگواؤ"

"میں خود ابھی لے کر آتا ہوں سر! اسے میں نے اپنی کسٹڈی میں رکھا ہے اور خود ذاتی طور پر اس کی تفتیش کر رہا ہوں"۔ ایس ایچ او اپنے نمبر بڑھانے کے لیے جلدی جلدی کہنے لگا۔ پھر وہ واپس کا اشارہ پاکر میرے کیس کی فائل لینے چل دیا۔

میں نے اسی وقت ہمزاد کو وہاں سے غائب ہوتے دیکھا میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے! میرے اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے اپنے تصور کا سلسلہ منقطع کیا اور آنکھیں کھول دیں۔ میرا ہمزاد ایس ایچ او کو مناسب سزا دے رہا تھا۔ مجھے ایس ایچ او پر بالکل ترس نہیں آیا کیوں کہ وہ مجھ پر ابھی کچھ دیر پہلے قاتلانہ حملہ کرا چکا تھا۔ بالفرض میں زندہ بھی رہ جاتا

تو اپنے ہاتھ پیروں سے ضرور محتاج ہو جاتا۔ دوسری جانب اس طرح کوئی ثبوت نہ ہونے کی صورت میں پولیس کے پاس کوئی جواز نہ رہتا کہ مجھے زیر حراست رکھا جا سکتا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ہمزاد میرے پاس واپس آگیا۔ اس نے مجھے آتے ہی بتایا کہ "میں نے وہ تمام ثبوت تلف کر دیے ہیں جو آپ کے خلاف پولیس کے پاس موجود تھے"۔

"میں بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ تم ایسا کرو گے"۔ میں بولا' پھر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "مگر شاید ایک جگہ تک تمہاری رسائی نہیں ہوئی......"

"آپ غالباً اس درخواست کے بارے میں کہہ رہے ہیں جس کی ایک نقل آئی جی کو بھی آپ کے محلّے والوں نے بھیجی تھی!" ہمزاد میری بات کی تہ تک پہنچتے ہوئے فوراً ہی بولا۔

"تم بالکل ٹھیک پہنچے"۔ میں نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔

وہ مسکرایا' پھر کہنے لگا۔ "جب آئی جی کے دفتر میں اس درخواست کی نقل کو تلاش کیا جائے گا تو وہ بھی نہیں ملے گی۔ میں ہر کام پورا کرتا ہوں کہ کوئی گنجائش نہ رہے۔ آئی جی' ایس پی اور ایس ایچ او کسی کے پاس بھی آپ کے خلاف کوئی تحریری ثبوت نہیں"۔

"زندہ باد!" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "اسی لیے تو میں تم پر فخر کرتا ہوں' پھر معاً" مجھے اپنی ان ملازماؤں کا خیال آگیا جنھوں نے مہ پارہ کے سحر میں آکر میرے خلاف پولیس کے سامنے بیانات دیے تھے' مگر اب مہ پارہ کا سحر ٹوٹ چکا تھا۔ اگر پولیس دوبارہ ان سے رابطہ قائم کرتی کہ میرے خلاف بیان حاصل کرے تو وہ میری بجائے شمبھو کا نام لیتیں جبکہ حقیقت بھی یہی تھی۔ ان پر میں نے نہیں شمبھو نے تشدد کیا تھا گویا اصل مجرم میں نہیں شمبھو تھا۔ پولیس اسے تلاش کرتی۔ اس نکتے پر سوچتے ہوئے مجھے مظلوم سریتا یاد آگئی جو شمبھو کے قبضے میں تھی۔ شمبھو اور سریتا' دونوں ہی غائب ہو گئے تھے۔ مجھے انہیں بھی تلاش کرنا تھا' لیکن میں ابھی سب سے پہلے پولیس کے چکّر سے نکلنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد ہی کچھ اور سوچا جا سکتا تھا میں اپنے سابق شریک کار نصیرالدّین کو بھی بھولا نہیں تھا جس بے ایمان نے میری شرافت اور مجبوری سے فائدہ اٹھا کر سارے کاروبار پر قبضہ کر لیا تھا یہی نہیں بلکہ اس نے مجھے اپنا مقروض ظاہر کر کے مجھ پر دعویٰ بھی دائرہ کر دیا تھا۔ پولیس سے نمٹنے کے بعد میں اس جعل ساز کو سبق دینا چاہتا تھا۔ رہا دوسرا کیس جس کا تعلق چاٹگام کی بلدیہ سے تھا تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی میرے وکیل نے عدالت میں کوٹھی کے ری اسسمنٹ کی جو درخواست دی تھی۔ اس کا مقصد محض وقت گزاری تھا تاکہ میں اپنے عمل کی مدّت پوری کر لوں۔ اگر بلدیہ مجھے حرجانہ ادا کر کے وہاں سے سڑک نکالنا چاہتی تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ یوں بھی اب میری

کوٹھی کھنڈر بن چکی تھی۔ ہاں مجھے وہاں سے اپنی اہم اور نایاب کتابیں ضروری نکالنا تھیں۔ اس کے سوا نہ مجھے جگہ کی قیمت سے دلچسپی تھی نہ کسی اور بات سے تسخیر ہمزاد کے بعد اب میرے لیے کوئی مسئلہ 'مسئلہ نہیں رہ گیا تھا۔

"آپ خاموش کیوں ہو گئے؟ کیا کوئی خاص بات ہے جس پر غور کر رہے ہیں؟" ہمزاد نے پوچھا۔

"ہاں"۔ یہ کہہ کر میں نے اسے مختصر حالات سے آگاہ کر دیا کہ چالیس دن کے دوران میں مجھ پر کیا کیا ستم ٹوٹے ہیں!"

اس نے میرے ہمت و حوصلے کی داد دی اور پھر وہی مشورہ دیا جس کے بارے میں پہلے ہی میں فیصلہ کر چکا تھا' یعنی دشمنوں سے ایک ایک کر کے نمٹا جائے فی الحال پولیس کا معاملہ اس کے نزدیک بھی اولیت کا حامل تھا آخر میں اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آج یہ معاملہ نمٹ جائے گا۔ میں ایس پی کے ذہن میں مزید شکوک و شبہات پیدا کر دوں گا اور پھر حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔ آپ کے کیس کی فائل غائب ہو جانے کے بعد یوں بھی ایس ایچ او کی نوکری خطرے میں پڑ گئی ہے۔ اس وقت ایس پی اس پر برس رہا ہو گا"۔

ہمزاد غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ ایس ایچ او کا بچنا اب محال ہی تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ پولیس کی تحویل سے کسی کیس کے تمام ثبوت اور شواہد غائب ہو جاتے' اس کا ذمے دار بہرحال ایس ایچ او تھا۔

"اجازت ہو تو میں جاؤں تاکہ اس راشی ایس ایچ او کا معاملہ نمٹ ہی جائے"۔ ہمزاد مجھے خاموش دیکھ کر بولا۔

"ہاں جاؤ"۔ میں نے اسے اجازت دے دی' پھر فوراً ہی کہا"۔ ٹھہرو اس اے ایس آئی کا کیا ہوا؟ وہ کہاں ہے؟"

"وہ اپنے گھر گیا ہے"۔ ہمزاد نے بتایا۔ رشوت کی ساری رقم اور اپنی پوری تنخواہ وہ اپنی بیوی کے ہاتھ میں لے جا کر دے دیتا ہے وہ انہی لوگوں میں سے ہے جن پر ان کی بیویاں حکومت کرتی ہیں"۔

"تو گویا اس کی بیوی کو بھی معلوم ہو گا کہ اس کا شوہر راشی ہے!"

"یقیناً اس وقت وہ اپنی بیوی کے سامنے گھگیا رہا ہو گا کہ مطلوبہ رقم واپس کر دے۔ وہ آپ سے بے حد خوف زدہ ہو گیا ہے اور رقم لینے ہی گھر گیا ہے ۔" "چلو ایک کے تو کس بل نکلے!" میں طویل سانس لے کر بولا"۔ اب تم دوسرے کو سنبھالو جا کر! یہ کہتے ہوئے

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی' طمانیت کی مسکراہٹ!

اب ظہر کا وقت قریب تھا اس لیے میں نے وضو کر لیا۔ اسی دوران میں اذان ہو گئی۔ پولیس کے خلاف یہ سب کچھ کر کے میرے ضمیر پر بوجھ نہیں تھا۔ میں نے ایس ایچ او اور اے ایس آئی کو جو مہلت دی تھی کبھی کی گزر چکی تھی۔ اس کے علاوہ یہ کہ کم از کم ایس ایچ او کی نیت صاف نہیں تھی اس نے میری دی ہوئی مہلت سے فائدہ اٹھانے کی بجائے انتقامی کاروائی شروع کر دی تھی جس کا نتیجہ اسے بھگتنا پڑ رہا تھا۔ میرا ضمیر مطمئن تھا کیونکہ میں نے نہ کوئی گناہ کیا تھا نہ خلاف قانون کوئی کام۔ مجھے مہ پارہ نے خواہ مخواہ اپنی مطلب براری کے لیے پولیس کے چکر میں پھنسا دیا تھا اور ایس ایچ او نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا تھا اس نے نہ صرف میری کوٹھی اور رقم ہڑپ کر لی تھی بلکہ میری عزت نفس کو بھی شدید مجروح کیا تھا۔ وہ لالچی' خود غرض اور راشی شخص اب میرے نزدیک کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا۔ میں نے اسی لیے ہمزاد کو اجازت دے دی تھی۔ اگر ایس ایچ او میری دی ہوئی مہلت سے فائدہ اٹھا کر معاملے کو راستی کے ساتھ ختم کر دیتا تو شاید میں اسے معاف کر دیتا' مگر اس نے طاقت و اقتدار کے نشے میں میری زندگی سے سے کھیلنا چاہا تھا۔ وہ یقیناً مجرمانہ ذہنیت کا مالک تھا اور ایسے لوگوں کو معاف کر دینا' سزا نہ دینا گناہ ہے۔ یہ لوگ اس سانپ کی طرح ہوتے ہیں جو موقع ملتے ہی ڈس لیتا ہے۔ وہ اس کا اہل نہیں تھا کہ اسے قانون کا محافظ کہا جا سکے۔ میں اس کے پنجے سے نکل جاتا تو وہ کسی اور بے گناہ کی گردن اپنی گرفت میں لے لیتا۔

اطمینان و سکون کے ساتھ نماز پڑھنے کے بعد میں دعا مانگ کر فارغ ہوا تھا کہ حوالات کا دروازہ کھلا۔ آنے والا اے ایس آئی تھا۔ وہ آتے ہی میرے پیروں پر گر گیا۔

میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور سخت لہجے میں بولا۔ "سیدھے بیٹھو! تمہارا ایمان مجھے بہت کم زور معلوم ہوتا ہے۔ خدا کے سوا بندے کو کسی کے آگے نہیں جھکنا چاہیے!"

"میں..... میں دراصل دیر سے آنے کی معافی....."

"معافی مانگنے کا یہ طریقہ نہیں ہے!" میں اس کی بات کاٹ کر بہ دستور سخت بنا رہا۔ "معافی مجھ سے نہیں' خدا سے مانگو! گڑگڑاؤ اس کے سامنے اور توبہ کرو اپنے گناہوں سے!"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں"۔ وہ گلوگیر سی آواز میں بولا' پھر اپنی پھولی ہوئی پینٹ کی جیب سے سو سو روپوں کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا"۔ یہ ..... یہ ساڑھے تین ہزار ہیں۔ خدا کے لیے انہیں قبول کر لیجے! باقی ..... باقی رقم میری بیوی

سے خرچ ہو گئی ہے اور یہ ...... یہ بھی اس نے بڑی منت سماجت کے بعد دیے ہیں۔ مجھے اسی ...... اسی لیے دیر ہو گئی تھی"۔

"زن مرید! بے غیرت!" مجھے اس پر غصّہ آ گیا۔ "جھوٹ بولا ہو گا اس عورت نے تم سے! جب تم پوری تنخواہ اور حرام کی ساری کمائی اس کے ہاتھ میں لے جا کر دے دیتے ہو تو پھر کہاں جاتی ہے وہ ساری رقم؟ ...... چپ کیوں ہو' جواب دو!"

وہ حیرت اور خوف سے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے جب آخری الفاظ ادا کیے تو وہ ہکلانے لگا۔ "اسے ...... سے ...... میری بیوی کو زیورات کا بہت شوق ہے"۔

"اور تم نے اسے بے لگام چھوڑ دیا ہے! قصور وار وہ بھی ہے' مگر اس سے زیادہ تم قصور وار ہو کہ تم نے اسے حرام کی کمائی کا چسکا لگایا ہے' اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلانے کی کوشش کی ہے!"

"تن ...... تنخواہ اتنی کم ملتی ہے کہ ...... کہ اس میں گزر نہیں ہوتی سرکار! میرے پانچ بچے ہیں اور بوڑھے ماں باپ کی ذمے داری الگ ہے"۔ وہ روہانسی آواز میں اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ یہ وہی اے ایس آئی تھا جس نے مجھے بغیر کسی جرم کے ایک مرتبہ بند کر دینے کی دھمکی دی تھی اور زبردستی رشوت وصول کی تھی۔

"تم آنے والی نسلوں کو بھی جرم کی راہ پر ڈال رہے ہو۔ سوچو جس اولاد کو تم حرام کی کمائی کھلا کر پرورش کر رہے ہو' وہ بڑی ہو کر کیا بنے گی! حرام کھانے کا یہ جواز نہیں کہ تنخواہ کم ملتی ہے! رزق حلال کا ایک لقمہ' ایک سوکھی روٹی' حرام خوری سے کہیں بہتر ہے۔ تم نے اپنی اوقات کیوں بھلا دی کہ ہو کیا! اپنی حدود میں کیوں نہیں رہے! زیادہ کی ہوس کیوں کی! کیا تم صرف نام کے مسلمان ہو! کیا تم اس کے امتی کہلانے کا حق رکھتے ہو جو اپنے پیٹ سے پتھر باندھ کر سو جاتا تھا! ہوس نے تمہیں اندھا کر دیا ہے' تم بھول بیٹھے ہو کہ تم کون ہو! چند روزہ دنیا کی خاطر تم نے اپنی عاقبت خراب کر لی! کیا جواب دو گے تم اپنے خدا کو! یہی کہ تمہاری تنخواہ کم تھی اور ذمے داریاں بہت تھیں! یہی کہ تمہاری بیوی کو زیورات کا شوق تھا! تمہیں جہنّم کی آگ سے خوف نہیں آتا! تم گناہ کی دلدل میں ڈوب رہے ہو اور اپنے ساتھ اپنے لواحقین کو بھی جہنّم کی طرف دھکیل رہے ہو۔ یہ ان سے تمہاری محبّت نہیں' تم ان کے لیے اچھا نہیں کر رہے! برا کر رہے ہو' تو اس کی تمام تر ذمّے داری تم پر ہے' صرف تم پر!"

میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھ رہا تھا۔ برف پگھل رہی تھی اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔ یقیناً اس کے اندر سویا ہوا انسان جاگ اٹھا تھا اور شیطان کو شکست ہو چکی تھی۔

میں خاموشی سے اسے روتے ہوئے دیکھتا رہا' یہاں تک کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

حوالات کا دروازہ ابھی تک نیم وا تھا' مگر سپاہی وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ یا تو اے ایس آئی نے اسے وقتی طور پر دروازے کے سامنے کھڑے رہنے سے منع کر دیا تھا یا پھر وہ خود ہی وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ اگر دروازہ کھول کر وہ خود وہاں سے ہٹا تھا تو اس کی یہی وجہ ہو سکتی تھی کہ مجھ سے بے حد مرعوب ہو چکا ہے۔ میں نے دراصل اس طرف اسی لیے نگاہ کی تھی کہ کہیں اے ایس آئی کی ہچکیاں سن کر وہ سپاہی یا کوئی اور ادھر متوجہ نہ ہو گیا ہو۔ ادھر سے مطمئن ہو کر میں نے اے ایس آئی کا شانہ تھپکا اور پہلی بار نرمی سے اسے مخاطب کیا۔ "مجھے روپوں کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے محض تمہارے باطن کو بیدار کرنے کے لیے یہ مطالبہ کیا تھا۔ چپ ہو جاؤ! اور جیسا میں نے کہا ہے' خدا کے حضور آنسو بہاؤ۔ وہ گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب تم اپنی زندگی کا رخ بدل دو گے۔ ان روپوں کا اختیار میں تمہیں دیتا ہوں جس طرح چاہو خرچ کرنا۔ انہیں ایک دوست کی طرف سے نذرانہ سمجھ کر قبول کر لو۔ میں اپنی مرضی سے بہ طور امداد تمہیں یہ رقم دے رہا ہوں۔ یہ اب تم پر حلال ہے' مگر اس کے علاوہ تمہارے پاس جو کچھ تمہاری محنت کی کمائی سے ہٹ کر ہے' اسے راہ خدا میں خیرات کر دو۔ ممکن ہے تمہاری اس نیکی کا اجر تمہیں مل جائے اور ممکن ہے نہ ملے کیوں کہ خدا کی راہ میں دیا جانے والا مال بھی حلال ہونا چاہیے۔ تم اجر کی توقع نہ رکھنا' ہاں خدا کو تمہارا یہ عمل پسند آیا تو یقیناً تمہیں اس کا بھی اجر دے گا۔ اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ بس توبہ شرط ہے"۔

میرے بدلے ہوئے رویے نے اس پر اچھا اثر مرتّب کیا۔ کچھ دیر بعد اس کی حالت سنبھل گئی۔ ندامت کے آنسوؤں نے اس کے چہرے سے جیسے گناہوں کی سیاہی کو دھو دیا تھا۔ وہ اب حقیقتاً مجھے کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب وہ کرختگی نظر نہیں آ رہی تھی جو پہلے اس کی شخصیت کا حصّہ تھی۔

"آپ نے مجھے راہِ راست دکھا کر یقیناً مجھ پر احسان کیا ہے"۔ وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولا۔ "میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا"۔

"یہ احسان نہیں' ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے دینی بھائی کو نیکی کا راستہ دکھائے۔ یہ روپے اٹھا کر واپس جیب میں رکھ لو اور جاؤ۔

اس نے روپے لینے سے انکار کیا' مگر میرا اصرار بڑھا تو وہ راضی ہو گیا۔ اس کے چہرے سے اب بھی خجالت کا اظہار ہو رہا تھا۔

اے ایس آئی حوالات سے نکل کر جا رہا تھا کہ میں نے ہمزاد کو اندر آتے دیکھا، مگر اس نے حوالات کا دروازہ بند ہو جانے کے بعد ہی لب کشائی کی۔ اس کی اطلاع کے مطابق کچھ دیر بعد ہی مجھے رہا کیا جانے والا تھا۔

"یہ کیسے ہو گیا؟ اور تمہیں واپسی میں اتنی دیر کیوں ہو گئی؟" میں نے ایک ہی سانس میں اس سے دو سوال کر دیے۔

ہمزاد مجھے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ ہوا یہ کہ جب کیس کی فائل گم ہو گئی تو ایس پی نے ایس ایچ او سے تحریری جواب طلب کر لیا، اسی کے ساتھ زبانی بھی اسے بہت لتاڑ پلائی۔ ایس ایچ او نے اس کی خوشامد در آمد کر کے یہ اجازت لے لی کہ میری جو ملازمائیں ابھی تک اسپتال میں زیر علاج تھیں، ان کے بیانات دوبارہ لے سکے۔ پھر وہ سیدھا اسپتال کی طرف دوڑا۔ میری ملازماؤں نے اس مرتبہ وہی بیانات دیے جن کی مجھے توقع تھی۔ اب وہ مہ پارہ کے سحر سے آزاد تھیں اس لیے انہوں نے سچی بات کہہ دی۔ سارا الزام انہوں نے شمبھو پر لگایا جس نے زبردستی میری کوٹھی پر قبضہ کر لیا تھا۔ ایس ایچ او نے انہیں لاکھ دھمکیاں دیں اور ڈرایا کہ وہ مجھ پر الزام لگا دیں، مگر ایسا ممکن نہ ہوا کیوں کہ ہمزاد وہاں موجود تھا۔ اس طرف سے مایوس ہو کر ایس ایچ او نے میرے محلے والوں سے رابطہ قائم کیا، لیکن کوئی بھی میرے خلاف دوبارہ بیان دینے پر راضی نہ ہوا۔ انہوں نے اس سے بھی انکار کر دیا کہ ہم نے شیخ کرامت کے خلاف پولیس کو کوئی درخواست دی تھی۔ اس طرح وہ درخواست بھی مشتبہ قرار پائی جس کی بنیاد پر پولیس نے میرے خلاف کارروائی کی تھی۔ نتیجتہً ایس ایچ او مایوس ہو کر تھانے لوٹ آیا۔ اس کی ان حرکات کا مقصد یہ تھا کہ اب بھی وہ اپنے دفاع میں مجھے پھنسوانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ ہمزاد کی کارگزاری کے سبب وہ واقعہ بھی ایس پی کے علم میں آ گیا جو مجھے حوالات میں پیش آیا تھا۔ اس نے ان تمام سپاہیوں کو طلب کر لیا جنہوں نے ایس ایچ او کے حکم پر مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے ایس پی کو واضح الفاظ میں بتا دیا کہ ان کے ایس ایچ او نے انہیں کیا حکم دیا تھا۔

ایس پی کے نزدیک یہ معاملہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا تھا۔ اس نے فون پر آئی جی سے احکام لیے اور پھر ایس ایچ او پر پولیس کیس قائم کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے دیدہ دانستہ اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ایک زیر حراست شخص کو قتل کرانے کا حکم دیا تھا۔ یہ قتل عمد کا کیس تھا۔ فی الوقت ان تمام سپاہیوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا جنہوں نے اپنے افسر کے حکم پر قانون کو ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اسی کے ساتھ ایس پی نے میری

رہائی کے احکام جاری کر دیے تھے۔ اس کے خیال میں یہ ساری سازش خود ایس ایچ او کے ذہن کی پیداوار تھی جس نے ایک فرضی درخواست ایس پی کو بھیجی اور اس کی ایک نقل آئی جی کو روانہ کی، پھر میری ملازماؤں کو ڈرا دھمکا کر میرے خلاف بیانات لیے اور مجھے حوالات میں بند کر دیا۔ اس کے بعد جب اسے افشائے راز کا اندیشہ ہوا تو اس نے کیس کی فائل غائب کر دی اور اسی کے ساتھ مجھے قتل کرانا چاہا۔

پولیس ہیڈ آفس سے فوری طور پر ایک دوسرے ایس ایچ او کو اس تھانے کا چارج لینے کے لیے روانہ کر دیا گیا تھا جو کچھ دیر بعد پہنچنے والا تھا۔ اس کے چارج لیتے ہی مجھے رہا کر دیا جاتا۔

ہمزاد سے ساری رُوداد سننے کے بعد میں نے ایک اور بات کی وضاحت چاہی۔ "ایس پی کے نزدیک ایس ایچ او نے میرے خلاف یہ قدم کیوں اٹھایا۔ اس سلسلے میں بھی تو اس نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہو گا!"

"جی ہاں"۔ ہمزاد نے جواب دیا۔ "اس نے فون پر آئی جی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ سارا کھیل مجھ سے کوئی بڑی رقم اینٹھنے کے لیے کھیلا گیا ہو گا"۔

"ظاہر ہے کہ نیا ایس ایچ او میرا بیان بھی لے گا۔ تمہارے خیال میں میرا کیا بیان ہونا چاہیے؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"وہی جو ایس پی کا خیال ہے"۔ ہمزاد نے مشورہ دیا۔

"مگر یہ حقیقت تو نہیں ہے۔ یہ تو سراسر جھوٹ ہو گا!" میں نے اعتراض کیا۔

"لیکن اس نے آپ سے رشوت تو بہرحال لی تھی نا؟"

"ہاں، مگر ترغیب دینے والا بھی تو میں ہی تھا!"

ہمزاد میری بات سن کر سوچ میں پڑ گیا، پھر کچھ دیر بعد بولا۔ "میں محسوس کر رہا ہوں کہ اب آپ کا اندازِ فکر یکسر بدل گیا ہے۔ پہلے تو آپ اس طرح نہیں سوچتے تھے"۔

"ہاں تم ٹھیک سمجھے۔ میں اب گناہوں سے توبہ کر چکا ہوں۔ یقیناً ایس ایچ او نے اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے، رشوت بھی لی ہے اور مجھے قتل بھی کرانا چاہا ہے، لیکن یہ بات قطعی غلط ہے کہ اس نے میرے خلاف یہ ساری سازش کی تھی۔ اسے صرف اسی جرم کی سزا ملنا چاہیے جو اس سے حقیقتاً سرزد ہوا ہے"۔ میں نے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

"پھر جو آپ کے نزدیک سچ ہے، اسی کا اظہار کیجیے گا"۔

ہمزاد کا جواب سن کر میں اپنے ذہن میں واقعات کو ترتیب دینے لگا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ نئے ایس ایچ او کے سامنے میری طلبی ہو گئی۔ ایک سب انسپکٹر بھی میرا بیان لکھنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ نئے ایس ایچ او کے چہرے سے قدرے خوف اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ غالباً ماتحت عملے نے اسے میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے علاوہ اُسے شاید ایس پی کا مطمع نظر بھی معلوم ہو گیا تھا جس کے نزدیک میں بے قصور تھا۔

میں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
"آیئے تشریف لایئے جناب!" اس کی تقلید سب انسپکٹر نے بھی کی تھی۔ اس نے میری طرف مصافحے کے لیے بھی ہاتھ بڑھایا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا تو وہ بولا۔ "مجھے سراج الدین کہتے ہیں اور آپ یقیناً شیخ کرامت ہیں!" اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔ "تشریف رکھیں"۔ اس نے میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر جب تک میں ایک کرسی پر بیٹھ نہ گیا، وہ کھڑا ہی رہا۔

عموماً" پولیس والے اتنے با اخلاق نہیں ہوتے، مگر اس وقت صورت حال مختلف تھی۔ میں اس کے اخلاق تہذیب اور شائستگی کا سبب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

نئے ایس ایچ او سراج الدّین نے میرا بیان قلم بند کرانے سے پہلے مجھے بتا دیا تھا کہ بیان لینے کے بعد آپ کو باعزّت طور پر جانے کی اجازت ہے۔ میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

پھر میرا بیان قلم بند کیا جانے لگا جو حقائق پر مبنی تھا۔ "اب سے چالیس دن قبل میں نے ایک وظیفہ شروع کیا جس کے لیے مقررہ وقت اور جگہ کی قید تھی ورنہ وظیفہ الٹا ہو جاتا اور میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ کوئی بھی وظیفہ بہ آسانی پورا نہیں ہو جاتا۔ اس کے دوران میں عامل بڑے پُراسرار اور ناقابل یقین حالات سے گزرتا ہے، لیکن لگن سچّی ہو، عامل میں خود اعتمادی کا فقدان نہ ہو تو خدا اسے کامیابی عطا کر دیتا ہے کہ سب کچھ اسی کی ذات عطا کرنے والی ہے۔ انسان میں جتنی بھی ظاہری اور باطنی قوّتیں ہیں اسی ذات واحد کا عطیہ ہیں"۔

"بے شک ..... بے شک!" ایس ایچ او سراج الدّین درمیان میں بول اٹھا جو مجھے گراں گزرا اس لیے بھی کہ اس کا لہجہ الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

"اگر آپ درمیان میں نہ بولیں تو ممنون ہوں گا میں!" میں نے شائستگی کے ساتھ اسے ٹوک دیا۔

"جی بجا فرمایا آپ نے!" وہ فوراً ہی گردن ہلا کر بولا۔ "اب یہ گستاخی نہیں ہو گی

کچھ دیر توقف کے بعد میں نے پھر اپنا بیان شروع کیا۔ "تو گویا میں یہ عرض کر رہا تھا کہ خدا کی ذات ہر قوّت کا سرچشمہ ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے بندوں کی آزمائش کے لیے انہیں کچھ محدود اختیارات سے بھی نوازا ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو ان اختیارات ہی کو سب کچھ سمجھ کر اختیارات عطا کرنے والی ذات کو بھول جاتے ہیں۔ اسی انداز فکر اور غفلت سے ساری برائیاں جنم لیتی ہیں۔ میرے ساتھ یہ ہوا کہ عمل کے دوران میں مجھے کچھ پُراسرار واقعات پیش آئے جنہیں میں اپنی آزمائش کا نام دیتا ہوں۔ پہلی ہی شب میرے چند ملازمین کی حماقت سے معاملہ پولیس تک پہنچ گیا۔ پولیس کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا، مگر اس کے باوجود سابق ایس ایچ او ملک فیروز دین نے مجھے تھانے بلا کر ڈرایا دھمکایا اور پانچ ہزار کی رقم اینٹھ لی۔ میں اس دوران میں زیر علاج تھا اور اپنے عمل کے سبب گھر ہی پر پڑا رہنا ضروری تھا۔ اس کے لیے میں نے اپنی کوٹھی میں ایک ڈاکٹر اور دو نرسوں کو رکھا ہوا تھا۔ انہی میں سے ایک نرس نادرہ، ایک شب میرے خلاف دست درازی کی رپورٹ کرنے تھانے پہنچ گئی۔ اس مرتبہ بھی مجھے اپنے عمل کی شرائط پوری کرنے کی خاطر مجبوراً پولیس کے مطالبے کو پورا کرنا پڑا۔ دوسرے دن صبح نرس نادرہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ میری صفائی پیش کرنے تھانے پہنچ گئی کہ مجرم وہ ہے، میں نہیں۔ لطف کی بات یہ کہ ایف آئی آر ہی نہیں لکھی گئی تھی، مگر ایس ایچ او ملک فیروز دین نے سمجھوتے کی آڑ میں اس غریب نرس نادرہ سے بھی پانچ سو روپے رشوت لے لی اور مجھے موٹی آسامی سمجھ کر اس نے اچھی طرح رگڑا۔ مختصراً" یہ کہ اس نے مجھ سے پندرہ ہزار روپے اینٹھ لیے۔ اسی دوران میں پُراسرار قوّتوں کا مالک ایک شخص شمبھو زبردستی میری کوٹھی پر قابض ہو گیا۔ کوٹھی کا صرف عقبی حصّہ میرے قبضے میں رہ گیا۔ شمبھو ذہنی مریض اور اذیت پسند تھا۔ میں اپنی ملازماؤں پر ظلم و تشدّد ہونے کی آوازیں سنتا تھا، مگر اس وقت بے بس تھا۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا۔ اب میرا عمل پورا ہونے میں صرف چند دن رہ گئے تھے۔ چالیس دن پورے ہونے میں صرف تین راتیں باقی تھیں کہ ایک دن صبح سابق ایس ایچ او پھر آدھمکا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ محلے والوں نے میرے خلاف درخواست دی ہے۔ وہ درخواست خود میں نے بھی پڑھی تھی جو ایس پی صاحب کے نام تھی اور اس کی ایک نقل آئی جی صاحب کو بھی بھیجی گئی تھی۔ وہ درخواست جعلی تھی یا نہیں، اس سلسلے میں میری رائے محفوظ ہے۔ بہرحال ایس ایچ او ملک فیروز دین نے میری کوٹھی سے میری ہی ملازماؤں کو برآمد کر لیا جن پر دراصل شمبھو نے تشدد کیا تھا، میں نے نہیں۔ خود شمبھو میری ایک ملازمہ سریتا کو لے کر فرار ہو گیا تھا۔ بہرحال ایس ایچ او نے میرے بیان پر یقین نہیں کیا کہ

میں بے گناہ ہوں۔ اس کا سب میری ملازماؤں کے بیانات بھی تھے جو اس وقت سحرزدہ تھیں۔ انہوں نے اپنے بیانات میں مجھی پر تشدد کا الزام لگایا تھا۔ اب گویا میں پوری طرح پھنس چکا تھا۔ میری مشکل یہ تھا کہ مجھے ہر حال میں مقررہ وقت اور مقررہ جگہ پر اپنا وظیفہ جاری رکھنا تھا ورنہ میں زندہ نہ بچتا۔ میری اسی مجبوری سے ایس ایچ او نے پھر فائدہ اٹھایا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اپنی زندگی بچانے کے لیے ایس ایچ او ملک فیروز دین کو رشوت کی ترغیب دی"۔ پھر میں نے وہ سب کچھ بیان کر دیا جو ایس ایچ او اور میرے درمیان طے ہوا تھا' یعنی یہ کہ ایس ایچ او رات کے وقت مجھے عمل کرنے کے لیے جانے دے گا اور صبح ہوتے ہوتے میں پھر تھانے لوٹ آؤں گا"۔ اسی دن ایس ایچ او نے میری کوٹھی کسی شخص ظفر حمید کے نام کرالی جو غالباً اس کا کوئی قریبی عزیز ہو گا۔ میں میں نے کاغذات پر دستخط کر دیے۔ میری کوٹھی کے تمام کاغذات ابھی تک ایس ایچ او ملک فیروز دین کے پاس ہیں۔ میری کوٹھی اس نے بطور رشوت ہتھیالی تھی' صرف یہ رعایت دینے پر کہ رات کے وقت میں وظیفہ پڑھنے اپنی کوٹھی جا سکتا ہوں۔ میں نے زبانی معاہدے کی پابندی کی اور وقت مقررہ پر تھانے پہنچتا رہا تاکہ اس پر کوئی حرف نہ آئے۔ گزشتہ شب آخری تھی۔ میرا وظیفہ پورا ہو گیا اور اس طرح میری زندگی بچ گئی۔ اب میں مجبور نہیں تھا۔ ایس ایچ او ملک فیروز دین نے اپنے اختیارات اور میری مجبوری سے بہرحال ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ میں نے اسی لیے آج صبح اس سے رشوت کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس نے بہ ظاہر ہامی بھر لی' مگر دوسری طرف اس نے تفتیش اور میری زبان کھلوانے کی آڑ میں مجھے قتل کرانا چاہا۔" پھر میں نے اپنے اوپر ہونے والے قاتلانہ حملے کی تفصیل بیان کی اور کہا۔ "مگر خدا جسے بچانا چاہتا ہے' ہر حال بچا لیتا ہے۔" زندگی اور موت کسی کے اختیار میں نہیں۔ پھر خدا ہی نے میری مدد کی اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو گیا۔ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ میں اس پر خدا کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔" میں نے دانستہ اپنے بیان میں اے ایس آئی کو بھی رشوت دینے کا ذکر نہیں کیا تھا کیوں کہ وہ اب توبہ کر چکا تھا۔

نیا ایس ایچ او میرا بیان سن کر اور اسے قلم بند کرانے کے بعد کچھ دیر تک سوچتا رہا' پھر محتاط لہجے میں بولا۔ "آپ کے بیان نے بڑی حد تک کیس کی صورت حال کو بدل دیا ہے۔ ایس پی صاحب نے مجھے جو کچھ بتایا تھا' آپ کے بیان سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ خود آپ نے اپنے بیان میں یہ اعتراف کیا ہے کہ ایک مرتبہ بلکہ ..... دوبار رشوت کی ترغیب آپ نے دی تھی' اس کا سبب خواہ کچھ بھی ہو۔ بہرحال رشوت لینا اور رشوت دینا دونوں ہی قانون کی نظر میں جرم ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کا یہ تحریری بیان پڑھ کر ایس پی صاحب اپنا یہ حکم واپس

لے لیں کہ آپ کو رہا کر دیا جائے۔ آپ تشریف رکھیں' میں ابھی ایس پی صاحب سے مل کر آتا ہوں"۔

میں اپنے تحریری بیان پر دستخط کر چکا تھا۔ ایس ایچ او نے سب انسپکٹر سے وہ بیان لے لیا اور اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہمزاد مودب ایک طرف کھڑا تھا۔ اس نے میر جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے اسے خاموش کھڑے رہنے کا اشارہ کر دیا۔ میں اس معاملے میں ہمزاد کی مداخلت نہیں چاہتا تھا' خواہ ایس پی مجھے رہا کیے جانے کا حکم واپس ہی لے لیتا۔ حالات کچھ بھی رہے ہوں' مجرم بہرحال میں بھی تھا۔ میں نے رشوت کی ترغیب دی تھی اور اس کی سزا بھگتنے کے لیے تیار تھا تاکہ میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ رہے۔

میں یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ نیا ایس ایچ او سراج الدین غیر ضروری طور پر اپنی کارکردگی کا مظارہ کر رہا تھا۔ وہ بھی بہرحال پولیس ہی کے محکمے سے تعلق رکھتا تھا اور ملک فیروز دین ہی کا بھائی بند معلوم ہوتا تھا ورنہ خواہ مخواہ اپنی قابلیت نہ چھانٹتا۔ پھر جب تک وہ واپس نہ آ گیا' میں بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ ایک سپاہی بھی تھا اور اس سپاہی کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی حوالات کے دروازے پر تھی۔

کمرے میں میں داخل ہوتے ہی اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے سپاہی سے کہا۔ "انہیں لے جا کر حوالات میں بند کر دو!"

اسرار و فسوں کی محفل
ابھی سجی ہوئی ہے
اپنے وقت کی مقبول ترین سرگذشت
ابھی جاری ہے
بقیہ واقعات دوسرے
حصے میں پڑھیں

ہمزاد کی واپسی

شمیم نوید

میرے لیے ایس ایچ او کا یہ حکم قطعی غیر متوقع تھا اسی لیے چونک اٹھا اور اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "کیا ایس پی صاحب نے اپنے احکام واپس لے لیے؟"

"جی نہیں۔" ایس ایچ او سراج الدین آگے بڑھ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "دراصل ایس پی صاحب اس وقت اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ شاید ہیڈ آفس گئے ہیں۔ جب تک وہ ......"

"برادرم سراج الدین!" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اب تم گویا اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے مجھے حوالات میں بند کرا رہے ہو! یہی بات ہے نا؟"

میرے چبھتے ہوئے لہجے نے اس کے چہرے پر بوکھلاہٹ کے آثار پیدا کر دیے۔

"شیخ صاحب! آپ غالباً میری طرف سے غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں۔ دراصل قانون تو قانون ہوتا ہے اور سب کے لیے برابر انصاف فراہم کرنا اس کا کام ہے۔"

وہ قانون کے بارے میں اپنی ضروری اور غیر ضروری معلومات کا اظہار کرتا رہا۔ اس کا مقصد محض یہ تھا کہ میں اسے قطعی جاہل نہ سمجھ بیٹھوں۔ میں خاموشی سے اس کی لن ترانیاں سنتا رہا۔ پھر جب وہ خاموش ہو گیا تو میں نے کہا۔

"برادرم! تم تو مجھے علم دریاؤ معلوم ہوتے ہو!" میں اسے گھسنے لگا۔ "تم تھے کہاں اب تک! قانون کے بارے میں اتنی وسیع معلومات!" لفظ "اتنی" کو میں نے ذرا کھینچ کر ادا کیا تھا۔

"اجی بس آپ بزرگوں کی مہربانی ہے۔" وہ ریشہ "خطمی" ہونے لگا۔

اس کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ میں کوشش کے باوجود اپنی رگ شرارت کو پھڑک اٹھنے سے باز نہ رکھ سکا۔ میں نے اسے شرماتے لجاتے دیکھ کر ایک دم کہہ دیا۔ "بس تو پیارے، تم مرغا بن جاؤ۔"

"ج...... ای...... اجی!" اس نے منہ پھاڑ دیا۔

"ہاں تمہارا مرغا بننا بہت ضروری ہے۔" میں سنجیدگی سے بولا۔ "اس طرح دوران خون سر کی طرف ہو جاتا ہے جس سے عقل بڑھتی اور آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ پھر تم پر قابلیت کے دورے نہیں پڑا کریں گے بلکہ مستقلاً قابلیت تمہاری کھوپڑی میں جگہ بنا لے گی۔ سمجھ گئے نا تم؟"

اب وہ حیرت کے لمحے سے نکل چکا تھا اور اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ "دیکھیے شیخ صاحب، میں آپ کے ساتھ عزت سے پیش آ رہا ہوں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ میرے ماتحت کے سامنے میری عزت سے کھیلنے لگیں۔"

اس کے لہجے میں تلخی آ گئی تھی، مگر مجھ پر اس کا کیا اثر ہوتا! میں بہ دستور اسے گھورتا رہا۔ "تم مجھ پر غلط الزام لگا رہے ہو! جہاں تک مجھے علم ہے کھلونوں سے کھیلا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید تمہاری عزت کھلونا نہیں ہے اور نہ میں کوئی بچہ ہوں کہ اس سے کھیلنا چاہوں گا۔"

"میں نے محاورۃً عرض کیا تھا!" وہ وضاحت کرتے ہوئے اور بھی مضحکہ خیز معلوم ہونے لگا۔

اچھا تو محاورۃً بولنا بھی آتا ہے تمہیں! کمال ہے! تمہاری صورت دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ تم اتنے قابل ہو گئے۔"

"کیا مطلب؟" اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"مطلب یہ کہ چُغد لگتے ہو صورت سے" یہ میرا گویا آخری حربہ تھا کہ وہ بے قابو ہو جائے اور مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔

"بس بہت ہو گیا!" وہ ایک دم اپنی اصلیت پر آ گیا۔ وہ خول اتر گیا جو اس نے وقتی طور پر اپنے اوپر چڑھا لیا تھا۔ میں اب ایک لفظ برداشت نہیں کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میز پر ایک طرف رکھا ہوا اپنا بینت اٹھا کر عالم جوش میں زور سے میز پر مارا۔ "تم شاید مجھے بھی ملک فیروز دین سمجھ رہے ہو!"

"تمھی کیا، یہاں اس کرسی پر بیٹھ کر سبھی ملک فیروز دین بن جاتے ہیں۔" میں نے پر سکون آواز میں کہا، پھر سخت لہجے میں بولا۔ "میرے پاس شرافت کا جواب شرافت اور کمینگی کا جواب کمینگی ہوتا ہے! سمجھے میاں سراج الدین! جب ایس پی میری رہائی کا حکم دے چکا ہے تو تم درمیان میں اپنی ٹرٹرانے والے کون ہوتے ہو؟ میں دو منٹ میں دماغ کے سارے کیڑے جھاڑ دیتا ہوں! اگر تم عزت کے ساتھ مجھے یہاں بٹھاتے اور کہتے کہ جب تک تمہارا

ایس پی نہ آ جائے، میں تھانے سے نہ جاؤں تو اور بات تھی، مگر تم کچھ زیادہ ہی پھیلنے لگے۔ ظاہر ہے، ایسی صورت میں مجھے تمہارا یہ فیصلہ کس طرح قبول ہو تا کہ حوالات میں دوبارہ بند کر دیا جاؤں!"

"تو تم میرے فیصلے کو چیلنج کر رہے ہو!" وہ مجھے گھور کر بولا۔ "یعنی مجھے بہ حیثیت ایس ایچ او یہ حق نہیں کہ کسی مجرم کو جو اقبال جرم بھی کر چکا ہو، حوالات میں بند کر سکوں!"

"تمہیں پھر قابلیت کا ہیضہ ہونے لگا! احمق آدمی! کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے جرم کی نوعیت دیکھی جاتی ہے اور یہ دیکھنا عدالت کا کام ہے، تم ایسے ٹٹ پونجیوں کا نہیں۔"

اس کی قوت برداشت آخری جواب دے ہی گئی۔ ایک تو یہی کم نہ تھا کہ وہاں سب انسپکٹر موجود تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ، وہاں سپاہی کی موجودگی کا خیال اسے ایک دم آ گیا۔ میری بجائے وہ اس کی طرف دیکھ دہاڑا۔ "لے جاؤ اس احمق کے بچے کو! بند کر دو حوالات میں! میں بھی دیکھتا ہوں کہ کتنے کس بل ہیں اس میں!"

"پچھتاؤ گے برخوردار!" یہ کہتے ہوئے میں نے ہمزاد کو اشارہ کر دیا۔ "ابھی یہاں تماشا شروع ہو جائے گا۔ جب تک تمہارا ایس پی اپنا حکم واپس نہیں لے گا، میں ہرگز حوالات میں بند نہیں ہوں گا! اگر میری بات پر یقین نہیں تو کوشش کر کے دیکھ لو۔"

میرا اشارہ پاتے ہی ہمزاد فوراً حرکت میں آ گیا تھا۔ ڈرتا جھجکتا ہوا سپاہی میری طرف بڑھتے بڑھتے ایک دم رک گیا۔ سب انسپکٹر شاید فضا میں تناؤ محسوس کرتے ہی ایک دم اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ایس ایچ او کا چہرہ شدید غصے کے سبب سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی نظریں سپاہی پر جمی ہوئی تھیں۔ سپاہی جیسے ہی رکا وہ چیخ اٹھا۔ "جلدی کر! رک کیوں گیا؟" پھر وہ سب انسپکٹر کی طرف پلٹا۔ "اور تم کھڑے ہوئے کیا تماشا دیکھ رہے ہو! ایک آدمی کو قابو میں نہیں کر سکتے تم!"

"یس سر!" سب انسپکٹر گڑبڑا کر جلدی سے میری طرف لپکا، پھر غالباً اسے گذشتہ ایس ایچ او ملک فیروز دین کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ یاد آ گیا اور وہ خود ہی ٹھٹک کر رک گیا۔

میں اطمینان کے ساتھ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا بلکہ اب ٹانگیں بھی پھیلا دی تھیں جیسے اس واقعے سے میرا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ ہمزاد کی موجودگی میں بھلا مجھے فکر بھی کیا ہوتی! میں دیکھ رہا تھا کہ وہ پوری طرح چوکنا ہے۔

پھر اس سے پہلے کہ ایس ایچ او مزید طرّم خانی دکھاتا، صورت حال غیر متوقع طور پر بدل گئی۔ ایس پی کا اردلی، کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بھی بنگالی تھا۔

"صاب بلاتا اے۔" اس نے گویا طلبی کا حکم سنایا۔

جس طرح غبارے میں بھری ہوئی ہوا ایک دم نکل جاتی ہے' وہی حال ایس ایچ او کا ہوا۔ ادھر اردلی حکم سنا کر گیا' ادھر ایس ایچ او اپنی کرسی سے اٹھا۔ "میں آتا ہوں ابھی" اس نے سب انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ پھر کھوکھلی سی آواز میں بولا۔ "جب تک میں لوٹ کر نہ آؤں......" اس نے میری طرف نگاہ اٹھائی۔ اس نے دانستہ فقرہ ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا۔ "سمجھ گئے تم؟"

سب انسپکٹر اس کا اشارہ سمجھا' یا نہیں' مگر اس نے زور سے گردن ہلا کر "یس سر!" کہہ دیا۔

دروازے تک پہنچتے پہنچتے بغیر مڑے ایس ایچ او نے اپنے اشارے کی وضاحت بھی ضروری سمجھی' بولا۔ "اسے میرے لوٹنے تک یہاں روکنا ہے!"

ایک بار پھر غریب انسپکٹر کو۔ "یس سر" کی ہانک لگانا پڑی۔ ایس ایچ او' کمرے سے نکل گیا۔

"اپنی تو ہر طرح مصیبت ہے!" سب انسپکٹر بڑبڑاتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا' پھر شاید اسے سپاہی کا خیال آگیا جو ابھی تک کسی مجسمے کی طرح اپنی جگہ کھڑا تھا۔ "اے! تم دروازے پر جا کر کھڑے ہو جاؤ۔ سنا نہیں صاحب کیا حکم دے کر گئے ہیں!"

سپاہی کسی چابی بھرے ہوئے کھلونے کی طرح اباؤٹ ٹرن ہوا اور دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

میرے بیان اور ایس ایچ او کی حماقت سے معاملہ بے سبب طول کھینچ رہا تھا اور ابھی مجھے بہت سے کام تھے۔ اب تھانے اور پولیس کے چکروں سے میرا جی اوب گیا تھا۔ یہ چکر جتنی جلد ختم ہو جاتا اچھا تھا۔ نیا ایس ایچ او بھی ظاہر ہے کہ اب میرے حق میں نہیں رہا تھا۔ وہ ایس پی کو کوئی نئی پٹی پڑھانے کی کوشش کرتا۔ وہ اس کوشش میں کامیاب ہوتا یا نہ ہوتا' میرا وقت ضرور برباد کرتا۔ میں نے چند ہی لمحوں میں ایک فیصلہ کر لیا۔ اس سب انسپکٹر اور سپاہی کے بس میں نہیں تھا کہ مجھے جانے سے روکا جا سکتا۔ میں اچانک کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اسی کے ساتھ ہمزاد کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

مجھے کرسی سے اٹھتے دیکھ کر سب انسپکٹر بوکھلا گیا اور خود بھی کھڑا ہو کر بولا۔ "جنا...... جناب! آپ...... آپ تشریف رکھیے!"

"بکو مت!" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ "تم پر کوئی ذمے داری نہیں آئے گی۔"

"ما...... مگر...... مگر جناب!...... سن...... سنیں تو سہی...... وہ......"

"عجب چڑچڑے ہو تم! اگر مگر کیے جا رہے ہو! کہہ تو دیا کہ تمہیں توپ دم نہیں کیا جائے گا۔ میں تھانے سے بھاگ نہیں رہا' تمہارے ایس پی کے پاس جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں آگے بڑھا۔

"پھر...... پھر تو ٹھیک...... ٹھیک ہے جناب!" یہ کہہ کر اس نے سپاہی کو بلند آواز میں مخاطب کیا۔ "جناب کو ایس پی صاحب کے کمرے تک چھوڑ آؤ!"

"نہیں!" میں نے سختی سے کہا۔ "زیادہ ہوشیاری چھانٹنے کی ضرورت نہیں' مجھے ایس پی کا کمرا معلوم ہے' خود اکیلا وہاں تک چلا جاؤں گا۔"

پھر سپاہی تصویر بنا دروازے پر کھڑا رہ گیا اور میں اس کے قریب سے گزر کر باہر آگیا۔ سپاہی کی اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ مجھے روک سکتا۔

جلد ہی میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا تھانے کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔ میرا ہمزاد میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا کہ جلد از جلد اس چکر سے نکلنا ہے' تم اس سلسلے میں جو چاہو کرو' مجھے کوئی اعتراض نہیں' مگر قانون کے معاملے میں مداخلت نہ کرنا۔

ایس پی کے کمرے کے دروازے پر مستعد کانسٹیبل کھڑا تھا۔ ہمزاد لپک کر اس کے سامنے آگیا۔ میں اس دوران میں اندر داخل ہو چکا تھا۔

"...... یقین کریں سر کہ وہ دس نمبری ہے اور......" ایس پی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے نئے ایس ایچ او کی آواز سنی۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اس کی آواز کو بریک لگ گیا تھا۔

"دس نمبری حاضر ہے جناب!" میں نے ایس پی کے قریب اپنے ہمزاد کو دیکھ کر کہا۔

"توم بکواس کرتا اے!" ایس پی ایک دم ایس ایچ او پر گرم ہو گیا۔

پھر ایس پی نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں نئے ایس ایچ او سے جواب طلب کیا کہ جب میں نے رہائی کا حکم دے دیا تھا تو پھر تم کون ہوتے تھے جو شیخ کرامت کو رہا نہیں کیا۔ ایس ایچ او سراج الدین لاکھ اپنی صفائی پیش کرتا رہا۔ مگر ایس پی نے ایک نہ سنی۔

ایس پی نے میرا تحریری بیان بھی منگوا لیا اور اسے پڑھنے کے بعد گویا اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس نے کہا کہ شیخ کرامت کا یہ بیان صداقت پر مبنی ہے' انہوں نے کچھ نہیں چھپایا' یہاں تک کہ حالات سے مجبور ہو کر رشوت دینے کا بھی اعتراف کیا ہے۔ قانون اندھا نہیں ہوتا جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے۔ وہ حالات و واقعات کا تجزیہ کرکے اور صحیح نتیجے پر پہنچنے کے بعد کسی پر لاگو ہوتا ہے۔ اس کیس میں یہ واضح ہے کہ شیخ کرامت کو رشوت دینے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے

سوا شیخ کرامت کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا اس لیے قانون کی نگاہ میں اصل مجرم شیخ کرامت نہیں' ایس ایچ او ملک فیروز دین ہے' لیکن اس کا حتمی فیصلہ عدالت کرے گی۔ ان حالات میں پولیس کے پاس کوئی جواز نہیں کہ شیخ کرامت کو زیر حراست رکھے۔ ہاں شیخ کرامت پر یہ پابندی ضروری عائد کی جا سکتی ہے کہ وہ پولیس کو اطلاع دیے بغیر چانگام سے کہیں نہ جائیں اور یہ کہ اگر اپنی موجودہ قیام گاہ چھوڑیں تو پولیس کو نئے پتے سے آگاہ ضرور کر دیں۔ اس کی وجہ یہ کہ اس کیس کے عدالت میں جانے کے بعد انہیں بھی عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔

جو کچھ ایس پی نے زبانی کہا' اسے تحریر میں بھی لے آیا گیا کیوں کہ اسی بنیاد پر عدالت میں کیس پیش کیا جانا تھا۔ اسی کے ساتھ نئے ایس ایچ او سراج الدین سے بھی تحریری طور پر جواب طلب کر لیا گیا کہ اس نے میرے سلسلے میں تعمیل حکم کیوں نہیں کی اور غیر ضروری طور پر مجھے تھانے میں کیوں روکا؟ میرے نزدیک اس کے لیے اتنی سزا کافی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ اتر گیا تھا۔

میری توقع سے کہیں پہلے گلو خلاصی ہو گئی اور اس میں یقیناً" ہمزاد کا ہاتھ تھا۔ اس نے میری ہدایت پر پورا عمل کیا تھا۔ ایس پی کے ذہن پر پوری طرح مسلط ہونے کے باوجود اس نے قانون میں مداخلت نہیں کی۔ ایس پی نے جو کچھ کہا تھا' خلاف قانون نہیں تھا۔ میں ایس پی کا شکریہ ادا کر کے اس کے کمرے سے نکل آیا۔

تھانے سے نکلتے نکلتے عصر کا وقت ہو گیا۔ میں نے قریبی مسجد میں عصر کی نماز پڑھی اور پھر اپنی جاہ حال کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ فی الحال میرے لیے وہی جائے پناہ تھی۔ میں اپنے ہمزاد سے بچھڑ کر ریزہ ریزہ بکھر گیا تھا اور اب مجھے اپنا بکھرا ہوا وجود سمیٹنا تھا۔ میرے پاس کچھ بھی تو نہیں رہا تھا' نہ گھر نہ در' نہ عزت' نہ وقار' نہ پیسا' نہ شہرت' نیک نامی نہ شادکامی!

مجھے زیادہ کی ہوس پہلے بھی رہی ہو تو رہی ہو' مگر اب نہیں تھی۔ اب میں نے اپنی زندگی کا رخ تبدیل کر لیا تھا۔ آدمی کے باطن کا اثر یقیناً" اس کے ظاہر پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ شان و شوکت' نمود و نمائش کیا دھرا تھا اس میں! زندگی میں بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ جسے گھر کہتے ہیں' وہ میں نے کبھی نہیں بنایا۔ گھر کا تصور میرے ذہن میں صرف در و دیوار نہیں۔ یہ میں نے اس لیے عرض کیا کہ عموماً" لوگ در و دیوار کو گھر کہہ دیتے ہیں۔ دل میں یہی ایک پھانس تھی جو کبھی کبھی چبھنے لگتی تھی۔ اس روز اپنی کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے بھی یہی خیالات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے جنہیں میں نے دانستہ اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

وہ میری کوٹھی کا ملبا نہیں' میری حسرتوں کا ملبا تھا جس کے درمیان سے ہو کر میں اپنے کمرے تک پہنچا۔ ہمزاد کو میں نے تھانے سے نکلتے ہی رخصت کر دیا تھا۔ اب پھر طلب کر لیا۔

"تم وہ جڑی بوٹیاں اور پتیاں لے آئے جن کا سفوف بنانا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"جی ہاں' یہ لیجیے۔" اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ "مجھے معلوم تھا کہ یہاں آ کر سب سے پہلے آپ کو انہی کا خیال آئے گا۔"

میں نے دونوں چیزیں اس سے لے لیں' پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "سفوف بھی تمہی بنا لو اور سوتے وقت مجھے اس کی ایک خوراک کھلا دینا۔ مجھے تمہاری بات پر یقین ہے' انشاء اللہ ایک ہفتے کے اندر میں معدے کے سرطان سے نجات حاصل کر لوں گا۔"

"انشاء اللہ۔" کہتے ہوئے ہمزاد نے مجھ سے وہ جڑی بوٹیاں اور پتیاں واپس لے لیں اور بولا۔ "میں سات دن کے لیے الگ الگ پڑیاں بنا کر رکھ لوں گا' آپ مطمئن رہیں۔"

"تم سے ایک بات اور پوچھنا تھی۔" کچھ دیر بعد میں نے مزید کہا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ یہ ممکن بھی ہے یا نہیں' پھر بھی....."

"آپ کہیں تو سہی۔" وہ مجھے خاموش دیکھ کر بولا۔

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرا باطن بدل چکا ہے' مگر ظاہر..... ظاہر وہی ہے۔ اب..... اب مجھے اپنے اس مکروہ چہرے سے بھی گھن سی محسوس ہوتی ہے جس پر گناہ کی متعدد تحریریں نقش ہونے لگی۔" "کسی اور کو یہ محسوس ہوتا ہو کہ نہ ہوتا ہو' لیکن مجھے اپنے چہرے اور بقیہ جسم کے درمیان یہ فرق بہت کھلتا ہے۔ تم..... تم میرے ہمزاد ہو اس لیے یقیناً" میرے جذبات کو سمجھ سکتے ہو۔ جانے کیوں کبھی پہلے مجھے یہ خیال نہیں آیا!"

"قطعی طور پر یہ چہرہ بدلنا تو ممکن نہیں' ہاں اس پر سے بڑھاپے کے آثار ختم کیے جا سکتے ہیں۔ جلد کا ڈھیلا پن' سیاہی' جھریاں' کھردرا پن اور پژمردگی دور ہو جائے گی' مگر چہرے کے بنیادی خطوط وہی رہیں گے جو در اصل ہیں۔" ہمزاد مجھے تفصیل کے ساتھ سمجھانے لگا۔ "یوں سمجھیں کہ آپ کا چہرہ' ایک جوان شخص کا چہرہ نظر آنے لگے گا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ آپ اگر پہلے کبھی یہ خواہش ظاہر کرتے تو اس کی تکمیل ہو جاتی۔"

"زندگی کے ہنگاموں اور ہوس و ہوس نے اتنی مہلت ہی کہاں دی تھی کہ میں یہ سوچ سکتا۔" میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"بس چند لمحے آپ کو تکلیف ہوگی' اس کے بعد آپ گویا عہد جوانی میں لوٹ جائیں گے۔ حکم دیں تو میں قریب آؤں!" ہمزاد بولا۔

"ٹھہرو!" میں نے کہا۔ "میں آخری بار یہ چہرہ دیکھ لوں جو کچھ دیر بعد میرے لیے اجنبی بن جائے گا۔" یہ کہہ کر میں مسہری سے اٹھا اور میز پر رکھا ہوا آئینہ اٹھا لیا۔

آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے اس وقت میرے احساسات بہت عجیب سے تھے۔ وہ چہرہ مجھے اپنا چہرہ معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے ہاتھ سے آئینہ رکھ دیا اور پھر مسہری پر آ بیٹھا۔

"آجاؤ اور تکلیف کی پروانہ کرو! گذشتہ چالیس دن کے دوران میں جو تکلیفیں میں برداشت کر چکا ہوں' بہرحال یہ تکلیف اس سے زیادہ نہیں ہوگی۔"

ہمزاد میرے قریب آگیا اور بولا۔ "آنکھیں بند کر لیجیے۔"

میں لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دوسرے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہمزاد مجھ پر جھکا ہو۔ اس کے بعد میں نے ایک چبھن سی محسوس کی' پھر یوں لگا جیسے میرے چہرے کی جلد جگہ جگہ سے پھٹنے لگی ہو۔ تکلیف شروع ہو گئی' مگر میں نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ میں ایک حیرت ناک تجربے سے گذر رہا تھا۔ برقی رو سی میری جلد میں دوڑ رہی تھی۔ یہ صرف چند لمحے تھے جو تکلیف کی وجہ سے مجھے زیادہ محسوس ہوئے۔ پھر ٹھنڈک سی محسوس ہوئی جیسے کوئی زخموں پر مرہم رکھ رہا ہو۔ بعد میں یہ احساس بھی جاتا رہا۔

"یہ آئینہ لیجیے۔" مجھے ہمزاد کی آواز سنائی دی۔ "آنکھیں کھول کر اپنا چہرہ دیکھیے۔"

آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے سے بھی پہلے' آنکھیں کھولتے ہی میرے لیے پہلا ذہنی جھٹکا ہمزاد کا بدلا ہوا چہرہ تھا۔ میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اور آئینے دیکھنے سے پہلے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ "یہ...... یہ تمہارا چہرہ...... یہ کیسے بدل گیا؟"

وہ مسکرایا۔ "میں آپ ہی کا تو جسم لطیف ہوں' آپ ہی کا عکس' آپ ہی کا آئینہ تو ہوں! یہ تو ہونا ہی تھا۔ جب آپ کا چہرہ بدل گیا تو پھر میرا چہرہ کیوں نہ بدلتا؟"

میرا ہمزاد ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میں جانے کہاں کہاں پہنچ گیا تھا' بدایوں' ہاں بدایوں! میری جوانی قید میں تو گزری تھی اور اب' اب وہی جوان چہرہ' میرا بچھڑا ہوا معصوم چہرہ مجھے آئینے میں بھی نظر آ رہا تھا جس پر گناہ کی سیاہی نہیں تھی۔ اس سے مجھے بڑی تقویت' روحانی تقویت محسوس ہوئی۔ اب میرا ظاہر بھی بدل گیا تھا۔ میرے چہرے اور بقیہ جسم کے درمیان جو نمایاں فرق تھا' ختم ہو چکا تھا۔ وقت جیسے پیچھے کی طرف لوٹ گیا تھا۔ مجھے بدایوں یاد آ رہا تھا۔ میرٹھ یاد آ رہا تھا' دلی کے گلی کوچے میری آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔

میں نہ جانے کب تک انہی خیالوں میں کھویا رہتا کہ ہمزاد کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ مجھ سے رخصت کی اجازت مانگ رہا تھا۔

"نہ جاؤ' ابھی نہ جاؤ اور مجھے سوچنے دو!...." میں جذباتی لہجے میں بولا۔ "مجھے سوچنے دو کہ میں کہاں آگیا ہوں اور کیوں؟...... اور سنو! اس وقت تک قریب ہی رہا کرو جب تک میں خود تمہیں رخصت نہ کر دیا کروں۔"

"بہتر ہے۔" اس نے سعادت مندی سے کہا۔

"بدلے ہوئے چہرے نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔" میں ہمزاد کی بجائے جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ "اب ان واقعات کو برسوں گزر چکے ہیں۔ اگر میں واپس بھی چلا گیا تو شاید میرا ماضی' میرا پیچھا نہیں کرے گا۔ وہ انگریزوں کی حکومت کا زمانہ تھا۔ وہ فضا اور تھی اور...... اور اب...... اب شاید...... مگر......" خیال کی ایک اور لہر نے میرے تخیل کی رو منقطع کر دی۔ میری فوری واپسی ممکن نہیں تھی۔ ابھی مجھے بہت سے مسئلے نمٹانا تھے اور ان میں سب سے اہم مسئلہ سریتا کی بازیابی کا تھا۔ شمبھو کو میں نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ سریتا کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ جانا خود غرضی ہوتی۔

ہمزاد ایک طرف مودب کھڑا تھا۔ میری نگاہ اس کی طرف اٹھی تو میں جیسے خیالوں کی دنیا سے لوٹ آیا۔

"سنو!" میں نے ہمزاد کو مخاطب کیا۔ "اس وقت پہلا مسئلہ سکونت کا ہے۔ میں اس کھنڈر میں نہیں رہ سکتا۔ یہیں اسی محلے میں کوئی خالی مکان تلاش کر لو۔ کرائے کا جھنجھٹ نہ ہو تو بہتر ہے۔ میں دیکھتا ہوں' کتنی رقم باقی رہ گئی ہے...." یہ کہتا ہوا میں اٹھا۔

الماری کھول کر دیکھی تو چند سو روپے پڑے تھے۔ ہمزاد کو میری مشکل سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ کچھ ہی دیر بعد میرے سامنے میز پر بڑے نوٹوں کی گڈیاں لگی ہوئی تھیں جنہیں میں نے ایک اٹیچی میں بھر لیا اور ہمزاد مکان کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔

یہ میرا تجربہ تھا کہ ہمزاد کے لیے کبھی کوئی مشکل' مشکل نہیں ہوتی۔ وہ جلد ہی لوٹ آیا اور آتے ہی بولا۔ "یہاں سے صرف دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک مکان خالی ہے۔ مالک مکان یہاں سے مغربی پاکستان کے ایک شہر کراچی منتقل ہونا چاہتا ہے۔ اس کی سکونت اپنے بڑے بھائی کے گھر میں ہے۔ مکان اس نے اسی لیے خالی کر دیا ہے کہ جب کوئی اچھا گاہک ملے' اسے بیچ دے۔ آپ چاہیں تو پہلے چل کر دیکھ لیں۔"

"تم نے دیکھ لیا کافی ہے۔ بس سر چھپانے کی جگہ چاہیے۔ تم مجھے مالک مکان کے

پاس لے چلو۔" ابھی میری بات پوری ہوئی تھی کہ مغرب کی اذان ہو گئی۔ میں نے ہمزاد سے کہا۔ "نماز پڑھ کر ابھی چلتا ہوں۔ یہ مسئلہ آج ہی حل ہو جائے تو بہتر ہے۔"

پھر مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد میں ہمزاد کے ہمراہ مالک مکان کے بڑے بھائی کے گھر تک پہنچ گیا۔ وہ بندہ بہار کا تھا۔ چھپرا ڈسٹرکٹ کے ایک قصبے کا رہنے والا! آدمی خوش اخلاق تھا' مگر تھوڑا سا لالچی بھی! اسی وجہ سے اس کا مکان نہیں بک سکا تھا۔ خالی مکان قریب ہی تھا۔ اس نے مجھے دکھایا اور میں نے پسند کر لیا۔

"اب آپ ہی بتائیں صیبجب' دو منزلہ مکان ہے' ساٹھ ہزار کوئی زیادہ تو نہیں ہیں!" مجھے اپنی دانست میں ہموار کرنے لگا۔

"ٹھیک ہے' مگر مجھے فوراً قبضہ چاہیے۔" میں نے بات کو مختصر کرنے کی خاطر کہا۔

"مکان تو اسی وجہ سے خالی پڑا ہے۔ صیبجب!" معاملہ بنتے دیکھ کر وہ جلدی سے بولا۔

"آپ ابھی آجائیں۔" پھر ذرا توقف سے کہا۔ "بات بس....."

"ہاں ہاں کہو' کیا بات ہے؟"

"سودا نقد ہو گا صیبجب!" اس نے دل کی بات کہہ دی۔

"منظور ہے۔" میں نے رضامندی کا اظہار کر دیا' پھر بولا۔ "آپ کے پاس اس کے کاغذات ہیں؟"

"بالکل صیبجب! ہر کام پکا ہے۔"

"مکان کی رجسٹری وغیرہ کل صبح ہو جائے گی۔ میں تمہیں رقم آج ہی ادا کر دیتا ہوں۔ تم مکان کے کاغذات دے دو۔"

"چلیں تو پھر..... اور یہ رکھیں مکان کی چابیاں!" اس نے مجھ پر اعتماد کا اظہار کرنے کی خاطر کہا۔

"نہیں میں پہلے رقم لے آؤں' پھر چابیاں لوں گا۔" یہ کہتا ہوا میں اس کے ساتھ خالی مکان سے باہر آگیا۔

"میں بے چینی سے آپ کا انتظار کروں گا۔" چلتے چلتے وہ بولا۔

"بس ابھی آیا۔" یہ کہہ کر میں اپنی کوٹھی کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھنے لگا۔

اس کے بعد عشاء سے پہلے پہلے میرا سارا ضروری سامان نئے مکان میں منتقل ہو چکا تھا۔ کاٹھ کباڑ میں نے وہیں پرانی حویلی کے کھنڈر میں چھوڑ دیا تھا۔ اسی دوران میں میرا پرانا ملازم ارشاد علی بھی آ پہنچا تھا۔ حویلی کو کھنڈر بنے دیکھ کر اس نے گریہ کرنے کے لیے ابتدا ہی

کی تھی کہ میں نے اسے روک دیا۔ ہمزاد کے علاوہ چھوٹا موٹا سامان منتقل کرنے میں اس نے بھی تیزی دکھائی تھی' اور سامان بچا بھی کیا تھا! سامان میں دیگر ضروری اشیا سے زیادہ کتابیں تھیں۔ ارشاد علی دن میں کئی بار وہاں چکر کاٹ کر گیا تھا اور بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ اس نے میری بدلی ہوئی صورت کو بھی بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔ مگر جب میری آواز سنی تھی تو اسے یقین کرنا ہی پڑا تھا کہ میں شیخ کرامت ہوں۔ اسے میرا وظیفہ کامیاب ہو جانے پر بڑی خوشی تھی۔ میرے بدلے ہوئے چہرے کو بھی اس نے وظیفے کے کھاتے میں ڈال دیا تھا اور میں صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔

نئے مکان کی اوپری منزل کو میں نے سکونت کے لیے منتخب کیا۔ اوپر صرف دو کمرے تھے جن میں سے ایک کو میں نے نشست گاہ اور دوسرے کو خواب گاہ بنا لیا۔ نچلی منزل پر تین کمرے تھے۔ ان میں سے ایک کو لائبریری' دوسرے کو مہمانوں کے لیے اور تیسرا کمرا ارشاد علی کے لیے مخصوص کر دیا۔

بہت کم وقت میں ہمزاد نے اس مکان کا حلیہ بدل دیا۔ اب اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ گھنٹہ بھر پہلے کوئی اس میں منتقل ہوا ہے۔ اوپری منزل پر دونوں کمروں کے سامنے کھلی چھت پر منڈیروں کے کنارے گملے لگے ہوئے تھے اور ان میں خوشبودار پھول مہک رہے تھے۔ سارا گھر خوبصورت سامان سے بھرا ہوا تھا۔ ارشاد علی بار بار میرے پاس آکر اپنی حیرت اور خوشی کا اظہار کرتا' کبھی کہتا۔ "مہمانوں والے کمرے میں جانے کہاں سے نئی مسہری اور نئی میز کرسیاں آگئی ہیں۔" کبھی ہانپتا ہوا آتا اور بتاتا۔ "جناب! جانے کہاں سے بڑا فرنیچر چلا آرہا ہے' نیا! میری تو عقل حیران ہے۔ میں ذرا کی ذرا باہر کا چکر لگانے گیا تھا کہ دیکھوں پاس پڑوس والے کیسے ہیں' لوٹا تو میرا کمرا سامان سے بھرا پڑا تھا اور ..... اور باورچی خانہ بھی! ..... اور تو اور غسل خانے میں لوٹا۔ بالٹی' تولیا' صابن بھی دیکھا ہے میں نے۔ کمال ہو رہا ہے جناب! سب اللہ کا کرم معلوم ہوتا ہے۔ جس نے لے لیا تھا' دوبارہ دے دیا۔"

وہ خود ہی توجیہات تلاش کر لیتا تھا اس لیے مجھے مزید سمجھانے کی کیا ضرورت تھی! ظاہر ہے کہ میں اسے ہمزاد کے بارے میں تو بتا نہیں سکتا تھا کہ یہ سب کارستانیاں اس کی ہیں۔ ہمزاد سے میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ نئے مکان کو رہنے کے قابل بنا دو اور وہ میرے مزاج سے بہ خوبی واقف تھا۔ اس نے وہی کیا تھا جو میں کہتا۔

وہ رات میں نے نئے مکان میں سکون اور اطمینان کے ساتھ سو کر گزار دی۔ صبح مکان کی رجسٹری بھی کرائی اور تھانے جا کر بھی اپنا نیا پتہ لکھوا آیا۔ تھانے والے بھی میری بدلی

ہوئی شکل دیکھ کر حیران ہوئے۔ مگر کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ مجھے شیخ کرامت تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا۔ گزشتہ روز انہیں خاصا سبق مل چکا تھا۔ وہ مجھ سے ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے سے تھے۔

تھانے سے لوٹتے ہوئے مجھے ڈاکٹر امتیاز کا خیال آیا۔ گھر آتے ہی میں نے ارشاد علی کو ساتھ لیا اور ڈاکٹر سے ملنے روانہ ہو گیا۔ ارشاد علی کو میں نے اس لیے اپنے ساتھ لیا تھا کہ وہ مجھے صحیح پتے پر پہنچا دے۔ وہاں پہنچ کر میں نے ارشاد علی کو واپس کر دیا۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ ایک بچی باہر آئی۔ میں نے اس سے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب ہیں؟"

"انکل سے ملنا ہے؟ امتیاز انکل سے؟" بچی نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں بیٹے!"

"کیا نام ہے آپ کا؟" بچی نے پوچھا۔

"شیخ کرامت۔"

"انکل اپنے کمرے میں سو رہے ہیں' ابھی جگاتی ہوں انہیں۔"

"اتنی دیر تک سوتے ہیں تمہارے انکل؟"

"صبح کی سیر کر کے آتے ہیں میرے ساتھ اور پھر سو جاتے ہیں' مگر میں نہیں سوتی۔ اس وقت تک اٹھ جاتے ہیں' نہیں تو میں جگا دیتی ہوں۔ اچھا میں آئی ابھی۔" یہ کہہ کر بچی اندر چلی گئی۔ اس کی باتوں میں بڑا بھول پن تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ وہ ڈاکٹر امتیاز کی بھتیجی ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ بچی بھاگتی ہوئی آئی اور مجھے نشست گاہ میں لے جا کر بٹھا دیا۔

"انکل ابھی منہ دھو کر آ رہے ہیں۔" اس نے بتایا' پھر بولی۔ "چائے پئیں گے آپ؟ بنوا کر لاؤں امی سے؟"

"نہیں بیٹے' شکریہ! آپ بس بیٹھی رہیں۔"

"جی نہیں جناب' میں نہیں بیٹھ سکتی آپ کے پاس۔"

"کیوں؟"

"ابو کہتے ہیں پہلے کام پھر باتیں۔"

"کیا کام ہے آپ کو اس وقت؟"

"اسکول سے آ کر دو پیج لکھتی ہوں' انگریزی کے۔ جس دن نہیں لکھتی نا تو امتیاز انکل یوں آنکھیں نکالنے لگتے ہیں!"

اس نے اس طرح آنکھیں نکال کر دکھائیں کہ مجھے ہنسی آ گئی اور میں بولا۔ "اچھا تو پھر تم جاؤ' لکھو!"

بچی چلی گئی تو میں سوچنے لگا کہ ڈاکٹر امتیاز یقیناً" بے روزگار ہے۔ غالباً" اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے ورنہ پیسے پاس پلے ہوتے تو اپنا کوئی چھوٹا سا کلینک کھول کر بیٹھ جاتا۔ میرے خیال میں وہ ایک ذہین اور باصلاحیت نوجوان تھا۔ اگر اسے آگے بڑھنے کا موقع ملتا تو یقیناً" کچھ کر دکھاتا۔ ایسے نوجوان ملک و قوم کا اثاثہ ہوتے ہیں' لیکن زمانے کی تیز رفتاری اور خود غرضی انہیں آگے نہیں بڑھنے دیتی۔

"السلام علیکم شیخ......" ڈاکٹر امتیاز کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔

اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ "آپ...... آپ نے اپنا نام......"

"بیٹھیں!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "یقین کریں میں ہی شیخ کرامت ہوں۔"

"آواز...... آپ کی آواز تو وہی ہے' مگر......" وہ ابھی تک میرے سامنے کھڑا حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"اور میں بھی وہی ہوں۔ اگر مزید یقین دلانے کی ضرورت ہو تو پرسوں حوالات میں میرے اور آپ کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی' وہ دہرا دوں!"

"لیکن یہ ممکن...... یہ کس طرح ہو سکتا ہے!" اس کی آواز میں حیرت کے باوجود اب شکست کا عنصر شامل تھا۔

"شاید آپ بھول گئے' میں نے آپ سے کہا تھا کہ عقیدے سے بڑی کوئی قوت نہیں۔"

"جی ہاں مجھے یاد ہے۔" یہ کہتا ہوا وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں اس لیے آپ سے ملنے آیا تھا کہ آپ خود اپنی آنکھوں سے خدا کی قدرت کا تماشا دیکھ لیں۔ خدا قادرِ مطلق ہے۔ وہ مردہ جسم میں بھی جان ڈال سکتا ہے۔ میرے یقین کو آپ عملی صورت میں دیکھ رہے ہیں کہ میں آپ کے سامنے زندہ سلامت اور تقریباً" صحت مند بیٹھا ہوں۔"

"صحت مند!...... ارے آپ تو جوان ہو گئے ہیں اور...... یہ ایک ناقابل یقین سی بات ہے' مگر میں اپنے مشاہدے کو کس طرح جھٹلا سکتا ہوں! یقین کریں شیخ صاحب کہ ابھی تک میرا ذہن اس حقیقت کو قبول نہیں کر رہا۔"

"اس کی وجہ ہے۔" میں نے پرسکون آواز میں کہا۔ "ہم اس حد تک مادہ پرست ہو

چکے ہیں کہ ہر معاملے میں عقل ہی کو اپنا رہنما بناتے ہیں۔ عقل کی اہمیت سے مجھے بھی انکار نہیں' لیکن ماورائے عقل بھی بہت کچھ ہے' جس کی کوئی توجیہہ ممکن نہیں۔"

"آپ بجا فرما رہے۔" اس نے میری بات کی تصدیق میں کہا۔ "ہماری عقل ایک خاص حد تک ہی ہماری رہنمائی کرتی ہے ورنہ اس کائنات میں متعدد ایسے مظاہر ہیں کہ ان کا کوئی عقلی جواز پیش نہیں کیا جاسکتا۔

"دراصل ہم نے روحانی اقدار کو یکسر نظرانداز کردیا ہے اور ساری خرابیاں اسی سے پیدا ہوئی ہیں۔ خیر! یہ بتائیں آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟ میں اصل موضوع پر آگیا۔

"فی الحال تو کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن چند دن بعد شاید مجھے جاب مل جائے۔ دراصل ڈاکٹر انوارالحق صاحب مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا تھا۔ انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔"

"خدا کرے آپ کی توقع پوری ہو' مگر میں کچھ اور عرض کرنا چاہتا تھا۔" میں نے اسے معنی خیز انداز میں مسکرا کر دیکھا۔

"جی فرمایئے۔" وہ خوش اخلاقی سے بولا۔

"آپ خود اپنا پرائیویٹ کلینک کیوں نہیں کھول لیتے!" میں نے عرض مدعا سے پہلے راہ ہموار کی۔

"اپنا کلینک نہ کھولنے کے کئی سبب ہیں جناب!" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں آپ جیسے مخلص آدمی سے جھوٹ بولنا نہیں چاہتا کہ میں کسی بڑے خاندان کا فرد نہیں ہوں' بڑے خاندان سے میری مراد روپے پیسے ہے۔ متوسط گھرانا ہے' ہمارے والد اور والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ میرے لیے بھائی صاحب ہی سب کچھ ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے پڑھا لکھا کر اس قابل کیا ہے کہ میں زندگی کی دوڑ میں شامل ہو سکوں۔ خدا ایسا بڑا بھائی سب کو دے۔ بہرحال ان کے ذمے داریاں ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اب مزید ان پر کوئی بوجھ ڈالوں۔ میری خواہش یہ ہے کہ اب ان کی ذمے داریوں کو کم سے کم کردوں۔ اسی تگ و دو میں لگا ہوں اور مجھے خدا کی ذات سے امید ہے کہ وہ مجھے مایوس نہیں کرے گا۔"

"ہوں!" میں چند لمحے خاموش رہا' پھر بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا۔ اگر آپ کو کہیں سے اتنی رقم مل جائے کہ اپنا کلینک کھول لیں تو....."

"جی نہیں۔" اس نے درمیان ہی میں میری بات کاٹ دی۔ "اوّل تو یہ کہ میں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا' یعنی قرض لے کر میں یہ کام نہیں کرسکتا! دوسری وجہ یہ ہے کہ

اپنا کلینک کھول لینا تو آسان ہے' مگر اسے چلانا اتنا آسان نہیں۔"

"آپ اپنی بات کی وضاحت کریں گے؟.... میں سمجھا نہیں کہ کلینک چلانے میں کیا قباحت ہے؟"

"بات یہ ہے جناب کہ مریض عموماً ہمارے جیسے نوجوانوں کو بالکل اناڑی سمجھتے ہیں۔ وہ تجربہ کار افراد کو ترجیح دیتے ہیں۔ میں اس کی ایک مثال عرض کروں۔ میرے ہی کلیگز میں سے ایک نے گوری کے قریب جو آبادی ہے غریبوں کی' وہاں اپنا کلینک کھولا ہے۔ ابھی کوئی ایک مہینہ ہوا..... بندہ ایم بی بی ایس ہے اور ذہین بھی۔ اسی سے کچھ فاصلے پر ایک بڑے میاں کا کلینک ہے' جو میرے علم و اطلاع کے مطابق پہلے ایک ڈاکٹر کے کمپاؤنڈر ہوتے تھے۔ نہ ان کے پاس مناسب تعلیم ہے نہ ڈاکٹری کی ڈگری۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ میرا کلیگ تو دن بھر مریضوں کے انتظار میں سوکھتا رہتا ہے اور ان بڑے میاں کے کلینک پر مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اب بتائیں ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ یہ معتبر و معزز پیشہ بھی لوگوں کی لاعلمی کے سبب دکان داری بن گیا ہے۔ آئے دن ایسے اناڑیوں کے ہاتھوں لوگوں کی زندگی خطرے میں پڑی رہتی ہے۔ کیس بگڑ جاتا ہے تو مریض کو سرکاری ہسپتال کا راستہ دکھا دیتے ہیں۔ کوئی مرے یا جیے ان کی بلا سے!" یہ کہہ کر ڈاکٹر امتیاز خاموش ہوگیا۔

"آپ اسے نصیحت نہ سمجھیے گا۔" میں اس کی پوری بات سمجھ کر بولا۔ "دراصل اس کی بنیادی وجہ ناخواندگی ہے۔ اس فضا کو آپ ایسے ہی نوجوان بدل سکتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ہمارے ملک میں ایک دم خواندگی کی سطح بلند ہو جائے۔ اس اس میں بڑا وقت لگے گا اور یہ بھی کہ اس سلسلے میں ہمیں ایثار اور قربانیوں سے کام لینا پڑے گا۔ لوگوں کا شعور رفتہ رفتہ ہی بلند ہو گا۔ ایسی صورت میں اگر آپ جیسے سمجھ دار نوجوان ہمت ہار بیٹھیں گے تو حالات جوں کے توں رہیں گے۔ ان حالات کو اسی وقت بدلا جاسکتا ہے جب شر کی جگہ خیر آجائے' بدی کی جگہ نیکی لے لے' برائی کی جگہ بھلائی اپنے قدم جمالے۔ یہ کام ایثار اور قربانی کا طالب ہے' اس کے لیے ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک سرد جنگ ہے جو آپ کی نسل کو جیتنا ہے۔ تو کیا آپ سپر ڈال دینا چاہتے ہیں؟"

میری گفتگو کے دوران میں اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔ یقیناً میرے استدلال نے اس پر کچھ نہ کچھ اثر کیا تھا۔ بالآخر وہ تھکی تھکی سی آواز میں بولا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں' لیکن...... لیکن...."

فضا کیوں کہ خاصی سنجیدہ ہو گئی تھی اس لیے اس کے بوجھل پن کو دور کرنے کی خاطر

میں نے مسکرا کر کہا۔ "لیکن یہ کہ سامان جنگ کہاں سے آئے؟ غالباً" آپ یہی کہنا چاہتے ہوں گے!"

وہ بھی مسکرا دیا۔ "آپ ٹھیک سمجھے۔"

میرا جو مدعا تھا۔ اس کے لیے اب فضا ہموار ہو چکی تھی۔ میں نے آہستگی سے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ بڑے نوٹوں کی ایک گڈی' میں اسی غرض سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ دس ہزار روپے تھے۔ میں نے نوٹوں کی گڈی اس کی طرف بڑھا دی اور پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا' بولا۔ "یہ قرض حسنہ ہے' آپ پر کوئی احسان نہیں۔ جب آپ کے پاس ہوں' واپس کر دیجئے گا' میں واپس لینے سے انکار نہیں کروں گا۔"

"نہیں.... نہیں جناب' یہ.... یہ کیسے ہو سکتا ہے! آپ.... آپ.... میں اتنی بڑی ذمے داری کا خود کو اہل نہیں سمجھتا۔" میں نے زور دے کر کہا۔

"تو اسے بڑے بھائی کی طرف سے چھوٹے بھائی کے لیے ہدیہ سمجھ لیجئے گا۔ رکھ لیں ورنہ میں سمجھوں گا کہ آپ کو میرے خلوص پر شبہ ہے۔" میں نے زور دے کر کہا۔

وہ شریف النفس نوجوان بڑی مشکل سے رام ہوا۔ پھر میں نے اسے اپنے نئے مکان کا پتہ سمجھایا اور اٹھنے لگا۔ اس نے بغیر چائے پلائے مجھے نہ اٹھنے دیا۔ جب وہ مجھے رخصت کر رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں ممنونیت کے آنسو تھے اور سر جھکا ہوا تھا۔ مفاد پرست لوگوں کی اس دنیا میں یقیناً" اس نوجوان کے لیے یہ بڑا انوکھا اور نیا تجربہ تھا۔ میں اسے خجالت کے احساس سے بچانے کی خاطر مزید وہاں نہیں رکا اور "خدا حافظ" کہہ کر اس کے گھر سے نکل آیا۔

تصویر کا یہ ایک رخ تھا اور اب میں تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے جا رہا تھا۔ اب مجھے اپنے سابق شریک کار نصیر الدّین سے ملنا تھا۔ ڈاکٹر امتیاز اگر نیکی کی علامت تھا تو نصیر الدّین بدی کا شاہکار! اس نے نہ صرف میرے پورے کاروبار پر ناجائز قبضہ کر لیا تھا بلکہ مجھے اپنا مقروض ثابت کر کے عدالت میں مجھ پر عدم ادائیگی کا کیس بھی کر دیا تھا۔

ایک زمانے میں جب میں نیا نیا چاٹگام آیا تھا تو یہی نصیر الدین کوڑی کوڑی کو محتاج تھا۔ چھوٹے شہروں میں چھوٹے سرمایہ دار بھی بڑے گنے جاتے ہیں۔ کسی سے اسے میرے بارے میں علم ہوا کہ میں پیسے والا آدمی ہوں' خود ہی آ کر ملا اور مجھے اپنی بپتا سنائی۔ اس بپتا کا خلاصہ یہ تھا کہ اسے کاروبار میں گھاٹا ہو گیا ہے اور یہ کہ سرمائے کی کمی کے سبب وہ مار کھا گیا ہے۔ اگر مناسب سرمایہ ہو تو وارے کے نیارے ہو سکتے ہیں۔ اس نے میرے سامنے کئی تجاویز رکھیں جن میں سے ایک مجھے پسند آ گئی۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں اپنی آمدنی کے اصل ذریعے کو چھپانا

چاہتا تھا۔ کم از کم اس نئے شہر میں مجھے یہ شہرت نہیں کرنا تھا کہ میرا ہمزاد میرے قابو میں ہے۔ دنیا دکھاوے کے لیے مجھے کوئی نہ کوئی کاروبار کرنا ہی تھا۔ نصیر الدّین چائے کی برآمد میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ واقعی وہ اس سلسلے میں تجربہ رکھتا ہے اور پیسہ نہ ہونے ہی کی وجہ سے پٹ رہا ہے۔ یہ مسلّمہ اصول ہے کہ بڑی مچھلی' چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ جن لوگوں کے بڑے کاروبار تھے' وہ نصیر الدّین کو پنپنے نہیں دے رہے تھے کہ کہیں کل کو یہی شخص ان کے مقابل نہ آ جائے۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ کتنا بنیادی سرمایہ چاہیے؟ اس نے پانچ لاکھ کی رقم کو کافی بتایا۔ میں نے ہاں کر لی اور لکھت پڑھت بھی ہو گئی۔ ابتدا میں دو چار دفع میں اس جگہ گیا جہاں اس نے اپنا دفتر قائم کیا تھا۔ پھر مہینوں بعد جانے لگا اس لیے کہ نفع ہوتا یا نقصان مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ آمدنی کے ذرائع کے سلسلے میں لوگ میری طرف سے شبہے میں نہ پڑیں۔ رفتہ رفتہ میں نصیر الدّین پر اتنا اعتماد کرنے لگا کہ بہ حیثیت شریک کار وہ مجھ سے جس کاغذ پر دستخط کراتا' ایک نظر اس پر ڈال کر دستخط کر دیتا۔ اس کے بعد میں نے سرسری نظر ڈالنا بھی چھوڑ دی' جہاں اس نے کہا' دستخط کر دیے۔ نہ مجھے اپنے لگائے ہوئے بنیادی سرمائے کی طرف فکر تھی' نہ منافع کی خواہش تھی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر نصیر الدّین نے چپ چپاتے مجھ سے اس کاغذ پر بھی دستخط کر لیے جس کی رو سے وہ مجھے میرے پانچ لاکھ واپس کر چکا تھا اور اب تنہا سارے کاروبار کا مالک تھا۔ اسی کے ساتھ اس نے مجھے مزید پھانسنے کی خاطر پونے دو لاکھ روپے کا مقروض بھی بنا لیا۔ جھوٹی رسیدوں پر دستخط کرا کے! اس حد تک بھی میرے نزدیک وہ قابل معافی تھا اس لیے کہ گناہ اس نے کیا تھا اور بالا آخر اس گناہ کی سزا اسے ہی بھگتنا تھی' یہاں نہیں تو آخرت میں! مگر ہوا یہ کہ وہ سینہ زوری پر اتر آیا اور وہ بھی میرے ساتھ! میری جگہ کوئی اور ہوتا تو رو دھو کر بیٹھ جاتا اور اپنی حماقت پر زندگی بھر پچھتاتا رہتا۔ آدمیت پر اسی لیے تو اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ نصیر الدّین جیسے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہی عقل کل ہیں۔ ایسوں کا سبق دینا یوں بھی ضروری ہے کہ کل وہ کسی اور شریف آدمی کے گرد اپنی ریاکاری کا جال نہ بن سکیں۔ بات صرف مقدور کی ہے اور مجھے یہ مقدور تھا۔ اب میں اس کے سارے کس بل بہ آسانی نکال سکتا تھا۔ "سو دن سنار کے' ایک دن لوہار کا" یہ کہاوت یوں ہی تو نہیں بنی۔ اس کے پیچھے صدیوں کا انسانی تجربہ ہے' مگر نصیر الدین شاید یہ بھول گیا تھا اور اس وقت اسے یہی یاد دلانے جا رہا تھا۔

اس نے چاٹگام جیسے شہر میں بڑا اچھا دفتر بنایا تھا۔ وہاں جتنے لوگ کام کرتے تھے' کم و بیش سبھی مجھ سے واقف تھے اسی لیے جب میں ایک طویل عرصے کے بعد دفتر میں داخل ہوا تو

وقتی طور پر ہلچل سی مچ گئی۔ شاید بدلے ہوئے چہرے کے سبب وہ یہ سمجھے تھے کہ میں ان کے سابق مالک کا بیٹا ہوں۔ نصیر الدین غالباً" پورے اسٹاف کو یہ باور کرا چکا تھا کہ اب وہی تنہا سارے کاروبار کا مالک ہے اور میرا اس فرم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات مجھ سے کسی نے کہی تو نہیں لیکن لوگوں کے چہروں اور ان کے رویوں سے مجھ پر حقیقت روشن ہو گئی۔ کوئی ایک شخص بھی میرے لیے کرسی چھوڑ کر کھڑا نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کسی تپاک کا مظاہرہ کیا تھا۔

نصیر الدین پہلے سے الگ کمرے میں بیٹھتا تھا۔ مجھے یہ ضرورت پیش نہیں آئی کہ اسے اپنی آمد سے مطلع کراتا۔ اس کے کسی "مصاحب" نے اسے خبر کر دی تھی۔ وہ اپنے اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی خاطر خود ہی اپنے کمرے سے نکل کر باہر آ گیا۔

"آداب! آپ غالباً" شیخ صاحب کے فرزند ہیں۔ تشریف لائیے۔" وہ میرے قریب آ کر بولا اور اپنے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ نے کیسے زحمت کی؟"

"ابھی کمرے میں چل کر عرض کر دوں گا۔" یہ کہتا ہوا میں اس کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔ میری آواز سن کر وہ چونکا ضرور تھا، مگر کچھ بولا نہیں۔

کمرے میں پہنچ کر وہ اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا اور اپنے سامنے رکھی ہوئی فائلوں کو ایک طرف سرکاتے ہوئے بولا "بیٹھیں۔"

میں اس کے مقابل والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے اور اس کے درمیان میز تھی۔ اصل گفتگو شروع کرنے سے پہلے میں نے اس سے کہا۔ "نصیر الدین! مجھے تم سے خلوت میں کچھ بات کرنا ہے اس لیے یہ بہتر ہے کہ تم اپنے چپراسی کو بلا کر ہدایت کر دو، اس دوران میں کوئی اندر نہ آئے۔ میرے بدلے ہوئے چہرے پر نہ جاؤ۔ میں شیخ کرامت ہی ہوں!"

لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آئے، پھر اس نے کہا۔ "اگر واقعی ایسا ہے بھی تو میں اس وقت ذرا کچھ مصروف تھا۔ کام بہت ہے آج کل۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کسی اور وقت آ جائیں۔ ٹھہریں، میں اپنی ڈائری دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ وہ ٹیبل کیلنڈر کے ورق الٹنے لگا۔

میں اس کی حماقت اور بھونڈی اداکاری پر مسکرا ہی سکتا تھا، سو مسکرا رہا تھا۔

"ہاں...... یہ..... یہ دیٹ..... یہ ٹھیک ہے۔" وہ جیسے خود سے باتیں کر رہا تھا۔ "میں لکھ لیتا ہوں، یہاں آپ کا نام، وہ قلم اٹھا کر لکھنے لگا۔ "شام چار اور پانچ بجے کے درمیان پرسوں آ جائیے۔ دراصل کام اتنا بڑھ گیا ہے کہ ایک ایک لمحے کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

اس نے اپنا سوجا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا اور اندر گوشت میں دھنسی ہوئی چھوٹی سی عیّار

آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"یہ تو ٹھیک کہتے ہو تم نصیر الدین کو بہت مصروف آدمی ہو تم! وقت بھی نہیں ہے تمہارے پاس! مگر دیرینہ دوستوں کے لیے تو وقت نکالنا ہی پڑتا ہے۔ آج ہی بات ہو جائے تو اچھا ہے۔ کام تو زندگی بھر کا ہے، کرتے رہنا۔" میں پرسکون آواز میں بولا۔ "یہ اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ میں تم سے مصالحت کی بات کرنے آیا تھا۔ میرے تمہارے درمیان جو رنجش خواہ مخواہ پیدا ہو گئی ہے، وہ ختم ہونا چاہیے۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے نا!" میں اسے کھلا رہا تھا۔

"دیکھیں شیخ صاحب، معاف کیجئے مصالحت کا وقت اب گذر چکا ہے۔ میرے آپ کے درمیان مقدمے بازی چل رہی ہے۔ اب فیصلہ عدالت کرے گی۔ اگر آپ اسی سلسلے میں بات کرنے آئے ہیں تو فضول ہے۔ بیکار اپنا اور میرا وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ میری شرافت ہے کہ آپ سے دیرینہ تعلقات کے سبب میں نے عزّت کے ساتھ یہاں اپنے کمرے میں بٹھا لیا ورنہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو آپ کو اس کمرے ہی میں نہیں، دفتر میں بھی گھسنے نہ دیتا!" نصیر الدین کا فطری گھٹیا پن ظاہر ہونے لگا۔

"خیر یہ تو تمہارا احسان ہے نصیر الدّین اور اس احسان کو میری آنے والی کئی نسلیں یاد رکھیں گی، مگر اس کے باوجود بات ابھی اور اسی وقت ہو گی!" میرا لہجہ بدلنے لگا۔

"کوئی زبردستی تو نہیں ہے؟" وہ عیّاری سے مسکرایا۔ "میں چاہوں تو ابھی آپ کو یہاں سے نکلوا سکتا ہوں۔"

"غلط فہمی ہے تمہاری یار!" میں ہنس پڑا۔ "تم تو تم تمہارے ابّا حضور قبلہ بھی مجھے یہاں سے جانے پر مجبور نہیں کر سکتے!"

"شیخ صاحب! دیکھیں آپ میرے باپ تک پہنچ رہے ہیں اور میں..... میں یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا! چلے جائیں۔ یہاں سے ورنہ میں چپراسی سے دھکے دلوا کر آپ کو دفتر سے نکلوا دوں گا!" غصے کی وجہ سے اس کا پھولا ہوا چہرہ مزید پھول گیا۔ "پھر یہ بھی نہ بھولو کہ تم خود کو اس بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ شیخ کرامت ثابت نہیں کر سکتے۔ تم نے یقیناً" کسی غیر ملک جا کر پلاسٹک سرجری کرائی ہے اور اس طرح خود اپنے لیے گڑھا کھود لیا ہے!" وہ بے ادبی پر اتر آیا۔

"گڑھا تو میں نے تمہارے لیے کھودا ہے نصیر الدّین! بس اس وقت تمہیں اس گڑھے میں دھکا دینے آیا تھا اور تم مجھے ایسا کرنے سے روک نہیں سکتے!" یہ کہہ کر میں اٹھا اور پھر پلٹ

کر اندر سے دروازہ بند کر دیا۔

"کیا کر رہے ہو یہ تم!" وہ خوف زدہ سی آواز میں چیخا۔ "میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔" یہ کہ کر اس نے ایک طرف رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں لپک کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ "حماقت نہ کرو گدھے!" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ سے ریسیور چھین لیا۔ "کس سے بات کرو' میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا!" میں نے ریسیور کو دوبارہ کریڈل پر رکھ دیا اور گھوم کر دوبارہ اس کے سامنے آ بیٹھا' پھر بولا۔ ""اب اگر تم نے ریسیور اٹھایا تو ٹیلی فون کا تار کھینچ کر نکال دوں گا!" میرے لہجے میں دھمکی تھی۔

وہ خوف زدہ سا نظر آنے لگا اور تیز تیز سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔

"ہاں تو نصیر الدین! اب کہو' مصالحت پر آمادہ ہو؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہرگز نہیں!" اس نے تیز آواز میں جواب دیا۔ "یہ نہ سمجھنا کہ تم غنڈہ گردی کر کے مجھ سے اپنی بات زبردستی منوا لوگے۔"

"غنڈہ گردی!" میں زور سے استہزائیہ انداز میں ہنس پڑا۔ "غنڈے تم ہو یا میں؟"

"تم کر رہے ہو غنڈہ گردی! میں تو شرافت سے بات کر رہا تھا۔"

"مگر شرافت سے تمہارا کیا تعلق! تم تو انتہائی کمینے اور ذلیل آدمی ہو' احسان فراموش ہو!"

"تم پھر حد سے بڑھ رہے ہو!"

"وہ تو میں بڑھوں گا اور تمہیں برداشت کرنا پڑے گا۔"

"کورٹ میں بات کرنا' کورٹ میں!"

"کورٹ!..... ہونہہ! کورٹ شرفا کے لیے ہوتی ہے۔ تم ایسے بدمعاشوں اور جعل سازوں کے لیے نہیں۔"

"تو پھر جعل ساز ثابت کر دو نا' مجھے عدالت میں! یہاں غنڈہ گردی کرنے کیوں آ گئے ہو!"

"تمہیں جعل ساز ثابت کرنے کے لیے خود تمہارا مردہ ضمیر کافی ہے۔ اس کے لیے مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں نصیر الدین!" میرے لہجے میں انتہائی چبھن تھی۔

"ضمیر اور بے ضمیری کی بات کمزور لوگ کرتے ہیں۔ کوئی اور بس نہیں چلتا تو ضمیر کی رٹ لگانے لگتے ہیں۔ میں کمزور آدمی نہیں ہوں' میرے پاس دولت ہے اور اس دنیا

میں دولت ہی سب سے بڑی قوت ہے۔"

"بیٹری ہو تم!" میں نے ہنس کر کہا۔ "کتنی دولت ہو گی تمہارے پاس! یہی دس بیس لاکھ یا اس سے بھی زیادہ ہے؟"

"تم کون ہوتے ہو یہ پوچھنے والے! کچھ بھی ہو میرے پاس' میرا اپنا ہے! میں نے اپنی محنت اور ذہانت سے کمایا ہے!"

"محنت اور ذہانت سے یا عیاری اور خباثت سے؟"

"بھونکے جاؤ کچھ بھی' مجھ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو گا!"

"اس لیے کہ تم چکنے گھڑے ہو! کمینگی کی انتہا پر پہنچ چکے ہو! اور اپنا وہ وقت بھول چکے ہو جب کوڑی کوڑی کو محتاج تھے اور میرے پاس آ کر رِیبیائے تھے کہ بڑے کاروباریوں نے تمہاری ناک میں نکیل ڈال دی ہے' تمہیں سرمایہ چاہیے۔ بھول گئے اپنی اوقات!" میں نے اسے گھورا۔

"کوئی احسان نہیں کیا تھا' تم نے مجھ پر! برابر کے شریک تھے تم!"

"پھر کیا ہوا؟..... بولو! تم نے اس شریک کار کو' اپنے اس محسن کو جس نے بڑے وقت میں تمہارا ساتھ دیا تھا۔ فراڈ کر کے نو دو گیارہ کر دیا۔ اسی کو ذہانت کہہ رہے ہو تو!"

"میں نے تم سے کوئی فراڈ نہیں کیا۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "جو فراڈ کرتے ہیں خود چل کر عدالت نہیں جاتے جہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا ہے!"

"ڈراما خوب بولتے ہو تم' اگر کسی ناٹک کمپنی میں ہوتے تو اچھا کما کھاتے۔ مسخرے کا کردار تم پر اچھا چجتا۔" میں نے اس کا مذاق آڑایا۔ "تمہاری صورت دیکھ کر ہی ہنسی آنے لگتی ہے۔ چلتے ہو تو لگتا ہے کوئی بڑی سی فٹ بال لڑھک رہی ہو! اس پر کپڑے ایسے پہنتے ہو کہ معلوم ہوتا ہے ڈھولک پر غلاف چڑھا دیا گیا ہے۔" یہ کہہ میں ہنسنے لگا۔

"زیادہ دانت نکالنے کی ضرورت نہیں ہے!" وہ ایک بار پھر گرم ہو گیا۔ "تمہیں میرا مذاق اڑانے کا کوئی حق نہیں' چلتے پھرتے نظر آؤ' اسی میں بہتری ہے تمہاری! میں تمہاری باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔"

"میں تو تمہیں غیرت دلا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید شرافت کی کوئی چنگاری تمہارے ناپاک وجود میں اب بھی باقی رہ گئی ہو۔"

"ناپاک وجود ہو گا تمہارا! شرافت کی بات بزدل کرتے ہیں اور میں بزدل نہیں ہوں۔ کیسی شرافت' کیسی مصالحت! تم نے کاروبار میں جو رقم لگائی تھی' واپس لے لی اور ہمارے

درمیان تحریری معاہدہ یہ تھا کہ جب میں تمہاری رقم واپس کردوں گا تو وہ تحریری معاہدہ منسوخ تصور کیا جائے گا۔ اب کس بات کا رونا رو رہے ہو! اس کے علاوہ پونے دو لاکھ روپے تم نے مجھ سے مزید لے لیے' اپنے علاج معالجے کی خاطر!"

"یہ تو میں بالکل بھول ہی گیا تھا' اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا کہ اپنا علاج میں نے تم سے پیسے لے کر کرایا تھا!" میری آواز میں تمسخر تھا۔ "میں نے تم سے جو رقم وقتاً فوقتاً لی ہے ظاہر ہے کہ اس کی پکی رسیدیں تو ہوں گی تمہارے پاس! جیسا کہ تم کئی بار بتا چکے ہو' مگر مجھے نہ جانے کیوں یقین نہیں آتا اس بات پر! تمہارے پاس رسیدیں وسیدیں ہیں نہیں' تم یونہی دون کی لے رہے ہو!"

عدالت میں سب معلوم ہو جائے گا تمہیں' رسیدیں ہیں یا نہیں! نصیرالدین کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔"

"تو ابھی تک تم گولیاں کھیلتے ہو' بچوں کی طرح! سچ بات آ ہی جاتی ہے زبان پر!..... خیر میں تمہیں یہ بتا دوں کہ اب عدالت کا رخ کیا تم نے تو بہت ذلیل ہونا پڑے گا وجہ یہ کہ وہ جعلی رسیدیں اب تمہارے پاس نہیں ہیں۔"

میں مسکرا کر بولا۔ "تم پر الٹا کیس ہو جائے گا۔"

"بکتے ہو تم! میں نے انہیں بہت سنبھال کر اپنے گھر کی سیف میں رکھا ہے!" یہ کہتے ہوئے وہ کچھ نروس سا نظر آنے لگا۔ غالباً" اس کی وجہ سے میرا پر یقین لہجہ تھا۔

"میں بکتا نہیں گدھے' فرمایا کرتا ہوں! وہ رسیدیں میرے پاس ہیں کہو تو ابھی دکھا دوں؟"

"شاید تمہارا دماغ چل گیا ہے۔" وہ ہنسنے لگا' پھر بولا "یا پھر تم کوئی چکر چلانا چاہتے ہو!"

میں نے اس دوران میں ہمزاد کو طلب کر لیا اور اس سے کہا۔ "رسیدیں لے آؤ' یہ کہتا ہے کہ وہ جعلی رسیدیں اس کے گھر کی سیف میں رکھیں ہیں' بے وقوف کہیں کا!"

ہمزاد میرا حکم سنتے ہی غائب ہو گیا۔

"اب مجھے یقین آ گیا شیخ کرامت کہ تم واقعی سرک گئے ہو۔" وہ ہنس کر کہنے لگا۔ ہواؤں سے باتیں کرنے لگے ہو!

"دم لو ذرا چھری کے نیچے' ابھی تمہاری فاختہ اڑ جائے گی بیٹا جب رسیدیں دکھاؤں گا۔" میرا جملہ پورا ہوا تھا کہ ہمزاد واپس آ گیا اور نے آہستگی کے ساتھ میری واسکٹ کی جیب میں رسیدیں لا کر رکھ دیں۔ میں نے اشارے سے اسے رخصت کر دیا۔ نصیرالدین مجھے اس

طرح دیکھ رہا تھا جیسے واقعی اسے میری ذہنی صحت پر شبہ ہو۔ میں نے اسے ایک بار پھر مخاطب کیا۔ "ہاں تو برخوردار' دیکھو گے وہ رسیدیں؟" اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا' میں نے اپنی واسکٹ کی جیب سے ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ رہیں وہ رسیدیں!" میرا ہاتھ واسکٹ کی جیب سے باہر آ گیا۔

نصیرالدین کے چہرے پر اس وقت زلزلے کے آثار تھے جب میں رسیدوں کی تہیں کھول کر اسے دکھا رہا تھا۔ اسے جیسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ پونے سات لاکھ روپے کی رسیدیں تھیں اور ان پر اسٹامپ بھی لگے ہوئے تھے۔ نصیرالدین کے لیے گویا وہ پونے سات لاکھ روپے تھے۔ معاً" میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس نے تیزی کے ساتھ جھک کر اپنی میز کی ایک دراز کھولی اور پھر مجھے اس کی ہاتھ میں ریوالور نظر آیا۔

"شیخ کرامت! یہ رسیدیں میرے حوالے کر دو ورنہ گولی مار دوں گا!" وہ مجھ پر ریوالور تان کر کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔

چلو اچھا ہوا تمہارا یہ روپ بھی نظر آ گیا کہ تم دولت کی خاطر کسی کو قتل بھی کر سکتے ہو!" میں نے انتہائی پر سکون لہجے میں کہا اور ہمزاد کو دوبارہ طلب کر لیا۔

"رسیدیں پھینک دو میز پر!" وہ میری بات کو نظر انداز کرتا ہوا بلند آواز میں بولا' مگر دوسرے ہی لمحے ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

ہمزاد نے اس سے ریوالور چھین کر مجھے تھما دیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اب میرے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا' دوسرے میں رسیدیں۔ ریوالور اتنی تیزی کے ساتھ اس کے ہاتھ سے نکل کر مجھ تک پہنچ گیا تھا کہ شاید نصیرالدین کچھ سمجھ ہی نہ سکا تھا کہ ایک دم ہوا کیا۔ اب اس کے چہرے پر انتہائی حیرت اور خوف کے تاثرات تھے۔

"اب میں تمہیں گولی مار دوں تو؟" میں نے ریوالور اس کی طرف سیدھا کر لیا۔

"نن ..... نہیں!" وہ تقریباً" چیخ اٹھا۔ "گولی نہ مارنا!..... میں ..... میں..... مجھے رسیدیں نہیں چاہیں۔"

"کیوں؟..... رسیدوں کے بغیر کیس کیسے لڑو گے؟" میں چبھتی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیس..... واپس..... واپس لے لوں گا میں۔" وہ گھگیانے لگا۔

"نہیں! رسیدیں تو میں تمہیں ضرور دوں گا!" یہ کہہ کر میں نے رسیدیں اس کی طرف پھینک دیں۔

وہ حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی اپنے سامنے پڑی ہوئی رسیدیں دیکھنے لگا۔

"اٹھا کر دیکھو انہیں۔ یہ وہی رسیدیں ہیں جو تم نے اپنے گھر کی سیف میں رکھی تھیں!"

"مجھے..... مجھے یقین ہے..... یقین ہے شیخ صاحب!" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"اچھا تو میں پھر شیخ صاحب ہو گیا۔" لفظ صاحب پر میں نے زور دیا اور مسکرانے لگا' پھر ایک دم میرا لہجہ بدل گیا۔ "رسیدیں اٹھاؤ! ورنہ....." میں نے ریوالور کو حرکت دی۔

"اٹھا..... اٹھا رہا ہوں!" وہ لرزنے لگا۔ "خدا..... خدا کے لیے گو..... گولی نہ چلائیے گا۔" پھر جب وہ جھک کر میز سے رسیدیں اٹھا رہا تھا تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

اس وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے اس سے سوال کیا۔ "وہ معاہدہ بھی تمہاری سیف میں ہے جو تم نے مجھ سے لکھوایا تھا' شراکت کا معاہدہ؟"

"ج..... جی..... جی ہاں شیخ صاحب!" اس نے جواب دیا اور اسی وقت کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ "کک..... کون..... کون ہے؟"

"کوئی بھی ہو' کہہ دو کہ تم اس وقت کسی سے ملنا نہیں چاہتے!" میں نے اسے حکم دیا۔

اس نے بلند آواز میں میرا حکم دہرایا۔ میں نے دروازے سے قدموں کی چاپ دور ہوتے سنی۔ ہلکی سی "کھٹ کھٹ" کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ دروازے پر دستک دینے والی کوئی لڑکی ہو گی۔ دفتر میں اب نصیر الدین نے لڑکیوں کا اضافہ بھی کر لیا تھا جنہیں میں نے آتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔

"ابھی بینک کا وقت ہے۔ تمہارے اکاؤنٹ میں کتنے روپے ہیں؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا' پھر سخت لہجے میں بولا۔ "جھوٹ نہ بولنا!"

"مجھے..... ٹھیک..... ٹھیک سے علم نہیں' اپنے اکاؤنٹنٹ سے پوچھ کر....."

"پوچھنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں خود معلوم کرائے لیتا ہوں۔ ابھی تک یہیں قریبی برانچ میں ہے نا تمہارا اکاؤنٹ؟" میں نے اسی کے ساتھ بینک کا نام لیا۔

"جی..... جی ہاں نیشنل بینک ہی میں ہے ابھی تک میرا اکاؤنٹ!" اس نے تصدیق کی۔ رسیدیں اب تک اس کے ہاتھ میں تھیں۔ اس کے چہرے سے خوف کے ساتھ اب الجھن کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔ وہ یقیناً" میری بات کی تہ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔

"چیک بک تو ہو گی' تمہاری میز کی دراز میں؟" میں بولا' پھر اس کے جواب دینے سے پہلے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم بے ایمان آدمی ہو اور جو خود بے ایمان ہوتا ہے کسی دوسرے پر اعتماد نہیں کرتا اس لیے مجھ سے بہانہ نہ کرنا کہ چیک بک' اکاؤنٹنٹ کے پاس ہے۔"

"میں..... میں نے کب کہا شیخ صاحب کہ چیک بک میرے پاس نہیں!" وہ بڑی لجاجت سے بولا۔ اپنی موت کو سامنے دیکھ کر اس کی ساری اکڑفوں رخصت ہو گئی تھی۔

"رسیدیں فی الحال میز پر رکھ دو اور چیک بک نکالو جلدی!"

"اس نے فوراً" میرے حکم کی تعمیل کی' پھر ڈرتے ڈرتے سہمی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔ "آپ..... آپ کیا..... کیا چاہتے ہیں شیخ صاحب؟"

"اپنے پانچ لاکھ واپس لینا چاہتا ہوں' چیک کاٹو تم!"

میری بات سن کر اس نے طویل سانس لیا' پھر کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے' مگر..... بیلنس اتنا نہ ہوا تو..... تو پھر....."

"وہ تم مجھ پر چھوڑ دو! ابھی تم بہت دعوے کر چکے ہو کہ بڑے دولت مند بن گئے ہو اور تمہارا دعویٰ مجھے غلط نہیں لگتا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم سے فراڈیوں کے پاس بہت مال ہوتا ہے! ہاں یہ خیال رکھنا کہ دستخط صحیح ہوں۔ میں اس وقت تک یہیں بیٹھا رہوں گا جب تک چیک کیش نہیں ہو جائے گا! لکھو پانچ لاکھ کا چیک! چیک پر سیلف' لکھنا!" میں نے تاکید کی۔

"وہ تو میں لکھ دیتا ہوں مگر....." وہ قلم اٹھاتے ہوئے بولا۔

"مگر کیا؟"

"آپ یہیں بیٹھیں رہیں گے تو..... تو چیک کون کیش کرا کے لائے گا؟" آپ مجھ پر یقین کریں' میں صحیح دستخط کروں گا۔"

"تاکہ ادھر میں چیک لے کر بینک جاؤں' ادھر تم فون پر مینجر سے کہہ دو کہ چیک کیش نہ کرے۔ بعد میں تم بینک کو اس چیک کے نمبر لکھ کر دے دو گے کہ اس نمبر کا چیک گم ہو گیا ہے اور اس کا پیمنٹ نہ کیا جائے!" میں نے یہ کہتے ہوئے اسے گھورا۔ "تمہاری بڑی کھوپڑی میں جو دو تولے بھیجا ہے' اس پر زیادہ زور نہ ڈالو' مجھے احمق کی دم!"

اب اسے میں احمق کی دم کہتا یا کچھ اور' وہ برا نہ مانتا' ایک کان سے سنتا دوسرے نکال دیتا۔ یہی ہوا بھی۔ وہ برا مانے بغیر نرمی سے بولا۔ "شیخ صاحب! مجھے اعتراف ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ برا سلوک کیا اور یہ کہ میں بہت برا ہوں' مگر اب..... اب آپ کے ساتھ کوئی

دھوکا نہیں کروں گا۔ آپ کہیں تو بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔"

میں استہزائیہ انداز میں ہنس پڑا۔ "تم ایسے لوگوں کی قسموں اور اعتراف گناہ کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تم کتے کی دم کی طرح ہو جسے بارہ سال بھی کسی نلکی میں رکھا جائے تو ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہے گی۔"

"تو پھر یوں کرتے ہیں کہ آپ یہاں تشریف رکھیں' میں خود چیک کیش کرا کر لے آتا ہوں۔" اس نے دوسری تجویز پیش کی۔

"چیک کیش کرا کے لاؤ گے یا پولیس کو ساتھ لے کر آؤ گے۔"

"آپ تو کسی طرح مان ہی نہیں رہے اور...... اور اگر ہم دونوں ہی یہیں بیٹھے رہے تو...... تو پھر چیک کون......" "ہاں واقعی یہ بات تو ہے۔" میں اس طرح چونک کر بولا جیسے پہلے یہ بات میرے ذہن ہی میں نہ آئی ہو۔ میں اس سے دانستہ کھیل رہا تھا۔

"اب آئی بات آپ کی سمجھ میں!" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

میں ایک دم اس پر ناراض ہو گیا۔ "دانت بند کر گھامڑ آدمی! چلا مجھے پٹی پڑھانے! ابے کیا تیرا کوئی آدمی چیک کیش کرا کے نہیں لا سکتا؟ بولا!"

"یہ...... یہ بات بھول...... بھول گیا تھا شیخ صاحب!" اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ پل پل وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہا تھا۔

"چیک لکھ جلدی سے!" میں بہ دستور سخت لہجے میں بولا۔ "دیر کی تو کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا! تیرے ابا جی کا مال نہیں تھا کہ تو پی جاتا چپ چاپ! اپنی ہی رقم واپس لے رہا ہوں' اس پر تو اس قدر کمینگی دکھا رہا ہے!"

کچھ دیر کو میرے زم رویے سے اس کے چہرے پر جو ذرا سی رونق آ گئی تھی' پھر ختم ہو گئی۔ وہ خاموشی سے سر جھکا کر چیک لکھنے لگا۔ چیک لکھنے کے بعد اسے چیک بک سے پھاڑ کر وہ مردہ سی آواز میں بولا۔ "اکاؤنٹنٹ کو بلا لوں؟ وہ...... وہ چیک کیش کرا لائے گا۔"

"میں نے کہا تجھ سے اکاؤنٹنٹ کو بلانے کے لیے؟" میں نے آنکھیں نکالیں۔ اس نے سر جھکا لیا۔

"ادھر دے چیک!" میں نے ہاتھ بڑھایا اور اس نے مجھے چیک تھما دیا۔ ریوالور اب بھی میرے دوسرے ہاتھ میں تھا۔ چیک پر ایک نظر ڈال کر میں نے ہمزاد کو اشارہ کیا جو اب میں خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہوا سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ میں نے دانستہ چیک لے کر اپنا بایاں ہاتھ میز کے نیچے کر لیا۔ ہمزاد سے مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے مجھ سے چیک لے

لیا۔ وہ یقیناً" سمجھ چکا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں! جب وہ مجھ سے چیک لینے کے لیے جھک رہا تھا تو میں نے آہستہ آواز میں اس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ نصیر الدین کے گھر کی سیف سے معاہدہ بھی لیتے آنا۔ میرا انداز ایسا تھا جیسے میں غصے میں بڑبڑا رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ کہ میں بے سبب اپنی پراسرار قوتوں کی شہرت نہیں چاہتا تھا۔ ہمزاد چیک لے کر چلا گیا تو میں نے نصیر الدین کو ایک بار پھر حیران کر دیا۔ میں بولا۔ "یہ جعلی رسیدیں خود اپنے ہاتھ سے جلا دو' میرے سامنے!" مجھے علم تھا کہ وہ سگریٹ پیتا ہے اور اس کی میز پر خوب صورت سگریٹ کیس رکھا ہے' اس میں لائٹر بھی ہو گا۔

میرا حکم سن کر وہ چند لمحے خوف زدہ سا ساکت بیٹھا رہا اور پھر جب میں نے دوبارہ ڈانٹ پلائی تو سہم کر بولا۔ "شیخ صاحب!...... یہاں کہیں آگ...... آگ نہ لگ جائے!"

"اگر چاہو گے تم خود تو ضرور آگ لگ جائے گی ورنہ یہ کام اتنا مشکل نہیں۔ اپنے بدگوشت کو اس گھومنے والی کرسی سے اٹھاؤ' رسیدیں اور لائٹر ہاتھ میں لو اور ادھر کونے میں میری طرف منہ کر کے یہ کار خیر انجام دے لو!" میرے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

بالآخر اسے میرے حکم کی تعمیل کرنا ہی پڑی۔ کرسی سے اٹھ کر کونے کی طرف جاتے ہوئے اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ دراصل وہ اندر سے اتنا ہی بزدل تھا اور وہی کیا ہر بے ایمان آدمی اندر سے بزدل ہی ہوتا ہے۔

جعلی رسیدیں جلا کر وہ دوبارہ اپنی کرسی پر آ بیٹھا تو اس اس طرح ہانپنے لگا جیسے کئی میل کا سفر کر کے آیا ہو۔

"سنو نصیر الدین! آج کے بعد سے میرا اور تمہارا کوئی تعلق نہیں رہا۔" میں نے کہا۔

"وہ...... مگر وہ...... معاہدہ......" وہ ہانپتے ہوئے کہنے لگا۔

"اسے بھی ابھی تمہارے ہی ہاتھوں جلواؤں گا' پہلے میری رقم واپس مل جائے۔ سنو بے وقوف آدمی! میں تم سے زبردستی پانچ لاکھ وصول نہ بھی کرتا تو میری صحت پر کوئی اثر نہ ہوتا' مگر یہ پانچ لاکھ تم ایسے کمینوں کے پاس چھوڑ دینا' شرافت سے بعید ہے۔ تم جو دولت کو سب سے بڑی طاقت سمجھتے ہو' تمہیں ذبح کرنے کے لیے یہی ہتھیار استعمال ہونا چاہیے۔ بے ایمانی سے ہضم کیے ہوئے ان روپوں کو تو نے اپنی ملکیت سمجھ لیا ہو گا اس لیے ان کی واپسی پر تم بہت تڑپو گے' یہ مجھے معلوم ہے! اپنی رقم وصول کر لینے کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ رہا یہ کہ اس پیسے سے تم نے مزید کتنا مال بنایا' اس سے نہ مجھے پہلے سروکار تھا' نہ اب ہے۔ تم نے اپنی دولت میں اضافے کی خاطر یقیناً" ہیرا پھیری بھی کی ہو گی' حلال روزی میں حرام کو شامل کیا ہو

گا' اس کے جواب وہ خدا کے سامنے ہوگے' میں نہیں! مجھے تمہاری اس حرام کی کمائی سے بھی کوئی غرض نہیں۔ تمہیں اپنی قبر میں سونا ہے' مجھے اپنی قبر میں۔"

"شیخ..... شیخ صاحب!" وہ بھاری آواز میں بولا۔ "میں..... میں یقیناً" آپ..... آپ کو نہیں سمجھ سکا۔ مجھ..... مجھ سے بہت..... بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔"

"پچھتاؤ کہ یہی تمہارا مقدر ہے!" میں نے سختی سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم کیوں پچھتا رہے ہو! موٹی مرغی ہاتھ سے نکل گئی! تمہیں مجھ جیسا دوسرا کوئی احمق نہیں ملے گا جو پلٹ کر حساب تک نہ کرے اور تمہاری جھوٹی باتوں پر یقین کر لے کہ کاروبار میں گھاٹا ہو رہا ہے!" یہ کہہ کر میں نے ریوالور سے گولیاں نکال لیں اور پھر خالی ریوالور' میز پر پھینکتے ہوئے بولا۔ "اس کھلونے کو دراز میں ڈال دو بغیر اس کے بھی تم اب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیوں کہ میں تمہارے سارے کس بل نکال چکا ہوں۔ تم جس پر چمار کر طرح اینٹھ رہے تھے' اس کی راکھ وہ کونے میں پڑی ہے۔ تم نے خود اپنے ہاتھ سے دولت کو آگ لگائی ہے' مگر حرام کی دولت کو!"

اب اسی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا اور نہ ہی اتنی ہمت رہی تھی کہ میرے خلاف مزید کوئی قدم اٹھا سکتا اس لیے خاموشی سے کسی مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔ خالی ریوالور اس نے اپنی میز کی دراز میں ڈال دیا تھا۔ ذہنی طور پر یقیناً" اس نے شکست قبول کر لی تھی۔

معاً" ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ نصیر الدین چونک کر ادھر متوجہ ہوا ہی تھا کہ میں بول اٹھا۔ "ریسیور اٹھا کر مجھے دے دو!" میری آواز میں حکم تھا۔

اس نے چوں وچرا نہیں کیا اور ریسیور اٹھا کر مجھے تھما دیا۔

"جی!" میں نے ریسیور ہاتھ میں لیتے ہی کہا۔

"یہ سیٹھ نصیر الدین کا دفتر ہے نا؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے سیٹھ صاحب سے بات کرنا ہے۔

"کون صاحب بات کر رہے ہیں؟"

"آپ انہیں فون دے دیں۔" دوسری جانب سے بولنے والے کی آواز میں ہلکی سے جھنجلاہٹ آگئی۔

"سیٹھ صاحب ذرا مصروف ہیں اس وقت! میرے سامنے ہی بیٹھے ہیں۔ آپ جب

تک اپنا کام نہیں بتائیں گے' بات نہیں ہو سکتی۔"

"میں ان کا بینک مینجر ناصر ہوں۔ مجھے ان سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔ آپ انہیں بتا دیں۔"

"ہولڈ کیجئے۔" یہ کہہ کر میں نے اسپیکر پر ہاتھ رکھا اور نصیر الدین سے کہا۔ "بینک مینجر ہے فون پر! وہ غالباً" تم سے چیک کی تصدیق کرنا چاہتا ہوگا۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ والی بات کی تو سمجھ ہی گئے ہوگے کیا حشر کروں گا تمہارا! میرا چیک بہر حال کیش ہونا چاہیے!"

نصیر الدین بغیر کچھ کہے مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔ پھر اس نے کہا۔ "شیخ صاحب! کیا کہہ رہے ہیں آپ!..... میں سمجھا نہیں۔ آپ تو ابھی تک یہیں بیٹھے ہیں' پھر چیک کس طرح..."

"لمبی بات نہیں! تم سے میں جو کہہ رہا ہوں' وہ کرو!" یہ کہہ کر میں نے ریسیور اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ہیلو!..... وعلیکم السلام!..... جی..... وہ..... وہ میرے دوست ہیں..... ہوں..... ہوں!..... نہیں' چیک جینون ہے' کیش کر دیں آپ!..... نہیں..... واقعی مصروف تھا..... جی؟..... اچھا..... کتنے کے چیک ہیں۔ کلیرنگ میں؟..... ہوں..... ٹھیک ہے..... اچھا..... کل تک تو شاید ممکن نہ ہو' ہاں دو ایک دن میں..... ٹھیک ہے' مینجر سے پہلے پہلے..... جی معلوم ہے مجھے..... خدا حافظ!" یہ کہہ کر پھر کہنے لگا۔ "حیرت ہے..... آپ یہاں بیٹھے ہیں اور..... اور چیک' بینک پہنچ گیا!..... ٹھیک اندازہ لگایا تھا آپ نے! مینجر نے اس آدمی کو بٹھا لیا تھا جو چیک لے کر گیا تھا۔ فون کی لائن میں گڑبڑ تھی کچھ اس لیے دیر لگی۔ وہ کافی دیر سے فون ملانے کی کوشش کر رہا تھا' مگر..... یہ..... یہ کس طرح ممکن ہے!"

"نصیر الدین! تمہاری چھوٹی سی عقل میں یہ باتیں نہیں آئیں گی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تم تو ابھی کچھ دیر بعد میرے پاس پانچ لاکھ کی رقم دیکھ کر حیران ہو جاؤ گے برخوردار!"

"وہ..... وہ آپ کا ایک آدمی رقم لے کر آئے گا بینک سے یہاں؟..... دروازہ کھول دوں اب؟"

"یہاں کوئی نہیں آئے گا بے وقوف آدمی!" میں نے ہنس کر کہا۔ "اور نہ دروازہ کھولنے کی ضرورت ہے۔"

"پھر..... پھر؟..... پھر کیسے؟..... کسی طرح رقم آپ کے پاس آ....."

"تم پھر ہانکنے لگے انٹ شنٹ!" میں نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا۔ "کہہ دیا نا کہ یہ

تم ایسے گھامڑوں کے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں!"

وہ سہم گیا۔

"اور سنو! اگر تم نے کسی سے اس واقعے کا ذکر کیا تو کھال کھینچ دوں گا تمہاری!" میں نے اسے دھمکی دی۔

اسی وقت میں نے محسوس کیا کہ ہمزاد کمرے میں آ چکا ہے۔ نصیر الدّین پوری طرح میری طرف متوجہ تھا اور ذہنی طور پر یقیناً انتشار کا شکار بھی' غالباً" اسی لیے اس کی نظر تھیلے پر نہیں پڑی جو خاموشی کے ساتھ ہمزاد سے مجھے تھما دیا تھا اور جس میں پانچ لاکھ کے نوٹ تھے۔ تھیلا میں نے اپنی کرسی کے قریب ہی رکھ لیا۔ اسی کے ساتھ ہمزاد نے معاہدے کا کاغذ بھی دے دیا تھا جو دو صفحات پر مشتمل تھا۔

"یہ لو وہ معاہدہ جو تمہارے اور میرے درمیان ہوا تھا۔" میں نے ہاتھ اوپر کر کے معاہدہ اس کی طرف بڑھایا۔ "اسے بھی جلا دو ابھی! حالانکہ اس معاہدے کی رو سے پانچ لاکھ مزید وصول کیے جا سکتے ہیں لیکن میں تمہاری طرح بے ایمان نہیں کیوں کہ میری رقم مجھے واپس مل چکی ہے۔ میرے پاس بھی اس کی ایک کاپی ہے جو میں پھاڑ کر پھینک دوں گا۔"

اس نے معاہدہ میرے ہاتھ سے لے لیا' پھر حیرت زدہ اور مردہ سی آواز میں پوچھا۔ "کیا وا...... واقعی رقم آ...... آ گئی آپ کے پاس؟"

"تو کیا میں تمہاری طرح جھوٹا ہوں!" یہ کہہ کر میں جھکا اور کینوس کا تھیلا اٹھا کر میز پر رکھ لیا جس میں سو سو کے نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ میں نے تھیلے کا منہ کھول کر اس کی طرف کر دیا اور بولا۔ "اب آ گیا یقین؟"

نصیر الدّین کی حالت ناقابلِ بیان تھی' چہرے کا گوشت بار بار پھڑک رہا تھا اور کبھی آنکھیں پھیل رہی تھیں' سکڑ رہی تھیں۔

"کہیں بے ہوش نہ ہو جانا!" میں ہنس کر بولا۔ "ابھی تمہیں یہ معاہدہ بھی نذرِ آتش کرنا ہے' اٹھو جلدی!"

اس پر وحشت سی طاری ہو گئی تھی۔ میرا حکم سن کر اس نے کئی بار کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی' مگر دھڑ سے پھر گر پڑا۔

"خیر چھوڑو۔" میں اس کی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے بولا۔ "اس معاہدے کو ضائع نہیں کرو گے تو تمہارا ہی نقصان ہے۔ جب تمہارے حواس واپس آ جائیں تو جلا دینا۔ میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ نصیر الدین' ہمیشہ کے لیے خدا حافظ!"

اس کے ہونٹ کانپے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو' مگر آواز نہیں نکلی۔ میں نے تھیلا ہمزاد کے حوالے کیا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہاں رکنا بے سود تھا۔ میں جس مقصد سے آیا تھا' وہ پورا ہو چکا تھا۔ دروازے کے چٹخنی کھولتے ہوئے میں نے ہمزاد سے کہا کہ تم یہ تھیلا گھر پہنچا کر جا سکتے ہو' میری آواز اتنی دھیمی تھی کہ نصیر الدّین نہ سن سکے۔ ہمزاد غائب ہو گیا۔

اسی وقت نصیر الدّین کی قوت گویائی جیسے لوٹ آئی۔ میں نے عقب سے اس کی آواز سنی۔ "شے...... شیخ...... شیخ صاحب...... رکیں...... ٹھہر جائیں! اب...... بس ایک منٹ کے لیے۔"

اس کی آواز میں التجا تھی۔ میں رک گیا اور پھر دروازہ کھول کر اس کی طرف پلٹا۔ بولو کیا بات ہے؟"

"مجھے صرف...... صرف اتنا بتا دیجئے کہ رسیدیں اور معاہدہ...... آخر کس طرح آپ نے میری سیف سے......"

"یہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا نصیر الدین!" میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "کچھ باتیں راز ہوتی ہیں اور انہیں راز ہی رہنا چاہیے یوں بھی اب یہ قصہ ختم ہو چکا ہے۔"

وہ چند لمحے خاموشی سے دیکھتا رہا' پھر کہنے لگا۔ "آپ...... آپ کو ناراض کر کے میں نے اپنا...... اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ اگر...... اگر آپ...... آپ مجھے کبھی معاف کر سکیں تو...... تو پھر اپنا خادم ہی پائیں گے۔ م...... میں ساری زندگی آپ کی خد...... خدمت میں گزار دوں گا۔"

جن لفظوں کے پیچھے جذبوں کی سچائی نہیں ہوتی بلکہ ان کا کوئی اور ہی مطلب ہوتا ہے' وہ الگ ہی معلوم و محسوس ہو جاتے ہیں۔ نصیر الدین کوئی احمق نہیں تھا کہ ساری زندگی میری خدمت میں گزار دیتا اور عیش دنیا چھوڑ دیتا۔ اس کا اصل مقصد مجھ سے چھپا نہ تھا۔ وہ یقیناً" اس نتیجے تک پہنچ گیا تھا کہ میری پاس کوئی پر اسرار قوت ضرور ہے۔ اسی کے بل پر تو میں نے اس کی کوڑی کوڑی بلوالی تھی۔ میری خدمت گزاری کے پردے میں اور میرا خادم بن کر وہ دراصل مخدوم بننا چاہتا تھا۔ وہ اس پر اسرار قوت کے راز کو معلوم کرنے کی بعد دوبارہ آنکھیں پھیر لیتا' چاہے بعد میں ناکام ہی کیوں نہ ہو جاتا کہ ہمزاد کو قابو میں کرنا بہرحال کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس میں زندگی داؤ پر لگانا پڑتی ہے' پھر بھی یقین نہیں ہوتا کہ کامیابی حاصل ہو گی یا نہیں! یہی وجہ تھی کہ اس وقت میں نصر الدین کی حماقت پہ ہنس دیا اور بولا۔ "اتنے فرماں بردار نہ ہو برخوردار اور اپنی کھال میں مست رہو! زیادہ کی ہوس اچھی نہیں ہوتی۔" میں نے اس کی زبانی بات کی بجائے دل کی بات کا جواب دیا اور شاید میرا اندازہ غلط نہیں تھا کیوں کہ میری بات

سن کر وہ کچھ بوکھلا گیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اسے خدا حافظ کہا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

باہر نکلتے ہی میں ایک خوب صورت لڑکی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ وہ کمان سے چھوڑے ہوئے کسی تیر کی طرح دروازے کی طرف آ رہی تھی۔ ٹکرانے سے بچنے کی خاطر اس نے اور میں نے، دونوں ہی نے کوشش کی۔ میں تو اس کوشش میں کامیاب ہو گیا کیونکہ میری رفتار زیادہ تیز نہیں تھی، مگر وہ لڑکی اپنا جسمانی توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ میں نے فوراً" یہ محسوس کر لیا کہ وہ گرنے والی ہے اس لیے مڑ کر تیزی کے ساتھ اسے سہارا دیا اور گرنے سے بچا لیا۔ صورت سے تو وہ دیسی ہی لگتی تھی، مگر اس کے جسم پر مغربی لباس تھا۔

"ایڈیٹ!" اس نے سنبھل کر کھڑے ہوتے ہی میری سماعت کی تواضع کر دی۔

لڑکیاں، خصوصاً" خوب صورت لڑکیاں اچھے صنف نازک ہونے کا پورا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ نہ معلوم کیوں اجنبی مردوں کے سامنے وہ خود کو کوئی آسمانی مخلوق ظاہر کرتی ہیں۔ میں نے کبھی ایسی لڑکیوں کو گھاس نہیں ڈالی اور ہمیشہ انہیں ان کی اوقات ضرور بتا دی۔ وہ لڑکی جس نے مجھے "ایڈیٹ" کہا تھا، ایسی ہی اتھلی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اسی لیے جواب میں فوراً" کہا۔ "خاتون! ایڈیٹ کیا آپ کے ابّا حضور کا نام ہے؟"

"وھاٹ؟" وہ بھنا گئی اور چہرہ غصے سے مزید سرخ ہو گیا۔ "کیا کہا تم نے۔؟

"جو سنا تم نے!" میں نے مسکرا کر پرسکون آواز میں جواب دیا۔

"میں سینڈل اتار لوں گی!"

"اور میرے پیر میں جوتا ہے!"

جب اسے اندازہ ہو گیا کہ بندہ دبنے والا نہیں ہے تو عورتوں کا مخصوص حربہ آزمایا اور چیخنے چلانے لگی۔ دفتر کے لوگ جمع ہو گئے اسی دوران میں مجھے معلوم ہو گیا کہ اس قدر چیخنے چلانے کا سبب یہ تھا کہ وہ اس دفتر کے مالک "سیٹھ" نصیر الدین کی منظور نظر تھی۔ "سیٹھ صاحب قبلہ" تک بھی یہ شور پہنچا اور انہوں نے بہ نفس نفیس وہاں نزول اجلال فرمایا۔ پھر حقیقت حال جاننے کے بعد وہ اس "فتنے" کا ہاتھ پکڑ کر اپنی خلوت گاہ میں لے گئے، مگر اس سے پہلے خادم سے معذرت ضرور کی۔ یقیناً" اس دفتر کے "سیٹھ صاحب" نے لڑکی کو بتایا ہو گا کہ بی بی، تم کہاں ہاتھیوں سے گنے چھین لینے کی فکر میں تھیں، جھپٹ میں آ جاتیں تو صورت نہ پہچانی جاتی۔

اس واقعے سے میں کچھ بے مزہ تو ہوا، مگر یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی کہ اے شیخ! تم

کہاں تک جی جلاؤ گے، یہاں تو آوے کا آوا ٹیڑھا ہے۔

گھر پہنچتے پہنچتے دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ ارشاد علی میرا انتظار کر رہا تھا۔ پرہیزی کھانا ابھی تک چل رہا تھا۔ گذشتہ شب سونے سے پہلے ہمزاد نے مجھے شفائے سرطان کی پہلی خوراک استعمال کرا دی تھی۔ ابھی مجھے پورے ہفتے پرہیزی کھانے پر ہی اکتفا کرنا تھا۔ یہ بات میں ارشاد علی کو بتا چکا تھا۔ میرے کہنے پر وہ کھانا لے آیا۔

صبح سے اب تک میں مصروف رہا تھا اس لیے کھانا کھا کر سو گیا اور شام چار بجے کے قریب اٹھا۔

میرے نزدیک اب صرف ایک ہی اہم مسئلہ قابل توجہ تھا، شبھو اور سریتا کا مسئلہ! مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ شبھو سریتا کو لے کر کہاں فرار ہوا ہے؟ ہمزاد کے بغیر بھی یہ معلوم کر لینا میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہے، میں نے سوچا۔ میں اس کے لیے اپنے تصور کی حیرت انگیز قوت کو بروئے کار لا سکتا ہوں، اپنی اس پراسرار قوت کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ یہ قوت مجھے میرے ہمزاد نے عطا کی تھی۔

میں اس وقت اپنے کمرے میں تنہا تھا اور ارشاد علی سے کہہ چکا تھا کہ اب جب تک میں خود اسے نہ بلاؤں، وہ نہ آئے۔ مجھے اس قوت کو بروئے کار لانے کے لیے پوری ذہنی یکسوئی اور ارتکاز توجہ کی ضرورت تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے شبھو کو کا تصور کیا کیوں کہ میں اسے ایک بار دیکھ چکا تھا۔ مجھے شدید حیرت ہوئی جب کافی دیر تک میرے صفحہ ذہن پر شبھو کا چہرہ نہ ابھر سکا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اب تک ایسا اسی صورت میں ہوا تھا جب وہ شخص زندہ نہ ہو جس کا میں تصور کروں۔ نتیجتہ" میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ شبھو مر چکا ہے؟ اگر ایسا نہیں تو پھر میرا ذہن کیوں تاریک ہے؟

یہ بھی تو ممکن ہے کہ ارتکاز توجہ اور رابطے کے درمیان شبھو کا سحر آڑے آ گیا ہو، میرے ذہن میں ایک نئے خیال نے جنم لیا اور پھر یہ خیال پختہ ہوتا چلا گیا۔ میرا ذہن شبھو کی موت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں بہت دیر اس مسئلے کا حل تلاش کرتا رہا اور آخر کار ایک راہ نکل آئی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اگر واقعی ایسا ہی ہے جو خیال میرے ذہن میں آیا ہے تو شبھو اپنی حد تک مجھ سے بچ سکتا ہے، مگر سریتا سے ذہنی رابطہ قائم کرنے میں حارج نہیں ہو سکتا۔ جہاں سریتا ہوتی، وہیں شبھو بھی ہوتا۔ اس طرح گویا میں سریتا کے ذریعے شبھو تک پہنچ سکتا تھا۔

پھر کچھ ہی دیر بعد میں دوبارہ آنکھیں بند کیے اپنے تصور کی قوت کو آزما رہا تھا۔ اس

مرتبہ میری توجہ کا مرکز سریتا تھی۔ چند ہی لمحے بعد میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ سریتا کے حسین چہرے نے میرے ذہن کو روشن کر دیا تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی سوگواری تھی۔ بال کھلے ہوئے تھے اور آنکھیں سوئی سوئی سی تھیں۔ وہ اسی حال میں تھی جس میں آخری بار میں نے اسے دیکھا تھا۔ اپنے تصور کے دائرے کو میں نے مزید وسعت دی۔ سریتا ایک خستہ حال کوٹھری میں تھی۔ جس چارپائی پر وہ بیٹھی تھی' اس پر کچھ بچھا ہوا بھی نہیں تھا۔ نیم تاریک کوٹھی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی غریب آدمی کا ٹھکانا ہو سکتا ہے۔ میں چونکا اس وقت جب سریتا کے قریب ہی ایک سیاہ ہیولے کو متحرک دیکھا۔ کوشش کے باوجود اس کے خدوخال نمایاں نہ ہو سکے۔ یہ تو میں سمجھ گیا کہ وہ سیاہ ہیولا کسی آدمی ہی کا ہے مگر وہ آدمی کون ہے' یہ نہ جان سکا۔ سریتا کے چہرے سے یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ سن رہی ہو' شاید اس سیاہ ہیولے کا مالک اس سے کچھ کہہ رہا تھا کیوں کہ سریتا کی نظریں اس کی طرف تھیں' لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ امر میرے لیے تعجب خیز ہی تھا۔ اب سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اپنے تصور کی قوت کو بروئے کار لا کر میں واضح طور پر سب کچھ دیکھتا اور سنتا تھا۔

معاً" سریتا کے لبوں کو جنبش ہوئی اور میں نے اس کی آواز سنی "کب تک.... آخر کب تک تم صاحب جی سے بچ سکتے ہو؟ ایک دن آئے گا کہ صاب جی' میرے صاحب جی تمہیں...."

سریتا کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ کیوں؟ یہ میں فوری طور پر نہ سمجھ سکا۔ غالباً" سیاہ وجود نے اس کی بات کاٹ دی تھی اور خود کچھ کہہ رہا تھا جسے سننا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ پھر وہ تیزی سے سریتا کے قریب آیا اور میں نے "تڑاخ" کی آواز سنی۔ اس نے سریتا کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ سریتا سسک پڑی اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میرے لیے یہ منظر سوہان روح تھا۔

اب میرے لیے یہ سمجھنا کوئی مشکل امر نہیں تھا کہ وہ سیاہ وجود کس کا تھا؟ سریتا کے ایک ہی جملے سے مجھ پر ساری حقیقت روشن ہو گئی تھی۔ وہ یہ جملہ شمبھو کے سوا کسی اور سے نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شمبھو مرا نہیں۔ میرا یہ خیال قطعی درست تھا کہ اس نے مجھ سے بچنے کے لیے اپنے سحر کو آزمایا ہے۔ سریتا نے جس لہجے اور جن الفاظ میں میرا ذکر کیا تھا' اس کو سن کر میری روح مضطرب ہو گئی تھی۔ میرے دل پر ایک عالم گزر گیا۔ "میرے صاحب جی" یہ الفاظ بار بار میری سماعت میں گونجنے لگے اور ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذہنی یکسوئی برقرار نہ رہ سکی۔ میرے تصوّر کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"سریتا"! میرے منہ سے بے اختیار اس کا نام نکلا۔

عجب تھی وہ لڑکی بھی! اس سے پہلے کبھی یوں اس کے لیے بے چین نہیں ہوا تھا۔ وہ جدا ہو گئی تھی تو مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ کھیل ہی کھیل میں بات بہت آگے نکل گئی تھی۔ بعض حالات میں آدمی کو خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے دل میں کس کے لیے کتنی جگہ ہے!"

ان حالات میں بھلا مجھ سے کس طرح صبر ہوتا! میں نے فوراً" ہی ہمزاد کو طلب کر لیا۔

"آپ کچھ پریشان پریشان معلوم ہو رہے ہیں۔" ہمزاد آتے ہی بولا۔ "کیا حکم ہے؟"

"سریتا جہاں بھی ہے اسے فوراً" یہاں لے آؤ!" میں نے اسے حکم دیا۔ "شمبھو سے میں بعد میں نمٹتا رہوں گا۔"

"بہتر ہے۔" یہ کہتے ہی وہ غائب ہو گیا۔

ہمزاد کے لیے وقت اور فاصلے بے معنی تھے اور اس بھری پری دنیا میں کسی کو تلاش کر لینا بھی کوئی مشکل کام نہ تھا اور اس کی قوتوں کا میں نے اندازہ لگا لیا تھا۔ کسی وجود کو سمجھنے کے لیے سو سال کا عرصہ بہت ہے۔ وہ سو سال سے میرے ساتھ تھا۔ پھر بھلا میں اسے نہ سمجھتا تو کون سمجھتا! ہاں مہ پارہ کے معاملے میں وقتی طور پر وہ ضرور بے بس ہو گیا تھا اور اس کی وجہ تھی۔ مہ پارہ خود پراسرار قوتوں کی مالک تھی۔ خطرہ مجھے شمبھو کی طرف سے بھی تھا مگر اس قدر نہیں۔ پھر بھی ہمزاد کے رخصت ہوتے ہی میں نے اپنے تصور کی قوت کو متحرک کر لیا۔

اب میری آنکھوں کے سامنے پھر وہی منظر تھا' وہی کوٹھری تھی' لیکن اب سریتا نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ لیے تھے۔ شمبھو' سیاہ وجود کی صورت میں ابھی تک کوٹھری میں موجود تھا۔

"چاند کی دیوی!" سریتا یہ کہہ ہذیانی انداز میں ہنسی۔ وہ غالباً" شمبھو کی کسی بات کے جواب میں کچھ کہہ رہی تھی۔ "چاند کی دیوی نے تجھے نئی قوتیں بخش دی ہیں' مجھے تیری اس بات پر قطعی یقین نہیں۔ تو کہتا ہے میرے صاب جی کے پاس بھی بڑی قوتیں ہیں مگر وہ تیری قوتوں کے آگے ہیچ ہیں۔ تو پھر تجھے معلوم ہو جائے گا کہ کون زیادہ طاقت ور ہے! تو میرے صاب جی! دل بھی کوئی چیز ہوتی ہے شمبھو! تو میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تو اب مجھ پر مزید ظلم نہ کر سکے گا اور......"

سریتا کا جملہ پورا نہ ہو سکا۔ معاً" کوٹھری میں ایک کڑاکا سا ہوا اور سریتا کی چیخ نکل گئی۔ شمبھو کا سیاہ وجود دوسرے ہی لمحے وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔ اسی کے ساتھ سارے منظر پر ایک چمکیلی سی دھند سی پھیل گئی اب مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک دم کیا ہوا میں کچھ

بھی نہ سمجھا۔ میں نے بہت کوشش کی سریتا میرے تصور کے دائرے میں آ جائے، مگر چونکہ دھند کے سوا مجھے کچھ نظر نہ آ سکا۔ مجبوراً میں نے تصور کا سلسلہ منقطع کر دیا اور آنکھیں کھول دیں۔

کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہوئی ہے، میں نے سوچا۔ میں نے اپنے ہمزاد کو بھیجا تھا کہ سریتا کو لے آئے۔ یہ عجیب و پراسرار واقعہ اسی سلسلے کی کڑی ہو سکتا تھا، میں نے ابھی چند ۔۔۔ پہلے سریتا کے جو چند جملے سنے تھے، وہ میرے نزدیک بہت اہم تھے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ شمبھو میری طرف سے غافل نہیں رہا۔ اسے یقیناً معلوم ہو چکا ہے کہ اپنے ہمزاد کو میں ۔۔۔ قابو میں کر لیا ہے۔ "چاند کی دیوی" بھی میرے لیے ایک اہم اشارہ تھا۔ اس وقت میری سماعت میں مہ پارہ کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے آخری ملاقات میں مجھ سے کچھ کہا تھا، اس کے معنی اب کھلتے جا رہے تھے۔ "..... میں اس نتیجے پر پہنچی کہ تمہیں ہلاک کرنا ممکن نہیں۔ مجھے تمہارے لیے کچھ اور ہی بندوبست کرنا پڑے گا کیوں کہ اب تمہارے اور میرے درمیان ہمیشہ کے لیے رابطہ ختم ہونے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ میں اسی لیے کل رات غائب رہی اور میں نے تمہارے لیے جو کچھ سوچا تھا، اسے عملی شکل دے دی۔ اس طرح میں اپنی بیشتر قوتوں سے محروم تو ہو چکی ہوں مگر مجھے اس کا کوئی ملال نہیں۔ اسی سبب ۔۔۔ میری بھٹکی ہوئی روح ہمیشہ کے لیے قید ہو جائے گی، لیکن یہ قید میں نے خود قبول کی ہے۔ ۔۔۔ میں اس دنیا میں کبھی نہ آ سکوں گی....."

مہ پارہ کی دھمکی سن کر میں نے اس سے معلوم کرنا چاہا تھا کہ اس نے میرے لیے بندوبست کیا ہے؟ مگر وہ کچھ بھی بتانے پر آمادہ نہیں ہوئی تھی۔

حالیہ پیش آنے والے واقعے کے پس منظر میں یہ "بندوبست" مجھ پر واضح ہو گیا تھا۔ "مہ پارہ" کا مطلب چاند کا ٹکڑا ہے۔ شمبھو، ہندو عقیدہ رکھتا تھا اور اسی لیے اس ظالم نے "ٹکڑے" کی بجائے "دیوی" کا اضافہ کر دیا ہو گا۔ میرا ذہن تیزی سے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "چاند کی دیوی" نے شمبھو کو نئی قوتیں بخشی تھیں۔ اس بات کے پس منظر میں مہ پارہ کے الفاظ کہ میں اپنی بیشتر قوتوں سے محروم ہو چکی ہوں، واضح طور پر ایک ۔۔۔ اشارہ کر رہے تھے۔ میرے ذہن نے تمام کڑیاں جوڑ لیں۔

مہ پارہ "چاند کی دیوی" بن کر شمبھو کے سامنے ظاہر ہوئی۔ شمبھو کو وہ میرے ۔۔۔ پہلے ہی لگا چکی تھی۔ پھر اس کی بھٹکتی ہوئی روح نے دنیا سے جاتے جاتے اپنی بہت سی قوتیں شمبھو کو بخش دیں۔ شمبھو اور میرے درمیان معرکہ آرائی سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ مہ پارہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور گویا اپنی جگہ شمبھو کو دے دی۔ ظاہر ہے کہ اب شمبھو آسانی سے میرے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ سریتا میرے اور اس کے، دونوں کے درمیان انا کا مسئلہ بن گئی تھی۔

اگر میں صحیح نتائج اخذ کرنے میں غلطی کی تھی تو میرے ہمزاد کو ناکام ہی لوٹنا چاہیے تھا۔ اس کے باوجود میں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا کیوں کہ ہمزاد آسانی سے اپنی شکست ماننے والا نہیں تھا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ چاہے مجھے کتنے ہی عذابوں سے گزرنا پڑے، میں شمبھو کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا، سریتا کو اس کے چنگل سے نکال کر رہوں گا۔

میں نے پہلے سوچا تھا کہ اپنے ہمزاد کو قابو کر لیا تو سارے دلدر دور ہو جائیں گے، شمبھو میرے سامنے ناک رگڑنے لگے گا۔ لیکن اب یہ دلدر دور ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ مہ پارہ میرا ٹھیک ٹھاک ہی بندوبست کر گئی تھی۔ آخر تھی نا "مستانی!" اس سے اور کیا توقع ہوتی۔

اب تک میرا تجربہ یہ تھا کہ جذبات، معاملات کو بگاڑ دیتے ہیں اور یہ مسئلہ بھی جذباتی تھا اس لیے بگاڑ پیدا ہو جانا بعید نہ ہوتا۔ جذبات سے قطع نظر اس مسئلے کو عقلی سطح پر سوچنے کی ضرورت ہے، میں نے سوچا۔ اسی وقت کوئی راہ نکل سکتی ہے۔ میں اسی لیے اپنے ذہن کو سکون رکھنے کی کوشش کرنے لگا یوں کہ جذبات، ذہن پر بھی غالب آ جاتے ہیں اور کچھ سوچنے نہیں دیتے۔

اسی دوران میں ہمزاد کی واپسی ہو گئی۔ میں پہلے ہی اپنے دل کو سمجھا چکا تھا اس لیے ہمزاد کو تنہا دیکھ کر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ سریتا کو اپنے ساتھ نہیں لا سکا تھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر ہمزاد کو یقیناً حیرت ہوئی تھی۔ جب وہ آیا تھا تو اس کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار تھے جن میں اب حیرت کا اضافہ ہو گیا تھا۔

"میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ سریتا کو کیوں نہیں لا سکے!" میں پرسکون آواز میں بولا، پھر بغیر رکے کہا۔ "مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم پر کیا گزری؟"

"مختصراً" یہ کہ شمبھو مجھ سے بچ کر نکل گیا۔"

"اور سریتا؟"

"اسے بھی وہ اپنے ساتھ ہی لے گیا۔"

"کہاں؟"

"وہ ڈھاکے طرف گیا ہے۔"

"تھا کہاں وہ؟" میں سوال پر سوال کیے جا رہا تھا اور وہ جواب دے رہا تھا۔

"ڈھاکے ہی کی ایک نواحی بستی ہے نرائن گنج۔" ہمزاد بتانے لگا۔ "ڈھاکے سے تقریباً چودہ میل ہو گی۔"

"تم نے یقیناً کوشش کی ہو گی کہ اسے روک سکو۔" یہ کہہ کر میں نے اپنے تصور قوت سے جو کچھ دیکھا تھا' اسے بتا دیا' پھر دریافت کیا۔ "وہ بجلی کا سا کڑاکا کیا تھا؟"

"شمبھو نے اس مکان گرد حصار کھینچ رکھا تھا۔ میرا وجود اس سے ٹکرایا تو وہ آواز پ ہوئی اور اسی سے شمبھو خطرے سے باخبر ہو گیا۔" ہمزاد نے جواب دیا۔

"ہوں!..... پھر؟"

"میں اپنی قوتوں سے کام لے کر اور بالآخر اس حصار کو توڑ کر اندر پہنچ گیا' مگر ا وقت تک وہ اپنی اور سریتا کی مدافعت کا بندوبست کر چکا تھا۔ اس مکان میں مجھے چمکیلی دھند سوا کچھ نظر نہ آیا جیسا کہ آپ نے بھی بتایا۔ پھر میں وہاں سے نکل آیا اور از سر نو اسے تلاش نے لگا۔ کافی جستجو کے بعد معلوم ہوا کہ شمبھو مجھے وہاں پھنسا کر سریتا کو ساتھ لیے ڈھاکے طرف جا رہا ہے۔ میں نے اس کا تعاقب کیا اور جلدی اس تک پہنچ گیا۔ وہ سریتا کا ہاتھ تھا ایک پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔ سریتا اور اس کے گرد ایک چمکیلا غبار رقص کر رہا تھا۔ میں اس چمکیلے غبار کو عبور کرنا چاہا' لیکن ممکن نہ ہوا۔ پھر میں نے یہ کوشش کی کہ اسے آگے بڑ سے روک سکوں اور......"

"اس چمکیلے غبار کو دیکھ کر کیا سمجھے تم؟" میں درمیان میں بول اٹھا۔ "اسے دیکھ کر ک یاد آیا تمہیں؟"

"جی ہاں۔"

"کون؟"

"مہ پارہ' آپ کی دشمن جاں!"

پھر میں نے جو نتائج اخذ کیے تھے' ان سے ہمزاد کو بھی آگاہ کر دیا' پھر بہت سکون ساتھ کہا۔ "ابھی وہ صرف اپنا بچاؤ کر رہا ہے' مگر موقع ملنے پر حملہ بھی کر سکتا ہے۔ تمہیں ا نکتے کو فراموش نہیں کرنا۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "اب آپ حکم دیں' کیا کیا جائے؟"

اس معاملے میں جلد بازی کی ضرورت نہیں۔" میں بولا۔ "ہاں چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ تم اس کی طرف سے غافل نہ رہنا۔ آیندہ کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا ہے' یہ میں تمہیں سوچ کر بتاؤں گا۔ دراصل میں نے جو نتائج اخذ کیے تھے' ان کی تصدیق چاہتا تھا۔

اب ہر بات کھل کر سامنے آ گئی ہے' کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

ہمزاد رخصت ہو گیا تو میں از سر نو اس مسئلے کا جائزہ لینے لگا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ شمبھو سے نمٹنے کے لیے مجھے' بہرحال ایک نہ ایک دن چاٹگام کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ مہ پارہ کو زیر دام لانے کے لیے بھی مجھے دربدر کی خاک چھاننا پڑی تھی' لیکن اس دوران میں مجھ سے ایک غلطی ضرور ہوئی تھی۔ میں نے عقل پر جذبات کو ترجیح دی تھی جس کے نتائج اچھے نہیں ہوئے تھے۔ میری زندگی کا ایک حصہ بڑے عذابوں میں گزرا تھا۔ اب میں اس غلطی کو دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ خدا نے زندگی ایسی نعمت اس لیے عطا نہیں کی کہ اسے یوں رائگاں کر دیا جائے۔ میں نے اپنی حیات نو کے لیے جو خواب دیکھے تھے' انھیں ہر قیمت اور ہر حال میں پورا ہونا چاہیے تھا ورنہ زندگی کا حاصل ہی کیا! یوں تو سبھی زندگی بسر کر لیتے ہیں اور ایک دن تہِ خاک سو جاتے ہیں۔ کوئی حسرت' کوئی امنگ' کوئی آرزو' کوئی خواب' کچھ تو ہو!" زندگی سے لذت کشید کرنے کے جائز راستے بھی تو ہیں! میں انھیں خیالوں میں کھویا تھا کہ عصر کی اذان ہو گئی۔ میں نے اٹھ کر وضو کیا اور پھر نماز پڑھ کر میرا ذہن مزید پرسکون ہو گیا۔

نماز پڑھ کر چائے پینے کے دوران میں' میں نے غور کیا کہ چاٹگام چھوڑنے میں کیا کیا چیزیں مانع ہیں؟ میں بغیر اچھی طرح سوچے سمجھے اب کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا کہ بعد میں میرے لیے کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے۔ عدالت میں تین کیس تھے جن میں میری موجودگی ضروری تھی۔ ان میں سے ایک کیس تو آج ہی تقریباً" ختم ہو چکا تھا۔ نصیر الدین نے مجھ پر جو دعویٰ کیا تھا' وہ خود ہی واپس لے لیتا کیوں کہ اب میرے خلاف اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ میرے پاس جو معاہدے کی نقل تھی' اسے بھی میں ضائع کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ دوسرا کیس بلدیہ چاٹگام کا تھا۔ میں نے عدالت میں ری اسیسمنٹ کی درخواست دی تھی۔ مجھے اب چار روپوں سے دلچسپی ہو نہ ہو۔ کیس بہرحال زیر سماعت تھا اور میرے وکیل نے اس کیس میں بھی آگے کی تاریخ لے لی تھی۔ میرے نزدیک یہ معاملہ بھی نمٹانا ضروری تھا' کس طرح؟ یہ مشورہ مجھے میرا وکیل ہی دے سکتا تھا۔ تیسرا کیس ملک فیروز دین کا تھا جو دراصل پولیس کیس تھا' مگر اس میں بھی میری حاضری ضروری تھی۔ میں نے بہرحال اپنے بیان میں رشوت دینے کا اعتراف کیا تھا' خواہ معاملات کچھ بھی رہے ہوں۔ پھر پولیس کے محکمے کی طرف سے بھی مجھے پابند کر دیا گیا کہ بغیر علم و اطلاع کے کہیں نہ جاؤں۔ آج کل میں پولیس کی طرف سے اس کیس کا چالان بھی عدالت پیش کر دیا جاتا۔ ایس ایچ او ملک فیروز دین نے اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مجھے قتل کرانا چاہا تھا اور میری حویلی بھی ہضم کرنے کی کوشش کی تھی اس لیے

عدالت میں میرا بیان ضروری تھا۔ صرف پولیس کا بیان دے دینا اس سلسلے میں ناکافی تھا۔ یہ فو
داری کیس تھا اس لیے اس میں زیادہ وقت نہ لگتا۔ دوم یہ کہ اس کیس سے جلد از جلد ا
جان چھڑانے کے لیے میں 'ہمزاد سے مدد لے سکتا تھا۔ تو جب تک یہ معاملات نمٹ نہ جا
چاٹگام سے جانا' مناسب نہیں تھا۔

اب لیڈووکیٹ چوہدری سے میری ملاقات ضروری ہو گئی تھا اور مجھے معلوم تھا ک
اپنے گھر میں کس وقت مل سکتا ہے! میں اس لیے مغرب کی نماز پڑھ کر گھر سے چل دیا۔
حسن اتفاق تھا کہ اس وقت چودھری کا کوئی موکل اس کے پاس نہیں بیٹھا تھا جب میں وہا
پہنچا۔ مجھے علم تھا کہ میرا بدلا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ بھی چونکے گا اور شاید مجھے بہ حیثیت شیخ کرامت
پہچاننے سے بھی انکار کر دے گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کی حیثیت کے اظہار سے مسکراتا رہا
میں اس کی نشست گاہ میں بیٹھا تھا جہاں وہ اپنے موکلوں سے ملتا تھا۔ سامنے ہی آرام دہ کرسی
وہ براجمان تھا۔

میرے مسکرانے پر وہ کچھ جھنجلا گیا اور بولا۔ "جہاں تک میرے علم میں ہے شی
صاحب کے کوئی اولاد نہیں' لیکن آپ کی شکل حیرت انگیز طور پر ان سے ملتی ہے۔ اس کے
باوجود مجھے یہ باور نہیں کر سکتے کہ آپ ہی شیخ کرامت ہیں۔ میرے نوکر نے مجھے اندر جا کر
بتایا کہ شیخ کرامت صاحب' نشست گاہ میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ بتائیں آپ نے یہ جھوٹ
کیوں بولا؟"

میں نے اب تک اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا ک
اس دلچسپ صورت حال سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ میں بہ دستور مسکراتا رہا۔

مجھے مسکراتے دیکھا کر اس کے لہجے میں مزید سختی آ گئی۔ "آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ خو
کو کچھ اور ظاہر کرنا بھی جرم ہے۔ میں اگر کہیں خود کو شیخ کرامت بتاؤں اور یہ ثابت ہو جا
کہ میں شیخ کرامت نہیں ہوں تو اس جرم میں مجھے زیر حراست لیا جا سکتا ہے۔ مجھے آپ اب
جلدی سے کھل جائیں کہ آپ کون ہیں اور کس لیے آپ نے خود کو شیخ کرامت ظاہر کیا ت
ورنہ....."

"ورنہ آپ مجھے گرفتار کرا دیں گے؟" میں پہلی بار بولا۔ "یہی کہنا چاہتے ہیں
آپ؟"

وہ میری آواز سن کر چونکا۔
"چونکنے کی ضرورت نہیں' آواز کی نقل بھی جا سکتی ہے۔ کیا خبر اپنے چہرے کی

مماثلت سے فائدہ اٹھا کر ہیں کوئی فراڈ....."

"ٹھہریں!" اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ "یہ تو میں کسی صورت
نہیں مان سکتا کہ آپ شیخ کرامت ہیں' اس خیال کو تو ذہن سے نکال دیں۔ رہی آواز تو آپ
نے خود اس کا جواز پیش کر دیا ہے۔"
بالفرض میں ہی شیخ کرامت ہوں تو اس کے لیے مجھے کیا ثبوت پیش کرنا ہو گا؟"



"ثبوت" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "ثبوت میری آنکھیں ہیں۔ ثبوت تو اس وقت طلب کیا جاتا ہے جب پہلے سے ثبوت موجود نہ ہو!" وہ وکیل تھا اور جرح کرنا اس کا پیشہ اس لیے ظاہر ہے آسانی سے رام نہ ہوتا۔

"کبھی کبھی آنکھوں دیکھا بھی تو غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ عینی گواہوں کو بھی تو آپ لوگ غلط ثابت کر دکھاتے ہیں کہ دراصل یوں نہیں یوں تھا!" میں نے بھی جرح شروع کر دی۔

"مقصد کیا ہے آپ کا' یہ بتائیں!اس کا لہجہ پھر بدلنے لگا۔ "آپ کیوں میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

"مقصد تو اسی وقت بتاؤں گا جب آپ مجھے شیخ کرامت تسلیم کرلیں گے!"

"وہ تو ممکن نہیں!اب آگے کہیں۔"

"پھر تو کہنے کو کچھ نہیں رہ جاتا۔" میں ہنس کر بولا' پھر شرارتاً" کہا "میں اجازت چاہوں گا۔"

"ہوں" اس نے ہنکار ابھرا۔ "اتنی آسانی سے تو اب جانے کی اجازت نہیں ملے گی آپ کو!" اس کے لہجے میں چبھن تھی۔

بات اب تفنن طبع کی حدود سے نکل رہی تھی اس لیے میں نے معاملے کو سنبھال لیا۔ ایڈووکیٹ چوہدری یہ جان کر بہت حیران ہوا کہ میرے چہرے کی تبدیلی کسی روحانی عمل کا نتیجہ ہے۔ میں نے دانستہ روحانی عمل کی وضاحت نہیں کی تھی۔ یہ ثابت کرنا بہرحال میرے لیے مشکل نہ تھا کہ میں ہی شیخ کرامت ہوں۔ اس گفتگو کے بعد میں اصل موضوع پر آگیا۔ میں بولا۔ "دراصل میں جلد از جلد چاٹگام سے جانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور کچھ خبر نہیں کہ واپسی کب ہو!میں چاہتا ہوں کہ کم از کم بلدیہ چاٹگام والا کیس جتنی جلد ممکن ہو' نمٹ جائے۔

"اس کیس میں تو آپ ہی نے مجھ سے وقت گزارنے کے لیے کہا تھا اور....."

"ہاں ایک بات شاید میں بھول جاؤں' معاف کیجئے گا کہ آپ کی بات کاٹی۔ اب مجھے رقم کی کوئی پروا نہیں بلدیہ جو رقم دے مجھے منظور ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر آپ نے یہی فیصلہ کیا ہے تو پھر تاخیر کا کوئی سوال نہیں۔" چودھری بولا۔ "اور ہاں وہ دوسرا کیس "نصیر الدین والا!اس کا....."

"وہ اپنا دعویٰ واپس لے رہا ہے۔" میں نے بتایا۔

"کیا؟" اسے میری بات سن کر حیرت ہوئی۔

"ہاں یہی حقیقت ہے۔ میں آج اس سے بھی ملا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے مختصراً" اور جس قدر ضروری ہوا ملک فیروز دین والے پولیس کیس کے بارے میں بھی بتا دیا تاکہ اس کا قانونی مشورہ حاصل کر سکوں۔

"آپ کو اپنے بیان میں رشوت دینے کا اقرار نہیں کرنا چاہیے تھا' یہ غلط ہوا۔"

"مگر حقیقت تو یہی تھی۔" میں مسکرایا۔

"بہرحال ابھی قبل از وقت میں کچھ نہیں کہہ سکتا جب تک یہ پورا کیس اسٹڈی نہ کر لوں۔"

"میرا مقصد بس یہ ہے کہ جلد از جلد اس سے جان چھوٹ جائے۔"

"فوجداری کا کیس ہے' اس میں زیادہ تو نہیں لگنا چاہیے' پھر بھی دو تین مہینے تو گزر ہی سکتے ہیں۔ دوسری پارٹی' یعنی ملک فیروز دین کے وکیل' عدالت سے مہلت لے سکتے ہیں۔"

"بالفرض وہ ایسا نہ کریں تو؟" میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"تو پھر جلدی بھی ممکن ہے' لیکن اس دوران میں یہاں اپ کی موجودگی ضروری ہو گی۔"

"خیر آپ ایک مسئلہ نمٹائیں' اس معاملے پر میں غور کرتا ہوں کہ کیا صورت نکل جائے!"

"آپ ایسا کریں کہ کل صبح کورٹ آجائیں' کچھ کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے' تو پھر میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اٹھنے لگا۔

"چائے تو پیتے جائیں' میں ابھی....."

"نہیں شکریہ!میں بس چلوں گا۔" میں نے خوش اخلاقی کے ساتھ معذرت کرلی۔

ایڈووکیٹ چودھری کے یہاں سے واپسی پر مجھے خیال آیا کہ میری کوٹھی کے کاغذات

ابھی تک ملک فیروز دین ہی کے قبضے میں ہیں۔ بلدیہ چاٹگام والے کیس کا فیصلہ ہو جانے کی صورت میں بہر حال مجھے ان کاغذات کی ضرورت پیش آتی۔ ہمزاد کے ذریعے ان کاغذات کو حاصل کر لینا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا' ممکن ہے کل ہی ان کاغذات کی ضرورت پڑ جائے۔ اسی وجہ سے گھر پہنچتے ہی میں نے ہمزاد کو طلب کرنے کے لیے اس کا تصور کیا۔

جیسے ہی میں نے اسے طلب کیا ہمزاد حاضر ہو گیا۔ "جی..... حکم؟" اُس نے آتے ہی کہا۔

میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "کبھی کبھی تمہارا یہ لہجہ اور ایسے الفاظ بڑے عجیب سے لگتے ہیں۔"

وہ کچھ نہ بولا اور میری طرف حیرانی سے دیکھتا رہا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا "تمہیں دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے کہ تمہیں نہیں اپنے آپ کو حکم دے رہا ہوں۔"

"آپ کے یہ احساسات فطری ہیں کیوں کہ میں اور آپ جدا کب ہیں! میں آپ ہی کا ہم شکل اور ہم آواز ہوں' آپ ہی کے وجود کا حصّہ ہوں۔"

"کسی صوفی منش نے سن لی یہ بات تو حق ہے کہہ کر مستانہ وار رقص کرنے لگے گا۔" میں نے ازرہ تفنن کہا۔

"اب کہاں رہ گئے ہیں' مستانہ وار رقص کرنے والے!" ہمزاد بولا۔ "اب تو ایسوں کی اکثریت ہے جو نہ اس مرتبے کو سمجھتے ہیں اور نہ تصوّف کو! ہاں کچھ ہیں' وہ بھی آٹے میں نمک برابر' جو ان رموز کو سمجھتے ہیں۔"

اس وقت مجھے میرؔ صاحب یاد آئے۔ جنھوں نے کہا تھا۔

سب تو ہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

میر تقی میر کے بعد میرے حافظے میں یگانہ چنگیزی کا ایک شعر تازہ ہو گیا۔

علم کیا علم کی حقیقت کیا
جیسی جس کے گمان میں آئی

میرؔ صاحب نے "اعتبار" کہا تھا' یگانہ نے اسے "گمان" میں بدل دیا۔ شعر دونوں بڑھیے تھے اس لیے کچھ دیر میں ان کی لذت میں گم رہا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ہمزاد میرے روبہ

رو ہے اور حکم کا منتظر ہے۔ میں نے اس سے کوٹھی کے کاغذات لے آنے کو کہا اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ جلد از جلد چاٹگام سے چلنا ہے۔ میں نے اس کی وجہ بھی بتا دی۔

"آپ نے درست نتائج اخذ کیے ہیں۔" ہمزاد نے میری بات کی تصدیق میں کہا۔ "شمبھو سے نمٹنے کے لیے چاٹگام کو خیرباد کہنا ہی پڑے گا۔"

پھر اُس دن کے بعد میں نے جو کچھ سوچا اور فیصلہ کیا تھا' اس پر عمل کیا۔ سارے معاملات حسن و خوبی سے نمٹتے چلے گئے' کوئی قباحت پیش نہیں آئی۔ بلدیہ چاٹگام نے نے مجھے میری کوٹھی کے عوض جو معاوضہ دینا منظور کیا' میں نے قبول کر لیا۔ نصیر الدین کا معاملہ میں پہلے ہی نمٹا چکا تھا۔ ایس ایچ او ملک فیروز دین کو لمبی سزا ہو گئی اور مجھ پر رشوت دینے کے جرم میں عدالت نے معمولی سا جرمانہ کر دیا۔ ان واقعات کے سوا دو ماہ میں کوئی اور قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ میں دانستہ شمبھو کی طرف سے یوں غافل رہا جیسے مجھے اس کی کوئی فکر نہ ہو۔ صرف ایک مرتبہ خود اس نے تھوڑی بہت چھیڑ خانی کی اور میں طرح دے گیا۔ ہمزاد کی اطلاع کے مطابق وہ ابھی تک ڈھاکہ میں تھا اور اس غلط فہمی کا شکار ہو چکا تھا کہ میں اب اس سے ٹکرانے کی ہمت نہیں کروں گا۔ سرتا اب بھی اس کے قبضے میں تھی۔

جب سارے معاملے نمٹ گئے تو میں نے ایک دن ہمزاد کو بلا کر کہا۔ "ڈھاکہ پہنچنے کے پہلے میں چاہتا ہوں کہ وہاں سکونت کا بندوبست ہو جائے۔ اس کے لیے محمد پور کا علاقہ ٹھیک ہے۔ میں پہلے بھی ایک بار چند دن کو وہاں رہا تھا۔"

"بادام تلی گھاٹ کیوں نہیں" ہمزاد معنی خیز انداز میں بولا۔ "سکونت کا بندوبست تو وہاں بھی ہو سکتا ہے!"

"نہیں' میں اس طرح فوری طور پر شمبھو کو چوکنا کرنا نہیں چاہتا۔ ڈھاکہ پہنچ کر بھی میں فی الحال اس سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں۔" میں نے جواباً کہا۔

ٹھیک ہے' میں آج ہی سکونت کا بندوبست کر لیتا ہوں تاکہ آپ کو وہاں پہنچ کر کوئی پریشانی نہ ہو۔" یہ کہہ کر وہ میرا اشارہ پاتے ہی چلا گیا۔

شمبھو کے بارے میں ہمزاد سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ بادام تلی گھاٹ میں سکونت پذیر ہے۔ یہ علاقہ ڈھاکہ کے بازار حسن بابو بازار کے پیچھے بوڑھی گنگا کے کنارے ہے۔ محمد پور وہاں سے خاصا دور ہے۔ اگر میں اپنی سکونت کے لیے بادام تلی گھاٹ ہی کو پسند کرتا تو ذرا جلدی شمبھو کی نظر میں آ جاتا جو میرے نزدیک بہتر نہیں تھا۔ دراصل میں غفلت میں اور اچانک اس پر حملہ کرنا چاہتا تھا تاکہ اسے سنبھلنے کا موقع نہ مل سکے۔

ہمزاد کے لیے یہ کوئی مشکل مرحلہ نہیں تھا کہ ڈھاکہ میں میرے بتائے ہوئے علاقے میں سکونت کا بندوبست کر لیتا۔ دراصل وہ جب چاہتا تھا اپنے نادیدہ وجود کو دیدنی بنا لیتا تھا۔ اسے دیکھنے والا یہی سمجھتا تھا کہ یہ وہ نہیں 'یعنی پراسرار وجود نہیں' خود میں ہوں۔ اس طرح وہ میری غیر موجودگی میں بھی بہت خوب صورتی کے ساتھ معاملات کو سنبھال لیتا تھا۔ پھر جب میں اس کی جگہ لے لیتا تھا تو کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ بندہ بدل گیا ہے۔ میرے لیے یہ کھیل دلچسپ بھی ہوتا تھا اور عجیب بھی!

اسی دن شام کو ہمزاد نے مجھے اطلاع دے دی کہ محمد پور کے علاقے میں سکونت کا بندوبست ہو گیا ہے۔ اس نے بتایا۔ "اب آپ جب چاہیں ڈھاکہ چل سکتے ہیں۔"

"مکان خریدا ہے یا کرائے پر لیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

آپ نے اس سلسلے میں کیوں کہ کوئی حکم واضح نہیں دیا تھا اس لیے فی الحال کرائے ہی پر......"

"ٹھیک ہے کوئی بات نہیں' مقصد تو سکونت سے ہے!" میں بولا۔ "پھر کیا خبر ہم جس کام سے جا رہے ہیں' وہ جلدی ہی ہو جائے!"

میرے لہجے میں پوشیدہ سوال اور معنی خیز نظروں کو ہمزاد نے سمجھ لیا اور کہا۔ "وہاں پہنچنے کے قبل کیا کہا جا سکتا ہے!"

"خیر اللہ مالک ہے' دیکھا جائے گا۔ پاس پڑوس کا ماحول کیسا ہے؟"

"ابھی تو میں نے کوئی اندازہ نہیں لگایا' بہ ظاہر تو ماحول ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔" ہمزاد نے جواب دیا' پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ "جو مکان میں نے کرائے پر لیا ہے' اس کے بالکل سامنے کوئی خان صاحب رہتے ہیں۔ غالباً" وہ خان صاحب کی بیٹی ہے...... وہ...... وہ البتہ مجھے ...... گویا آپ کو بڑی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔" یہ کہہ کر ہمزاد مسکرانے لگا۔

"مجھے نہیں تمہیں!" میں بھی مسکرا دیا۔ "میں نے اب یہ سارے دھندے چھوڑ دیے ہیں ویسے موصوفہ کی عمر کیا ہو گی؟"

جب یہ دھندے چھوڑ ہی دیے ہیں آپ نے تو پھر عمر سے کیا دلچسپی......"

"بس یوں ہی پوچھ رہا تھا تو تم معنی پہنانے لگے اس بات کو!"

"عمر تیس پینتیس سے کم نہیں ہو گی آپ خود دیکھ لیں گے۔ مجھے کیوں کہ کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے مزید کچھ جاننا ضروری نہیں سمجھا۔"

"تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ اس کی نظریں میٹھی تھیں یا کھٹی؟ یقیناً تم نے بھی

اسے غور سے دیکھا ہو گا!" میں نے جواباً ہمزاد کی کھچائی شروع کر دی۔

"اب وہ چپک ہی گئی تھی اپنی کھڑکی سے تو میں کیا کرتا! نگاہ اٹھ ہی جاتی ہے۔" وہ کچھ خجل سا ہو کر اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ پھر کچھ دیر بعد میں سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔ "اب یہاں سے چلنے میں کوئی قباحت تو ہے نہیں' آج ہی چلتے ہیں۔ کیا کہتے ہو تم؟"

"جیسی آپ کی مرضی!" وہ کہنے لگا۔

"ہاں سنو! رات کو چلیں گے' نصف' شب گزرنے پر' زوال کا وقت گزار کے' سوا بارہ اور ساڑھے بارہ بجے کے قریب! بہت دن ہو گئے فضا میں پرواز کیے' اچھا لگتا ہے!"

"لیکن آپ ہوش میں کب رہ سکیں گے!"

"کچھ دیر تو رہ سکتا ہوں! پھر جب تم تیز رفتاری دکھاؤ گے تو خود کہہ دوں گا کہ اب ......"

"ہاں یہ ممکن ہے۔"

اس کے بعد میں نے ہمزاد کو رخصت کر دیا اور اپنے ملازم ارشاد علی کو آواز دی۔ ابھی میں نے اسے چاٹگام سے جانے کے بارے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ جب نچلی منزل سے تقریباً دوڑتا ہوا اوپر آ گیا تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ "ارشاد علی! آج رات میں ایک کام سے ڈھاکہ جا رہا ہوں۔"

"جی جناب!" وہ اپنے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"ابھی کچھ معلوم نہیں کہ مجھے وہاں کتنے دن لگیں! تم میری طرف سے فکر مند نہ ہونا۔" یہ کہہ کر میں نے سرہانے رکھے ہوئے تکیے کے نیچے سے چیک بک نکالی اور بولا۔ میں نے سادہ چیکوں پر دستخط کر دیے ہیں۔ اس چیک بک کو حفاظت سے اپنے پاس رکھنا...... لو!"

"مگر...... مگر جناب' بینک...... بینک میں تو بہت...... بہت پیسہ ہے اور...... اور آپ مجھ پر اتنی بڑی ذمے داری......"

"فضول باتیں نہ کرو!" میں نے اسے محبت سے ڈانٹ دیا۔ "مجھے تم پر پورا اعتماد ہے کہ تمہاری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں۔ ارشاد علی! اس دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں پیسے سے نہیں محبت ہی سے خریدا جا سکتا ہے' اور میں نے بھی تمہیں اپنی محبت سے خریدا ہے' مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے بے وفائی نہیں کر سکتے۔ لو پکڑو چیک بک!"

بالآخر اس نے چیک بک لے لی جس میں سے ایک چیک بھی نہیں کاٹا گیا تھا۔

"اس سے..... اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے جناب کہ آپ طویل عرصے کے لیے جا رہے ہیں۔" وہ چند لمحے رک کر بولا۔

"ہاں امکان یہ بھی ہے۔" میں نے گول مول بات کی "اگر——— اگر ایسا ہی ہے تو..... تو پھر مجھے..... مجھے بھی ساتھ لے چلیے تاکہ وہاں آپ کو پریشانی نہ ہو۔"

"نہیں ارشاد علی!" میں نے انکار میں گردن ہلائی۔ "دراصل ابھی کچھ طے نہیں ہے جیسا کہ میں نے بتایا تمہیں۔"

پھر وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں بولا اور ذرا دیر بعد کہنے لگا۔ "سفر طویل ہے حضور کھانے کے لیے کیا کیا بنا....."

"کچھ نہیں۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اور ہاں سنو آج بھی تم حسب معمول اندر سے دروازہ بند کر کے اپنے مقررہ وقت پر سو جانا۔ جس وقت مجھے جانا ہو گا' چلا جاؤں گا۔"

"لیکن دروازہ..... وہ بند کرنا پڑے گا مجھے اندر....."

"نہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے معنی خیز انداز میں اسے مسکرا کر دیکھا پھر کہا۔ "تم اس چکر میں نہ پڑو اور جو کہہ رہا ہوں' بس وہ کرو۔"

معلوم نہیں' وہ کیا سمجھا' کیا نہیں! ہاں اس نے اس طرح سر ضرور ہلایا تھا جیسے ساری بات سمجھ میں آ گئی ہو۔ اس کے باوجود وہ بستر بند باندھنے اور بقیہ سامان کی بات کرنے لگا۔

"کہہ دیا نہ تم سے کہ اپنی عقل نہ بھڑاؤ اس معاملے میں! اب کچھ کر لوں گا میں! کچھ ضرورت نہیں مجھے۔ بس جس طرح روز وقت پر کھانا لے آتے ہو لے آنا۔ اب جاؤ!"

ارشاد علی کچھ حیران حیران سا چلا گیا۔ وہ میرا وفادار جاں نثار ملازم تھا اس لیے میں نے اس کی اتنی باتیں سن بھی لیں تھیں ورنہ کوئی اور ہوتا تو نہ اسے کچھ پوچھنے یا کہنے کی جرات ہوتی نہ میں اتنی بات کرتا۔ مجھے علم تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے' اس میں نیک نیتی شامل ہے اسی وجہ سے میرے لہجے میں نرمی رہی۔ پھر یہ کہ میں اسے بتاتا بھی کیا! بہر حال میرے اندازے کے مطابق اس نے اتنا ضرور سمجھ لیا تھا کہ عمل کر کے میں نے کوئی پُراسرار قوت ضرور حاصل کر لی ہے۔ اس قوت کے کئی مظاہرے وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا' مثلاً" میرے بوڑھے چہرے پر جوانی کی بہار آ جانا! یہ بھی کم حیرت انگیز بات نہیں تھی۔ اس سے قطع نظر بھی بہت سی حیرت انگیز اور عجیب باتیں رونما ہو چکی تھیں جن کا علم ارشاد علی کو تو کیا کسی کو بھی نہیں تھا۔ یہ صرف مجھی کو معلوم تھا کہ اب میرا وجود غیر فطری ہونے کے باوجود غیر فطری نہیں رہا۔ وہ جسم جو کبھی میرے لیے آزار جاں تھا' راحت جاں بن چکا تھا۔ ہمزاد نے معدے کے سرطان کے

لیے جو سفوف بنایا تھا' وہ ایک ہی ہفتے میں اپنا اثر دکھا چکا تھا۔ اب میں نے سرطان موذی مرض سے نجات حاصل کر لی تھی۔ میں جسمانی طور پر بھی اب قطعی صحت مند ہو چکا تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مرنے سے پہلے آدمی کی روح اس کے دماغ میں سمٹ آتی ہے' اور دماغ ہی جسم کا وہ حصّہ ہے جہاں سے روح آخر میں نکلتی ہے۔ مجھے علم نہیں کہ اس نظریے میں کتنی صداقت ہے! ہاں اس کا عملی تجربہ مجھے ضرور ہو چکا ہے کہ میری روح میرے دماغ میں سمٹ آئی تھی اور یہ تجربہ کئی بار ہوا ہے ورنہ اپنے بقیہ جسم سے بچھڑ کر میں زندہ نہ رہ سکتا۔ اس کا سبب میں نے پہلے ہمزاد کے وجود کو سمجھا تھا' مگر اب خدا کی قدرت کو سمجھتا ہوں۔ وہ قادر مطلق ہے' اس کی قدرت سے کچھ بعید نہیں وہ تنکے میں بھی جان ڈال سکتا ہے اور انہیں پیوند خاک سلا سکتا ہے جو خود کو ناقابل شکست تصوّر کرتے ہیں۔ قوم عادؑ نے بھی تو خود کو ایسا ہی سمجھا تھا اور ہلاک کر دی گئی۔ مجھ پر خدا کا احسان تھا کہ اس نے ناممکن حالات میں مجھے موت کا ذائقہ نہ چکھنے دیا۔ ہاں ذریعہ..... ذریعہ کوئی بھی ہو سکتا ہے' وہ ہمزاد کا وجود ہو یا کچھ اور! دراصل ہم سے بنیادی غلطی یہی ہو جاتی ہے' ہم ذریعے ہی کو اصل سمجھنے لگتے ہیں' غلطی یہی ہو جاتی ہے' ہم ذریعے ہی کو اصل سمجھنے لگتے ہیں' اسی کو مقصد کہنے لگتے ہیں۔ خود مجھ سے اس غلطی کا ارتکاب ہو چکا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں راہ راست سے نہ بھٹکتا۔ اب صورِ حال بدل چکی تھی۔ میرا ظاہر بھی بدل چکا تھا اور باطن بھی! اور اصل بدلنا باطن کا ہے! بہ ظاہر اگر میں ایک وجیہہ اور پُرکشش نوجوان تھا تو یہ وجاہت اور حسن میرے باطن میں بھی تھا۔ روح کی کثافتیں دھل چکی تھیں۔ میرے دماغ نے اب ایک اجنبی جسم کو مکمل طور پر قبول کر لیا تھا اور اب وہ جسم میرے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ اب وہ میرا جسم تھا۔ گویا میں تھا! جس روح کے درمیان رابطے کی یہ حالی ممکن ہے' کچھ لوگوں کو بڑی عجیب' پُراسرار اور ناقابل یقین معلوم ہو۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ بہ ظاہر ایک نظر آنے والا جسم ایک نہ ہو؟ ممکن ہے کہ یہ مجھ پر نہ بیتی ہوتی تو میں بھی اسے ناقابل یقین ہی سمجھتا' لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ زندگی میں ہر شخص ایک ہی سے تجربات سے گزرے۔ اس کائنات کا ہر عقدہ تو ابھی نہیں کھلا' اور جو کھل گیا ہے' کیا ضروری ہے کہ وہ سچ بھی ہو! پھر کائنات تو بہت بڑی چیز ہے' اس کائنات کے ایک بہت مختصر حصے انسان کے بارے میں حتمی طور پر ابھی کچھ سراغ نہیں ملا' گویا خود انسان کا وجود ایک اسرار ہے' ایسا اسرار جسے سمجھنے کی کوشش اب تک جاری ہے۔ ہاں یہ کوشش یہ جستجو ان کی ہے جو عقائد نہیں رکھتے' بے عقیدہ ہیں! ہونے اور نہ ہونے' وجود اور بے وجودی نے بہت سے نظریات کو جنم دیا ہے۔ یہ بھی غلط نہیں کہ جاننا اور جستجو کی کوشش ہی علم ہے' صرف راہوں کے تعین

میں فرق ہے۔ میں نے کسی طرح جانا' تم نے کیسے جانا؟ مقصد دونوں ہی کا جاننا ہو اور جاننا نہیں گویا علم سے انحراف اندھیروں کی طرف لے جاتا ہے جہاں سے بے یقینی پیدا ہوتی ہے۔

شمیم نوید! میں محسوس کر رہا تھا کہ تمہارے چہرے پر اضطراب اور الجھن کے آ ہیں اور اس کا سبب بھی میرے علم میں ہے۔ تمہیں شاید جسم و روح کی اس پیچیدہ بحث زیادہ میری سرگزشت سے دلچسپی ہے کیوں کہ تم فلسفے اور نظریات نہیں' کہانیاں لکھتے ہو' میں اس سے گریز کرتے ہوئے تمہیں اسرار افسوں کی فضا میں لے چلتا ہوں۔ میری اس بح کا مقصد صرف یہ تھا کہ میری سرگزشت کو محض کہانی ہی نہ سمجھ لیا جائے۔

بہر حال مختصراً" یوں سمجھ لو کہ میں اب خود کو کوئی پُراسرار وجود سمجھنے کی بجائے ایک انسان سمجھنے لگا تھا مگر ایسا انسان جسے خدا نے کچھ ایسی قوتوں سے نواز دیا تھا جو عام انسانوں نہیں ہوتیں۔ میں اب ان قوتوں کو شر کی بجائے خیر کے حصول میں صرف کرنا چاہتا تھا۔ چا سے میری روانگی بھی اس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

اس شب سوا بارہ بجے کے قریب ہمزاد حاضر ہو گیا۔ میں پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ ار علی میرے حکم کے مطابق گھر کا دروازہ اندر سے بند کر سو چکا تھا۔ میں اپنے کمرے کی رو گل کر کے چھت پر آ گیا۔ ہر طرف سناٹا اور تاریکی تھی۔ میں نے اسی لیے نصف شب کا وق مقرر کیا تھا۔

میرا اشارہ پا کر ہمزاد قریب آ گیا اور پھر اسی کے ساتھ ایک طویل عرصے کے بعد م ایک پُراسرار تجربے سے گزرا۔ میرا جسم اوپر اٹھنے لگا۔ ہمزاد میرے ایما پر تیز رفتاری سے گریز کر رہا تھا' اس کے باوجود میرے حواس بے قابو سے ہو رہے تھے۔ چاٹگام شہر کی روشنیا مجھے اب ٹمٹماتے دیوں کی طرح محسوس ہو رہی تھیں اس لیے کہ میں خاصی بلندی تک پہنچ تھا۔

ہمزاد کی پرواز جاری تھی۔ وہ مجھے سہارا دیے بہت آہستہ آہستہ ڈھاکہ کی طرف پرو کر رہا تھا۔ تقریباً" نصف گھنٹے میں نے پرواز کا لطف لیا' پھر ہمزاد سے کہا۔ "اب تم تیز رفتار سے اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہو اس لیے کہ چاٹگام شہر نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔"

دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی آنکھوں پر اس کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا اور اپ میرے ذہن پر تاریکی چھا گئی۔

مجھے علم نہیں کہ مجھ پر کتنی دیر غفلت طاری رہی! ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک خواب گاہ میں پایا۔ میں ایک مسہری پر دراز تھا اور میرے سامنے ہی ہمزاد مودب کھڑا تھا۔ مجھے

اس کے چہرے پر داد طلبی کے آثار نظر آ رہے تھے' اور تھا بھی ایسا ہی! میں نے بخل سے کام نہ لیا اور بولا۔ "تم نے واقعی بہت خوب صورتی سے اس خواب گاہ کو سجایا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور مسہری ہی پر ایکطرف رکھے ہوئے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا لی۔ "مجھے تمہارے ذوق جمال کا اندازہ ہوتا جا رہا ہے۔"

"شکریہ!" وہ ادب سے جھکا اور پھر میری طرف چابیوں کا گچھا بڑھا دیا۔ "پہلی منزل پر بھی دو کمرے ہیں' ایک بڑا ہے' ایک چھوٹا۔" وہ بتانے لگا۔ "ایک کو میں نے نشست گاہ بنا دیا ہے اور دوسرے کو اسٹور۔ نیچے باورچی خانہ اور غسل خانہ ہے۔ اوپر اس خواب گاہ کے علاوہ ایک کمرا اور تھا۔ فی الحال میں نے اسے مطالعہ گاہ بنایا ہے' ویسے جو آپ کہیں گے....."

"تم نے میرے کہنے کو چھوڑا کیا ہے جان عزیز!" میں نے محبت سے کہا۔

"سامنے یہ جو لکڑی کی الماری ہے' اس میں آپ کے کپڑے اور ضروریات کا دیگر سامان ہے۔" ہمزاد نے اشارہ کیا۔

معاً" میرے ذہن میں ایک بات آئی اور میں نے اس سے پوچھا۔ "نیچے صدر دروازہ تو ابھی باہر سے مقفل ہو گا نا؟"

وہ مسکرایا۔ "جی نہیں۔ میں صدر دروازے کا تالا کھول کر گھر میں آیا ہوں تاکہ پاس پڑوس والے دیکھ لیں اور اندر روشنی دیکھ کر یہ نہ سمجھیں کہ چور گھر میں گھس گئے ہیں۔"

"اور میں کہاں تھا اس وقت؟ مجھے بھی تو....."

"آپ اس وقت خواب گاہ میں پہنچ چکے تھے۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"اچھا! سمجھ گیا میں۔ پہلے تم نے مجھے یہاں اس خواب گاہ میں لا کر مسہری پر لٹا دیا' پھر باہر پہنچ کر تالا کھولنے کے بعد گھر میں آئے۔" میں سر ہلا کر بولا۔ "نیچے کا دروازہ تو لگا دیا ہے؟"

"جی ہاں۔" ہمزاد نے جواب دیا۔

"ویسے تو خیر ابھی ایک ہی بجا ہے....." میں نے دائیں جانب دیوار پر لگی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "پھر بھی اب سو ہی جانا بہتر ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

ہمزاد چلا گیا تو میں نے خواب گاہ کی روشنی گل کی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ کسی کو اگر میں یہ بتاتا کہ آج رات تقریباً" پون بجے تک چاٹگام ہی کی حدود میں تھا اور ایک بجے ڈھاکہ میں تو یقیناً" مجھے خبطی یا پاگل سمجھتا مگر حقیقت یہی تھی۔ ہمزاد کو چاٹگام سے ڈھاکہ پہنچنے میں اتنی دیر بھی صرف میری وجہ سے لگی تھی کیوں کہ میرا جسم اس قدر تیز رفتاری کا متحمل نہیں ہو

سکتا تھا ورنہ وہ تو پلک جھپکتے کہیں سے کہیں پہنچ جاتا تھا۔

دوسرے دن صبح میں نے غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر مکان کا ایک چکر لگایا۔ مکان [illegible] بنا ہوا تھا مگر مضبوط اور غنیمت تھا۔ پھر یہ کہ ہمزاد نے اس کی صورت بدل دی تھا۔ اسی دور[illegible] میں مجھے سامنے والے گھر کی اس لڑکی کا خیال آیا جس کا تذکرہ ہمزاد نے کیا تھا۔ خواب گاہ [illegible] متصل جو کمرا تھا' میں نے وہاں پہنچ کر اس کی ایک کھڑکی کھول دی۔ سامنے والے دو منزلہ مک[illegible] کی کئی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں مگر وہاں کوئی تھا نہیں۔ دونوں گھروں کے درمیان بیچ جو [illegible] تھی' زیادہ چوڑی نہیں تھی اس لیے درمیانی فاصلہ خاصا کم تھا۔ میں پلٹنے ہی والا تھا کہ کسی [illegible] تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھتے دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ وہی ہو سکتی تھی جو مجھے ا[illegible] طرف دیکھتے پا کر کچھ ٹھٹک سی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہمزاد نے یوں میری طرح اسے بہ [illegible] راست دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔

اس کی عمر کے بارے میں بھی ہمزاد نے ٹھیک ہی اندازہ لگا تھا۔ وہ تیس پینتیس [illegible] درمیان ہی رہی ہوگی' مگر حسن جیسے اس پر ٹوٹ کر برسا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے بھری بہار [illegible] بھرپور خوشبو کے حصار ہوں اور رنگ چھلک اٹھنے کو بے تاب ہوں۔ وہ کھڑکی سے لگی کھڑی تھی [illegible] نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی آنکھوں پر دراز پلکیں سایہ کیے ہوئے تھیں' جسم گد[illegible] ہونے کے باوجود متناسب معلوم ہوتا تھا۔ ہرا جمپر اور ہرا ہی دوپٹہ اس پر کھل رہا تھا۔ نچلے ہو[illegible] کے نیچے دائیں جانب نمایاں تل تھا اور سرخ و سفید رخساروں پر جذبوں کی دھنک تھی [illegible] چوڑی پیشانی پر ایک آوارہ لٹ یا تو خود ہی جھوم رہی تھی یا اس نے بہ طور خاص یہ اہتما[illegible] تھا۔ چہرہ بیضوی تھا' مگر پرکشش! بعض چہرے ایسے ہوتے ہی کہ کوشش کے باوجود ان پر [illegible] نگاہ نہیں ہٹتی۔ وہ چہرہ بھی ایسا ہی تھا۔

چند لمحے بعد اس نے آہستہ آہستہ اپنی دراز پلکیں اٹھائیں اور گوشہ چشم سے می[illegible] طرف دیکھا' پھر ایک دم پلٹ کر تیزی سے اندر چلی گئی۔ وہ چلی بھی گئی مگر کچھ دیر مجھے [illegible] محسوس ہوتا رہا کہ کھڑکی خالی نہیں ہے۔ پھر میں نے کھڑکی تو بند نہیں کی البتہ خود وہاں [illegible] ہٹ گیا۔ بہ یک وقت میرے ذہن میں بہت سی باتیں آئی تھیں۔ ظاہری بات تھی کہ وہ [illegible] گھر میں اکیلی تو نہ ہوگی' یقیناً اور لوگ بھی ہوں گے۔ اگر کسی نے مجھے یوں کھڑکی میں دیکھ [illegible] یہ کوئی اچھی بات بہرحال نہیں ہوگی۔ پھر مجھے اس کی عمر کا خیال آیا۔ اس عمر تک پہنچ کر عمو[illegible] لڑکیاں کنواری نہیں رہتیں۔ وہ شادی شدہ بھی ہو سکتی تھی' ہر چند کہ معلوم نہیں ہوتی تھی [illegible] صورت میں اس کا شوہر نامدار "مرغ [illegible] سیاہ" بن کر میری "مزاج پرسی" کر سکتا تھا۔

ان باتوں سے بھی قطع نظر یہ کہ میں توبہ کر چکا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ زیب نہیں دیتا تھا۔

اس خیال نے مجھے مضطرب کر دیا۔ میں سوچنے لگا کہ میرا شیطان اب بھی میرے اندر چھپا ہوا ہے ورنہ یوں نہ ہوتا۔ اب میں اپنی خواب گاہ میں آ کر ہمزاد کو طلب کر چکا تھا۔ اسے میں نے ناشتہ لانے بھیج دیا اور پھر اپنے دل کو سمجھانے لگا کہ مجھ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا۔ وہ خود ہی تو میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی! تو کیا میں اپنا آنکھیں بند کر لیتا! پھر یہ کہ میں نے اس سے کچھ کہا بھی نہیں۔ جلوہ اتنا بھرپور اور پرکشش ہو تو بھلا کون کافر ہے جو نظر پھیر لے گا! یہ تو بدذوقی ہوئی۔ دل اپنا تھا کسی طرح سمجھ ہی گیا اور مجھے احساس گناہ سے نجات مل گئی۔

جب تک ہمزاد ناشتہ لے کر آیا۔ میں بڑی حد تک خود کو سنبھال چکا تھا' پھر بھی اس نے جانے کیسے میرے اضطراب کو محسوس کر لیا۔

"کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔

"کہیں درشن تو نہیں ہو گئے؟" اس نے مسکرا کر دوسرا سوال کیا۔ بالآخر وہ بات کی تہ تک پہنچ ہی گیا۔

میں جھوٹ نہ بول سکا۔ مگر اسی کے ساتھ کہا۔ "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ..... کہ....."

"آپ نے توبہ کر لی ہے۔" اس نے شوخ لہجے میں میری بات پوری کر دی' پھر بولا۔ "لیکن در توبہ ابھی بند تو نہیں ہوا!"

"بکو مت!" میں نے اسے پیار بھرے لہجے میں ڈانٹ دیا۔

"میں بکوں گا تو ضرور!" وہ بہ دستور شرارت پر آمادہ رہا۔

"وہ کس خوشی میں؟" میں نے آنکھیں نکالیں۔

"وہ عرض کر دیتا ہوں۔" وہ مسکرایا "مجھے معلوم تھا کہ آپ کو شربت دیدار ضرور پلایا جائے گا اسی لیے میں نے بطور احتیاط صاحب دیدار کا حدود اربعہ معلوم کر لیا تھا' مگر بتاؤں گا نہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ آپ مجھ سے پوچھیں گے ہی نہیں کچھ' اس کے بارے میں۔"

"میں نے یہ کب کہا تھا کہ کچھ نہیں پوچھوں گا!" میں اس سے سوال جواب کے دوران میں ہر چند کہ ناشتہ بھی کر رہا تھا مگر ساری توجہ اسی کی طرف تھی۔

"اگر ایسا ہے تو پھر جب پوچھیں گے تو بتا دوں گا۔ میں بھلا بغیر پوچھے کیوں بتاؤں گا کہ اس کا نام نفیسہ ہے اور یہ بھی کہ وہ ابھی تک کنواری ہے!" وہ مسکرایا۔

"کیا؟"

میں چونک اٹھا۔ کنواری ہے؟"

"جی ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "اور اس کی وجہ ہے' مگر میں کیوں بتاؤں وجہ کہ وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہے اور ان کی گزر بسر کا واحد ذریعہ ہے!

"دیکھو تم شرارت سے باز آجاؤ اور سیدھے سیدھے بتاؤ ساری بات!" میری آنکھوں میں کوئی خواب سا جاگنے لگا تھا۔ گزر بسر کے واحد ذریعے سے کیا مراد ہے تمہاری؟"

"اب آئے نا آپ گھاٹ پر!" وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ نوکری کرتی ہے وہ ایک دفتر میں! ٹائپسٹ ہے وہاں.... اور کچھ پوچھنا ہے؟"

"ہاں سب کچھ بتاؤ اس کے بارے میں!" میں نے زور دے کر بولا۔

"سب کچھ نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔" ہمزاد سنجیدہ ہو گیا۔ "کچھ باتوں کا نہ جاننا بھی اچھا ہوتا ہے۔"

"اب سبق نہ دو مجھے! جو پوچھ رہا ہوں بتا دو!"

"تو سنئے! اس کا عدد منگیتر بھی ہے اور وہ نفیسہ کو ٹوٹ کر چاہتا ہے۔"

"اچھا!" میں نے طویل سانس لیا اور اسی کے ساتھ میری آنکھوں میں جو خواب جاگا تھا' ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔ "اسی لیے کہہ رہے تھے کہ....

"کچھ باتوں کا نہ جاننا بھی اچھا ہوتا ہے۔" ہمزاد نے میرا جملہ پورا کر دیا' پھر بولا۔ ویسے زیادہ مایوس ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ آپ کے چہرے سے ظاہر ہو رہا ہے۔"

"غلط خیال ہے تمہارا!" میں جھینپ مٹانے کے لیے مسکرایا۔ "میں کیوں مایوس ہوتا!" یہ کہتے ہوئے میں نے پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ناشتہ تو کر لیں یا بھوک ہی اڑ گئی؟"

"تم پھر اپنی پہ آگئے! کر چکا ہوں' ناشتہ!" میں نے گلاس ہونٹوں سے لگا لیا' پھر پانی پی کر کہا۔ "ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے کہ مایوسی کی بات نہیں؟"

"کچھ نہیں' خاک ڈالیں اس پر! یہ سوچیں کہ ڈھاکہ کس لیے آئے تھے! کہیں اس چکر میں پھنس کر آپ اس غریب سریتا ہی کو نہ بھول جائیں!"

"تم ایسا سمجھتے ہو مجھے!" میں نے اس کی شرارت کو مدنظر رکھتے ہوئے نسبتاً سخت آواز میں کہا۔

"سمجھتا تو نہیں ہوں' پھر آپ کیوں اس سلسلے میں پیش رفت نہیں کر رہے؟"

"تو اب تم جواب طلبی کرو گے مجھ سے!" میں نے اسے گھورا۔

"کمال کرتے ہیں آپ بھی! میری یہ مجال کیسے ہو سکتی ہے!"

"پھر سریتا کے سلسلے میں کیوں بک بک کر رہے ہو! جب کہ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں' جلد بازی نہیں کرنی!"

"یہ تو میں بھول ہی گیا تھا!"

ہمزاد نے یہ جملہ بالکل اسی طرح ادا کیا جیسے میں ایسے موقعوں پر کسی کو "جھنے" کے لیے ادا کرتا تھا۔ مجھے ہنسی آگئی۔ آخر وہ میرا ہی جسم لطیف تو تھا۔ اس سے زیادہ مجھے کون جانتا!

"دیکھو ڈھاکہ آئے ابھی مجھے پہلا دن ہے اور میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا کہ کیا قدم اٹھاؤں گا۔ جب تک میں کسی نتیجے تک نہیں پہنچ جاتا' اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ارے آپ تو ناحق سنجیدہ ہو گئے! یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔"

"تو پھر نفیسہ کے بارے میں فوراً" وہ سب کچھ اگل دو جو تم نے معلوم کیا ہے۔"

"نہیں مانیں گے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"آپ کی مرضی! بعد میں تلملائیں تو مجھ پر الزام نہ لگایئے گا کہ اس نے یہ بلا میرے پیچھے لگائی تھی۔"

"تم بکو گے بھی کچھ کہ بس تمہید ہی باندھے جاؤ گے!"

"بکتا ہوں' بکتا ہوں' ذرا سانس تو لینے دیں!" اس نے مظلوم نظر آنے کی اداکاری کی' پھر کہنے لگا۔ "تو کیا پوچھ رہے تھے آپ؟"

"تمہارا سر!" میں چڑ کر بولا۔"

"وہ تو سلامت ہے اپنی جگہ!" اس نے بھولپن سے کہا۔

"لیکن تم مجھے اسی طرح ستاتے رہے تو یہ سلامت نہیں رہے گا' سمجھ گئے!"

"تو پہلے کیوں نہیں کہا تھا یہ!"

مجھے پھر ہنسی آگئی۔ دراصل میری تنہا زندگی میں ہمزاد کی یہ شرارتیں شامل نہ ہوتیں تو جینا بڑا کٹھن ہو جاتا۔ میں اسی لیے اس پر زیادہ سختی نہیں کرتا تھا اور کبھی کبھی اسے طرح دے جاتا تھا۔ اس کا اندازہ خود اسے بھی تھا' وہ بھی میرے ساتھ ہنسنے لگا۔ کافی عرصے کے بعد ایسا کوئی موقع مجھے نصیب ہوا تھا کہ یوں لمحے خوش گوار گزرے ہوں ورنہ عموماً اعصاب کشیدہ ہی رہتے

تھے یا پھر کسی نہ کسی معرکہ آرائی رہتی تھی۔ میرا ذہن فکر سے خالی تو اب بھی نہیں تھا مگر اب میں نے اپنا انداز فکر ذرا سا بدل دیا تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ اور تلخ تجربات کے سبب میرے مزاج میں قدرے ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ یہ مثبت تبدیلی ہمزاد کو دوبارہ مسخر کرنے کے بعد مجھ میں رو ہوئی تھی ورنہ پہلے میں اتنا صبر کہاں کرتا تھا! نتیجتہ" مجھے اس کی سزا بھی بھگتنا پڑتی تھی۔

اس وقت ہمزاد اور میں دونوں ہی دیر تک ہنستے رہے' پھر اس نے مجھے بتایا۔

"نفیسہ رشید کو بالکل نہیں چاہتی! میں نے اس لیے کہا تھا کہ زیادہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"رشید غالباً" اس کے منگیتر کا نام ہے؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"جی ہاں اب منگیتر بننے سے پہلے بھائی جان ہوا کرتا تھا"

"نہ چاہنے کا سبب؟" میں نے "بھائی جان" کی تفصیل سے گریز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ایک نہیں کئی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "پہلا تو یہی کہ اس غریب کے منہ چیچک کے داغ ہیں' اور ظاہر ہے کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں' رنگ بھی کچھ دبا ہوا سانولا! پھر یہ کہ میٹرک پاس ہے اور نفیسہ نے بارہ کلاس پڑھ لی ہیں' یعنی تعلیم میں وہ اپنے منگیتر سے دو کلاس بڑھ کر ہے' جسم بھی کچھ ہلکی ہے' ہلکی سی توند بھی ہے۔ ایک بازار بند ایک کھلا ہوا۔"

"بازار؟"

"میرا مطلب یہ ہے' موصوف ساری دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔"

"تو سیدھے سیدھے یوں کہو نا کہ ایک آنکھ ہے!"

"وہی تو کہہ رہا تھا!..... خیر تو اس میں اس غریب کا کیا قصور کہ بچپن میں بیماری کے سبب ایک آنکھ جاتی رہی اس لیے ہر وقت دھوپ کا چشمہ لگائے رہتا ہے۔ بڑے بڑے لوگ ایک آنکھ والے ہوئے ہیں مثلاً".....

"پٹڑی سے نہ اترو!" میں نے اسے ٹوکا۔ "آگے کہو۔"

"کیا اب بھی کچھ کہنا سننا باقی رہ گیا ہے۔!"

"کیوں نہیں!" میں زور دے کر بولا۔ "سوال یہ ہے کہ نفیسہ کے ماں باپ نے ا کیسے قبول کر لیا!"

"آخر کوئی وجہ تو ہو گی نا!"

"ایک نہیں کئی!" وہ مسکرایا۔

وہ شرارت پر تو آمادہ تھا ہی مگر میرے سوالوں کا جواب بھی دے رہا تھا اس لیے میں نے صرف اتنا کہا۔ "بیان کرو وجوہ!"

"آپ تو اس وقت بالکل کوئی جج معلوم ہو رہے ہیں اور میں آپ کے سامنے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوا کوئی....."

"ارنگ بڑنگ نہیں' بس مطلب کی بات! وہ وجوہ بتاؤ جن کی بنا پر نفیسہ کے ماں باپ نے رشید کو قبول کیا اور اور یہ بھی کہ نفیسہ اس پر کیسے راضی ہو گئی؟"

اس کے لیے مجھے ماضی کے اوراق پلٹنا پڑیں گے اور ان اوراق کو پلٹتے ہوئے یہ خیال بھی رکھنا پڑے گا کہ بہت بوسیدہ ہیں کہیں اللہ کو پیارے نہ ہو جائیں!"

"تو پلٹو اوراق!" میں بھی اس سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔

"یہ پلٹا پہلا ورق!" اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے ہنسانے کی کوشش کی اور میں نے اسے مایوس نہیں کیا۔ اس پر لکھا ہے کہ نفیسہ کی عمر اس وقت' جوانی راتیں مرادوں کے دن تھی' یعنی صرف انیس سال! اس عمر میں موصوفہ اغوا کر لی گئیں اور پولیس کی ان تھک کوششوں کے بعد کھنا سے برآمد کی گئیں۔ ان ان تھک کوششوں میں پولیس کو چار ماہ لگ گئے اور چار ماہ کسی جوان جہاں لڑکی کے لیے بہت ہوتے ہیں! سمجھ رہے ہیں نا آپ..... خیر ان دونوں بندوں کو تو لمبی سزا ہو گئی جنہوں نے نفیسہ کی مرضی کے خلاف اسے حبس بے جا میں رکھا ہوا تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ نفیسہ پر جو کچھ گزر گئی اس کا تدارک کون کرتا! غریب ماں باپ کی اکلوتی بیٹی بدنام ہو گئی جب کہ وہ بے قصور تھی۔ یہ بات بھی چھپائے نہ چھپی کہ اس کے ماں باپ نے اسے فوراً" ہی کچھ دن کے لیے ایک اسپتال میں داخل کروا دیا تھا۔ اسپتال سے نفیسہ خالی ہاتھ ہی گھر آئی۔ وہ پیلی پڑ گئی تھی' بڑی مدت کے بعد کہیں جا کر پہلی سی بہار آئی' مگر اب بہت سے مسئلے درپیش تھے۔ پہلا مسئلہ تو یہی کہ کوئی خاندان والا کسی ایسی لڑکی کو اپنی بہو بنانے پر راضی نہ تھا جو اغوا بھی کی جا چکی ہو اور..... آپ خود ہی سمجھتے ہیں' تفصیل کیا عرض کروں! آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں کچھ شرمیلا واقع ہوا ہوں۔ ایسی باتیں میری زبان پر نہیں آتیں۔ آپ کو شاید یاد ہو گا کہ ایک مرتبہ آپ نے میرٹھ میں مجھے....."

"بس!" میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا۔

"اسی طرح تو آپ مجھے بے بس کر دیتے ہیں اور میرے دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی ہے۔ آپ ہی بتائیں یہ ظلم ہے کہ نہیں؟"

"برداشت کرو ظلم! یہ تو ہو گا۔ تم جان بوجھ کر بھکو گے تو میں ضرور ٹوکوں گا۔ ہاں تو پھر

کیا ہوا؟"

"اب تو وہ ورق ختم ہو گیا' یقین کریں میں آخری سطر تک پڑھ چکا ہوں۔ مزید کچھ جاننے کے لیے مجھے ماضی کے اوراق میں سے ورق نمبر دو الٹنا پڑے گا اور یہ میں عرض ہی کر چکا ہوں کہ اوراق بوسیدہ ہیں اس میں ٹیم لگے گا۔"

"تو لگاؤ ٹیم' میں نے کب منع کیا ہے! مجھے کون سا کہیں حاضری بجانے جانا ہے!"

"معاف کیجئے گا" آپ اہل زبان ہو کر غلط اردو بول رہے ہیں' حاضری بجائی نہیں جاتی! دلیل اس کی یہ کہ حاضری کوئی بانسری نہیں ہوتی' نہ کسی قسم کا باجا! حاضری دی جاتی ہے۔

"ہم اہل زبان ہیں جس طرح چاہیں بولیں۔ تم کون ہوتے ہو ٹوکنے والے!"

اور آپ یہ بھی کہیں گے کہ زبان ہمارے گھر کی لونڈی ہے!"

میں نہ سمجھ سکا کہ وہ مجھے اس طرح چوٹ کرنے کے لیے گھیر رہا ہے! اسی سبب کہہ دیا۔ "ہاں زبان ہمارے گھر کی لونڈی ہے!"

"اس لیے آپ اس کے ساتھ لونڈیوں کا سا سلوک کرتے ہیں۔" وہ مجھ پر چوٹ کر گیا۔

جھینپ مٹانے کے لیے میں نے اسے ڈانٹ پلائی اور اصل موضوع کی طرف لوٹنے کا "حکم" صادر کیا۔

"یہ لیجئے' ناراض کیوں ہوتے ہیں! پلٹ گیا ورق! لکھا ہے نفیسہ نے اپنی تقدیر کو قبول کر لیا کہ بن بیاہی رہے گی۔ ماں باپ نے اوپرے دل سے اس کے اس فیصلے کے خلاف تھوڑی بہت بک جھک کی۔"

"اوپرے دل سے کیا مطلب ہے تمہارا؟ اس کی وجہ تھی کوئی؟"

"ایک نہیں کئی!"

"اگر تم ہر بات پر انہیں لفظوں کی تکرار کرتے رہے تو 'ایک نہیں کئی' تمہارا تکیہ کلام ہو جائے گا بلکہ میں تمہاری چڑ بنا لوں گا 'ایک نہیں کئی!'" میں چڑ کر بولا۔

"چڑ تو آپ رہے ہیں ان الفاظ سے! اور چڑ اسی کی بنتی ہے جو کچھ مخصوص الفاظ سن کر ....."

"تم مجھے پھر سبق پڑھانے لگے!"

"میں تو بتا رہا تھا آپ کو! آپ تو بس خواہ مخواہ ہر وقت میری طنابیں کھینچے رہتے ہیں۔"

"بس بتا دیا تم نے کافی ہے۔ آگے کہو۔"

"کیا؟"

"وہی جو کہہ رہے تھے!"

"وہ تو میں بھول گیا۔"

پھر جب میں نے اسے گھور کر دیکھا تو "راہِ راست" پر آ گیا۔

"اس طرح تو نہ دیکھا کریں' میں ڈرنے لگتا ہوں۔ تو میں اوراق ماضی کا ورق نمبر دو اور سطر نمبر.... کیا تھی.... وہ کیا تھا سطر نمبر؟" اس نے شرارت سے میری طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی میرے چہرے کا "جلال" دیکھ کر جلدی سے بولا۔ "یاد آ گیا.... یاد آ گیا! سطر نمبر پندرہ تھی۔ دراصل بہت باریک باریک لکھا ہے اور کاتب نے قلم بھی صحیح نہیں لگایا' جگہ جگہ بین السطور گڑبڑ ہے۔ میم کا ڈنڈا نچلی سطر کے کاف کے مرکز سے اٹکھیلیاں کر رہا ہے۔ خیر کر رہا ہو گا مجھے کیا!.... تو سطر نمبر پندرہ کے بعد لکھا ہے۔ نفیسہ کی اماں اپنی آنکھوں کی بینائی سے محروم ہوتی جا رہی تھی جس طرح کہ عام طور پر بیوہ نوں کی آماؤں کی بینائی ایسے موقعوں پر کم ہو جایا کرتی ہے۔ وہ اب سلائی کڑھائی کر کے گھر کا خرچہ پورا نہیں کر سکتی تھی۔ ابا حضور قبلہ سدا کے نکھٹو تھے۔ ان حالات میں بیوی غریب کی جان عذاب میں تھی۔ غرض کہ اب نفیسہ پڑھ لکھ کر جوان ہوئی تو اس نے گھر کی ذمہ داری قبول کر لی۔ گویا نوکری کو پیاری ہو گئی اور شادی نہ کرنے کا اعلان بھی سنا دیا۔ میں نے اسی لیے کہا تھا کہ اس کے والدین نے اوپرے دل سے اس اعلان پر تھوڑی سی ریں ریں چیں چیں کی تھی ورنہ کمانے والی لونڈیا دوسرے گھر کی ہو جاتی تو وہ کیا کھاتے ڈیل!"

"مگر تم نے اس سلسلے میں رشید کا ذکر تو گول ہی کر دیا! وہ کہاں تھا۔ اس عرصے میں؟ اور پھر کب اور کس طرح وہ نفیسہ کا منگیتر بن گیا؟" میں نے اعتراض کیا۔

رشید جیسور میں تھا۔ ابھی کوئی سال بھر ہوئے وہ ڈھاکہ آیا ہے۔" ہمزاد نے جواب دیا۔ صبر یں' اس کی الگ کہانی ہے' عرض کرتا ہوں ابھی!"

لیکن زیادہ تفصیل نہیں مختصر!"

"یہ اچھا کہا آپ نے! اس کی کہانی ہے ہی مختصر! میں چاہوں بھی تو اس میں زیادہ کلی پھندنے نہیں جوڑ سکتا۔"

"خیر.... سنا دو اس کی کہانی بھی مگر اصل موضوع کی طرف جلد لوٹ آنا!"

"جاؤں گا تو لوٹوں گا' میں تو یہیں ہوں' آپ کی خدمت میں!" وہ بولا "ہاں تو عرض کیا ہے....."

"یہ تم کوئی شعر سنا رہے ہو یا واقعہ؟"

"یہ تو میں بھول ہی گیا تھا!"

"یاد دلاؤں؟" میں نے ہاتھ اٹھایا۔

"آ گیا یاد.... بالکل آ گیا! آپ اپنا ہاتھ نیچے کر لیں.... ہاں اس طرح!.... رشید کا قصہ یہ ہے کہ گویا وہ اپنے اماں ابا کی موت ہی کا انتظار کر رہا تھا' ادھر وہ دونوں دن ہائی ون آؤٹ ہوئے' ادھر رشید اپنے بڑے بھیا سے لڑ کر ڈھاکہ بھاگ آیا۔ شادی اس کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اب آپ مجھ سے اس کی وجہ نہ پوچھے گا ورنہ میں پھر وہی کہوں گا۔ ایک نہیں کئی!"

"میں پوچھ کب رہا ہوں وجہ جو تم آپ ہی آپ فرض کر رہے ہو!"

"مگر پوچھ تو سکتے ہیں!"

"نہیں پوچھوں گا' لکھ کر دوں!"

"لکھنے کی زحمت نہ کریں۔ میں آپ کی زبان پر اعتبار کیے لیتا ہوں۔"

"آگے بکو' آگے بکو!" میں نے اسے ٹوکا۔ "تم بتا رہے تھے کہ رشید اپنے بڑے بھائی سے لڑ کر ڈھاکہ آ گیا اور یہ کہ وہ غیر شادی شدہ تھا۔"

"بالکل تھا!" اس نے تائید میں سر ہلایا۔ ڈھاکہ آ کر اس نے قبلہ ماموں جان کی چھاتی پر مونگ دلنے کی کوشش فرمائی' مگر ماموں جان کی چھاتی پہلے ہی مونگ سے خالی تھی' دلتا کیا! ماموں' یعنی نفیسہ کے ابا نے دو چار دن تو برداشت کیا کہ چلو یتیم بھانجا ہے' پھر دھتا بتا دی کہ میاں چلتے پھرتے نظر آؤ' یہاں پہلے ہی رگوں میں تیل نہیں ہے۔ نتیجتہً میاں ایک جگہ نوکر ہو گئے' پھر ہفتے دو ہفتے میں کسی چھڑے کے ساتھ رہنے کا بندوبست بھی کر لیا اور تام تمبیڑا اٹھا کر چل دیے۔ اسی دوران میں کیوپڈ نے ان کے دل پر تیر اندازی شروع کر دی تھی۔ موصوف نفیسہ پر لٹو اور نفیسہ منہ لگانے کو تیار نہیں۔ منہ لگانا تو سمجھتے ہیں نا آپ! محاورہ ہے۔"

"ہاں سمجھتا ہوں' تم آگے کہے جاؤ۔" میں جان چھڑانے کے لیے فوراً بول اٹھا کہ کہیں وہ محاوروں پر شروع نہ ہو جائے!

"تو پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ آتش عشق اتنی تیز ہوئی.... اتنی کہ بس! خطرہ پیدا ہوا کہ عاشق نامراد' یعنی رشید اگر بامراد نہ ہوا تو اس آگ میں ایک دن زندہ ہی جل جائے گا اور دیکھنے والے ہاتھ ملاتے یا ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ ٹھنڈی میٹھی آہوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ایک دن ممانی جان کے سامنے یعنی نفیسہ کی ماں کے سامنے بھی ایک عدد آہ نکل گئی۔ بڑی بی

نے بھانجے کی نظروں کا تعاقب کیا تو معلوم ہوا اس آہ کا ٹارگیٹ انہی کی لخت جگر ہے' یعنی نفیسہ۔ نفیسہ اس وقت اپنے ہاتھ پر نئے کپڑے ڈالے' بال کھولے باتھ روم کا رخ کر رہی تھی۔ رات کو بڑی بی نے بڑے میاں کو اس آہ سے آگاہ کیا۔ پھر دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور طے ہوا کہ اگر واقعی ایسا ہے تو اس آہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے' وہ بھی اس طرح کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ نفیسہ ان کے بڑھاپے کی لاٹھی ہی تو تھی۔ اگر یہ لاٹھی ان کے ہاتھ سے چھین لی جاتی تو زندگی کی شاہراہ پر وہ دونوں بڈھے بڑھیا ایک قدم نہ چل سکتے۔ بڑے میاں نے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بھانجے صاحب پر پڑو ڈالنے کے لیے خود پہل کی۔ جو خود زیر دام آنا چاہتا ہو اسے تو بس اشارہ چاہیے۔ بھانجے کی دانست میں قبلہ ماموں حضور کی شرط بھی کوئی مشکل نہ تھی۔ اس شرط کی شقیں تھیں جیسی کہ ہوا کرتی ہیں' شرط ایک ہوتی ہے اور شقیں کئی' پہلی کہ بھانجے صاحب گھر داماد بن کر رہیں گے' دوسری کہ لونڈیا بہ دستور نوکری پر چڑھی رہے گی اور اپنی تنخواہ حسب معمول اپنی اماں کو لا کر دیا کرے گی۔ بھانجے' یعنی رشید نے فی الفور ہاں کر دی۔ اب مسئلہ نفیسہ کی ہاں کا تھا۔ سو بڑی بی نے اسے پٹی پڑھانا شروع کی۔ نفیسہ کو رشید دو آنکھوں تو کیا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا' مگر ماں باپ کے دباؤ میں آ کر اسے ہوں ہاں' کرنی ہی پڑی۔ قریب و دور کے رشتے دار جو باتیں بناتے رہتے تھے' وہ نفیسہ کے علم میں بھی تھیں۔ اس کے شادی نہ کرنے کے سبب والدین کی بڑی بدنامی ہو چکی تھی۔ لوگ منہ پر کہنے لگے تھے کہ اماں ابا اس لیے بیٹی کو نہیں بیاہتے کہ بھوکوں مر جائیں گے اور یہ کہ انہوں نے اپنی خاطر بیٹی کی جوانی برباد کر دی۔ لوگ باتیں تو بہت بناتے تھے لیکن کوئی نفیسہ کو قبول کرنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ یہ بات خود نفیسہ کے علم میں بھی تھی۔ کچھ اس بدنامی سے بچنے کے لیے اور کچھ فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر نفیسہ آخر رشید کو اپنا جیون ساتھی بنانے پر راضی ہو ہی گئی۔ رشید کیسا بھی تھا مگر اسے چاہتا تو تھا۔ مرد تو تھا اور مرد کے بغیر عورت ادھوری ہوتی ہے۔ تو یوں مجبوراً" نفیسہ نے رشید کو قبول کر لیا۔ یہ ہے ساری کتھا کہانی! اب آپ فرمائیں کہ بیچ اس مسئلے کے آپ کیا کہتے ہیں؟" یہ کہہ کر ہمزاد نے طویل سانس لیا اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"مجھے کچھ نہیں کہنا' تم جا سکتے ہو!" میں نے اس سے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب!" وہ حیران ہو کر بولا۔

"مجھے تو بلوا بلوا کر تھکا مارا اور اب آخر میں ٹکا سا جواب دے دیا کہ جا سکتے ہو!"

"میں کچھ دیر تنہا رہنا چاہتا ہوں' تم جاؤ۔" میری آواز تھکی تھکی اور بوجھل سی تھی۔

میں نے ہمزاد سے غلط نہیں کہا تھا۔ اس وقت میں واقعی تنہائی چاہتا تھا۔ ایسا عموماً" اس وقت ہوتا ہے جب آدمی کو کوئی دھچکا لگتا ہے۔

ہمزاد نے میرے چہرے سے یقیناً میری دلی کیفیت کا اندازہ لگایا تھا اس لیے مزید نہیں رکا اور چلا گیا۔

خواب اور سراب! آدمی لاکھ چاہے ان سے دامن نہیں بچا سکتا۔ یہی کیفیت میری تھی۔ دراصل محرومیاں' خوابوں اور سرابوں کو جنم دیتی ہیں اور میں بھی زندگی کے ایک سکھ سے محروم تھا۔ میں نے مکان تو بہت دیکھے اور برتے تھے' مگر گھر نہیں۔ نفیسہ کو دیکھ کر بھی میری آنکھوں میں گھر کا خواب جاگ اٹھا تھا' کیا کوئی شرمیلی سی ایسی ہی لڑکی میرا گھر نہیں بسا سکتی؟ یہ سوال اس وقت لمحے بھر کو میرے ذہن میں ابھر کر معدوم ہو گیا تھا اور میں جلوہ حسن میں کھو گیا تھا' مگر اب سب کچھ جان لینے کے بعد نفیسہ کی چاہت مجھے کسی کے حق پر ڈاکا ڈالنے کے مترادف محسوس ہو رہی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ نفیسہ کے والدین رشید کی جگہ مجھے قبول کر لیتے' اس پر مجھے ترجیح دیتے اور خود نفیسہ بھی ایسا ہی کرتی' لیکن یقیناً" یہ اس شخص کے ساتھ زیادتی ہوتی جو نفیسہ کا منگیتر تھا' یعنی رشید! ضروری تو نہیں کہ اس کا ظاہر جیسا تھا' باطن بھی ویسا ہی ہوتا۔

مختصراً یہ کہ نفیسہ بہرحال وہ لڑکی نہیں ہو سکتی تھی جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے اسی لیے اس کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور فیصلہ کیا کہ اب اس کی طرف نگاہ نہیں اٹھاؤں گا۔ یہاں میں یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے اس فیصلے کا سبب نوجوانی میں نفیسہ کا اغوا نہیں تھا۔ اس پر جو کچھ گزری تھا۔ اس سلسلے میں وہ میرے نزدیک قطعی بے قصور تھی' اسے اس ناکردہ گناہی پر جو سزا ملی تھی' وہ بھی ظلم تھا۔ مجھے تو صرف نفیسہ کے والدین اور رشید کی محبت کا خیال تھا۔ ان حالات میں میرے لیے مصالحت یا منافقت قطعی ناممکن تھی۔ نہ میں گھر داماد بن کر رہ سکتا تھا' نہ نفیسہ کے والدین کی شرائط پوری کر سکتا تھا اور نہ ہی اپنے ضمیر کو اس پر مطمئن کر سکتا تھا کہ اپنی قوت و سرمائے کے بل بوتے پر کسی کا دل توڑ دوں' کسی کی محبت چھین لوں' اپنا لوں' یہ خود غرضی میرے امکان میں نہیں تھی۔

اب صرف نفیسہ کا مسئلہ رہ جاتا تھا۔ اس نے وقتی طور پر حالات سے سمجھوتا تو کر لیا تھا مگر اس کا دل اس سمجھوتے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس پر ابتدا ہی سے ظلم ہوا تھا اور یہ بھی بہرحال ظلم ہی ہوتا کہ اسے رشید کی یک طرفہ محبت کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا جیسا کہ مجھے ہمزاد سے معلوم ہوا تھا' نفیسہ اور رشید کا کوئی جوڑ نہیں تھا' ہاں حالات نے انہیں ضرور

مجبور کر دیا تھا جو وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے تھے کہ انہیں جدا کرنا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ ایک ہو جائیں کہ جدا انہیں کیا! کسی نے جیسے میرے اندر سرگوشی کی اور غالباً" یہ میرا ضمیر ہی تھا۔

پھر خود میں بھی اپنے دل کو سمجھانے لگا کتنی شادیاں بے جوڑ ہو جاتی ہیں' کتنے دل دکھوں کی دھیمی دھیمی آنچ پر سلگتے رہتے ہیں! کس کا دل درد سے خالی ہے' کس کی روح اداس نہیں ہے! میں کس کس آنکھ میں جھانکوں گا' کس کس کی آس بندھاؤں گا!"

وہ سارا دن گویا انہی خیالوں میں بیت گیا۔ شام کو جب میں نچلی منزل پر تھا اور غسل خانے سے نہا کر نکل رہا تھا تو دروازے پر دستک سنائی دی۔

میں چونک اٹھا کیوں کہ وہاں میرا جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ پھر؟..... کون ہو سکتا ہے آنے والا؟ دستک پھر ہوئی۔

"اچھا!" میں نے بلند آواز میں کہا تاکہ دستک دینے والی شخصیت مطمئن ہو جائے۔ پھر میں صدر دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازہ کھولتے ہی میری آنکھوں میں جیسے چکا چوند سی ہو گئی اور دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ شعلہ حسن کو خود سے اتنے قریب دیکھ کر وقتی طور پر میں گنگ سا ہو گیا۔

"آداب!" اس کا نازک سا ہاتھ ماتھے تک اٹھا اور مترنم آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں لمحہ حیرت کے حصار سے نکل آیا۔

میں نے بھی جواباً آداب کہا! پھر بولا۔ "فرمایئے۔!"

"آپ کو میری امی نے بلایا ہے۔" اس نے کہا۔ نام ہی کی طرح اس کے لہجے میں بڑی نفاست تھی۔

"مجھے!" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"جی ہاں.... دراصل وہ خود آتیں مگر ان کے گھٹنوں میں درد رہنے لگا ہے اس لیے وہ زیادہ اترتی چڑھتی نہیں ہیں۔"

"آپ اندر تو آئیں۔ اس طرح دروازے پر کھڑے ہو کر بات کرنا..... معاف کیجئے گا' کچھ معیوب سا لگتا ہے۔" میں نے اس کی سرخ پھولوں دار ساڑھی اور پھر کانوں میں پڑے ہوئے خوب صورت جھالوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں دانستہ اس کے حسین چہرے پر نگاہ ڈالنے سے گریز کر رہا تھا۔

"جی ..... جی نہیں شکریہ! میں ..... میں اب چلتی ہوں۔" وہ مڑنے لگی۔

"ٹھہریے!" میں نے اسے روکا۔

"جی۔" وہ رک گئی۔

"آپ کم از کم وجہ تو بتاتی جائیں کہ آپ کی امی کیوں بلا رہی ہیں مجھے؟"

"وجہ بھی معلوم ہو جائے گی' آپ آئیں تو!" وہ خفیف سی مسکرائی۔

"خیال نہ کیجیے گا' میں بغیر سبب جانے کسی اجنبی گھر میں جانا پسند نہیں کرتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے...... لیکن وجہ بتانے کے لیے دراصل مجھے اندر آنے پر کوئی اعتراض نہیں ...... مگر...... مگر آپ ..... آپ اکیلے...... میرا مطلب ہے کہ گھر میں کوئی عورت ....." وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہوئے کچھ ہچکچا رہی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ! مگر آپ کوئی بچی تو نہیں ہیں اور نہ ہی میں بچہ ہوں۔ پھر یہ کہ آپ تو پڑھی لکھی سمجھ دار خاتون ہیں۔ دفتر میں بھی آپ مردوں کے ساتھ ہی کام کرتی ہیں اور یہ بات آپ کے والدین بھی جانتے ہیں!"

میری اس بات کا وہی ردِّعمل ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ وہ چونک اٹھی اور پھر اپنی دراز پلکیں اٹھا کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "آپ ..... کیا آپ کو..... آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ..... کہ میں کسی دفتر میں کام کرتی ہوں؟"

"مجھے تو آپ کے بارے میں اور بھی بہت کچھ معلوم ہے' اس ذکر کو چھوڑیں۔" میں نے کہا۔ "آپ تو یہ بتائیں کہ آپ کی امی کیوں بلا رہی ہیں مجھے؟"

"وہ...... وہ بات تو خیر عرض کر دوں گی' مگر آپ...... آپ اور..... اور کیا کیا جانتے ہیں میرے بارے میں؟" وہ پریشان سی نظر آنے لگی۔

یہ دیکھ کر میں نے اسے تسلی دی۔ "سنیں اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں اور نہ ہی یہ ایسی بات ہے کہ اس طرح دروازے پر کھڑے ہو کر کی جائے۔ بہر حال آپ کی مرضی کہ ......"

"ٹھہریے' میں ابھی امی سے کہہ آتی ہوں۔" وہ پھر پلٹنے لگی۔

"ٹھیک ہے آ جائیے' میں انتظار کر رہا ہوں' ادھر نشست گاہ میں!" میں نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "دروازہ آپ کو کھلا ہی ملے گا۔"

وہ مزید کچھ کہے بغیر تیزی سے گلی عبور کر کے سامنے والے دروازے میں داخل ہو گئی۔ اسی وقت میری نگاہ اوپر اٹھی۔ کھڑکی میں مجھے کسی کی جھلک نظر آئی وہ جو کوئی بھی تھا'

... متوجہ پا کر پیچھے ہٹ گیا۔ میرے اندازے کے مطابق یا تو وہ نفیسہ کا باپ تھا یا اس کی ماں! گھر میں ان دونوں کے سوا اور کون ہوتا! ان کی جوان بیٹی' ایک اجنبی اور تنہا مرد کے دروازے پر دستک دے رہی تھی اس لیے ان کا چوکنا رہنا قرین قیاس تھا۔

مجھے کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ نفیسہ کی واپسی میں کچھ دیر لگے گی۔ اس کے والدین آسانی سے اسے دوبارہ میرے گھر آنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ یہی سوچ کر میں نے اپنے بال سنوارے' پھر اوپر جا کر لباس تبدیل کیا اور نیچے نشست گاہ میں پہنچ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ ہمزاد نے اب تقریباً میری پوری شخصیت ہی بدل کر رکھ دی تھی۔ جو لباس اس نے فراہم کیا تھا۔ اس میں اب پینٹیں اور شرٹیں بھی تھیں۔ اس سے پہلے میں نے بھی یہ لباس نہیں پہنا تھا' لیکن اب مجھے یہ لباس برا نہیں لگتا تھا۔ اس وقت بھی میں نے پینٹ اور شرٹ ہی پہنی تھی۔ دراصل لباس کا مقصد ستر پوشی ہے' ستر پوشی خواہ کسی بھی لباس سے کی جائے۔ فرد صرف اس کا پاک ہونا ہے۔ میں نے اسی لیے اس لباس پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور اسے استعمال کرنے لگا تھا۔

نفیسہ کو واپسی میں واقعی دیر لگی۔ میں اس دوران میں یہ سوچتا رہا کہ آخر وہ لڑکی کس بہانے میرے قریب آنا چاہتی ہے؟ مگر کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا۔ یہ تو سیدھی سی بات تھی کہ اس کی ماں کا بلاوا بھی اسی سلسلے کی کوئی کڑی تھا۔

میں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ نشست گاہ میں اس کا انتظار کر رہا ہوں اس لیے وہ سیدھی وہیں چلی آئی' مگر دروازے پر آ کر رک گئی۔ وہ بڑی حیرت سے میری سجی سجائی نشست گاہ کو دیکھ رہی تھی۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور دیواروں پر خوب صورت اور مہنگے ریشمی کپڑے کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ بہترین صوفوں پر سے ایک پر میں بیٹھا تھا۔ اسے جھجکتے اور حیران ہوتے دیکھ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "تشریف لائیے!"

"ج...... جی!" وہ گڑبڑا کر بولی۔ "ذرا سینڈل اتار....." یہ کہہ کر وہ جھکنے لگی۔

"اس کی ضرورت نہیں' آ جائیے۔ میں بھی جوتے پہنے ہی بیٹھا ہوں۔"

اس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا اور یقیناً اس نے ایسی کوئی آراستہ نشست گاہ نہیں دیکھی ہو گی اور نہ اس میں گئی ہو گی اسی لیے وہ سینڈل باہر ہی اتارنے کو کہہ رہی تھی۔ بہر حال وہ دبیز قالین پر سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتی ہوئی قریب آ گئی۔ وہ بہت مرعوب و متاثر نظر آ رہی تھی۔

میں نے دانستہ سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تشریف

رکھیے!"

"شکریہ!" وہ اس طرف بڑھ گئی۔

میں اس کے مقابل والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ صوفے پر بیٹھنے کے بعد وہ کچھ دیر سہمی سہمی رہی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور دوسرا رنگ جاتا رہا۔

"جی اب فرمایئے نفیسہ خاتون!" میں نے دانستہ آغاز گفتگو کرتے ہوئے اسے اس کے نام سے مخاطب کیا۔

وہ کچھ اور سراسیمہ ہو گئی۔ بات بھی ایسی ہی تھی۔ ایک اجنبی مرد سے بغیر تعارف کے اپنا نام سن کر اسے حیران ہونا ہی چاہیے تھا۔ "آ..... آپ میرا..... میرا نام....."

"جی۔" میں مسکرایا۔ دراصل میں پہلی ہی ملاقات میں معاملہ ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خواب نہ جاگنے لگیں۔ "مجھے آپ ہی کا نام معلوم نہیں بلکہ آپ کے منگیتر کا نام بھی معلوم ہے۔ سچ بتایئے رشید نام ہے نہ اس کا؟"

کچھ دیر کو جیسے وہ سناٹے میں رہ گئی۔ مجھے یہی توقع بھی تھی۔

"پریشان نہ ہوں۔" میں نے اس کے اعصاب پر بوجھ محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا بلکہ میرے اپنے ذرائع ہیں۔ دراصل جہاں میں کچھ عرصے کے لیے سکونت اختیار کرتا ہوں' پاس پڑوس کے متعلق پہلے ہی معلومات حاصل کرا لیتا ہوں' کون لوگ ہیں اور کیسے ہیں! میرے خیال میں یہ کوئی بری بات نہیں۔ پاس پڑوس کی طرف سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔"

میری بات سن کر اس نے طویل سانس لیا۔ پھر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "آپ..... آپ بہت پراسرار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

"آپ کہتی ہیں تو یقین کرنا ہی پڑے گا۔ ویسے میں ایسا ہوں نہیں۔" میں بھی مسکرا دیا' پھر بولا۔ "ہاں تو اب بتایئے آپ کی امی مجھے کیوں بلا رہی ہیں؟"

"دراصل ابھی..... ابھی آپ نے کہا تا کہ پاس پڑوس کی طرف سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ یہی..... یہی بات تھی دراصل!" یہ کہہ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

"معاف کیجئے گا' میں سمجھا نہیں۔"

"امی کو معلوم ہوا تھا کہ آپ..... آپ اکیلے ہیں اور گھر میں کوئی عورت بھی نہیں۔" وہ رک رک کر کہنے لگی۔

"جی! تو پھر؟"

"وہ دیکھیے نا..... پاس پڑوس کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں نا!..... تو امی دراصل یہ چاہتی تھیں کہ..... کہ اگر آپ کو کھانے پینے کے لیے کوئی پریشانی ہو تو..... تو..... امی....."

"امی کا نام آپ بار بار لے رہی ہیں! یہ بتائیں کہ امی کو پڑوسی کے حقوق کا خیال آیا تھا پہلے' یا آپ؟" میں نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا۔

"جی..... جی ہاں امی..... امی ہی کو خیال آیا تھا۔ انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا تھا۔ وہ پہلے رک کر اور پھر اپنی صفائی میں تیزی سے بولنے لگی۔

"کیوں' کیا آپ کو پڑوسیوں کا خیال نہیں آتا؟"

"آتا ہے' کیوں نہیں آتا!"

"پھر امی غریب ہی پر کیوں سارا بوجھ ڈال رہی ہیں!"

"دراصل پہلے انہوں نے ہی کہا تھا۔ پھر میں نے بھی تائید کر دی۔" وہ نظریں چرانے لگی۔

"اور آپ کے والد صاحب؟"

"وہ..... ابا جی..... دراصل ذرا ان معاملوں سے الگ تھلگ ہی رہتے ہیں۔"

"الگ تھلگ تو نہیں رہتے۔" میں نے پھر ایک ایسی بات کہہ دی کہ وہ گھبرا گئی "رشید سے آپ کے رشتے کا معاملہ انہوں نے ہی طے کیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

اس نے مجھے خوف زدہ سی نظروں سے دیکھا۔ پھر قدرے بھاری آواز میں بولی۔ "آپ بار بار اس طرح رشید کا تذکرہ کر رہیں جیسے اسے جانتے ہو' کہیں اس نے ہی تو....."

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔ نہ جانتا ہوں اسے!" میں بولا۔

"پھر آخر آپ کو اتنی تفصیلات کا علم کیسے ہو سکتا ہے!"

"بی بی! میں نے آپ سے عرض کیا تا کہ میرے اپنے ذرائع ہیں اور میں کسی بھی صورت کسی کو ان ذرائع کے بارے میں نہیں بتاتا۔ یہ میرا اصول ہے۔ آپ بھی پوچھیں گی تو میرا جواب انکار ہی ہو گا۔ سمجھ گئی ہوں گی غالباً" اب آپ!"

وہ اپنی ساڑھی کے پلو کو بار بار اپنی انگلی پر لپیٹ رہی تھی' کھول رہی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ذہنی الجھن میں گرفتار ہو چکی ہے۔

"اپنے ذرائع سے آپ نے اور کیا کیا معلوم کیا ہے ہمارے بارے میں؟" اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔

"دیکھیں بی بی" آپ ہوں یا میں یا کوئی' حقائق سے چشم پوشی یا فرار ممکن نہیں۔" میں نے بالواسطہ اسے سمجھانا شروع کیا اور یہی میرا مقصد تھا۔ "زندگی اپنے بہاؤ میں دکھوں او سکھوں کی لہریں لیے آگے بڑھتی رہتی ہے۔ ہم آپ ان لہروں میں کسی بے بس تنکے کی طر بہتے رہتے ہیں۔ ہم میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کے بہاؤ کے خلاف ہاتھ پاؤں مار کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ بھی پڑھی لکھی خاتون ہیں' غالباً" میری بات کا ابلاغ آپ کو ہو چاہیے۔ تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جدوجہد اور کوشش کی بھی حدود مقرر ہیں' ان حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے اور ..... اور جس حد تک امکان میں ہو زندگی کے اس بہاؤ سے مصالحت کر لینا چاہیے۔

سمجھیں آپ!"

"جی!"

اس نے اپنی جھکی ہوئی نظریں اٹھائیں' پھر وہ بھی بالواسطہ گفتگو کرنے لگی۔ "آپ درست کہہ رہے ہیں' لیکن جدوجہد کا حاصل سوائے تھکن کے کچھ نہ ہو اور جب تقدیر "آدمی" کو کھلونا سمجھ کر کھیلنے لگے تو کیا..... کیا آدمی سچ مچ تقدیر کے ہاتھوں میں کھلونا بن جائے!"

"آپ نے تقدیر کے جبر کی بات چھیڑ دی۔" میں بولا۔ "بے شک اس سے مفر نہیں میں نے لفظ مصالحت استعمال کیا تھا اور آپ نے اسے کھلونا بن جانا کہا۔ یہ اپنے اپنے احساس کی بات ہے۔ بہر حال تقدیر کے ستم اپنی جگہ لیکن حوصلہ ہار جانا بغاوت کرنا اس کا تدارک نہیں ہے۔"

"پھر..... پھر کیا تدارک ہے اس کا؟" وہ نڈھال سی آواز میں بولی۔

"وہی جو میں نے عرض کیا' مصالحت!"

"اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو؟"

"ممکن کیا ہے اور ناممکن کیا' یہ آدمی کے اپنے رویے' ارادے اور عزم پر منحصر ہے میرے خیال میں خاتون' ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا' بس ذرا جی کو مارنے اور دل کو سمجھا لینے کی بات ہوتی ہے۔"

"آپ..... آپ شاید یہ کہہ سکتے ہیں اس لیے کہ..... کہ آپ کو میرے دکھوں کا ....." اس کی آواز بھرا گئی اور وہ اپنی بات پوری نہ کر سکی۔

گفتگو کا رخ اب بالواسطہ سے براہ راست کی طرف مڑ رہا تھا' اس لیے میں نے کچھ دیر کو دوسری بات چھیڑ دی تاکہ فضا بدل جائے۔ "دیکھئے' عجیب بات ہے کہ ابھی ہم دونوں کا

تعارف بھی نہیں ہوا اور ہم اس طرح گفتگو کر رہے ہیں جیسے برسوں کے شناسا ہوں۔ ہے نا خاتون!" میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"آپ..... آپ تو شاید بڑی..... بڑی حد تک میرے بارے میں جان چکے ہیں۔ ہاں میں..... میں آپ کے نام..... نام کے سوا کچھ..... کچھ نہیں جانتی۔" وہ نظر جھکائے رک رک کر کہنے لگی۔

"نام کس نے بتایا میرا؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

"جن کا یہ مکان ہے' وہ عزیز ہیں ہمارے۔ کل اسی سے کچھ بات کرنے آئے تھے' اب سنا تھا میں نے کہ انہوں نے اپنا مکان کسے کرائے پر دیا ہے!" اس نے جواب دیا۔

"اچھا تو یوں آپ کو میرا نام معلوم ہوا! آپ بھی مجھے بڑی پراسرار لگتی ہیں چپکے چپکے میرا نام بھی معلوم کر لیا!" یہ کہہ کر میں دانستہ ہنسنے لگا تاکہ فضا کی کشیدگی کچھ کم ہو۔ میری بات سن کر وہ بھی مسکرانے لگی۔

"جی نہیں' میں قطعی پراسرار نہیں ہوں آپ کی طرح کی بتاؤں ہی نہیں کس طرح نام معلوم ہوا تھا!" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"ایک بات بتائیں بالکل سچ سچ!" میں نے فضا کو ہموار دیکھ کر کہا۔

"پوچھیں" اس نے مجھے ترچھی نظروں سے دیکھا اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ وہ اتنی بھولی بھی نہیں ہے جتنا ظاہر کر رہی ہے۔ اس کو ان سارے حربوں کا علم تھا جن کے آگے عموماً" مرد ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

ابھی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک تیز مردانہ آواز سنائی دی "کوئی ہے؟"

میں نے دیکھا کہ نفیسہ کا چہرہ ایک دم تاریک سا ہو گیا اور اس کے لبوں کو جنبش ہوئی۔ اس نے یقیناً" کچھ کہا تھا مگر آواز اتنی مدھم تھی کہ میں سن نہ سکا۔ اس سے میں نے یہ اندازہ تو لگا ہی لیا کہ آنے والا نفیسہ کے لیے اجنبی نہیں ہے اور یہ کہ اسے آنے والے کی مداخلت ناگوار ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ وہ کچھ گھبرا گئی ہے۔ میں اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتا ہوا اٹھا اور پھر بلند آواز میں بولا۔ "ادھر تشریف لے آئیں۔"

صدر دروازہ کھلا ہوا تھا اور نشست گاہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس لیے چند ہی لمحے بعد وہ نووارد اس طرف آ گیا یقیناً" میری آواز نے اس کی رہنمائی کی تھی۔ اسے نشست گاہ کے دروازے سے اندر آتے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ آنے والا نفیسہ کا منگیتر رشید کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمزاد نے مجھے اس کا جو حلیہ بتایا تھا' وہ اس پر بالکل پورا اترتا تھا۔ پھر اس

سے پہلے کہ میں اسے مخاطب کرتا' وہ نفیسہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تمہیں امی بلا رہی ہیں۔"

"جاؤ کہہ دو ابھی آ رہی ہوں۔" نفیسہ نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ شاید اسے رنگ میں بھنگ پسند نہیں آیا تھا۔

"بہت دیر ہو گئی ہے تمہیں یہاں اور......"

"نفیسہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "بچی نہیں ہوں میں! معلوم ہے مجھے بھی! تم جاؤ۔"

"برادر عزیز! آپ بیٹھیں تو سہی!" میں نے پہلی بار اس "کارٹون" کو مخاطب کیا جو غالباً" خود کو "ہیرو آف دی پچویشن" سمجھ رہا تھا۔

"جی نہیں' شکریہ!" وہ منہ بنا کر بولا۔

"آپ شاید یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں آپ کی محبت پر ڈاکا ڈال رہا ہوں! تو ایسی بات نہیں۔ اگر آپ کو ایسی کوئی غلط فہمی ہے تو اپنے دل سے نکال دیں۔" یہ کہتے ہوئے میں صوفے پر دوبارہ بیٹھ گیا۔

اس کا منہ ایک بار حیرت سے کھلا اور پھر بند ہو گیا۔

"ان پر شک نہ کیجئے گا۔" میں نے نفیسہ کی طرف اشارہ کیا۔ "انہوں نے مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا۔"

تاریک شیشوں کا بدنما سا چشمہ اس وقت بھی اس کی آنکھوں پر لگا ہوا تھا۔ پینٹ پہننے کا شوق تھا مگر اسے اپنی پھولی ہوئی توند نظر نہیں آتی تھی۔ اگر وہ ڈھیلا ڈھالا لباس پہنتا تو اس قدر "کارٹون" تو نظر نہ آتا۔ خوب صورت عورتوں کے مردوں یا منگیتروں کی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔ عموماً" وہ احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں۔ رشید کا معاملہ بھی ایسا ہی لگتا تھا۔ چند لمحے حیران پریشان رہ کر اس نے میری بجائے نفیسہ کو مخاطب کیا۔ "چل رہی ہو یا جاؤں؟"

"جاؤ!" نفیسہ نے گویا دو ٹوک جواب دے دیا۔

"ٹھیک ہے' میں امی سے کہہ دیتا ہوں کہ تم نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔" اس کا لہجہ بالکل بچوں کا سا تھا۔

"اور یہ بھی کہہ دینا کہ میں نے تمہاری تلی بھی چھین لی ہے!" میں کوشش کے باوجود فقرہ کہنے سے باز نہ رہ سکا۔ نفیسہ میری برجستگی پر مسکرا دی۔

"کیا؟" اس کے بے سُری آواز نسبتاً" بلند ہو گئی۔ یقیناً" نفیسہ کو مسکراتے دیکھ

کر اس کے مزید پتنگے لگ گئے ہوں گے۔ "آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں!" اس کا انداز جواب طلبی کا سا تھا۔"

"اڑانے کے لیے اور بہت سی چیزیں ہیں برخوردار مثلاً" پتنگ!" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم فکر نہ کرو تمہاری پتنگ نہیں کٹے گی۔"

"مجھے برخوردار کہہ رہے ہو!...... میں برخوردار نظر آ رہا ہوں تمہیں!

"ہاں ہو تو برخوردار ہی! توند پھلا لینے سے آدمی بالغ نہیں ہو جاتا۔

"ٹھیک ہے' دیکھ لوں گا تمہیں بھی! میرا بھی نام رشید ہے!" یہ کہہ وہ ہو مڑنے لگا۔

"کیوں' کیا ابھی دیکھا نہیں!"

"سب معلوم ہو جائے گا تمہیں! تم شاید اپنے پیسے پر اینٹھ رہے ہو گے! تو پیسا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔" یہ کہتا ہوا وہ تیر کی طرح نشست گاہ سے نکل گیا۔

"آپ کا منگیتر ماشاء اللہ خاصا نامعقول ہے!" میں نے یہ جملہ اس طرح ادا کیا جیسے تعریف مقصود ہو۔ ظاہر ہے کہ میری مخاطب نفیسہ ہی تھی۔

میں نے نفیسہ کے ہونٹوں پر تبسم دیکھا' مگر وہ بولی کچھ نہیں

"ایسا کریں خاتون کہ اب آپ بھی جائیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ کے گھر میں کوئی بدمزگی پیدا ہو۔ معلوم نہیں وہ آپ کا منگیتر جا کر کیا لگائی بجھائی کرے۔ پھر بھی آ جایئے گا۔ میں عموماً" گھر ہی پر ہوتا ہوں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ!" اس نے میری تائید میں کہا۔ "کل چھٹی ہے میری' کل آؤں گی کسی وقت!"

"مگر اپنے اماں' ابا کو میری طرف سے مطمئن کر کے کہ میں کوئی آوارہ یا بدقماش آدمی نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "باقی باتیں کل کریں گے۔"

وہ اپنی ساڑھی سنبھالتی ہوئی اٹھی اور جاتے جاتے ایک بار پھر مجھے اپنے حسن کا احساس دلا گئی۔ اس نے اپنی ساڑھی کا پلو ایک مخصوص انداز میں کاندھے پر ڈالا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہیں "ٹیں" ہو جاتا مگر اب میں خاصا "واٹر پروف" ہو چکا تھا۔

نفیسہ چلی گئی تو میں صدر دروازہ بند کر کے اوپری منزل پر آ گیا۔ کہیں آنا جانا تو تھا نہیں اس لیے میں نے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیے۔ یوں بھی پینٹ پہن کر نماز پڑھتے ہوئے مجھے ذرا قباحت محسوس ہوتی تھی اور اب مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔ عصر کی نماز میں سو کر اٹھنے کے بعد ہی پڑھ چکا تھا۔ جب سے میں نے نماز شروع کی تھی اللہ کے فضل سے کوئی قضا نہیں

ہوئی تھی' ہاں یہ ضرور تھا کہ باجماعت نہیں پڑھ پاتا تھا حالانکہ اس کا ثواب زیادہ ہے۔

"مغرب کی نماز پڑھ کر چائے پینے کو جی چاہا تو میں نے ہمزاد کو طلب کر لیا۔ اس نے چند ہی لمحوں میں میری خواہش کی تکمیل کر دی۔ چائے کے ساتھ ہی وہ پھل وغیرہ بھی لے آیا تھا۔

"تم شاید رات کا کھانا لانے سے جان چھڑانا چاہتے ہو!" میں نے پھلوں کی ٹرے اپنی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے؟"

"ایسے کہ ڈھیر سارے پھل لا کر رکھ دیے! بندے کا پیٹ بھر جائے گا تو پھر رات کو تنگ نہیں کرے گا۔"

جواباً" وہ ہنسنے لگا' پھر بولا۔ "ٹل گئیں آخر وہ؟"

"کون؟" میں نے دانستہ انجان بنتے ہوئے کہا۔

"وہی جو صوفے سے چپک گئی تھیں اور کسی طرح جانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں' یعنی نفیسہ خاتون!"

"اچھا تو بدبخت' تم میری ٹوہ میں رہتے ہو!"

"تو کیا غافل رہوں آپ کی طرف سے! کیا اس رقیب روسیاہ شمبھو کو آپ بھول گئے۔ اس خبیث سے کیا بعید ہے' کب سنک جائے!"

"ہاں یہ تو ہے!" میں نے سر ہلایا' پھر کہا۔ "تو اس بہانے جناب میری نظروں سے چھپ کر آس پاس منڈلا رہے تھے!"

"ظاہر تو اس وقت ہوتا جب آپ طلب کرتے!" اس نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔

"ہاں وہ دھمکی سی تھی تم نے اس کھدّر کی؟ میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"نفیسہ کے منگیتر کی بات کر رہے ہیں؟"

"ہاں۔"

"چڑ تا تی ہے چھوڑیں۔"

"تو میں کب اسے پکڑے بیٹھا ہوں!" میں تو بتا رہا تھا تمہیں کہ کیسے کیسے پڑے ہیں اس دنیا میں!"

"اس پر لعنت پڑھیں اور بتائیں کہ کچھ سوچا؟" ہمزاد بولا۔

"کس سلسلے میں؟"

"اچھا تو اب سلسلہ بھی بتانا پڑے گا!"

"کیوں' کیا الہام ہوتا ہے مجھے؟"

"شمبھو کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔" ہمزاد نے کہا۔

"ابھی قطعی طور پر تو کوئی بات نہیں آئی ذہن میں!..... پھر بھی فی الحال ان خطوط پر آگے بڑھا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے اس طرح کامیابی کی کوئی صورت نظر آ جائے یا امکانی جدوجہد کی جا سکے۔ تم آج کم از کم ایک بات کا اندازہ لگا ہی سکتے ہو' لیکن....." میں کچھ کہتے کہتے رک گیا کیوں کہ میری ذہن میں فوراً" ہی ایک خطرہ سر ابھارنے لگا تھا۔

"چپ کیوں ہو گئے آپ؟" ہمزاد بول اٹھا۔ اب وہ مجھے سنجیدہ دیکھ کر خود بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"دراصل یہ سوچ رہا تھا کہ میں اس طرح بھی خبیث چوکنا ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر کس طرح؟ کچھ بتائیں تو سہی کہ آپ نے کیا سوچا ہے؟" ہمزاد نے پوچھا۔

"میں چاہتا تھا کہ تم اس مکان کے گرد نا قابل شکست حصار کھینچ کر دیکھو جہاں شمبھو کی سکونت ہے۔ پھر تم یہ جائزہ لو کہ شمبھو اپنی پُراسرار قوتوں سے کام لے کر اس حصار کو توڑنے کی قدرت رکھتا ہے یا نہیں!" میں نے آج دوپہر ظہر کی نماز پڑھنے اور سونے سے پہلے جو کچھ سوچا تھا' ہمزاد کو بتانے لگا۔ "مگر اب یہ خیال ذہن میں آ رہا ہے کہ کہیں ایسا کرنے سے وہ چوکنا نہ ہو جائے! تم بتاؤ' تمہارا کیا خیال ہے اس سلسلے میں؟"

"یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔" ہمزاد کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ "علم اور لاعلمی کا انحصار اس کی قوتوں پر ہے اور اس بات پر بھی کہ آیا وہ آپ کی طرف سے ہوشیار ہے یا نہیں' گویا دونوں ہی احتمالات ہیں' یعنی وہ حصار کھینچے جانے سے آگاہ بھی ہو سکتا ہے اور بے خبر بھی رہ سکتا ہے۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" میں نے سوال کیا۔

"جو بھی قدم اٹھایا جائے گا' اس میں خطرہ تو بہر حال مول لینا ہی پڑے گا۔ ویسے میرے خیال میں یہ تجویز مناسب تھی۔" ہمزاد نے اپنی رائے دی۔ "اس طرح کی قوتوں کا اندازہ بھی ہو جائے گا۔ پھر ہمیں اس سے نمٹنے میں آسانی رہے گی۔"

"اس کے چوکنا ہونے کی صورت میں بس یہ خطرہ ہے کہ وہ دوبارہ سریتا کو لے کر فرار ہو جائے۔ نتیجتہ" ہمیں پھر اس کے تعاقب میں کسی اور شہر کی رخ کرنا پڑے گا۔" میں

بولا۔

"اور اس کے علاوہ یہ کہ وہ جوابی حملہ بھی کر سکتا ہے!" ہمزاد نے کہا۔

"خیر وہ تو جو بھی ہو گا بھگتنا پڑے گا۔ فی الحال تو اس بات پر غور کرنا ہے کہ یہ قدم اٹھایا بھی جائے یا نہیں! وجہ سوچنے کی یہ کہ ممکن ہے' کوئی اور بہتر صورت نکل آئے۔ آدمی جتنا سوچتا ہے' اتنے ہی بہتر امکانات سامنے آتے جاتے ہیں۔ تمہارا مشورہ اس تجویز کے حق میں ہے اس لیے آج شب اس عمل کر کے دیکھ لو۔ یہ خیال اس لیے میرے ذہن میں آیا کہ اس طرح کم از کم اس کے فرار کی راہ تو مسدود ہو ہی جائے گی۔ پھر وہ گھر گیا تو شاید آسانی سے قبضے میں آ جائے۔"

میرے اس خیال سے بھی ہمزاد نے مکمل اتفاق کیا اور بولا۔ "اگر وہ اس قدر طاقت ور ہوتا کہ جوابی حملہ کر کے مجھے زیر کر لے تو وہ نرائن گنج سے فرار نہ ہوتا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسے کسی نہ کسی حد تک میری طرف سے خطرے کا احساس ہے۔ راہ فرار اسی وقت اختیار کی جاتی ہے جب مقابلے کی طاقت نہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر اس کے فرار کی راہ مسدود کر دی گئی تو کامیابی کا امکان ہے۔ آپ نے ٹھیک ہی سوچا ہے۔"

"تو پھر آج رات تم اس تجویز پر عمل کر کے دیکھ لو۔ مگر فی الحال فوری طور پر اس سے بھڑنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے تاکید کی۔ "تم کوئی ایسی ترکیب کرنا کہ حصار کھینچ کر وہاں سے دور ہٹ جاؤ اور دور رہ کر یہ جائزہ لو کہ وہ اس حصار سے باہر نکلنے کا اہل ہے یا نہیں۔ تم وہاں سے دور ہو گے تو شاید اس کا دھیان تمہاری طرف نہیں جائے گا۔ اگر وہ محصور ہو جائے اور حصار سے نکل نہ سکے تو پھر تم حصار اٹھا کر میرے پاس چلے آنا۔"

"لیکن اس تجربے کے لیے رات سے زیادہ دن کا وقت موزوں ہے۔" ہمزاد نے اپنے خیال کا اظہار کیا' پھر وضاحت کرنے لگا۔ "دن کے وقت تو وہ کسی ضرورت سے باہر بھی سکتا ہے' مگر رات کو یہ امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔"

"اس پر میں نے غور نہیں کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ تم اسے گھر سے باہر نکالنے کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر ہی لو گے۔" میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔

"یہ تو خیر ممکن تھا' لیکن بات وہی ہے کہ وہ اس طرح ہوشیار ہو جائے گا۔ اسے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا جائے یا وہ خود نکلے' ان دونوں باتوں میں فرق ہے۔"

"اگر ایسا ہی ہے تو پھر دن سہی!" میں نے ہمزاد کی بات مان لی۔ "تم کل دن کے وقت یہ تجربہ کو لو۔ دن بھر اور کسی وقت تو گھر سے نکلے گا ہی وہ!"

"ٹھیک ہے' آپ مجھے وہاں دہاڑی سے لگا کر مسمات نفیسہ بیگم کا دکھ بانٹنے کی کوشش کیجیے گا۔" ہمزاد پھر شرارت پر اتر آیا۔ "وہ خاتون' یعنی کہ مسمات واقعی ہمدردی کی مستحق ہیں۔"

"کیا اب میں تمہیں یہ حکم دوں کہ دال نے عین ہو جاؤ یا تم خود ہی..." میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اگر آپ حکم دیں گے تو مجبوری ہے ورنہ...."

"ورنہ کیا کرو گے؟" میں نے آنکھیں نکالیں۔

"یہی کہ دال نے عین ہو جاؤں گا۔" وہ روتی صورت بنا کر بولا۔

"عمل جان عزیز' عمل! صرف بتولے بنانے سے کچھ نہیں ہوتا!"

"یعنی کہ میں واقعی چلا جاؤں؟ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا

"ہاں واقعی!"

"تو پھر میں گیا!" ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ غائب ہو گیا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح ہمزاد مجھے ناشتا کرا کے گیا ہی تھا کہ نیچے صدر دروازے پر دستک ہونے لگی۔ مجھے اس قدر جلد نفیسہ کے آنے کی توقع نہیں تھی کیوں کہ ابھی صبح کے پونے سات ہی بجے تھے۔ پھر بھی میں نے یہی سوچا کہ ممکن ہے' وہ بھی میری طرح صبح جلدی اٹھتی ہو اور مجھ سے ملنے کی بے تابی اسے کھینچ لائی ہو۔ کمرے سے نکلتے نکلتے جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ برابر والے کمرے کی کھڑکی سے نیچے جھانک کر دیکھ لوں۔ دستک پھر ہوئی۔ میں تیزی سے برابر والے کمرے میں داخل ہوا اور آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی۔ جلد بازی کے سبب میں یہ خیال نہ رکھ سکا کہ کھڑکی کھولنے کی آواز نہ ہو۔ بہر حال میں نے نیچے جھانک کر دیکھا تو دو اجنبی افراد کو صدر دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ دونوں اوپر ہی دیکھ رہے تھے۔ غالباً" انہیں کھڑکی کھلنے کی آواز نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ وہ دونوں ہی خاصے بنے ٹھنے نظر آتے تھے اور چہروں سے بھلے آدمی معلوم نہیں ہوتے تھے۔ معاً" میرے ذہن میں نفیسہ کے منگیتر رشید کی دھمکی گونجی اور میں نے سوچا' کہیں یہ لوگ اسی کے بھیجے ہوئے تو نہیں؟ مگر اس سے زیادہ میں کچھ نہ سوچ سکا کیوں کہ ان میں سے ایک نے مجھے مخاطب کر لیا تھا۔

"ذرا نیچے آئیے' آپ سے ایک ضروری کام ہے۔"

"آتا ہوں ابھی!" میں یہ کہہ کر کھڑکی سے ہٹ گیا۔

دوسرے ہی لمحے میں' ہمزاد کو طلب کر چکا تھا۔

"دیکھو جا کر کون ذات شریف ہیں!" میں نے اسے حکم دیا۔ "صورت سے تو غنڈے ہی لگتے ہیں۔"

ہمزاد نے فوراً ہی اپنے وجود کی تجسیم کر لی۔ اب کمرے میں گویا دو شیخ کرامت نظر آ رہے تھے۔ مجھے اس موقع پر ایک شرارت سوجھی۔

"ٹھہرو!" میں نے ہمزاد کو روک لیا۔ "اگر یہ غنڈے ہی ہیں جیسا کہ میرا قیاس ہے اور انہیں رشید ہی نے میری "اوور ہالنگ" کے لیے بھیجا ہے تو ان کے لیے سزا ضروری ہے تاکہ آئندہ کسی شریف آدمی کو تنگ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ نیچے چلتے ہیں۔"

معلوم نہیں ہمزاد میری شرارت کو سمجھا یا نہیں لیکن وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ نیچے پہنچ کر میرے اشارے پر دروزہ ہمزاد ہی نے کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ دونوں تیزی کے ساتھ بغیر کچھ دیکھے اندر گھس آئے۔

"دروازہ بند کر دو پارٹنر!" میں نے ہمزاد کو حکم دیا۔ "شکار خود ہی جال میں پھنس گیا ہے۔"

وہ دونوں مجھ پر نظر پڑتے ہی ایک دم ٹھٹک گئے اور فوراً ہی مڑ کر ہمزاد کی طرف دیکھا جو دروازہ بند کر کے وہیں کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔ اچانک ان دونوں کو جانے کیا سوجھی کہ اپنی اپنی پینٹوں کی جیب سے کھٹکے دار چاقو نکال کر کھول لیے، پھر ان میں سے ایک غرایا۔ "ہمیں شکار کہہ رہے تھے تم! ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کون شکار ہے، کون شکاری!"

اب اس میں شک کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ غنڈے ہیں اور انہیں بھیجنے والا رشید ہی ہو سکتا ہے۔ رشید کے سوا یہ حماقت کسی اور سے متوقع نہیں تھی۔ وہی گذشتہ روز مجھے دھمکی دے کر گیا تھا، مگر اتنی جلدی رقابت کی آگ اسے یہ احمقانہ قدم اٹھانے پر مجبور کر دے گی، اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ اس نتیجے تک پہنچنے میں مجھے صرف چند لمحے لگے۔

"کتنے پیسے دیے ہیں رشید نے تمہیں اس کار خیر کے لیے؟" میں نے "کار خیر" پر زور دیتے ہوئے کہا۔ مگر میرا طنز شاید اس جاہل کے سر سے گزر گیا۔

"ہم کسی رشید وشید کو نہیں جانتے!" ان میں سے ایک چاقو لہراتے ہوئے بولا۔

"اچھا تو تم اپنے کاروبار میں رازداری برتنے کے بھی قائل ہو۔" میں نے پرسکون آواز میں کہا حالانکہ ان میں سے ایک کھلا ہوا چاقو ہاتھ میں تھامے مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہمزاد میرے اشارے پر ابھی تک دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا کیوں کہ بات میں ہی کر رہا تھا

اس لیے وہ دونوں میری ہی طرف متوجہ تھے۔

"زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں لونڈے!" میرے قریب والے نے منہ بگاڑ کر کہا۔ ہرچند کہ وہ چالیس سے اوپر لگتا تھا، پھر بھی اسے مجھ ایسے "جوان جہان" کو "لونڈے" کہنے کا حق نہیں تھا۔

"یار کیوں ڈرا رہے ہو!" میں اسے "رگڑنے" کے لیے بولا۔ "میں تو تمہاری تعریف کر رہا تھا کہ تم بہت بااصول آدمی ہو۔ دراصل مجھے تو بس پیسوں کے بارے میں پوچھنا تھا، رشید کا نام تو یونہی زبان پر آ گیا۔ میں نے سوچا جتنے پیسے اس نے دے کر تمہیں یہاں میری مار کٹائی کے لیے بھیجا ہے، اس سے دگنے پیسے دے کر اس کی گھڑنت کرا دوں۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

"ابھی تو تم ہمیں شکار کہہ رہے تھے! اب موت کو سامنے دیکھ کر ہوا نکل گئی!" وہ برف خانے کے چمار کی طرح اینٹھ گیا۔ "پہلے میں نے سوچا تھا کہ دو چار ہاتھ جڑ کر اور بس چند گھونسے اور لاتیں مار کر روزی حلال کر لوں گا، مگر اب..... اب ایسا نہیں ہو سکتا! تم نے توہین کی ہے میری! میں تمہاری آنتیں باہر کیے بغیر نہیں چھوڑوں گا تمہیں!"

"کچھ لے دے کر کام نہیں چل سکتا؟" میں نے عاجزی سے کہا۔

"ہرگز نہیں!" اس نے بلند آواز میں انکار کر کے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ "تو اسے سنبھال جو ادھر دروازے کے پاس چھپا بنا کھڑا ہے، اسے میں ابھی زمین چٹواتا ہوں!" وہ اپنی گرم خانی میں شاید اس بات کو نظر انداز کر بیٹھا تھا کہ وہاں ایک ہی شکل، حلیے اور قد و قامت کے دو افراد موجود ہیں۔ اس نے اس بات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ وہ تو بس یہ سن کر بھڑک گیا تھا کہ اسے شکار کہا گیا ہے۔

"ٹھیک ہے پیارے بھائی، تم میری آنتیں ضرور باہر کر دینا، مگر اصل آدمی میں نہیں ہوں جس کی ٹھکائی کے لیے تمہیں بھیجا گیا ہے۔"

"کیا مطلب ہے اس سے تمہارا؟" وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ "کچھ بھی کہو، چھوڑوں گا نہیں میں!"

"مجھ غریب کو ناحق کیوں پکڑنا چاہتے ہو! میں تو دوست ہوں شیخ کرامت صاحب کا!" میں گڑگڑانے لگا۔ "شیخ صاحب تو وہ دروازے کے پاس کھڑے ہیں۔"

"مگر بیٹا جی، شکار تو ہمیں تم ہی نے کہا تھا! پھر رشید کا نام بھی تمہاری زبان ہی سے نکلا۔ بلخ کے بچوں کو تیرنا سکھا رہے ہو!"

"کمال ہو گیا پیارے بھائی! میں تو تمہیں آدمی کا بچہ سمجھ رہا تھا اور تم بلخ کی اولاد نکلے!"

"کیا کہا؟" وہ گلا پھاڑ کر چیخا۔ "ابھی بتاتا ہوں۔" اسی کے ساتھ وہ چاقو لہراتا ہوا مجھ پر جھپٹا۔

دوسرے ہی لمحے ہمزاد حرکت میں آ چکا تھا۔ اس نے مجھ پر چاقو سے وار کرنے والے سے چاقو چھین کر اسے ایک طرف دھکیل دیا' پھر دوسرے پٹھے خان کے ہاتھ میں بھی چاقو نہ رہنے دیا۔

"اب تم دونوں ایک دوسرے کی خاطر مدارت کرو گے! چلو جلدی!" ہمزاد نے انہیں حکم دیا۔

وہ دونوں مشینی انداز میں ایک دوسرے کی طرف لپکے' میں سمجھ چکا تھا کہ ان دونوں کے ذہن اب ہمزاد کے قابو میں ہیں اور یہ بھی کہ وہ ہمزاد کا ہر حکم ماننے پر مجبور ہیں۔

میں نے انہیں ایک دوسرے پر گھونسے برساتے دیکھا۔ وہ بڑے پرجوش انداز میں بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہو رہے تھے۔

"تم اسی طرح لڑتے ہوئے اس گھر سے نکل جاؤ! تم اس وقت تک لڑتے رہو گے جب تک کہ کوئی ایک گر نہ جائے!" ہمزاد نے دوسرا حکم دیا اور اسی کے ساتھ گھر کا دروازہ کھول دیا۔

چند ہی لمحے بعد وہ دونوں غنڈے لڑتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئے۔ ان کے لیے یہ سزا بہرحال کم نہیں تھی میرے اشارے پر ہمزاد نے دروازہ بند کر دیا اور پھر دوسرا اشارہ پا کر فوراً" غائب ہو گیا۔ دراصل مجھے اور اسے دونوں ہی کو شبھو کی فکر تھی۔ اگر ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آتا تو میں اسے طلب کرنے سے گریز کرتا۔

باہر گلی میں شور ہو رہا تھا۔ غالباً" ان دونوں کو لڑتے ہوئے دیکھ کر لوگ جمع ہو گئے تھے۔ شور کی آوازیں میرے گھر میں بھی آ رہی تھیں۔ میں ان آوازوں کو نظر انداز کرتا ہوا اوپری منزل پر آ گیا۔ اوپر آ کر مجھے خیال آیا کہ شاید نفیسہ بھی اپنی کھڑکی میں کھڑی ہوئی یہ سنسنی خیز منظر دیکھ رہی ہو گی۔ یہ سوچ کر میں نے اس کمرے کا رخ کیا جس کی کھڑکی سے یہ گلی کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔

کھڑکی کے قریب پہنچتے ہی میری پہلی نظر رشید پر پڑی جو سامنے ہی نفیسہ کے گھر کی کھڑکی کھولے نیچے دیکھ رہا تھا۔ میں اسے دیکھ کر چونک اٹھا اور سوچا' تو یہ "ذات شریف" یقیناً" اسی لیے صبح ہی صبح یہاں براجمان ہیں کہ میری رسوائی کا تماشا دیکھ سکیں۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ رشید کے برابر نفیسہ کھڑی تھی اور وہ بھی حیرت زدہ چہرہ لیے ہوئے

گلی کا منظر دیکھنے میں محو تھی۔ وہ شاید ابھی کچھ دیر پہلے نہا کر آئی تھی اس لیے کہ سیاہ ریشمی زلفیں اس کے شانوں پر بکھری ہوئی تھیں اور چہرہ کسی ایسے گلاب کی طرح معلوم ہو رہا تھا جیسے شبنم نے دھویا ہو۔ مجھے گلی کے منظر سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اس لیے ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ میں دانستہ کھڑکی کے قریب نہیں گیا کہ انہیں وہاں میری موجودگی کا احساس نہ ہو' مگر اس کے باوجود نا جانے کس طرح نفیسہ نے میری چلبلی نگاہ کو محسوس کر لیا۔ اس کی نگاہ اٹھی اور پھر اٹھی ہی رہ گئی۔ میں نے سر کے خفیف اشارے سے اسے سلام کیا۔ جواباً اس کا سر بھی تھوڑا سا جھکا اور پھر دایاں ہاتھ آہستہ سے ماتھے کی طرف اٹھایا تو نفیسہ کا اٹھا ہوا ہاتھ رشید کے شانے سے چھو گیا یا پھر اس نے کسی طرح یہ محسوس کر لیا کہ نفیسہ اب گلی کے منظر کی طرف متوجہ نہیں' بہرحال وہ بھی ایک دم چونک کر سامنے دیکھنے لگا

میں نے رشید کو تپانے کے لیے دانستہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجالی۔ رشید کا چہرہ یوں ہی دھواں دھواں ہو رہا تھا' میری اس حرکت سے وہ کچھ اور بھی سٹپٹا گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ مڑ کر تیزی کے ساتھ کھڑکی سے ہٹ گیا۔ اسی وقت گلی میں "پولیس پولیس" کا شور سنائی دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ دو تین پولیس والے گلی کی بائیں جانب سے بھاگے چلے آ رہے تھے۔ پھر میری نگاہ ان غنڈوں پر پڑی جن کے چہرے لہولہان ہو رہے تھے۔ ان میں ایک جھومتا ہوا گر رہا تھا اور دوسرا اچھل کر اس کے چہرے پر لات مار رہا تھا۔ گویا پولیس والے ادھر نہ بھی آتے تو اب "دی اینڈ" ہونے والا تھا۔ تو کسی نے پولیس کو مطلع کر دیا تھا یا پھر خود کسی طرح اسے ہنگامے کی خبر لگ گئی تھی۔

جس غنڈے نے مار مار کر اپنے ساتھی کو زمین پر گرا دیا تھا' خود اس کی حالت بھی قابل رحم تھی۔ غالباً" اسی لیے پولیس والوں کو آتا دیکھ کر بھی اس نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اس میں اتنی جان ہی نہیں رہ گئی تھی۔ نتیجتہ" ان دونوں کو نیم بے ہوشی کی سی حالت میں پولیس والوں نے "پھڑ" لیا' پھر گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ انہوں نے کسی گواہی یا تفتیش کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی' اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ' ان دونوں کی "نیک نامی" سے واقف رہے ہوں گے۔

غنڈوں اور پولیس والوں کے جاتے ہی لوگ کونے کھدروں سے نکل آئے اور واقعے پر "رننگ کمنٹری" نشر کرنے لگے۔ اس دوران میں نفیسہ کو کسی نے آواز دی اور وہ چونک کر کھڑکی سے ہٹ گئی۔ آواز نسوانی تھی' اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ نفیسہ کی ماں ہو گی۔ نیچے گلی میں لوگوں کی "کمنٹری" سے میں نے گویا ان دونوں غنڈوں کا "شجرہ

نسب" جان لیا محمد پور پر گویا انہی دونوں کا راج تھا اور یہ کہ وہ دونوں جگری یار مشہور تھے اور شاید اسی لیے بڑی بے جگری سے لڑتے تھے۔ شریف لوگ ان سے تنگ اور ذلیل خوش رہتے تھے۔ آج ان دونوں کے جھگڑے نے ایک طرف تو لوگوں کی حیرت میں مبتلا کر دیا تھا' دوسری طرف وہ خوش بھی تھے کہ چلو اب آپس میں کھٹک گئی ہے' اس طرح ان سے جان چھوٹ جائے گی۔

میں کھڑکی سے ہٹ آیا اور پھر اپنی خواب گاہ میں آ کر بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ رشید غریب نے یقیناً" مفت ان کی خدمات حاصل نہیں کی ہوں گی۔ ان غنڈوں نے اسے خاصا" چھیلا" ہو گا جبھی یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا ہو گا۔ ممکن ہے وہ دونوں رشید کی پوری تنخواہ "نیل" گئے ہوں' یہ سوچ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ غصہ تو مجھے نابنجار رشید پر بھی آ رہا تھا لیکن اس کے اظہار کی خاطر میں نے وہ وقت مناسب نہ سمجھا۔ اصل قصوروار وہ غنڈے نہیں رشید تھا کیوں کہ ان کا تو دھندا ہی یہی تھا۔ رشید خود اپنی آنکھوں سے مجھے صحیح سلامت دیکھ چکا تھا' اس سے وہ اور بھی جل بھن رہا ہو گا کہ دھوتی کی ناک میں لنگوٹی بھی چلی گئی تھی' یعنی ایک طرف تو میری "مرمت" نہیں ہو سکی تھی' دوسری جانب اس کی جیب بھی ہلکی ہو گئی تھی۔

کوئی نصف گھنٹہ اور گزرا ہو گا کہ وہ غارت گر ہوش آ ہی گیا جس کے آنے کی توقع تھی۔ میں نے گذشتہ روز کی طرح اسے نشست گاہ میں بٹھانا چاہا تو کہنے لگی۔ "کیوں' کیا آپ اپنا گھر نہیں دکھانا چاہتے مجھے؟ یہ کمرا تو دیکھ لیا ہے۔ آپ نے اسے بہت خوب صورت سجا رکھا ہے' یقیناً" وہ کمرا اس سے کہیں زیادہ اچھا ہو گا جہاں آپ سوتے ہوں گے۔" اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔ "آپ کا ذوق بہت اچھا ہے۔"

"شکریہ خاتون!" میں نے کہا۔ "دراصل میں اس لیے اوپری ہی منزل پر آپ کو نہیں لے جا رہا تھا کہ پھر گھر کا دروازہ بند کرنا پڑے گا۔"

"تو کیا ہوا' بند کر دیجئے۔" وہ بولی۔

میں اور وہ دونوں ہی ابھی تک نشست گاہ کے دروازے پر کھڑے تھے۔ میں اس کی بات سن کر مسکرا دیا' پھر کہا۔ "کل تو آپ گھر میں آتے ہوئے جھجک رہی تھیں اور آج خود دروازہ بند کرنے کو کہہ رہی ہیں! ایک ہی دن میں آپ نے مجھ پر اتنا اعتماد کیسے کر لیا؟"

"بس کر لیا!" وہ ایک ادا سے بولی۔ "کسی کو ایک لمحے میں بھی سمجھا جا سکتا ہے اور اسے خود سے قریب محسوس کیا جا سکتا ہے اور کوئی عمر بھر ساتھ رہ کر بھی اجنبی ہو سکتا ہے!"

"سبحان اللہ!" میں ہنس دیا۔ "آپ تو بڑے زبردست مکالمے بول لیتی ہیں۔"

"مذاق نہ اڑائیے میرا" میں کیا اور میرے مکالمے کیا!" وہ کچھ اداس سی ہو گئی۔

کچھ دیر بعد ہی اوپری منزل پر وہ میری خواب گاہ میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا اندازہ میں نے اس کے چہرے سے لگایا کہ خواب گاہ کی آرائش نے بھی اسے متاثر کیا ہے۔ خواب گاہ میں ایک جانب دو کرسیاں بھی پڑی تھیں اور ان کے درمیان چھوٹی سی خوب صورت میز بھی تھی۔

"آئیے یہاں بیٹھتے ہیں۔" میں اس طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"آپ یقیناً" کوئی سرمائے دار معلوم ہوتے ہیں ورنہ کرائے کے مکان پر اتنا پیسا نہ لگاتے!" اس نے بھی آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"خیر سرمائے دار نہیں ہوں' ہاں بس گزر بسر ہو جاتی ہے کیوں کہ اس شہر میں میری سکونت عارضی ہے اس لیے مکان خریدا نہیں' کرائے پر لینا مناسب سمجھا۔" میں یہ کہتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ میرے مقابل والی کرسی پر آ بیٹھی آج بھی وہ پورے "ہتھیاروں" سے لیس ہو کر آئی تھی۔ سیاہ شلوار سوٹ میں اس کی رنگت کچھ اور کھل اٹھی تھی۔

"ارے ہاں! میں نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ آپ نے ناشتہ بھی ابھی کیا یا نہیں؟" وہ چونک کر بولی۔ "اگر نہیں کیا تو میں بنا دیتی ہوں۔"

"شکریہ! ناشتہ کر چکا ہوں!"

"خود بنا لیتے ہوں گے اپنے ہاتھ سے؟"

"جی ہاں۔" میں نے تفصیل سے بچنے کی خاطر کہا۔ "کھانا بھی خود پکا لیتا ہوں۔ دراصل مجھے کسی کی محتاجی اچھی نہیں لگتی!.... خیر اس ذکر کو چھوڑیں اور بتائیں' آپ کے منگیتر صاحب کیسے ٹپک پڑے صبح ہی صبح؟"

"چھٹی کے دن وہ عموماً" آ دھمکتا ہے اور پھر دن بھر لہو پی جاتا ہے میرا!" اس نے ناگواری سے کہا۔

"آپ لہو پلاتی ہوں گی تو پیتا ہو گا نا!" مجھے شرارت سوجھی۔

"بڑا ہی ڈھیٹ ہے!" وہ میری بات کو نظر انداز کرتی ہوئی بولی۔ "دن بھر بس میرے ہی گرد منڈلاتا رہتا ہے۔"

"پروانہ بھی تو ڈھیٹ ہی ہوتا ہے جو شمع کے گرد منڈلاتا رہتا ہے!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "یہ تو اس کے عشق کی انتہا ہے۔"

"مگر میں تو تھوکتی بھی نہیں اس کی صورت پر!" اس نے رشید سے اپنی نفرت کا اظہار

کیا۔ "اکثر چھٹی کے دن اسی سے بچنے کے لیے میں اپنی کسی سہیلی کے گھر چلی جاتی ہوں۔"
اور جب وہ آپ کا شوہر نامدار بن جائے گا تو کیا کریں گی؟"
"ہاں یہ ... یہ ..." وہ کوشش کے باوجود کچھ نہ کہہ سکی۔
"خیر چھوڑیں' وہ گیا کہ ابھی ہے؟"
"چلا گیا۔" اس نے جواب دیا۔ پھر حیرت سے بولی۔ "آج پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ میں گھر ہی میں تھی اور وہ خود ہی ٹل گیا ورنہ تو کمبل ہو جاتا ہے۔"
"ٹلنے کی وجہ بتاؤں آپ کو؟" میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔
"حیرت ہے کہ ..... کہ جو بات مجھے معلوم نہیں' کسی ..... کسی کو بھی خبر نہیں وہ...... وہ آپ کو کیسے ....."
"ابھی جو گلی میں ہنگامہ ہو رہا تھا' بھول گئیں آپ اسے؟ اور کل جو اس نے مجھے دھمکی دی تھی وہ بھی شاید آپ کے ذہن سے نکل گئی ورنہ آپ بھی میری طرح صحیح نتیجہ اخذ کر لیتیں۔"
"میں کچھ بھی نہیں سمجھی۔ اس ہنگامے سے آپ کا یا رشید کا کیا تعلق؟ وہ دونوں تو علاقے کے مشہور غنڈے ہیں اور سبھی جانتے ہیں انہیں۔ کسی بات پر آپس میں جھگڑا ہو گیا ہو گا ان میں۔"
"خاتون! یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔" میں نے مسکرا کر طویل سانس لیا اور پھر اسے بتانے لگا۔ "رشید ہی نے ان غنڈوں کو میری 'مزاج پرسی' کے لیے بھیجا تھا اور یقیناً" اس کے لیے انہیں خاصی رقم بھی دی ہو گی۔" پھر میں نے اسے بتایا کہ کس طرح وہ غنڈے گھر میں گھس آئے تھے۔ "یہ میرا کمال تھا کہ میں نے ان دونوں ہی کو آپس میں لڑوا دیا اور وہ لڑتے ہوئے ہی میرے گھر سے نکل کر گلی میں چلے گئے۔ میں نے ان کے جاتے ہی دروازہ بند کر لیا تھا' کسی خوف سے نہیں بلکہ لاتعلقی کے اظہار کی خاطر!"
"اب میں سمجھی کہ وہ کمینہ آج صبح ہی صبح کیوں آ دھمکا تھا!" وہ نفرت سے بولی۔ ورنہ تو چھٹی کے دن وہ عموماً" دوپہر ہوتے ہوتے آیا کرتا تھا۔ ... خوش بھی بہت نظر آ رہا تھا۔ تو یہ بات تھی! بڑا ہی گھٹیا اور کمینہ ہے وہ!"
"آپ نے شاید وہ کہاوت نہیں سنی کہ جنگ اور عشق میں سب کچھ جائز ہے۔ عشق آدمی کو سبھی کچھ بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس سے بس غلطی یہ ہو گئی کہ ناحق مجھے اپنا رقیب سمجھ بیٹھا۔"

"کچھ بھی ہو اس کی یہ حرکت ناقابل معافی ہے۔"
"آپ تو ایسا نہ کہیں' وہ آپ پر صدقے واری ہوتا رہتا ہے!"
"ہوا کرے! محبت یک طرفہ نہیں ہوتی۔"
"یہ تو آپ نے پہلے سوچا ہو گا!"
"بس عقل ماری گئی تھی میری! اور ..... اور پھر امی نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے شادی سے انکار کیا تو وہ زہر کھا لیں گی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کروں تو کیا کروں۔"
"اگر آپ میرا دوستانہ مشورہ قبول کریں تو کچھ عرض کروں!" میں بولا۔ اس نے سر جھکا لیا اور کچھ نہ بولی۔ میں نے اسے خاموشی دیکھ کر مزید کہا۔ "آپ کی خاموشی کو نیم رضامندی سمجھتے ہوئے میں یہی مشورہ دوں گا کہ اپنی امی کو سمجھائیں کسی طرح! انہیں بتائیں کہ رشید کے ساتھ قطعاً" آپ کا نباہ نہیں ہو سکے گا۔ اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ آپ خود ہی اپنے جیون ساتھی کو تلاش کر لیں۔ اس زمانے میں یہ کوئی معیوب بات نہیں۔ آپ اب کوئی بچی نہیں ہیں کہ انتخاب میں دھوکا کھا جائیں۔ جب آپ رشید کا نعم البدل' اس سے بہتر نعم البدل تلاش کر لیں گی تو آپ کی امی اور ابا جی دونوں راضی ہو جائیں گے۔"
"یہ تقریباً" ناممکن سی بات ہے۔" وہ بہت مدھم آواز میں بولی۔ اس کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔
"وجہ؟" میں نے سوال کیا۔
"ہمارے یہاں برادری سے باہر شادیاں نہیں ہوتیں اور ..... اور برداری والے کسی صورت ....." وہ چپ ہو گئی۔
اس کے چپ ہونے کی وجہ مجھے اچھی طرح معلوم تھی۔ یقیناً اس کا ماضی سب کے علم میں تھا۔ اس کی عمر زیادہ ہو چکی تھی۔ رشید بھی عمر میں اس سے سات آٹھ سال چھوٹا تھا۔
"دیکھیں خاتون" "تمام شرائط بہرحال پوری ہونا' ممکن نہیں۔ ترجیح برداری ہی کو دینا چاہیے' لیکن اگر برداری والے خود کسی مظلوم کی مظلومیت اور بیگناہی کا خیال نہ کریں تو پھر کیا ضروری ہے کہ برداری ہی میں رشتہ کیا جائے!"
میرا معنی خیز جملہ سن کر وہ چونک اٹھی۔ اس نے اپنی بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ "آپ ..... آپ کو یقیناً" میرے ..... میرے بارے میں سب ..... سب کچھ علم ہے ورنہ مظلوم .... مجھے مظلوم نہ کہتے۔"
"ہاں خاتون!" میں نے اقرار کر لیا۔ "مگر یہ نہ پوچھیے گا کہ کس طرح؟ اور نہ ماضی کو

ویرانے کی ضرورت ہے۔ آپ جو کچھ بتانا چاہیں گی' مجھے پہلے ہی اس کا علم ہے۔ بہرحال میرے نزدیک آپ قطعی بے گناہ ہیں۔ خدا نیکیوں کا حساب رکھتا ہے' اسی پر فیصلہ کرتا ہے۔ دنیا نے آپ کو ٹھکرا کر یقیناً" ظلم کیا ہے حالانکہ آپ بے قصور و بے گناہ ہیں!"

میں نے دیکھا کہ اس کے حسین رخساروں پر موتی ڈھلک آئے اور وہ انہیں اپنے دوپٹے کے دامن میں چھپانے لگی۔ یقیناً" میری ہمدردی کا اس کے دل پر گہرا اثر ہوا تھا۔ پھر وہ کافی دیر بعد ہی خود پر قابو پا سکی۔

"بیٹے' کوئی نہ کوئی اللہ کا نیک بندہ ایسا ضرور مل جائے گا جو آپکی پسند پر بھی پورا اتر سکے اور گھر داماد بننے پر بھی راضی ہو جائے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"تو.... تو آپ کو یہ..... یہ..... میری اس مجبوری کا بھی علم ہے!" وہ رک رک کر حیرت زدہ آواز میں بولی۔

"ہاں میں یہ بھی جانتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ آپ اپنے والدین کو چھوڑ کر نہیں جا سکتیں کہ آپ ہی ان کا واحد سہارا ہیں اور آپ کو انہیں چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہیے!"

میری یہ بات سن کر وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ کچھ دیر خاموش رہی' پھر اس کے لب کھلے۔ "آپ.... آپ جب..... جب سب کچھ جانتے ہیں اور مجھے بے قصور بھی سمجھتے ہیں تو..... تو..... کیا..... کیا.... آپ خود مجھے...."

میں اب اس کی نظروں کا مفہوم اچھی طرح سمجھ چکا تھا اور اس ادھورے فقرے کا مطلب بھی ہے جسے پورا کرنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ وہ ایک مشرقی لڑکی تھی اور قدرے باحیا بھی! بھلا وہ اپنی زبان سے یہ کس طرح کہہ دیتی کہ پھر آپ ہی مجھے اپنا لیں۔

میں شدید الجھن میں گرفتار ہو گیا کہ اسے کیسے سمجھاؤں۔؟ اگر دو ٹوک جواب دے دیتا تو اس کا زخمی دل یہ نیا زخم شاید برداشت نہ کر پاتا۔ ابھی میں اسی کشمکش میں گرفتار تھا کہ معاً" میں نے وہاں ہمزاد کی موجودگی محسوس کی اور پھر وہ مجھے نظر بھی آ گیا۔ یقیناً" کوئی بات ایسی ضرور تھی جس سے مجھے وہ فوری طور پر آگاہ کرنا چاہتا ہو گا۔ وہ شبھو کی طرف گیا تھا' اسی تجویز پر عمل کرنے جس کا فیصلہ گذشتہ روز ہم دونوں ہی نے کیا تھا۔ کچھ سوچ کر میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور نفیسہ کو مخاطب کیا۔ "میں ابھی حاضر ہوا خاتون!"

OO.....O.....OO

نفیسہ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ باتیں کرتے کرتے ایک دم اس طرح اٹھ کھڑے ہونا یقیناً" اس کے لیے حیرت کا سبب رہا ہو گا۔ وہ ابھی تک خوابوں کے حصار میں تھی جس کا اظہار اس کے چہرے سے بھی ہو رہا تھا۔ میں نے جو کچھ کہا تھا' اس کے ادھورے سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ تو مجھ سے کچھ اور ہی سننے کی منتظر رہی ہو گی۔

"ابھی آ رہا ہوں میں' بیٹھیں آپ! بس برابر والے کمرے تک جاتا ہے۔" میں نے اسے حیران دیکھ کر مزید کہا اور پھر تیزی کے ساتھ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

یہ تو ممکن تھا کہ ہمزاد مجھ سے جو کچھ کہتا نفیسہ نہ سن پاتی لیکن میری آواز اسے بہرحال سنائی دیتی' یعنی جواباً" میں ہمزاد سے کچھ کہتا تو وہ سن لیتی۔ یہ صورت حال لازماً" اس کے لیے اور بھی حیران کن ہوتی۔ یہی سوچ کر میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

خواب گاہ سے متصل ہی وہ کمرا تھا جسے ہمزاد نے مطالعہ گاہ بنا دیا تھا۔ میں خواب گاہ سے نکل کر اسی کمرے میں داخل ہو گیا۔ ہمزاد میرے ساتھ تھا۔ وہ بھی یقیناً" سمجھ چکا تھا کہ میں نفیسہ کی موجودگی کے سبب خواب گاہ سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گیا ہوں۔

"ہاں اب کہو!" میں ہمزاد کی طرف پلٹا۔

میرے لہجے میں یقیناً" فکرمندی تھی جسے غالباً" ہمزاد نے محسوس کر لیا اور بولا۔

"کوئی زیادہ تشویش ناک بات نہیں ہے۔"

"تم بھی عجب چوتھ ہو!" مجھے تاؤ آ گیا۔

"جب ایسی کوئی بات نہیں تھی تو پھر..."

"پہلے پوری بات تو سن لیں' اس کے بعد جو..."

"خاک سن لیں!"

"وہ بھی سن لیں۔"

"کیا؟"

مجھے اس وقت اس کا شرارتی لہجہ کھل گیا۔

"ہمزاد میرا مزاج شناس تھا۔ وہ شاید سمجھ گیا کہ اس وقت میرا پارا چڑھا ہوا ہے اس لیے فوراً" ہی اس نے مطلب کی بات کہہ دی۔ "شمبھو سے میرا ربط منقطع ہو گیا ہے اور اس کی بحالی کے لئے ضروری ہے کہ میں بہ راہ راست کوئی قدم اٹھاؤں۔ میں اسی سلسلے میں آپ سے اجازت لینے آیا تھا۔"

"میں کچھ بھی نہیں سمجھ سکا' تم کیا کہہ رہے ہو!"

"اگر سنیں تو عرض کروں!" وہ اب مودب تھا۔

"ہاں تفصیل سے بتاؤ کیا بات ہے!"

"صبح جب آپ نے مجھے ان غنڈوں سے نمٹنے کے لیے طلب کیا تھا' اس سے پہلے تک شمبھو میری نظر میں تھا۔" ہمزاد بتانے لگا۔

"جب آپ نے مجھے طلب کیا تو میں اس مکان کی اطراف نادیدہ حصار قائم کر چکا تھا۔ پھر جب میں لوٹ کر گیا تو صورت حال بدل چکی تھی۔"

"یعنی؟"

میں نے وضاحت چاہی۔

"شمبھو میری چشم تصور سے دور ہو چکا تھا' گویا میرا اور اس کا رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔" ہمزاد نے بتایا۔

"اس کا سبب تمہارا کھینچا ہوا نادیدہ حصار بھی تو ہو سکتا ہے!" میں بولا۔

"میرے ذہن میں بھی اُس وقت یہی بات آئی تھی۔"

"پھر؟"

"پھر میں نے حصار اٹھا لیا۔" ہمزاد نے جواب دیا۔ "مگر پھر بھی شمبھو سے رابطہ قائم نہ ہوا۔"

"اس دوران میں جب تم میرے پاس تھے' کہیں وہ سریتا کو لے کر فرار تو نہیں ہو گیا؟" میں نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"کیا کہا جا سکتا ہے' جب تک میں اس مکان میں داخل ہو کر..."

"نہیں!"

میں اٹھا کر بولا۔ "فی الحال یہ خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے حصار کھینچ

ہی اسے اس کا علم ہو گیا ہو اور..."

میں کچھ کہتے کہتے رک گیا کیوں کہ صورت حال ایسی ہی تھی۔ حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں تھا۔ ذرا توقف کے بعد میں نے پھر کہا۔ "احتیاط کا تقاضا یہی ہے۔ ممکن ہے خود شمبھو نے اس طرح تمہارے لیے کوئی جال بچھایا ہو۔ وہ خود یہ چاہتا ہو کہ تم رابطہ منقطع ہو جانے کے بعد اس مکان میں داخل ہونے کی کوشش کرو۔"

"ہاں اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا' لیکن اس کی طرف سے یوں غافل تو نہیں رہا جا سکتا۔"

"سنو! بے صبری نہیں۔" میں نے پر سکون لہجے میں کہا

"تمہاری زندگی مجھے زیادہ عزیز ہے یا بہ الفاظ دیگر یوں کہو کہ اپنی زندگی! میں نہیں چاہتا کہ تمہیں جلد بازی میں کوئی نقصان پہنچ جائے۔"

میں نے یہ بات اپنے گزشتہ تلخ تجربات کی روشنی میں کہی تھی۔ اب سے پہلے میں اپنے ہمزاد کی زیادہ پروا نہیں کرتا تھا کہ اس پر کیا گزرے گی! مجھے تو بس اپنے مقصد سے غرض ہوتی تھی۔

"پھر کیا حکم ہے میرے لیے؟" اس نے پوچھا۔

"تم اپنے طور پر شمبھو سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں مصروف رہو۔ آج رات تک کوشش کر لو' پھر کچھ سوچیں گے۔ بالفرض وہ فرار ہو گیا ہے تو معلوم ہو ہی جائے گا کہ اس نے کدھر کا رخ کیا ہے اور ظاہر ہے' وہ اسی کرہ ارض پر کہیں نہ کہیں ہو گا۔ ہمارے لیے اس تک پہنچنا محال نہیں ہو گا۔ اگر ایسا نہیں اور وہ یہیں ڈھاکہ میں ہے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں۔ اب نہیں تو دو ایک روز میں اس کی خیر خبر مل ہی جائے گی۔ اور بھی راستے ہیں کہ اسے اپنے بل سے نکلنا پڑے۔ یہ گفتگو تفصیل طلب ہے اور اس وقت ممکن نہیں۔ یہ لڑکی نفیسہ چلی جائے گی تو ممکن ہے' میں تمہیں طلب کروں۔ وہ میرے اتنی دیر غائب رہنے سے کسی شک میں بھی پڑ سکتی ہے۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"تو پھر میں جاؤں؟" اس نے اجازت چاہی۔

"ہاں اب تم جاؤ۔" اسے اجازت دیتے ہی معاً" مجھے ایک اور خیال آ گیا۔ وہ غائب ہونے والا تھا کہ معاً" میں نے اسے پکارا۔ "ہمزاد سنو!"

"جی۔" وہ پھر ظاہر ہو گیا۔

"شمبھو کے مکان کے گرد حصار قائم ہے یا تم نے اسے اٹھا لیا؟" میں نے سوال کیا۔

"کیا؟"

مجھے اس وقت اس کا شرارتی لہجہ کھل گیا۔

"ہمزاد میرا مزاج شناس تھا۔ وہ شاید سمجھ گیا کہ اس وقت میرا پارا چڑھا ہوا ہے اس لیے فوراً" ہی اس نے مطلب کی بات کہہ دی۔ "شمبھو سے میرا رابطہ منقطع ہو گیا ہے اور اس کی بحالی کے لئے ضروری ہے کہ میں براہ راست کوئی قدم اٹھاؤں۔ میں اسی سلسلے میں آپ سے اجازت لینے آیا تھا۔"

"میں کچھ بھی نہیں سمجھ سکا' تم کیا کہہ رہے ہو!"

"اگر سنیں تو عرض کروں!" وہ اب مودب تھا۔

"ہاں تفصیل سے بتاؤ کیا بات ہے!"

"صبح جب آپ نے مجھے ان غنڈوں سے نمٹنے کے لیے طلب کیا تھا' اس سے پہلے تک شمبھو میری نظر میں تھا۔" ہمزاد بتانے لگا۔

"جب آپ نے مجھے طلب کیا تو میں اس مکان کی اطراف نادیدہ حصار قائم کر چکا تھا۔ پھر جب میں لوٹ کر گیا تو صورت حال بدل چکی تھی۔"

"یعنی؟"

میں نے وضاحت چاہی۔

"شمبھو میری چشم تصور سے دور ہو چکا تھا' گویا میرا اور اس کا رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔" ہمزاد نے بتایا۔

"اس کا سبب تمہارا کھینچا ہوا نادیدہ حصار بھی تو ہو سکتا ہے!" میں بولا۔

"میرے ذہن میں بھی اُس وقت یہی بات آئی تھی۔"

"پھر؟"

"پھر میں نے حصار اٹھا لیا۔" ہمزاد نے جواب دیا۔ "مگر پھر بھی شمبھو سے رابطہ قائم نہ ہوا۔"

"اس دوران میں جب تم میرے پاس تھے' کہیں وہ سریتا کو لے کر فرار تو نہیں ہو گیا؟" میں نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"کیا کہا جا سکتا ہے' جب تک میں اس مکان میں داخل ہو کر۔۔"

"نہیں!"

میں اٹھا کر بولا۔ "فی الحال یہ خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے حصار کھینچ

ہی اسے اس کا علم ہو گیا ہو اور۔۔۔"

میں کچھ کہتے کہتے رک گیا کیوں کہ صورت حال ایسی ہی تھی۔ حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں تھا۔ ذرا توقف کے بعد میں نے پھر کہا۔ "احتیاط کا تقاضا یہی ہے۔ ممکن ہے خود شمبھو نے اس طرح تمہارے لیے کوئی جال بچھایا ہو۔ وہ خود یہ چاہتا ہو کہ تم رابطہ منقطع ہو جانے کے بعد اس مکان میں داخل ہونے کی کوشش کرو۔"

"ہاں اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا' لیکن اس کی طرف سے یوں غافل تو نہیں رہا جا سکتا۔"

"سنو! بے صبری نہیں۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا

"تمہاری زندگی مجھے زیادہ عزیز ہے یا بہ الفاظ دیگر یوں کہو کہ اپنی زندگی! میں نہیں چاہتا کہ تمہیں جلد بازی میں کوئی نقصان پہنچ جائے۔"

میں نے یہ بات اپنے گزشتہ تلخ تجربات کی روشنی میں کہی تھی۔ اب سے پہلے میں اپنے ہمزاد کی زیادہ پروا نہیں کرتا تھا کہ اس پر کیا گزرے گی! مجھے تو بس اپنے مقصد سے غرض ہوتی تھی۔

"پھر کیا حکم ہے میرے لیے؟" اس نے پوچھا۔

"تم اپنے طور پر شمبھو سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں مصروف رہو۔ آج رات تک کوشش کر لو' پھر کچھ سوچیں گے۔ بالفرض وہ فرار ہو گیا ہے تو معلوم ہو ہی جائے گا کہ اس نے کدھر کا رخ کیا ہے اور ظاہر ہے' وہ اسی کرہ ارض پر کہیں نہ کہیں ہو گا۔ ہمارے لیے اس تک پہنچنا محال نہیں ہو گا۔ اگر ایسا نہیں اور وہ یہیں ڈھاکہ میں ہے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں۔ اب نہیں تو دو ایک روز میں اس کی خیر خبر مل ہی جائے گی۔ اور بھی راستے ہیں کہ اسے اپنے بل سے نکلنا پڑے۔ یہ گفتگو تفصیل طلب ہے اور اس وقت ممکن نہیں۔ یہ لڑکی نفیسہ چلی جائے گی تو ممکن ہے' میں تمہیں طلب کروں۔ وہ میرے اتنی دیر غائب رہنے سے کسی شک میں بھی پڑ سکتی ہے۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"تو پھر میں جاؤں؟" اس نے اجازت چاہی۔

"ہاں اب تم جاؤ۔" اسے اجازت دیتے ہی معاً" مجھے ایک اور خیال آگیا۔ وہ غائب ہونے والا تھا کہ معاً" میں نے اسے پکارا۔ "ہمزاد سنو!"

"جی۔" وہ پھر ظاہر ہو گیا۔

"شمبھو کے مکان کے گرد حصار قائم ہے یا تم نے اسے اٹھا لیا؟" میں نے سوال کیا۔

"فی الحال تو حصار قائم ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "یہاں آنے سے قبل میں نے دوبارہ حصار کھینچ دیا تھا تاکہ وہ..."

"اٹھالو حصار!" میں نے کہا۔ "جب تک یقین نہ ہو جائے کہ وہ اس مکان میں موجود ہے' حصار بے فائدہ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

اس نے میری رائے سے اتفاق کیا اور پھر میرا اشارہ پا کر غائب ہو گیا۔

ہمزاد کی غیر متوقع آمد اور شمبھو کے بارے میں جان کر میں کچھ متفکر ہو گیا۔ دشمن یوں اچانک نظروں سے اوجھل ہو جائے تو فکر ہوتی ہی ہے!

ہرچند کہ اس کمرے میں بھی بیٹھنے کے لیے کرسیاں وغیرہ تھیں' مگر میں بیٹھا نہیں تھا اور کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ صورت حال ہی ایسی تھی۔ میں نفیسہ سے بات کرتے کرتے اٹھ کر یہاں آ گیا تھا۔ میری پشت کمرے کے دروازے کی طرف تھی۔ ہمزاد کے رخصت ہونے کے بعد میں بس چند لمحے اس کمرے میں مزید رکا کہ اپنے حواس پر قابو پالوں تا کہ نفیسہ میری متغیر حالت محسوس نہ کر سکے۔ اس کے بعد میں آہستہ قدمی کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں لوٹ آیا۔

نفیسہ کو میں نے بہ دستور خواب گاہ میں پایا' لیکن ایک تبدیلی نے مجھے چونکا دیا۔ وہ اب اس کرسی پر نہیں بیٹھی تھی جس پر میں اسے بیٹھے ہوئے چھوڑ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ میری غیر موجودگی میں وہاں سے اٹھی تھی۔ الجھا ہوا ذہن ہونے کے باوجود میں نے تحمل سے کام لیا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہوئے ایک نظر میں نے اس کے چہرے پر بھی ڈالی تھی۔ وہ کچھ چور چور سی لگ رہی تھی۔

"جی... کچھ کہہ رہی تھیں آپ!" معاً میں نے اسے مخاطب کیا۔

وہ چونک اٹھی۔ "جی... ہاں۔" اس نے نظر اٹھائی۔

"تو پھر کہیں نا!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

چند لمحے وہ مجھ سے نظریں ملائے رہی' پھر اس کی نظریں جھک گئیں۔ "مجھے یاد نہیں رہا کیا بات ہو رہی تھی!" وہ بولی' آواز مدھم تھی۔

اس کے انداز و اطوار سے اب مجھے پوری طرح یقین ہو چکا تھا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ یہ عین ممکن تھا' تجسس سے مجبور ہو کر وہ میرے پیچھے پیچھے برابر والے کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی ہو کہ دیکھ سکے' میں بات کرتے کرتے وہاں اٹھ کر کیوں گیا ہوں! میرے

...ں تھا کہ بچوں اور عورتوں میں تجسس کا مادہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہی تھا تو ...نے کم از کم وہ باتیں تو سن ہی لی تھیں جو میں نے ہمزاد سے کی تھیں۔ ہرچند کہ یہ کچھ بہتر ...ں ہوا تھا' اس کے باوجود کوئی خطرے کی بات نہیں تھی۔ یا وہ مجھے خبطی تصور کرتی یا پھر ...سمجھتی کہ میں کسی پر اسرار وجود سے مخاطب تھا جو اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ سوچ کر میرے ...ں کو سکون تو مل گیا مگر یہ جاننا بہرحال ضروری تھا کہ میرا مفروضہ درست بھی ہے یا نہیں!

کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ نظریں جھکائے چپ بیٹھی تھی۔

"سنیں خاتون' آپ اسی کرسی پر آ جائیں جہاں پہلے بیٹھی تھیں۔" یہ کہتے ہی میں اٹھ ...ا ہوا۔

"جی... جی!"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں مان جائیے! اس کرسی پر بیٹھی ہوئی آپ زیادہ اچھی لگ رہی تھیں۔ دراصل ...ری میں آپ یہ بھول گئیں کہ پہلے کس کرسی پر بیٹھی تھیں۔ آیئے!" میں ایک طرف ہو کر ...ا۔

وہ سٹپٹا سی گئی اور میرے اصرار پر اپنا دوپٹا سنبھالتی ہوئی پہلی کرسی پر بیٹھ گئی جو میں نے ...اس کے لیے خالی کر دی تھی۔

"دراصل یہی ذرا ذرا سی باتیں ان باتوں کو ظاہر کر دیتی ہیں جنھیں آدمی چھپانا چاہتا ...ہے۔" میں دوسری کرسی سنبھالتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔

"سمجھ میں نہیں آ رہا کہ... کہ آپ یہ... یہ کیسی باتیں کرنے لگے!" وہ رک رک کر ...ولی۔ "میں... تو وہیں... وہیں بیٹھی تھی جہاں آپ چھوڑ کر گئے تھے۔"

"دیکھیں' جھوٹ بولنا بھی ایک ہنر ہے۔ یہ ہنر ہر ایک کو نہیں آتا۔" میں مسکرا کر ...ا۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پر ہی تھیں۔

"علم ہو یا ہنر' دونوں کے مثبت اور منفی پہلو ہوتے ہیں۔ آپ یہ سن کر کسی غلط فہمی میں ...نہ ہو جائیے گا کہ میں جھوٹ کو ہنر کہہ رہا ہوں! بہرحال آپ ایسی بھولی بھالی لڑکیاں یہ ہنر ...نہیں جانتیں اس لیے میرا نیک مشورہ یہی ہے کہ ایسی کوشش نہ کیا کریں۔ تجسس بری چیز ...نہیں ہے بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا تجسس کے بغیر علم کا حصول ہی مشکل ہے۔ اگر آپ کے ...دل میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ میں برابر والے کمرے میں کیوں گیا ہوں تو یہ کوئی غیر فطری بات ...نہیں۔ پھر اس قطع نظر یہ کہ میں بہرحال ابھی آپ کے لیے اجنبی ہوں اور آپ میرے بارے

میں بہت سی باتوں سے لاعلم ہیں۔ اس کے باوجود اخلاق کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ آپ غالباً" سمجھ رہی ہوں گی میری بات! جو ہو گیا' بھول جائیں اسے! آپ نے جو کچھ سن لیا ہو ذہن سے جھٹک دیں کہ یہی بہتر ہے آپ کے لیے! کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں خاتون کہ ان کا نہ جاننا آدمی کے لیے بہتر ہوتا ہے۔" میں بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ اس پر میرے فقروں کا کیا رد عمل مرتب ہو رہا ہے! وہ خاموش ہی رہی تو میں نے مزید کہا۔ "آپ کی خاموشی سے میں یہی نتیجہ اخذ کر سکتا ہوں کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہے۔ آپ یقیناً" یہاں سے اٹھ کر برابر والے کمرے کے دروازے تک گئی تھیں۔ میں اس پر ہرگز اصرار نہیں کروں گا کہ آپ اپنی زبان سے اس کا اقرار کریں۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آپ جو کچھ سن چکی ہیں' اسے فراموش کر دیں۔"

میری بات کے اختتام پر اس نے بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھا' پھر ذرا توقف سے بولی۔ "مجھ سے یقیناً" غلطی ہوئی ہے اور... اور میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن..."

"ہاں ہاں کہیں' کیا بات ہے؟ جھجکنے کی ضرورت نہیں!" میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی' اگر آپ سچ سچ بتا سکیں۔"

"پوچھیں! میں کوشش کروں گا کہ آپ کے سوال کا جواب دے سکوں بشرطیکہ وہ جواب آپ کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔" میں محتاط لہجے میں بولا۔

"کیا واقعی ہمزاد کا وجود ہوتا ہے؟"

اس کے سوال پر میں چونک اٹھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بالکل صحیح خطوط پر سوچ رہی تھی۔ میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے سکون کے ساتھ کہا۔ "ہاں یہ کوئی مفروضہ نہیں' مگر آپ یہ کیوں جاننا چاہتی ہیں؟"

"دراصل اب سے پانچ سال قبل میری امی کے ایک عزیز سکھر سے آئے تھے۔ ہمارے ہی گھر ٹھہرے تھے وہ۔ ان سے پہلی بار میں نے ہمزاد کے بارے میں سنا تھا اور انھوں نے ہمزاد کے متعلق اتنی عجیب اور حیرت انگیز باتیں بتائیں کہ کم سے کم مجھے تو یقین نہیں آیا۔ وہ کہتے تھے کہ ہر شخص اپنے ہمزاد کو قابو میں کر سکتا ہے' مگر اس کا وظیفہ بہت مشکل ہے۔ معاف کیجئے گا' آج ایک طویل عرصے کے بعد میں نے آپ... آپ کی زبان سے ہمزاد کا نام سنا اور... اور حیران رہ گئی۔ ہمزاد کے متعلق مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ صرف اسی کو نظر آتا ہے

جس کے قبضے میں ہو۔ دراصل میں... میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا... کیا آپ نے اپنے ہمزاد کو قابو میں کر لیا ہے؟" اس نے وہ سوال کر ہی دیا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔

"اگر میں آپ کے اس سوال کا جواب دے بھی دوں تو اس سے حاصل کیا ہو گا آپ کو؟" میں نے سنبھل کر کہا۔ "میں نے ابھی آپ سے عرض کیا تھا نا کہ کچھ چیزوں کا نہ جاننا ہی بہتر ہوتا ہے!"

"اچھا اگر یہ نہیں بتاتے تو اس کا سوال کا جواب تو دے ہی دیں کہ کیا واقعی ہر شخص اپنے ہمزاد کو قابو میں کر سکتا ہے؟"

"جی ہاں یہ حقیقت ہے۔ آدمی کو اللہ تعالیٰ نے حیرت انگیز قوتوں سے نوازا ہے' بس ان قوتوں کا ادراک ضروری ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ آدمی اپنی قوت کا صحیح استعمال بھی جانتا ہوں ورنہ عموماً" وہ بھٹک جاتا ہے۔ اسی اندیشے کے پیش نظر کہ آدمی بھٹک نہ جائے' اسے ان معاملات میں نہیں پڑنا چاہیے۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"اب میں سمجھ گئی کہ آپ کو میرے بارے میں سب کچھ کس طرح معلوم ہوا ہے!"

اس نے معنی خیز انداز میں میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ وہ کافی دیر بعد مسکرائی تھی اور اب اس کے چہرے پر خوف یا شرمندگی کے آثار نہیں تھے۔

"کیا سمجھ گئیں آپ؟" میں نے بھی مسکرا کر پوچھا۔

"یہی کہ آپ نے اپنے ہمزاد کے ذریعے میرے بارے میں سب کچھ معلوم کرا لیا ہو گا!"

میں اس کی بات سن کر ہنسنے لگا' پھر بولا۔ "تو گویا آپ نے فرض کر لیا ہے کہ میرا ہمزاد میرے قابو میں ہے!"

"جی ہاں!"

اس نے پر یقین لہجے میں کہا۔ "میں خود اپنے کانوں سے آپ کو اس سے گفتگو کرتے سن چکی ہوں اور اسی گفتگو کے دوران میں ایک بار آپ نے اسے ہمزاد کہہ کر بھی پکارا تھا۔ بتایئے غلط کہہ رہی ہوں میں!"

"تو آپ آ گئیں ہمزاد کے چکر میں!" میں نے اسے بنانے کی خاطر کہا۔

"کیا مطلب!"

اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ارے جناب! یہ سب ڈراما تھا ڈراما! مجھے معلوم تھا کہ اگر میں آپ سے بات کرتے

کرتے اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا تو تجسس سے مجبور ہو کر آپ ضرور میرے پیچھے آئیں گی۔"

"جی نہیں!" وہ ایک ادا سے بولی۔ "وہ ڈراما ہر گز نہیں تھا البتہ اس وقت آپ ڈراما کر رہے ہیں۔"

"خیر آپ کی مرضی! نہ مانیں میری بات!" میں نے ہنس کر کہا۔ اس گفتگو سے میرا مقصد محض یہ تھا کہ وہ یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں رہے۔ اگر اسے مکمل طور پر یقین ہو جاتا کہ واقعی میرا ہمزاد میرے قابو میں ہے تو خواہ مخواہ مزید کمپل ہو جاتی جو میں نہیں چاہتا تھا۔

"جی ہاں، نہیں آؤں گی آپ کی باتوں میں۔" اس کا لہجہ محبوبانہ تھا۔

"گھاٹے میں رہیں گی۔" میں بولا

"رہوں گھاٹے میں!" یہ کہتے ہوئے اس کی نگاہ وال کلاک کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ارے سوا گیارہ بج گئے!"

"کیوں کیا ہوا، نہیں بجنا چاہیے تھے سوا گیارہ؟"

"یہ بات نہیں بلکہ..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی، پھر بولی۔ "چلتی ہوں میں۔ ہاں وہ دوپہر کا کھانا آج میں لاؤں گی آپ کے لیے!"

"وہ کس خوشی میں خاتون!"

"بس یونہی! دراصل چھٹی کے دن دوپہر کا کھانا میں ہی پکاتی ہوں۔ ابو کو شامی کباب بہت پسند ہیں، وہ بھی میرے ہاتھ کے! آپ بتایئے گا کھا کر کہ واقعی ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں یا ابو میرا دل رکھنے کو تعریف کر دیتے ہیں۔" اس کے لہجے میں خلوص اور معصومیت تھی۔ وہ غالباً سمجھ چکی تھی کہ میں اس کے گھر نہیں جاؤں گا۔ دوم یہ کہ وہاں اسے خلوت بھی میسر نہ ہوتی۔

"ٹھیک ہے۔" میں انکار نہ کر سکا۔ "لیکن ایک شرط ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ ہی کھانا کھائیں گی۔"

"منظور۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

میں اسے نیچے تک چھوڑنے گیا۔

"ایک بجے تک آجاؤں گی میں!" وہ دروازے کے پاس رک کر بولی۔

"انتظار کروں گا میں۔"

وہ نیسن بان چلاتی ہوئی چلی گئی اور میں گھر کا دروازہ بند کر کے اوپر اپنے کمرے میں آ

گیا۔ یہ لڑکی نفیسہ میرے دل میں اپنی جگہ پیدا کرنے کے لیے اپنی دانست میں گویا ہر حربہ آزما رہی تھی۔ وہ ایک محروم لڑکی تھی، ہر طرح محروم! اور نہ میرے لیے یہ ناممکن نہیں تھا کہ اسے قریب نہ آنے دیتا۔ ایسے دل جو پہلے ہی سے زخم زخم ہوں، انھیں مزید کوئی چرکا نہیں لگانا چاہیے۔ میرے نزدیک یہ انسانیت سے بعید بات تھی اسے میں دھیرے دھیرے راہ راست پر لا سکتا تھا اور یہ بھی میرے لیے مشکل نہ تھا کہ اس کے مستقبل کو کسی اور طرح سنوار دوں۔ یہ بہرحال ضروری نہیں کہ ہر محروم لڑکی کو گلے کا ہار بنا لیا جائے۔ کچھ دیر میں نفیسہ ہی کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر مجھے اسی کے حوالے سے سریتا یاد آگئی جو ایک شیطان صفت شخص شمبھو کے قبضے میں تھی۔

میں نے ہمزاد سے کہا تھا کہ اگر ممکن ہوا تو نفیسہ کے جانے کے بعد تفصیلی گفتگو کے لیے اسے طلب کروں گا۔ نفیسہ کی واپسی میں ابھی دیر تھی۔ میں نے اسی لیے ہمزاد کو طلب کر لیا۔

"جی ارشاد!" وہ آتے ہی بولا۔

"کیا رہا؟ شمبھو سے تمھارا رابطہ قائم ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تک نہیں۔" ہمزاد نے جواب دیا۔ "معلوم نہیں اس کم بخت نے کیا نیا چکر چلا دیا ہے!"

"وہ ابھی کھل کر ہمارے مقابل آیا ہی کب ہے جان عزیز کہ ہم اس کی قوتوں کا اندازہ کر سکیں۔ بہرحال اس کی تلاش کے سلسلے میں ایک بات ذہن میں آتی ہے۔ ممکن ہے اس طرح کوئی سراغ مل جائے اس کا!" میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"کیا؟" ہمزاد نے سوال کیا۔

"میں اپنے تصور کی قوت آزماتا ہوں۔ میں اس شیطان کا نہیں، سریتا کا تصور کروں گا۔ پہلے بھی اسی طرح ایک مرتبہ کامیابی ہو چکی ہے، اس وقت جب وہ نارائن گنج میں تھا۔ میرا مطلب یہ کہ سریتا جہاں ہو گی، وہیں وہ بھی ہو گا۔" میں نے تفصیل کے ساتھ جواب دیا۔

"دیکھ لیں، یہ کر کے، ویسے مجھے زیادہ امید نہیں ہے کہ اس مرتبہ بھی آپ کامیاب ہو جائیں۔" ہمزاد نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

ہمزاد کی خیال آرائی پر کوئی تبصرہ کیے بغیر میں نے آنکھیں بند کر لیں اور پوری توجہ و انہماک سے سریتا کا تصور کرنے لگا۔ وہ بھولا بھالا معصوم سا چہرہ میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا جو مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ مکمل ذہنی یک سوئی کے ساتھ میں اس کا دھیان کرتا رہا، مگر ہمزاد کا خیال

درست ثابت ہوا۔ میرے تصور کی طاقت ور لہریں ایک چمکیلے دودھیا غبار سے ٹکرا کر لوٹ آئیں۔ وہ جہاں کہیں بھی تھی' اس چمکیلے غبار کے اندر تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور ہمزاد سے مخاطب ہوا "تم ٹھیک کہتے تھے۔ اس نے غالباً" یہ اندازہ لگالیا ہے کہ میں 'نارائن گنج' میں سریتا ہی کے ذریعے اس تک پہنچا تھا۔ یہی سبب معلوم ہوتا ہے کہ اس بار وہ سریتا کی طرف سے بھی چوکنا ہے۔" میں نے طویل سانس لے کر مزید کہا۔ "خیر اس طرح کچھ اور نہیں تو کم از کم یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ ہماری راہ میں اصل رکاوٹ یہی چمکیلا غبار ہے۔" یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

"بہرحال اب کیا کیا جائے؟" ہمزاد سنجیدگی سے بولا۔ "اس کی طرف سے یوں تاریکی میں رہنا اچھا نہیں ہے۔ وہ اس سے فائدہ اٹھا کر ہمیں کوئی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔"

"بس یہ کہ ہمیں بھی تاریکی کا انتظار کرنا چاہیے۔" میں معنی خیز لہجے میں بولا۔

"گویا آج رات کا انتظار!" ہمزاد نے میرے اشارے کو سمجھ کر کہا۔

"آج ہی شب کی کوئی قید نہیں۔" میں بولا۔ "کسی بھی شب کوئی عملی قدم بہ راہ راست اٹھایا جا سکتا ہے۔"

"آج رات ہی کیوں نہیں؟" ہمزاد نے سوال کیا۔

"اب تم کرنے لگے نا چو کھڑپن کی باتیں! کتنی بار تمہیں سمجھاؤں کہ جلد بازی نہیں! آج رات وہ ہماری طرف سے کسی عملی اقدام کا منتظر ہو گا' اب آیا کچھ عقل میں!"

"جب عقل بٹ رہی تھی تو ساری عقل تو آپ لے بھاگے' میں تو بس کھرچن پر گزارا کر رہا ہوں۔" ہمزاد نے یہ جملہ اس طرح ادا کیا جیسے اس پر بڑا ظلم ہوا ہے۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ بھی ہنسنے لگا اور یوں میرے اعصاب کی کشیدگی کسی قدر کم ہو گئی۔

"میرا خیال یہ ہے کہ جب تک ہم اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتے' مجھے اس کی ٹوہ میں رہنے کی بجائے آپ کی فکر کرنا چاہیے۔" ہمزاد نے خیال آئی کی' پھر اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے مزید بولا۔ "اس خبیث کی طرف سے کسی حملے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔"

میں نے اس کے خیال سے اتفاق کیا' پھر بولا۔ "یہ بتاؤ کہ پاس پڑوس میں رہنے والوں پر کیا رد عمل ہے اس کا؟"

"شمبھو ہی سے کیا' لوگ تو اس مکان ہی سے خوف زدہ رہتے ہیں۔" ہمزاد نے بتایا۔

"وجہ؟"

"وہ مکان آسیب زدہ مشہور تھا اور ایک طویل عرصے سے خالی پڑا تھا۔ شمبھو جب مالک مکان سے ملا اور اس مکان کو کرائے پر لینے کی پیشکش کی تو مالک مکان نے اس سے کچھ نہیں چھپایا۔ شمبھو تو خود ایک شیطان تھا' کسی آسیب سے کیا خوف کھاتا اس لیے سب کچھ جاننے کے باوجود واجبی کرائے پر فوراً" وہ مکان حاصل کر لیا۔ مالک مکان نے سوچا کہ چلو اس طرح کوئی مکان میں رہنے پر آمادہ تو ہوا ورنہ تو خالی ہی پڑا رہتا' اسے کوئی خریدنے پر بھی راضی نہیں تھا۔" ہمزاد تفصیل کے ساتھ بتانے لگا۔ "بہرحال شمبھو وہاں آبسا۔ اس کے بعد لوگوں نے کم ہی اسے مکان سے نکلتے دیکھا۔ ہاں انھیں کبھی کبھار مکان کی کھڑکی میں سریتا کھڑی ضرور نظر آ جاتی۔ پاس پڑوس والے شمبھو اور سریتا کو بھی بھٹکی ہوئی روحیں تصور کرتے ہیں۔ کوئی ان دونوں سے ملنے کی کوشش نہیں کرتا اور نہ خود شمبھو کسی سے ملتا ہے۔"

"ہوں!" میں نے ہنکارا بھرا۔

"ہاں میں یہ بتانا بھول گیا کہ محلے کا ایک ہندو نوجوان یوگندر' سریتا پر مرمٹا ہے۔ وہ ضرور اس مکان کا چکر کاٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ یقیناً" اس نے سریتا کو کھڑکی میں کھڑے دیکھا ہو گا۔ اس بے چارے کو کیا خبر کہ بڑے بڑے اس زلف گرہ گیر میں اٹکے ہوئے ہیں بلکہ اٹک کر لٹک گئے ہیں۔" اس نے شرارتی لہجے میں مجھ پر چوٹ کی۔

"بکو مت!"

"ویسے اس عشق خانہ خراب میں کھڑکی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔" وہ کہے گیا۔ "اگر کسی طرح کھڑکی بند کر دی جائے یا نہ کھلا کرے تو بہت سے غریب نوجوان بے بات کی موت مرنے سے بچ جایا کریں! اب بھی دیکھ لیجئے' نفیسہ کے معاملے میں بھی کھڑکی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس موقع پر مجھے کسی شاعر کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ کہیں تو سناؤں!" پھر اس نے میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی "شعر" سنا دیا۔

وہ دریچے سے جو جھانکے تو بس
اتنا پوچھوں
چارپائی لے آؤں

"کوشش کے باوجود میں اپنی ہنسی نہ روک سکا' پھر بولا۔ "یہ شعر ہے!"

"پہلے مصرعے پر نہ جائیں' دوسرے پر غور کریں' شاعر نے کس طرح اپنے جذبات کی عکاسی کا بے ساختہ اظہار کیا ہے!"

"کچھ خوف خدا کرو' دوسرا مصرعہ بہت چھوٹا ہے پہلے سے۔" میں نے کہا۔ "سر سے

بے وزن ہی میں نہیں!"

"آپ کہتے ہیں تو ممکن ہے نہ ہو وزن میں! لیکن چارپائی لانے کی اجازت طلب کر
میں کس قدر اظہار صداقت ہے! ویسے اس موقع کے لیے شعرائے کرام نے دفتر کے دفتر
کیے ہیں۔ اگر فرمائیں تو کئی دن تک صرف اسی موضوع پر اشعار سنا سکتا ہوں، مثلاً" وہ
شعر..."

"بس!" میں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اب ایک شعر بھی نہیں سنوں گا میں!"

"میرا خیال تھا کہ آپ صاحب ذوق آدمی ہیں۔"

"قطعی نہیں ہوں!"

"چلیں آپ نے ایک حقیقت تو تسلیم کی!" وہ پھر چوٹ کر گیا۔

"بتاؤں تمھیں ابھی حقیقت!" میں نے ہاتھ اٹھایا تو وہ اچھل کر پیچھے ہو گیا۔

"اگر برا نہ مانیں تو اس موقع پر شاعر نے ایک شعر کہا ہے۔ یہی تو کمال ہے شاعروں
کہ کوئی موقع چھوڑتے نہیں بلکہ موقع کی تلاش میں رہتے ہیں!"

"مگر بدبخت تم تو شاعر نہیں ہو، پھر کیوں میرا بھیجا چاٹ رہے ہو!"

"تو گویا آپ کے خیال میں شعرائے کرام صد احترام کو چاٹنے کے لیے کچھ اور نہیں
ملتا اور لوگوں کا بھیجا چاٹنا گویا ان کا محبوب و مرغوب مشغلہ ہے! یوں آپ گویا شعراء حضرات
توہین کر رہے ہیں! ارے ہاں... اس گھپڑ سٹ میں وہ ہاتھ اٹھانے والا شعر تو رہ ہی گیا۔"
کہتے ہی اس نے بغیر رکے شعر سنا ڈالا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ یہ شعر کم از کم وزن میں
تھا۔

سخت مجنوں کو شکایت ہے جہان تو سے
انگلیاں اٹھتی تھیں اب ہاتھ اٹھا کرتے ہیں

"اب غالباً" تم داد بھی چاہو گے اس کی کہ تمھیں کم از کم ایک اونگا بونگا شعر تو ٹھیک
طرح یاد ہو گیا!" میں نے اسے چڑایا۔

"میں سخت احتجاج کروں گا آپ کے تبصرے پر! اس لیے کہ نہ شعر اونگا ہے نہ بونگا
اس شعر میں جتنا عصری شعور جھلکتا ہے، کم اشعار میں جھلکا کرتا ہے بلکہ اکثر تو جھلکتا ہی نہیں
ہے۔ جی ہاں!"

"اب تم مجھے تنقید پر بھی بور کرو گے!"

"چلیں نہیں کرتا۔" وہ بڑے فیاضانہ لہجے میں بولا۔ "آپ بھی کیا یاد کریں گے

ہمزاد سے پالا پڑا تھا۔"

"احسان ہے تمھارا! ورنہ تمھاری بکواس جب ایک بار شروع ہو جاتی ہے تو پھر مشکل
ہی سے رکتی ہے۔ ویسے نو دو گیارہ ہونے کے بارے میں کیا خیال ہے تمھارا؟"

"نو دو گیارہ تو کیا میں دس تین بارہ بھی ہو سکتا ہوں، آپ بس حکم کریں!" وہ مسکرایا۔

"تم اتنی غبی کب سے ہو گئے ہو کہ اشارہ بھی نہیں سمجھے!"

"جب سے آپ کی مسمات نفیسہ کو دیکھا ہے۔" اس نے آہ کھینچی۔ "میں اپنی
چشم تصور سے ملاحظہ کر رہا ہوں کہ عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ غریب کباب پہ کباب تلے جا
رہی ہے تاکہ پیٹ کے راستے آپ کے دل تک پہنچ سکے، مگر آپ بڑے کٹھور ہیں، اسے پیٹ
کے رستے دل تک پہنچنے کا راستہ نہیں دیں گے۔ خوب معلوم ہے مجھے!"

"تمھیں بڑی ہمدردی ہو رہی ہے اس سے!"

"کیوں نہ ہو آخر وہ برابر پڑو ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے اور آپ اڑن گھائیاں بھر
رہے ہیں۔"

"یہ تم کیا انٹ شنٹ لفظ بولتے رہتے ہو! اڑن گھائیاں کیا ہوتا ہے؟"

"ہوتا نہیں حضور والا، ہوتی ہیں! اور یہ میری اپنی لغت کے الفاظ ہیں۔ اگر زندگی نے
وفا کی اور آپ نے گھڑی گھڑی طلب کر کے میرا ناک میں دم نہ کیا تو انشاء اللہ لغت ہمزاد کے
عنوان سے ایک لغت ترتیب دوں گا۔" وہ بڑے تفاخرانہ لہجے میں بولا۔

"بس ہوئی زبان کی مٹی پلید! لغت پر تو تم رحم ہی کر دو۔"

"ہاں مجھ سے ہر چیز پر رحم کرائے جائیں اور خود ساری داد وصول کیے جائیں۔ زمانہ
ہی ایسا آ گیا ہے، کیا بھی کیا جائے!" وہ مظلوم نظر آنے لگا۔

"اچھا اب تم جاؤ گے بھی یا..."

"جا رہا ہوں جناب، کیوں خفا ہوتے ہیں، مگر آپ کے حکم کے مطابق ارد گرد ہی منڈ
لاتا رہوں گا۔" وہ بولا۔

مجھے اس پر پھبتی کسنے کا موقع مل گیا۔ "تو گویا تم پرندے ہو! اس لیے کہ پرندے ہی
منڈلایا کرتے ہیں۔"

"جی نہیں، آج کل سارے چرندوں اور پرندوں کی عادات حضرت انسان نے اپنالی
ہیں۔" وہ فوراً بول اٹھا۔ "علامہ اقبال کا وہ شعر نہیں سنا، پلٹنا، جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا اور پھر یہ جو
مسمات نفیسہ بیگم آپ کی اطراف منڈلا رہی ہیں تو کیا یہ بھی 'پرندی' ہیں، اس لیے کہ میں

ان کی جنس تو غلط بتا نہیں سکتا۔ پرندے کی مادہ کو پرندی ہی کہیں گے نا!"

"تمہارا سر کہیں گے!"

"ہرگز نہیں جناب! اس لیے کہ سر بھی مذکر ہے، مونث نہیں اور پھر ایسی صورت میں تو مزید مذکر ہے جبکہ خود میں مذکر ہوں!... بس بس غصے میں نہ آئیں، یہ گیا میں!" ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ شریر غائب ہو گیا۔

بحث میں وہ مجھے اکثر زچ کر دیتا تھا اور جب دیکھتا تھا کہ اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے، راہ فرار اختیار کر لیتا تھا۔

میں کچھ دیر آنکھیں بند کیے آرام کرتا رہا۔ کوئی اچھی سی کتاب پڑھنے کو جی چاہ رہا تھا، لیکن اب وقت نہیں رہا تھا۔ ایک بجنے والا تھا اور نفیسہ نے ایک بجے آنے کو کہا تھا۔ معاً مجھے ایک شرارت سوجھی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے ہمزاد کو طلب کر کے اسے ایک حکم دیا اور مسکرانے لگا۔

پھر ادھر گھڑی نے ایک بجایا، ادھر نیچے دروازے پر دستک سنائی دی۔

"آ رہا ہوں!" میں نے بلند آواز میں کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا نیچے جانے کے لیے سیڑھیاں اترنے لگا۔

آنے والی نفیسہ ہی تھی اور اس کے ہاتھ میں مجھے ناشتے دان نظر آ رہا تھا۔

"اوپر ہی چلیں۔" اس نے دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی کہا۔

"جو آپ کی مرضی!" میں نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ "کبابوں میں نمک مرچ بھی ٹھیک ٹھاک ڈالا ہے یا پھیکے ہیں؟"

"یہ تو آپ کو ابھی معلوم ہو جائے گا۔ کوئی دعویٰ تو نہیں لیکن مزہ نہ آئے تو کہیے گا!" وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہنے لگی۔

"مزہ تو جب آئے گا خاتون کہ آپ واقعی بے وقوف نہ بنا رہی ہوں مجھے!" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب! میں بھلا بے وقوف کیوں بنانے لگی آپ کو!" وہ میری طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ایسا بھی ہوتا ہے کبھی کبھی!" میں نے دانستہ ایک سرد آہ بھری۔ "کچھ عشوہ طراز ایسے بھی ہوتے ہیں جو لوگوں کی محرومیوں کا مذاق اڑانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔" وہ پریشان سے لہجے

بولی۔

"اب کیا صاف صاف کہہ دوں کہ آپ مجھے بے وقوف بنانے کے لیے خالی ناشتے دان ر کر آئی ہوں گی!"

"حد ہے آپ سے بھی! مجھے کیا ضرورت ہے ایسا کرنے کی! اگر کباب نہ کھلانا ہوتے ے تو میں کیوں کہتی!"

"چلیں ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔" میں نے اس کے ساتھ ساتھ خواب گاہ میں داخل ہو کر کہا۔ "ہمیں اس میز پر کھا لیتے ہیں۔ روٹیاں بھی لائی ہیں نا؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں!" وہ بڑی اپنائیت سے بولی۔ "آپ ذرا کسی جگ میں پانی لے لیں اور دو گلاس بھی!" اس کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے میرے گھر میں پکنک منانے آئی ہو۔

میں کچھ کہے بغیر خواب گاہ کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ باہر نکلتے ہی میرے حکم پر زاد نے پانی سے بھرا جگ اور دو گلاس مجھے تھما دیے۔

"ارے اتنی جلدی لے آئے!" وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئی بولی اور ناشتے دان میز پر ر دیا۔

میں اس کی بات کو نظر انداز کرتا ہوا میز کی طرف بڑھا اور کہا۔ "ویسے دو گلاس کیوں لائے ہیں آپ نے؟"

"کیوں؟" وہ میری طرف مڑی۔ "کوئی اعتراض ہے آپ کو اس پر؟"

"نہیں، اعتراض تو خیر نہیں۔ بس یہ سوچ رہا تھا کہ... خیر چھوڑیں۔" میں میز کے پاس پہنچ گیا اور پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کھولیں خالی ناشتے دان!" گلاس اور جگ میں نے میز پر رکھ دیے۔

"آپ پھر وہی بات کرنے لگے!" وہ کچھ نروس سی ہو گئی۔ "یہ دیکھیے، ابھی آپ کو ل کر دکھاتی ہوں۔" وہ ناشتے دان کھولنے لگی۔

پھر اس کی صورت واقعی قابل دید تھی جب ناشتے دان خالی ملا۔ نہ اس میں کباب تھے، نہ روٹیاں! ہمزاد میرے اشارے پر پہلے ہی ان پر ہاتھ صاف کر چکا تھا۔

"یہ... یہ... مگر میں نے خود اپنے ہاتھ سے..." وہ روہانسی سی ہو گئی۔

"اب ہکلانے سے کچھ حاصل نہیں خاتون!" میں بول اٹھا۔ "میں نے اسی لیے اس ن میں شاہی کباب بنا لیے تھے کہ بھوکا نہ رہنا پڑے۔ بیٹھیں آپ، میں لے کر آتا ہوں۔"

"لیکن... لیکن..." وہ قسمیں کھانے لگی۔

"چلیں فرق کیا پڑتا ہے! آپ نے نہ سہی تو میں نے کھلا دیے کباب!" میں دروا
کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"رک جایئے! میں ابھی گھر سے ہو کر آتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا
میں نے کرسی کھسکنے اور ناشتے دان اٹھانے سے لگایا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا اس کے چہرے پر "زلزلے" کے سے آثار تھے۔ "اس
مطلب یہ ہے کہ آپ میرے ہاتھ کے بنے ہوئے کباب کھانا نہیں چاہتیں!" میں نے کہا
اگر ایسا ہے تو پھر میں بھی آپ کے گھر کی کوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔"

"آپ... آپ تو غلط... غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں... میں نے یہ کب کہا ہے کہ
کے کباب..."

"میرے کباب نہیں' بکری کے گوشت کے کباب!" میں نے اسے درمیان ہی
ٹوک دیا۔ "یقیناً" آپ مجھے آدم خور معلوم نہیں ہوتیں! بیٹھ جایئے پلیز!"

مجبوراً" اسے بیٹھنا ہی پڑا۔ ہمزاد' خواب گاہ کے باہر "چوری کا مال" ایک ٹرے
سجائے کھڑا تھا اور اس کے ہونٹوں پر بھی بڑی شریر مسکراہٹ تھی۔ میری اس شرارت سے
بھی یقیناً" لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"کچھ یہ دیر بعد میں نے ٹرے لا کر میز پر رکھ دی اور اس کا خالی ناشتے دان بیچ
طرف رکھ کر بولا۔ "کھایئے!"

وہ حیرت سے کبابوں اور روٹیوں کو دیکھ رہی تھی۔ روٹیاں اس طرح تہ کی ہوئی
میں رکھی تھیں جس طرح گھی میں لگا کر اس نے ناشتے دان میں رکھی تھیں۔

"اب بسم اللہ کریں نا! دیکھ کیا رہی ہیں!" میں نے روٹی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہو
اس سے کہا۔

پھر جب اس نے ایک لقمہ منہ میں رکھا تو مزید حیران نظر آنے لگی۔

"ہیں نا مزے دار کباب!" میں نے گویا لطف لینے کی خاطر کہا۔

"ج... جی... جی ہاں۔"

وہ منہ چلاتے ہوئے رک رک کر بولی۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار اب
تھے۔

میں بھی تیزی سے کبابوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ ذائقہ واقعی اچھا ہی تھا۔
شرارت سے اسے خجالت اٹھانا پڑی تھی۔ میں خاصی تفریح لے چکا تھا اس لیے ذرا

آپ سین کے لیے فضا ہموار کرنے لگا' میں نے کہا۔ "خاتون! آپ روتی منہ بسورتی یا حیران
ہرگز اچھی نہیں لگتیں۔ میں ذرا صاف گو آدمی ہوں' برا نہ مانئے گا اس بات کا ویسے برا
ہی گئیں تو میرا کچھ نہیں جائے گا' آپ ہی کا خون جلے گا۔" میرے لہجے کی شوخی نے اس پر
اثر کیا۔

اس کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہو گیا' پھر ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی آ گئی۔

"اب ہوئی نا بات!" میں نے گویا فوراً" گرہ لگائی۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"سمجھانے کے لیے مجھے ایک شعر کا سہارا لینا پڑے گا' کہیں تو عرض کروں!"

"تو آپ شاعر بھی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" میں نے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں
مجھے شعر پسند ضرور کہہ سکتی ہیں۔"

"سنایئے کیا شعر سنا رہے تھے۔ مجھے بھی شعر اچھے لگتے ہیں' بس یاد نہیں رہتے۔"

میں نے شعر پڑھا۔

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

"اچھا شعر ہے۔" اس نے تعریف کی اور پھر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"آپ کھائیں نا اور! کیا اچھے نہیں لگے کباب؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔ "میں نے تو
کوشش کی تھی کہ بالکل ویسے ہی کباب بناؤں جیسے آپ بناتی ہیں"

"یقیناً" آپ نے کوئی چکر چلایا ہے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔" وہ خوش مزاجی
سے بولی۔

"بہت سی باتیں آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ ہوتا ہے ایسا' آپ پریشان نہ ہوں۔"
میں نے ہنس کر کہا۔

"لیکن کچھ تو بتائیں کہ یہ ہوا کیسے؟" وہ میرے چہرے پر نظر جمائے ہوئے پوچھنے
لگی۔

"مگر کیا؟" میں جان کر انجان بن گیا۔

"معلوم تو سب کچھ ہے آپ کو! اب زیادہ نہ بنائیں۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"چھوڑیں یہ قصہ! بہرحال کباب عمدہ تھے۔ شکریہ آپ کا!" میں نے گویا اپنی دانست

میں ڈراپ سین کر ہی دیا۔

"میرا شکریہ!... وہ کیسے؟ کباب آپ نے کھلائے ہیں اور شکریہ میرا ادا کر رہی ہیں۔"

"کھلائے میں نے ہیں مگر بنائے تو آپ ہی نے ہیں!" میں نے مزید بات صاف کر دی۔

"جبھی میں حیران ہو رہی تھی کہ اتنا ذائقہ کس طرح یکساں ہو سکتا ہے!... لیکن ... میں پھر وہی سوال کروں گی کہ..."

"اور میں آپ کو اس کا جواب نہیں دوں گا۔" میں نے درمیان ہی میں سے اس کی بات کاٹ دی۔ "اب یہ موضوع ختم! چلیں نیچے نشست گاہ میں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"کیوں، یہاں کیا ہوا؟"

"ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے طبیعت بھی تو اوب جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو خود یہ حیرت ہوتی ہے کہ آپ ہر وقت کس طرح گھر میں گھسے رہتے ہیں میں تو جب دیکھتی ہوں آپ گھر ہی میں ہوتے ہیں۔ کیا باہر بالکل نہیں نکلتے؟"

"تنہا کہاں گھوموں؟"

"تو میرے ساتھ چلیے! آج شام کو چلتے ہیں کہیں گھومنے۔" اس نے پیشکش کی۔

"جوان جہان لڑکیوں کے ساتھ گھومنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ مجھ پر نہیں تو آپ پر لوگ انگلیاں اٹھائیں گے اور میں یہ نہیں چاہتا۔"

"میں اب اس کی پروا نہیں کرتی!" وہ کسی قدر سخت لہجے میں بولی۔ "جب لوگوں کو میری پروا نہیں تو میں کیوں ان کی پروا کروں!"

"اگر آپ کو کوئی پروا نہیں تو چلے چلیں گے، مگر وہ آپ کا ایک عدد منگیتر..."

"ذکر نہ کریں اس لعنتی کا! میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ ہرگز اس سے شادی نہیں کروں گی!" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

"اور آپ کے والدین؟ ان سے کیا کہیں گی؟ انھیں کس طرح ہموار کریں گی؟" میں نے پوچھا۔

"جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"میرا ایک مشورہ ہے، اگر آپ قبول کریں۔" میں بولا، پھر بغیر رکے کہنے لگا۔ "آپ پہلے کوئی اور مناسب بندہ تلاش کر لیں۔ ایسی صورت میں شاید آپ کے والدین کو کوئی اعتراض نہ ہو!"

میری بات سن کر اس نے بہ غور میرے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی نظریں عجیب سی تھیں۔ چند لمحے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "آپ میری سمجھ میں بالکل نہیں آئے! آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"آپ کی بہتری! اس کے سوا میرا کوئی اور مقصد و منشا نہیں ہے۔" میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ "آپ چاہیں تو مجھے اپنا ہمدرد اور دوست سمجھ سکتی ہیں!"

"صرف دوست؟" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

گھڑی بھر کو میں کچھ گڑبڑا گیا مگر فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور جواباً کہا۔ "جی ہاں خاتون، صرف دوست! اس سے زیادہ کا میں اہل نہیں ہوں۔"

"آپ اہل نہیں یا مجھے اس کا اہل نہیں سمجھتے؟" اس کی آواز میں بڑی چبھن تھی۔

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پرسکون آواز میں کہا۔ "دیکھیے خاتون، دوستی بھی معمولی بات نہیں۔ آپ اسے غیر اہم کیوں سمجھتی ہیں؟"

"مگر یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں!"

"ضروری نہیں کہ ہر سوال کا جواب دیا جا سکے۔ زندگی خود ایک سوال ہے جس کے جواب میں دفتر کے دفتر سیاہ کیے جا چکے ہیں مگر یہ سوال ہنوز جواب طلب ہے۔ کسی نے اسے عناصر میں ظہور ترتیب کا نام دیا اور کوئی اسے دیوانے کا خواب کہتا رہا اور..."

"میں کسی اور کی نہیں، اپنی اور آپ کی بات کر رہی ہوں اور اسی حوالے سے زندگی کی تشریح چاہتی ہوں۔" وہ بہ راہ راست مجھے گھیرنے لگی۔

"بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے امتحان میں نہ ڈالیں اور میں نے دوستی کی جو پیشکش کی ہے، اسے قبول کر لیں۔"

"ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی۔" اس نے طویل سانس لے کر کہا۔ وہ کیا سمجھی گیا نہیں، میں نے اس کی تشریح نہیں چاہی اور موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر بولا۔ "تو پھر چلیں گی نا آج شام کو گھومنے؟"

"کچھ دیر وہ خاموش رہی، پھر نظر جھکا کر گردن اقرار میں ہلا دی۔ وہ پھر ایک بار اداس نظر آنے لگی تھی۔ اس کی اداسی کا سبب مجھ سے زیادہ اور کون جانتا! میں نے صرف دوستی کی پیشکش کر کے گویا اس کی بقیہ توقعات پر پانی پھیر دیا تھا۔ میرے نزدیک یہ ضروری تھا۔ میں اسے کسی خوش فہمی میں مبتلا رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ پہلے ہی ایک ستم رسیدہ لڑکی تھی۔ نئی توقع اور نئے خوابوں کے زخم اسے مزید توڑ کے رکھ دیتے۔ اب سے پہلے میں نے کبھی کسی لڑکی کے

معاملے میں اس ہمزاد کی مدد اور اس کا تعاون حاصل نہیں کیا تھا‘ لیکن نفیسہ کا مسئلہ مختلف تھا۔ مجھے علم تھا کہ اگر ہمزاد ایک بار اس کے ذہن میں وہ بات بٹھا دیتا جو میں چاہتا تھا تو پھر میرے لیے کوئی مشکل نہیں رہتی۔ میری خواہش تھی کہ وہ بہ حیثیت دوست مجھے قبول کرلے اور اس سے زیادہ کوئی توقع نہ رکھے۔ اسی میں اس کی اور میری بہتری تھی۔

"میں آیا ابھی!" یہ کہہ کر میں تیزی کے ساتھ اٹھ کر خواب گاہ سے باہر چلا گیا۔ دوسرے ہی لمحے ہمزاد میرے سامنے تھا اور میں اس سے اپنی خواہش کا اظہار کر رہا تھا۔

"الٹی گنگا بہہ رہی ہے آج کل!" وہ شوخی سے بولا "ایک وہ زمانہ تھا کہ جب..."

"ہو گا! تم سے جو کہہ رہا ہوں‘ وہ کرو!" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور دوبارہ تیزی سے خواب گاہ میں واپس آگیا۔

ہمزاد میرے پیچھے ہی پیچھے خواب گاہ میں آگیا تھا۔ چند لمحوں کا کھیل تھا۔ میں نے ہمزاد کو نفیسہ کے قریب دیکھا اور پھر نفیسہ کا چہرہ کسی گلاب کے مانند کھل اٹھا۔ میں نے ہمزاد کو اشارے سے رخصت کر دیا کیوں کہ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

میں نے نفیسہ کو آزمانے کی خاطر ایک ایسا سوال کیا جو کوئی دوست ہی دوسرے دوست سے کر سکتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ "خاتون! آپ نے کبھی کسی سے عشق بھی کیا ہے؟"

"یہ آپ مجھے ‘خاتون خاتون‘ نہ کہا کریں!" وہ بے تکلفی سے بولی۔ "دوستی میں یہ تکلف اچھا نہیں لگتا‘ نام لیا کریں نا میرا!"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا!"

"کیا تو ہے عشق‘ مگر ناکام ہی سمجھیں!"

"کیوں؟"

"کامیاب میں اسے جب کہتی کہ وہ زندگی بھر ساتھ نبھانے پر آمادہ ہو جاتا۔"

"کوئی وجہ تو ہو گی انکار کی یا ناکامی کی؟"

"اسے وہ شرائط قبول نہیں تھیں جو میرے والدین کے لیے لازمی ہیں۔ میں اس کی خاطر اپنے ماں باپ کو تو نہیں چھوڑ سکتی تھی نا!"

"تو یہ سبب ہوا‘ عشق میں ناکامی کا!" میں نے طویل سانس لے کر کہا‘ پھر پوچھا۔

"آپ کی برادری ہی کا تھا وہ؟"

"پھر وہی آپ؟" اس نے مجھے ٹوکا۔

"یار‘ عادت چھوٹتے چھوٹتے ہی تو چھوٹے گی‘ تم میرے سوال کا جواب دو۔"

"برادری ورادری کا نہیں تھا۔ میرے ساتھ دفتر میں کام کرتا تھا اور... کرتا کیا تھا‘ اب بھی کام کرتا ہے۔"

"تمہارے والدین نے اعتراض نہیں کیا اس بات پر کہ وہ غیر برادری کا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"ان تک بات ہی نہیں پہنچی۔ ویسے مجھے امید تھی کہ میں انھیں راضی کر لوں گی۔"

"لیکن تم تو کہہ رہی تھیں کہ اس نے تمہارے والدین کی شرائط قبول نہیں کیں؟"

"مجھے علم تھا نا کہ وہ کیا چاہتے ہیں! یہی میں نے ایاز سے کہہ دیا تھا۔ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ اگر وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو میں نوکری نہیں چھوڑوں گی اور نہ اپنے والدین کے گھر کو خیرباد کہوں گی بلکہ اسے میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔" اس نے بتایا۔

"ایاز غالباً" انھی ذات شریف کا نام ہے‘ جنھوں نے یہ شرائط قبول نہیں کیں!" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" اس نے تصدیق کی "ویسے وہ مجھے آج بھی چاہتا ہے‘ لیکن میرا دل اس کی طرف سے کھٹا ہو چکا ہے۔ محبت قربانی چاہتی ہے اور وہ اس سے گریز کرتا ہے۔ یہ کہاں کی بات ہوئی! حالانکہ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں‘ تنہا رہتا ہے‘ اس کے باوجود میرے ساتھ رہنے پر راضی نہیں ہوا‘ خود غرض کہیں کا! کہتا تھا‘ نوکری چھوڑنا پڑے گی اور تمہیں پردے میں رکھوں گا میں! عجب دقیانوسی ذہنیت تھی اس کی! اگر مجھے پہلے سے اندازہ ہو جاتا کہ وہ ایسا ہے تو قریب ہی نہ جاتی اس کے!" وہ کچھ غصے میں آگئی۔

"خیر چھوڑو غصہ‘ یہ اپنی اپنی ذہنیت کی بات ہے‘ مگر یہ بتاؤ‘ کیا تم بھی سیریس تھیں اس کے لیے؟"

"ہاں تھی تو مگر اب نہیں ہوں۔" وہ صاف گوئی سے بتانے لگی۔

"وجہ غالباً" وہی ہو گی جو ابھی تم بیان کر چکی ہو۔ اس کے سوا تو کوئی اور بات نہیں تھی؟"

"نہیں‘ بس یہی بات تھی۔ ویسے میں اب پردے کی بُو بُو بن کر بھی نہیں رہ سکتی۔"

"تمہارے حسن بلاخیز سے ڈرتا ہو گا وہ غریب! اسی لیے پردے میں رکھنا چاہتا ہو گا" میں نے ہنس کر کہا‘ پھر بولا "یہ واقعہ کب کا ہے؟"

"تین چار سال ہو گئے۔"

"شادی تو نہیں کی اس نے ابھی؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن آپ گڑے مردے کیوں اکھاڑ رہے ہیں؟"

"اب ایسا بھی ظلم نہ کرو۔" میں معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا۔

"ظلم!... کبھی نہیں میں!" اس نے حیرانی کے ساتھ کہا۔

"یہ ظلم... تو نہیں تو کیا ہے کہ تم اس غریب کو مردہ کہہ رہی ہو!"

"میں نے کسے مردہ کہا؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "اس بے چارے کا اتنا ہی تو قصور ہے نا کہ عشق کیا اور بس!"

"ویسے میں اس کی عزت اب بھی کرتی ہوں۔" وہ سنجیدہ نظر آنے لگی۔ "اگر وہ دفتر میں نہ ہوتا..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی' پھر خود ہی ذرا دیر کے بعد بولی۔ "آپ سمجھتے ہیں نا کہ لوگ تو عورت کو بس کانچ کی گڑیا سمجھتے ہیں!... ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں نا!... وہ... اب تک میرے لیے ڈھال بنا ہوا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو... تو شاید مجھے نوکری چھوڑنا پڑتی۔"

"میرا خیال ہے کہ عزت اور محبت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہ صرف عزت کیے جانے پر مطمئن نہیں ہوگا۔ خیر اپنے اپنے احساس کی بات ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا مطالبہ اتنا خود غرضانہ بھی نہیں تھا جتنا تم نے سمجھ لیا۔ ہر آدمی اپنے طور پر زندگی کو برتنا اور محسوس کرنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک یہی مناسب رہا ہوگا کہ ہونے والی شریک حیات نوکری نہ کرے۔"

"لیکن... لیکن میں... آپ ہی بتائیں کہ اس کی خاطر اپنے ماں باپ کو کیسے چھوڑ دیتی؟" وہ بولی "ویسے ایک بار اس نے یہ پیشکش بھی کی تھی کہ الگ رہتے ہوئے وہ میرے والدین کا خرچ بھی اٹھانے کا مگر بے کا الگ ہی! ان کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہیں تھا۔"

"تو پھر اس پر تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا!"

"ابھی آپ خود کہہ چکے ہیں کہ ہر آدمی اپنے طور پر زندگی کو برتنا اور محسوس کرنا چاہتا ہے! میں... میری غیرت یہ... یہ کیسے گوارا کر لیتی۔ میں اس پر کیوں بوجھ بن جاتی اور... پھر اپنی حد تک بھی اگر یہ گوارا کر لیتی تو والدین کے سلسلے میں کس طرح اس کی پیشکش قبول کر لیتی! پھر یہ... یہ کہ میں خود کماتی ہوں' کما سکتی ہوں! یہ تو وہی بات نہ ہوئی کہ آدمی اپنی خوشی کی خاطر دوسرے کو پنجرے میں قید کر دے اور محبت کا نام دینے لگے!"

"کبھی تم نے ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کیا کہ آخر ایاز ایسا کیوں چاہتا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں!" وہ جلدی سے بولی۔ "بس خود غرضی!"

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔" میں نے پرسکون آواز میں کہا۔ "اور اس کی وجہ ہے۔ تم

ابھی کہہ چکی ہو کہ اگر ایاز دفتر میں نہ ہوتا تو تم شاید نوکری چھوڑ دیتیں۔ کہا تھا نا تم نے؟" اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی ہمارا معاشرہ اس سطح... اس ذہنی سطح تک پہنچ سکا جہاں وہ یہ بات محسوس کر سکے کہ اگر کوئی لڑکی اپنے گھر سے نکل کر نوکری کرنے آئی ہے تو اس کی وجہ ہی ہوگی! ممکن ہے' اسے حالات نے ایسا کرنے پر مجبور کیا ہو! اگر یہ گداز' یہ احساس لوگوں کے دل میں پیدا ہو جائے تو پھر وہ اس طرح کی حرکتیں نہ کریں کہ لڑکیاں... میری مراد حساس اور شریف النفس لڑکیوں سے ہے' وہ نوکری چھوڑنے کے بارے میں سوچنے لگیں۔ سمجھ رہی ہو نا تم! اس فضا میں اگر کوئی محبت کرنے والا یہ سوچتا ہے کہ اس کی محبوبہ نوکری نہ کرے تو اسے خود غرضانہ فعل نہیں کہا جا سکتا۔ بتاؤ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

جواب میں وہ کچھ نہ بولی۔ وہ کچھ سوچنے لگی تھی شاید!

"قصور کا صرف ایک ہی رخ نہیں ہوتا نفیسہ!" میں نے اسے خاموش دیکھ کر مزید کہا۔ "دوسرے کا دکھ اور اس کا مسئلہ بھی سمجھنا چاہیے۔ کچھ کھو کر آدمی کو کچھ ملتا ہے۔ زندگی میں ہر شے کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ یہ ادائیگی کہیں ایثار و قربانی کی صورت میں ہوتی ہے' کہیں مال و زر کی صورت میں اور کہیں محبت کی شکل میں! مسئلہ صرف حالات ہیں کہ ان کا اندازہ کیا ہے! کامیابی انھی کا مقدر ہوتی ہے' جو حالات کے تقاضوں کو سمجھ لیتے ہیں۔"

"مگر اب... اب ان باتوں سے کیا حاصل! میں... میں اسے ایک عرصے قبل صاف صاف جواب دے چکی ہوں۔" اس نے بجھے بجھے سے لہجے میں کہا۔

"اگر اس نے تمہارے جواب کو قبول کر لیا ہوتا تو شاید اب تک اپنا گھر بسا چکا ہوتا۔ میرا اندازہ یہ ہے اور خود تم نے بھی اس کا اقرار کیا ہے کہ وہ اب بھی تمہیں چاہتا ہے۔"

"تو... تو پھر مجھے... مجھے کیا کرنا چاہیے؟" وہ میری باتوں سے کچھ پگھلنے لگی۔

"سوچیں گے۔" میں طویل سانس لے کر بولا۔ "سوچنے سے کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔ دراصل کچھ تمہیں اور کچھ اسے دونوں ہی کو اپنے رویے میں تھوڑی لچک پیدا کرنا پڑے گی۔ خیر... فی الحال تو تم اپنے والدین سے اس سلسلے میں کچھ نہ کہو۔ پہلے یہ ضروری ہے کہ خود تم اور ایاز دونوں ذہنی طور پر ایک دوسرے کو قبول کرنے پر راضی ہو جاؤ۔ تمہیں چاہیے کہ کل سے تم اس کے ساتھ اپنا رویہ بدل دو! اور ہاں' تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کیا ایاز کو تمہاری نسبت کا علم ہو چکا ہے؟"

"ہاں میں نے خود ہی اسے یہ بات بتائی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"اس کا ردعمل کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا اور صرف ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گیا تھا۔" اس نے بتایا۔

"تم نے سوچا" کس لیے اسے یہ بات بتانا ضروری سمجھی!... یقیناً" تم نے اس پر غور نہیں کیا ہوگا۔ دراصل لاشعوری طور پر اس طرح تم اسے اذیت دینا چاہتی تھیں۔ تمہارا جذبہ انتقامی تھا کہ دیکھو اگر تم نے مجھے نہیں اپنایا' میری شرائط قبول نہیں کیں تو دوسرا شخص ان شرائط پر راضی ہو گیا۔ کیوں' ایسا ہی تھا نا؟"

"ممکن ہے' آپ کا خیال درست ہو!" اس نے اقرار کیا۔ "ہاں مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ جب اسے یہ بات بتا رہی تھی تو خود میرا سینہ دھواں دھواں تھا۔ بہ ظاہر میں خوشی کا اظہار کر رہی تھی لیکن اندر ہی اندر ٹوٹ رہی تھی۔"

"اور یہی اندر اندر ٹوٹنا محبت کی علامت ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ تم نے گھاٹے کا سودا کیا تھا تم پچھتا رہی تھیں!"

"ہاں یہ تو ہے!" اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ یقیناً" اس کے دل میں محبت کی دبی ہوئی چنگاریاں تھیں ورنہ وہ اقرار نہ کرتی۔

میں بڑی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا اور وہ بیتے لمحوں کے دکھ میں اداس ہونے لگی تھی اس لیے مجھے موضوع گفتگو بدلنا پڑا۔ "سنو نفیسہ! شام کو تو گھومنے چلو گی نا؟"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں!" وہ چونک کر بولی۔

"تو پھر اب جاؤ' تمہارے اماں ابا جانے کیا سوچ رہے ہوں گے کہ لونڈیا جا کے چپک گئی وہاں! لوٹی نہیں اب تک!" میں نے بے تکلفی سے کہا۔

"ایسے نہیں ہیں وہ!" وہ پر اعتماد لہجے میں بولی۔ "انہیں مجھ پر پورا بھروسا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو گھر سے باہر ہی نہ نکلنے دیتے!"

"میرا جی چاہا کہہ دوں' بی بی! یہ سب خوش فہمی ہے تمہاری! اس دنیا میں بڑے بڑے پڑے ہیں' سب کچھ جانتے بوجھتے کچھ نہیں کہتے۔ کچھ اپنی مجبوریوں کے سبب اور کچھ مصلحتوں اور کم ہمتی کی وجہ سے! مگر میں پی گیا اور کچھ نہ کہا۔ خواہ مخواہ اس کی دل آزاری ہوتی جو میرا مقصد نہیں تھا۔ بہرحال وہ اپنا ناشتے دان لے کر شام پانچ بجے آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

دوپہر کو عموماً" کھانا کھانے اور نماز پڑھنے کے بعد میں سونے کا عادی تھا۔ آج نہ ابھی تک نماز پڑھ سکا تھا اور نہ ہی سو سکا تھا اس لیے نفیسہ کے جاتے ہی پہلے نماز پڑھی اور پھر سو گیا۔

شام کو آنکھ کھلی تو ساڑھے چار بج رہے تھے۔ نفیسہ کے آنے میں کم وقت رہ گیا تھا اس لیے میں نے جلدی جلدی غسل کیا' عصر کی نماز پڑھی اور پھر کپڑے بدلنے لگا۔ ابھی کپڑے بدل ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میں قمیص کی آستین میں ہاتھ ڈالتا ہوا خواب گاہ سے نکلا۔ نیچے پہنچتے پہنچتے میں نے قمیص پہن لی اور بٹن لگا لیے۔

"تم تو وقت کے معاملے میں بالکل انگریز ہو!" میں نے دروازہ کھولتے ہی کہا' پھر جب اس پر بھرپور نظر ڈالی تو لباس کے انتخاب کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ "تم بس ساڑھی ہی باندھا کرو' اچھی لگتی ہے تم پر"

"ایاز بھی یہی کہتا تھا۔" وہ مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔

"تو گویا میری باتوں کا اس پر واقعی اثر ہوا ہے ورنہ اس وقت "عاشق نامراد" یاد نہ آیا ہوتا۔ میں نے سوچا اور پھر اسے نشست گاہ میں لا کر بٹھا دیا۔ "میں ابھی جوتے اور موزے پہن کر آتا ہوں' اوپر سے! تم بیٹھو آرام سے! اور اس دوران میں یہ سوچ لو کہ کہاں گھومنے چلنا ہے!" یہ کہہ کر میں نشست گاہ سے باہر آ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد نفیسہ کے ساتھ ایک ٹیکسی میں بیٹھا ہوا جناح ایونیو کی طرف جا رہا تھا۔ کچھ دیر اس علاقے میں گھوم کر ہمارا ارادہ رمنا پارک کی طرف جانے کا تھا۔ جناح ایونیو' ڈھاکہ کے اچھے علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہیں ڈھاکہ کی مشہور مسجد بیت المکرم بھی ہے اور ڈھاکہ اسٹیڈیم بھی۔ مسجد' ڈھاکہ اسٹیڈیم کے قریب ہے۔ اسٹیڈیم کی داہنی جانب مشہور اور تاریخی اہمیت کا حامل پلٹن میدان ہے۔

جناح ایونیو پہنچ کر ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پھر ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھومتے رہے۔ ہم دونوں کو دیکھ کر شاید ہی کوئی یہ کہہ سکتا کہ ہمارے تعلقات صرف دوستی کی حد تک ہیں۔

"کیوں نہ یہاں سے پیدل ہی رمنا پارک کی طرف چلیں!" میں نے تجویز پیش کی۔

"ہاں چل سکتے ہیں' دور ہی کتنا ہے یہاں سے!" وہ خوش مزاجی سے بولی۔ "مگر میرے ذہن میں کچھ اور ہی تھا' خیر چھوڑیں!"

"بتاؤ نا کیا تھا؟" میں پوچھا۔

"میں فلم دیکھنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ہم اس وقت گلستان سینما کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

"پھر کبھی سہی!" میں بولا۔ "ساری خوب صورت شام وہیں غارت ہو جائے گی۔ دیکھو کیسے حسین بادل گھر گھر کے آ رہے ہیں! کیسا اچھا موسم ہے! اس موسم میں تو جھیل کنارے زیادہ لطف آئے گا۔ کیوں ہے نا؟" میں نے اس سے تصدیق چاہی۔

"وہ تو ٹھیک ہے بادل تو مجھے بھی اچھے لگ رہے ہیں، مگر برسنے لگے تو سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔" وہ ہنس کر بولی۔

"کیوں، بھیگنے میں بھی تو لطف آتا ہے!"

"اور تماشا بھی بن جاتا ہے آدمی!" وہ شوخی سے بولی۔ "خاص طور پر لڑکیاں تو واقعی دیکھنے کی چیز بن جاتی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔

"میں اس کا اشارہ سمجھ گیا اور خود بھی ہنسنے لگا۔ پھر کہا۔ "ایسا کرتے ہیں کہ پیدل چلنے کی بجائے رمنا پارک کے لیے ٹیکسی کر لیتے ہیں یہاں سے! وہیں گپ لڑائیں گے، جھیل کے کنارے!"

رمنا پارک سے گرین روڈ کی طرف جاتے ہوئے ایک خوب صورت جھیل تھی۔ میں اور نفیسہ، ٹیکسی میں بیٹھ کر ذرا دیر ہی میں وہاں پہنچ گئے۔ نفیسہ نے میرے تجویز فوراً" مان لی تھی۔

ایک تو چھٹی کا دن تھا، دوسرا موسم بھی خوش گوار اس لیے جھیل کے کنارے کنارے سبزہ زار پر خاصے لوگ موجود تھے۔ میں کسی مناسب جگہ کی تلاش میں نفیسہ کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک دم ٹھٹک گیا۔ سامنے سے ایک جوڑا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آتا دکھائی دیا۔ یہ دونوں ہی میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ میں ان دونوں کو خلاف توقع وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے ان دونوں کو پہلی بار چاٹگام کے ایک پارک میں دیکھا تھا۔ لڑکے کا نام زاہد تھا اور لڑکی کا نام ثمینہ! یہ وہی ثمینہ تھی جو مہ پارہ کے ایما پر میرے پیچھے لگ گئی تھی اور میں بہ مشکل اس سے جان چھڑا سکا تھا۔ یہ دونوں ڈھاکہ ہی کے رہنے والے تھے۔ ثمینہ شادی شدہ اور تین بچوں کی ماں تھی اور عمر میں بھی زاہد سے بڑی۔ زاہد کنوارا تھا۔ ثمینہ اس کے ساتھ اپنے بچوں اور شوہر کو چھوڑ کر فرار ہو گئی تھی۔ وہ دونوں فرار ہو کر چاٹگام پہنچے تھے۔ چاٹگام تک کے واقعات یہ تھے کہ ثمینہ کو اپنے بچوں کی محبت ستا رہی تھی۔ وہ بغیر طلاق لیے زاہد سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی اور زاہد اس پر بضد تھا۔ ان دونوں کی گفتگو سن کر ہی مجھے ان کے حالات سے

آگہی ہوئی تھی اور مہ پارہ نے ثمینہ کو اپنی پُراسرار قوت کے اثر میں لے کر مجھے پھانسنے کے لیے ایک اور ہی چکر چلا دیا تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں مجھے پھر کہیں نظر نہیں آئے تھے۔ وہ دوبارہ کیسے مل گئے؟ اور پھر ڈھاکہ کس طرح واپس آ گئے؟ اس سے میں بے خبر تھا۔ ڈھاکہ سے تو وہ دونوں فرار ہوئے تھے، پھر یہاں کیسے واپس آ گئے؟ انھیں دیکھتے ہی چند ہی لمحوں میں تیزی کے ساتھ سارے واقعات میرے ذہن میں تازہ ہو گئے۔ ابھی دونوں چند گز کے فاصلے پر تھے۔

میں لاشعوری طور پر ٹھٹک کر رک گیا تھا اور اس بات کو غالباً" نفیسہ نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ بولی "کیا ہوا؟ رک کیوں گئے؟"

میں چونک اٹھا۔

"ہاں... ہاں چلو۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ شاید نفیسہ نے یہ بات محسوس نہیں کی ہو گی کہ ان دونوں کو آتے دیکھ کر میرے قدم خود بہ خود رک گئے تھے، مگر ایسا نہیں تھا۔ اس بات کا علم مجھے فوراً" ہی ہو گیا۔ نفیسہ نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔ کیا ان دونوں کو آپ جانتے ہیں؟" اس کی آواز دھیمی ہی تھی کیوں کہ اب وہ دونوں مزید قریب آ گئے تھے۔

"ہاں۔"

میں جھوٹ نہ بول سکا۔ "خیر چھوڑو آؤ!" میں نفیسہ کو ساتھ لیے ایک طرف ہو گیا۔

جب وہ دونوں مجھ سے کچھ فاصلے پر باتیں کرتے ہوئے گزر رہے تھے تو نہ چاہتے ہوئے بھی میں ان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"ثمینہ! تم کچھ بھی کہو، یہ کانٹا تو نکالنا ہی پڑے گا۔ زاہد اس سے کہہ رہا تھا۔

"اس جگہ تو ایسی باتیں نہ کرو۔" ثمینہ کی دبی دبی سی آواز سنائی دی۔ ہمارے ارد گرد اور لوگ بھی ہیں! تم میں ذرا عقل نہیں!"

"تو پھر کب کروں یہ بات! کہاں کروں؟" زاہد کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔

"صبر سے کام لو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں جلد ہی اس سے..." وہ دونوں دور چلے گئے اور ثمینہ کی آواز ہجوم کے شور میں دب گئی۔ آدمی چاہے نہ چاہے لیکن اس کے علم میں کوئی ایسی بات آ جائے تو حقیقت تک پہنچنے کا تجسس دل میں پیدا ہوتا ہی ہے۔ ہر چند کہ وہ دونوں میرے لیے قطعی اجنبی تھے، ان سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا، بس چاٹگام میں کچھ وقت اس کی باتیں سننے اور پھر اس لڑکی سے جان چھڑاتے ہوئے عرصہ گزرا تھا، مگر اس کے باوجود

میں لاتعلق نہ برت سکا۔ یقیناً" ثمینہ مجھے نہیں پہچان سکی تھی اور پہچانتی بھی کیسے! اب تو میرا ظاہری بدل چکا تھا۔ اس کے نوجوان عاشق نے لفظ کانٹا کس کے لیے استعمال کیا ہو گا' یہ بات مجھ پر چھپی نہ تھی۔ "یہ کانٹا تو نکالنا ہی پڑے گا۔" اس کا مطلب سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ یہ جملہ یقیناً" اس نے ثمینہ کے شوہر شوکت کے لیے استعمال کیا تھا' گویا وہ ثمینہ کے شوہر کو قتل کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا اور ثمینہ سے اس کی تائید چاہ رہا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے نظرانداز کر دیا جاتا۔

"کیا غلط ہے؟ کیا نہیں ہونے دیں گے آپ؟ کچھ مجھے بھی تو بتائیں نا بھئی!" نفیسہ نے مجھے مخاطب کیا۔

میں چونک اٹھا اور جھنیپ مٹانے کی خاطر ایک دم ہنس پڑا۔ "کچھ نہیں یار! میں ایسے ہی فنٹشی مار رہا تھا۔"

"فنٹشی!... یہ کس چڑیا کا نام ہے؟" وہ ہنس کر پوچھنے لگی۔

"فنٹشی بس فنٹشی ہوتی ہے!" میں ہنس کر بولا۔ "اس کا نعم البدل کوئی لفظ نہیں۔"

"ویسے بائی دی وے' آپ کو بیٹھے بیٹھائے ہو کیا گیا تھا؟" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"بس یوں ہی کبھی کبھار چل نکلتا ہوں' کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے بات کو ٹالنے کی خاطر کہا۔

"ان خاتون سے کوئی پرانا چکر تو نہیں چل رہا جو ابھی لہراتی بل کھاتی ہوئی کسی کا ہاتھ تھامے ادھر سے گزری تھیں؟ سچ بتا دیں' کہوں گی نہیں کسی سے! اس لیے کہ جب سے وہ خاتون ادھر سے گزری ہیں' آپ کا حال بے حال ہے اور بہ قول خود آپ کے' آپ چل نکلے ہیں!"

"نہیں نا یار' ایسی کوئی بات نہیں! تم خواہ مخواہ پر کا کوا بنا رہی ہو۔"

"یہ اقرار تو آپ کر ہی چکے ہیں کہ ان دونوں کو جانتے ہیں' اب ذرا تفصیلی تعارف بھی کرا ہی دیں۔" وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

"تم تو جھاڑ کا جھینھرا ہو گئیں!" میں زچ ہو کر بولا۔

"یہ کیا ہوتا ہے؟"

"بس ہوتا ہے! ہر بات تو بتائی نہیں جا سکتی نا!"

کچھ بھی ہو لیکن میں بہرحال جھینھرا ہرگز نہیں ہو سکتی! ہاں آپ جھینھری کہتے

تو شاید میں یقین کر لیتی۔" وہ شوخی پر اتری ہوئی تھی۔

"اچھا چلو جھینھری سہی! اب خوش!" میں نے مصالحانہ انداز میں کہا۔

"غرض کہ آپ مجھے لفظوں کے اس گورکھ دھندے میں پھنسا کر بتائیں گے نہیں اصل بات! ایسا ہی ہے نا؟"

"کوئی بات ہو تو بتاؤں بھی! ویسے کیا یہ ممکن نہیں' تم کچھ دیر خاموش رہ کر موسم کے حسن کو محسوس کرو! دیکھو جھیل کا پانی یہاں سے کتنا اچھا لگ رہا ہے' اور وہ پرندے دیکھ رہی ہو! کس طرح قطار بنا کے آگے پیچھے اڑتے جا رہے ہیں۔!" میں نے ایک طرف اشارہ کیا۔

وہ میری باتوں میں آ ہی گئی۔ میں اسے بتاتا بھی تو کیا بتاتا! بہ ظاہر تو میں موسم لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن درحقیقت میرا ذہن انھی میں الجھا ہوا تھا۔ وہاں اب میرا جی قطعی نہیں لگ رہا تھا۔ جب آدمی کے اندر موسم تبدیل ہو جائے تو باہر کا موسم بھی ویسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ نفیسہ موسم کے حسن اور نظاروں کی دل کشی میں کھوئی ہوئی تھی۔ ایسے میں اگر میں اس سے واپسی کے لیے کہتا تو یقیناً" یہ ظلم ہوتا۔ وہ محروم لڑکی شاید ایک طویل عرصے کے بعد اپنے ماحول کے حبس اور حالات کی گھٹن سے باہر نکلی تھی۔ اس کے انداز و اطوار سے یہی ظاہر ہو رہا تھا' لیکن میرا ذہن کہیں اور ہی تھا میں یہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد گھر پہنچ کر ہمزاد کے ذریعے ان دونوں کے حالات سے واقف ہو جاؤں اور اس سلسلے میں فوری طور پر جو ممکن ہو' وہ کروں۔ یہ معاملہ میرے اندازے کے مطابق ایک بے گناہ شخص کے متوقع قتل کا تھا اور یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی۔ بہرحال یہ غلط ہی ہوتا کہ میں مقدور رکھنے کے باوجود خاموش رہتا۔

وہ لمحہ غالباً" قبولیت ہی کا تھا۔ بس اچانک یہ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ صرف چند ہی جوڑے اور کچھ ہی افراد پھوار کے باوجود وہاں رکے باقی سب جلدی جلدی اپنے اپنے گھر کی راہ لینے لگے۔ انھی میں نفیسہ بھی تھی اور میں بھی!

"آپ تو کہہ رہے تھے کہ بھیگنے میں بھی مزہ آتا ہے!" وہ میرے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی بولی۔

"اور اپنی بات بھول گئیں کہ لڑکیاں تماشا بن جاتی ہیں!" میں نے بھی جواباً" کہا۔ "تو میں تمھیں تماشا تو نہیں بنانا چاہتا نا!"

پھوار کے ساتھ ہی تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ نفیسہ کی زلفیں اس تیز ہوا سے بکھر رہی تھیں اور وہ بار بار انھیں سنوار رہی تھی۔ اس کی سادگی بھی اسے پریشان کر رہی تھی۔

بہر حال کسی نہ کسی طرح کافی وقت کے بعد ہمیں ایک ٹیکسی مل ہی گئی۔ اس دوران میں نفیسہ اور میں دونوں ہی تقریباً" بھیگ گئے تھے۔ میں دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا کہ کہیں میرے اندر چھپا ہوا شیطان مجھے آزمائش میں نہ ڈال دے۔

محمد پور پہنچ کر میں نے نفیسہ کو اس کے گھر کے دروازے پر اتارا کیوں کہ اس وقت تک پھوار' تیز بارش میں بدل چکی تھی۔

"پکوڑے تلنے کا موسم ہے۔" وہ چلتے چلتے بولی۔ "کہیں تو لاؤں تل کے؟"

"نہیں۔" میں نے ٹیکسی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ جلدی سے جا کر کپڑے بدل لو ورنہ زکام ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر میں نے ٹیکسی والے کو اشارہ کیا اور بولا۔ "اب ذرا اس طرف سامنے والے مکان کے دروازے پر روک لو' میں اتنے میں پیسے نکالتا ہوں۔"

میں نے ٹیکسی والے کو منہ مانگے پیسے دیے تھے اس لیے اس نے انکار نہیں کیا اور ٹیکسی موڑ ماڑ کر میرے گھر کے دروازے سے لگا دی۔ میں نے اسے پیسے ادا کیے اور ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اتر گیا۔

گھر میں پہنچتے ہی میں نے لباس تبدیل کیا' مغرب کی نماز پڑھی اور پھر فوراً" ہی ہمزاد کو طلب کر لیا۔

"ارشاد عالی!" ہمزاد ظاہر ہوتے ہی میرے سامنے مودبانہ جھکا۔ "پکوڑے حاضر کروں یا گرم گرم چائے؟"

اس کا انداز ایسا ہی تھا کہ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "تم تو اس طرح میرے سامنے آداب بجا لا رہے ہو جیسے میں بادشاہ سلامت ہوں اور تم میرے خادم!"

"میرے تو بادشاہ ہی ہیں آپ! حکم کریں بس وہ بہ دستور ریشہ خطمی رہا۔

"اچھا تو خادم صاحب بیٹھئے! معاملہ بہت سنگین ہے۔"

"اور شاید رنگین بھی!" اس نے فوراً" ہی گویا گرہ لگائی۔

"قافیہ آرائی کی بات نہیں ہو رہی!" میں سنجیدہ ہو گیا۔ "یہ ایک شخص کے قتل کا معاملہ ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے تفصیلات سے آگاہ کر دیا' پھر بولا۔ "تم معلوم کر کے آؤ کہ یہ کیا چکر ہے! کیا واقعی میرا قیاس درست ہے؟ یعنی کیا زاہد' ثمینہ کے شوہر شوکت کو قتل کرنا چاہتا ہے؟"

جواباً" خلاف توقع ہمزاد نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"کیا ہوا تمہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اب اسی کام کا رہ گیا ہوں میں! کہاں وہ دن تھے کہ روشان خوش اندام و خوش خرام و خوش کلام کو کشاں کشاں..."

"بکواس نہ کرو اور جو میں نے کہا ہے وہ کرو!"

"آپ تو بس خدائی فوج دار بن گئے ہیں! خیر... جو حکم! چلا بندہ!" یہ کہتے ہی وہ غائب ہو گیا۔

ہمزاد کو گئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ معاً" میرے ہاتھ پیروں میں اینٹھن سی ہونے لگی۔ میں نے بستر سے اٹھنا چاہا' مگر ناکام رہا۔ پھر عجیب سی سرسراہٹیں کمرے میں گونجنے لگیں۔ میرے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ معلوم نہیں وہ بجلی کا کڑاکا تھا یا کچھ اور! مجھے تو بس یوں لگا تھا جیسے کہیں بجلی گری ہو۔ بارش اب تک ہو رہی تھی اور بادل بھی گرج رہے تھے۔ غالباً" اسی لیے میں اس خطرے کی نوعیت کو پوری طرح سمجھ نہیں سکا۔

میں اپنی خواب گاہ میں بستر سے پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ معاً" مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میرے دونوں پیر کسی سخت گرفت میں آ گئے ہیں۔ میں نے ایک دم گھبرا کر اپنے پیروں کی طرف دیکھا اور پھر ـــــ میرے سارے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ وہ بھورے رنگ کا ایک بڑا سانپ تھا جس نے میرے دونوں پیروں کو جکڑ لیا تھا۔ وہ یوں میرے پیروں سے لپٹا ہوا تھا جیسے کسی نے کس کر رسی باندھ دی ہو۔ اس کی وجہ سے میرا دوران خون بھی متاثر ہو رہا تھا۔ سانپ کا پھن میری نظر سے اوجھل تھا۔ پھن مجھے اپنی ایک پنڈلی پر محسوس ہو رہا تھا۔

اس ابتلا کے سبب کچھ دیر کو میرے حواس گم ہو گئے۔ میری سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے! مجھے علم تھا کہ جن علاقوں میں بارش بہ کثرت ہوتی ہے' وہاں حشرالارض کی بہتات بھی ہوتی ہے۔ وہاں سانپ کا پایا جانا کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی' مگر یہ معاملہ ہی کچھ اور معلوم ہو رہا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ میرے حواس بحال ہوتے ایک مرتبہ پھر مجھے اپنے قریب ہی مسہری پر تیز سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اسی کے ساتھ مجھے اپنی پشت پر کسی سانپ کے رینگنے کا احساس ہوا۔ دوسرے ہی لمحے میرا شبہ' یقین میں بدل گیا۔ وہ سانپ انتہائی سرعت کے ساتھ میری پشت سے رینگتا ہوا گردن تک آ گیا' میں نے اس کے پھن کا لمس اپنی گردن پر محسوس کیا تھا۔ پھر وہ مجھے نظر بھی آ گیا۔ وہ اب میری گردن میں لپٹ رہا تھا۔

بس اچانک ہی اپنی زندگی کو شدید خطرے میں محسوس کر کے مجھے جیسے ہوش آ گیا۔

میں پوری قوت سے چیخ اٹھا۔ "ہمزاد"

اسی وقت مجھے یوں لگا جیسے میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ گردن میں لپٹنے والے سانپ نے بہت تیزی کے ساتھ اپنی گرفت سخت کر دی تھی۔ میری آنکھوں میں اندھیرا اترنے لگا اور پھر یہی اندھیرا میرے پورے حواس پر چھا گیا۔ میں یقیناً" اپنے ہوش کھو بیٹھا تھا۔

پھر جانے کتنی دیر بعد میں اپنے حواس میں آیا تھا۔ حواس بیدار ہوتے ہی مجھے ہمزاد کی آواز سنائی دی تھی۔ "کیسے ہیں اب آپ؟"

میں نے آنکھیں کھول دیں اور محسوس کیا کہ اپنے بستر پر دراز ہوں اور ہمزاد میرے سرہانے مجھ پر جھکا ہوا ہے۔ حواس کھونے سے پہلے جو منظر آخری بار میں نے دیکھا تھا' لمحے بھر کو میری آنکھوں میں گھوم گیا اور مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ میں زندہ اور صحیح سلامت تھا' اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ میرے ذہن میں اس وقت جو خیال آیا درست تھا۔

"اب تو جسم میں اینٹھن محسوس نہیں ہو رہی؟" ہمزاد نے مجھے خاموش دیکھ کر پھر سوال کیا۔ اس نے یقیناً" سب کچھ معلوم کر لیا تھا کہ مجھ پر اس کے پیچھے کیا گزری ہے!

میں نے اپنے جسم کو جنبش دی۔ جسم میں ہلکا سا تشنج تو تھا مگر وہ کیفیت نہیں تھی جو پہلے پہل تھی۔ میں نے ہمزاد سے اس کا اظہار کر دیا۔

"ابھی یہ بھی نہیں رہے گی' فکر نہ کریں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا ایک ہاتھ میرے سارے جسم پر پھیرا۔ "بس چند لمحے بعد ہی آپ پہلے کی طرح خود کو تروتازہ محسوس کریں گے۔ میری غیر موجودگی میں اس خبیث شمبھو کو آپ پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا اور یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ ہوش کھونے سے پہلے آپ نے مجھے پکار لیا۔ چند لمحے بھی تاخیر ہو جاتی تو شاید..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"غالباً" تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ چند لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو میری زندگی کا چراغ گل ہو جاتا!" میں نے اپنی دانست میں اس کی بات پوری کر دی۔

"شاید!" وہ متفکرانہ لہجے میں بولا۔ "اگر وہ اذیت پسند نہ ہوتا تو فوری طور پر اس موقع سے فائدہ اٹھاتا۔ وہ دونوں سانپ انتہائی زہریلے تھے جنہیں میں نے چشم زدن میں خاک کر دیا۔ شمبھو چاہتا تو وہ دونوں آپ کے پیروں اور گردن سے لپٹنے کی بجائے فوراً" آپ کو ڈس لیتے! لیکن غالباً" وہ اس طرح آپ کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ شاید یہ چاہتا ہو گا کہ آپ دہشت زدہ ہو کر دم گھٹنے سے آہستہ آہستہ موت کے نزدیک ہوتے جائیں۔ اس دوران میں وہ شیطانی عمل بھی کر رہا ہو گا جس کے سبب آپ کو اپنے جسم میں پہلے اینٹھن محسوس ہوئی۔ اس طرح اس

نے بڑی حد تک آپ کے جسم کو پہلے ہی تقریباً" مفلوج کر دیا تھا۔ بہرحال جو بھی ہوا سو ہوا' لیکن اس سے ایک فائدہ ضرور ہو گیا۔" یہ کہہ کر ہمزاد نے طویل سانس لیا۔

"وہ کیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"وہ ایک بار پھر میری نظر میں آ گیا۔ اس سے میرا رابطہ قائم ہو گیا۔" ہمزاد نے بتایا۔

"کیا وہ اسی مکان میں ہے؟"

"ہاں۔"

"اور سریتا؟"

"وہ بھی اس کے ساتھ ہے۔" ہمزاد نے جواب دیا۔ "وہ اپنے شیطانی عمل میں مصروف تھا اس لیے کچھ دیر کو اسے میری طرف سے اپنی توجہ ہٹانا پڑی ورنہ جانے کب تک میں اس کی طرف سے لاعلم ہی رہتا۔ اب میں نے یہ بندوبست بھی کر لیا ہے کہ دوبارہ رابطہ منقطع نہ ہو سکے۔" ہمزاد نے بتایا۔

اب میں خود کو بالکل ٹھیک ٹھاک محسوس کر رہا تھا۔ جسم میں نام کو بھی تشنج نہیں رہا تھا اس لیے میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور خوش گوار لہجے میں ہمزاد کو مخاطب کیا۔

"چلو میری زندگی خطرے میں پڑنے سے کچھ تو فائدہ ہوا!"

"اور بھیجیں مجھے لڑکیوں کی انکوائری کرنے؟"

وہ بھی میرا خوش گوار لہجہ دیکھ کر اپنی پر آ گیا۔ "کہا تھا مان جائیں' مگر کہاں! مارے محبت کے کلیجہ پھٹا جا رہا تھا"

"احمق ہو تم تو! مجھ سے کیا علاقہ اس کا!"

"ایسے ہی کہتے ہیں اور پھر بعد میں سارا علاقہ ہتھیا لیتے ہیں' نہ پھر نشیب دیکھتے ہیں لوگ نہ فراز! یہ بھی میرا وہ بھی میرا!"

"بکواس کیے جاؤ گے کہ کچھ بتاؤ گے بھی کہ ہوا کیا؟ جس لیے بھیجا تھا تمہیں!"

"بس چند ہی لمحے بعد تو بلا لیا تھا آپ نے مجھے! اتنی سی دیر میں کیا خاک معلوم کرتا!"

"خیر چند لمحے بھی نہیں تھے' اب تم اتنی گپ بھی نہ چھوڑو۔"

"چلیں چند منٹ سہی! اگر چند منٹ کافی تو نہیں ہوتے!"

"گویا تم کچھ بھی معلوم نہیں کر سکے؟" میں نے اسے گھور کر دیکھا کیوں کہ یہ ناممکن سی بات تھی' وہ کچھ بھی معلوم نہ کر سکا ہو۔ اس کے لیے اتنا وقت بھی کم نہیں تھا۔ یقیناً" وہ مجھے ستانے کے موڈ میں تھا۔

"اس طرح گھور کر دیکھیں گے تو کچھ نہ کچھ بتانا ہی پڑے گا۔" پھر اس نے وہ کہانی سنانا شروع کی جس کے ابتدائی واقعات چانگام ہی میں مجھے معلوم ہو چکے تھے۔ زاہد اور ثمینہ کے چانگام پہنچنے تک کے واقعات بتا کر وہ خاموش ہو گیا۔

"پھر؟... پھر کیا ہوا؟" میں نے اسے خاموش دیکھ کر بے تابی سے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟" یہ جاننے کے لیے کل کا اخبار ملاحظہ کیجیے!"

"تم پھر سرک گئے!"

"وہی تو اور وہیں تک تو بتاؤں گا جو معلوم کر کے آیا ہوں! کیا اپنی طرف سے ٹھونکنے لگوں!"

"تم نے جو واقعات بیان کیے ہیں' یہ تو میرے علم میں بھی تھے۔ اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ ڈھاکے کیسے لوٹ آئے؟... خیر اب معلوم کر لیا؟"

"جی نہیں۔" وہ فوراً بول اٹھا۔

"کیا جی نہیں؟"

"اب میں آپ کو تنہا چھوڑ کر جانے والا نہیں ہوں کہ وہ کمینہ پھر موقع پا کر اپنی کمینگی پر آ جائے۔"

"یہ تو برا ہوا" میں دانستہ فکرمند لہجے میں بولا۔

"کیا؟"

"اس بہانے تو تم ہر وقت مجھ پر مسلط رہو گے! میرا تو جینا دوبھر کر دو گے تم!"

"میرے ساتھ رہنے پر تو آپ اتنی ناک بھوں چڑھا رہے ہیں اور ان مسمات نفیسہ بیگم کے ساتھ سارا دن گزار دیا تو کچھ نہیں!" ہمزاد بولا۔

"ہاں' وہ میں تم سے نفیسہ کے متعلق بھی بات کرنا چاہتا تھا۔ تم نے اچھا کیا ذکر چھیڑ دیا اس کا!"

"کیوں' کیا فیصلہ کر ہی لیا آز؟" اس نے مسکرا کر کہا۔

"کس بات کا فیصلہ؟"

"گھر بسانے کا فیصلہ اور کیا!"

میں ہنس دیا۔ "پاگل ہو تم! ایسے میں نے گھر بسانے کا فیصلہ تو کیا ہے' مگر اپنا نہیں اس کا گھر!"

"اس کا گھر آپ بسائیں گے! گویا رخصتی اس کی نہیں آپ کی ہو گی! بھئی سبحان اللہ!

کی گھر داماد بنیں گے آپ!"

"تمہارا سر بنوں گا!" میں جھنجلا گیا۔

"معاف کیجئے' وہ تو آپ نہیں بن سکتے۔"

"باز آ جاؤ! کیوں تمہاری موت ڈنڈ پیل رہی ہے! اب بھی وقت ہے سدھر جاؤ۔ ہر وقت ہنکی لگایا کرتے!"

"موت کا ڈنڈ پیلنا اور ہنکی لگانا! ذرا ارشاد ہو کہ یہ کون سی اردو ہے؟ آپ میری اردو میں بہت کیڑے نکالتے تھے' آج پکڑے گئے!"

اس وقت جو معاملات درپیش تھے میرے نزدیک سبھی توجہ طلب اور سنجیدگی سے غور کرنے کے تھے۔ ہمزاد شاید انھی کی طرف سے میری توجہ ہٹانے کی خاطر ادھر ادھر کی اڑا رہا تھا کہ میرے ذہن پر دباؤ نہ رہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی مجھ پر قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا۔ میں ایک خطرناک صورت حال سے گزرا تھا۔ موت گویا میرے بہت قریب آ کر واپس چلی گئی تھی۔ ہمزاد کے خلوص نیت سے مجھے انکار نہیں تھا' لیکن بہرحال یہ شمبھو کے مسئلے کا حل نہیں تھا کہ اس کی طرف سے توجہ ہٹالی جائے یہی سوچ کر میں سنجیدہ ہو گیا اور ہمزاد کو بھی احساس کچھ ہی دیر میں ہو گیا۔

"بہت ہو گیا اب!" میں نے بالآخر ہمزاد سے کہہ ہی دیا۔ "اب اس سے دو دو ہاتھ کرنا ہی پڑیں گے۔"

"یعنی؟"

ہمزاد نے وضاحت چاہی۔

"یعنی یہ کہ بس آج رات ادھر یا ادھر! میں اب مزید صبر نہیں کر سکتا! آج میں بھی ہاں گا تمہارے ساتھ اور جو ہو گا' دیکھا جائے گا!"

"وہ جوابی حملے کا منتظر ہو گا!" ہمزاد نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"ہوا کرے! بہت ہو گئی احتیاط!" میں نسبتاً تیز لہجے میں بولا۔ "پانی اب سر سے گزرنے لگا ہے۔ وہ کمینہ شاید مجھے بزدل سمجھ بیٹھا ہے! اسے شاید معلوم نہیں کہ میرے اندر کتنا زہر بھرا ہوا ہے! میں نے اگر خود ہی اسے زہر کو مار رکھا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں شیخ کرامت نہیں رہا!" لمحہ بہ لمحہ میرا غصہ بڑھتا گیا۔ "شمبھو کو آج رات معلوم ہو جائے گا کہ اس کے مقابلے پر کون ہے! اچھا کہیں گا!"

"آج آپ مجھے بہت عرصے بعد وہی پہلے والے شیخ کرامت محسوس ہو رہے ہیں۔"

ہمزاد نے دبے دبے لہجے میں خیال آرائی کی۔ "بالکل وہی شخص جو کبھی خطرات سے منہ نہیں موڑتا تھا۔"

"ہاں میں وہی ہوں! صرف اتنا تغیر مجھ میں ضرور ہوا ہے کہ اب میرا سارا غصہ بدی کے لیے ہے اور شمبھو مجسّم بدی ہے!"

اس کے بعد ہمزاد میرا اشارہ پا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نصف شب گزرنے کے بعد شمبھو سے نمٹنا چاہتا تھا اور اس کا اظہار میں نے ہمزاد سے کر دیا تھا۔ اس وقت تک میں اس معاملے پر غور و فکر کرنا چاہتا تھا جس کے لیے تنہائی ضروری تھی۔

غصے کی زیادتی میں عموماً" بھوک پیاس اڑ جاتی ہے۔ اس رات اسی لیے کھانے کو بھی میرا جی نہ چاہا۔ پھر ادھر بارہ بجے ادھر میں نے ہمزاد کو طلب کر لیا۔

"چلو اس کمینے کی طرف!" میں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

ہمزاد میرے چہرے پر نگاہ ڈال کر کچھ نہ بولا۔ غالباً" اس نے اندازہ لگایا تھا کہ میں ابھی تک غصے میں ہوں۔

پھر کچھ ہی دیر بعد ہمزاد نے مجھے ہلدام تلی گھاٹ پہنچا دیا' بوڑھی گنگا کے کنارے اس جگہ جہاں میرے دشمن شمبھو کا قیام تھا اور جہاں سریتا تھی! اس وقت میرے سارے جسم میں بجلی سی کوند رہی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اپنے دشمن کو للکاروں کہ دیکھ میں آ گیا ہوں! نکل اپنے بل سے' بزدل کہیں کے! اب تو میری سریتا پر ظلم نہیں ڈھا سکے گا! سامنے ہی مجھے وہ مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا جہاں میرے دشمن نے پناہ لے رکھی تھی۔ فیصلہ کن لمحات پہنچے تھے۔



پھر اس سے پہلے کہ میں' ہمزاد کو کوئی حکم دیتا' اس نے خود ہی مجھے مخاطب کیا۔ "میں اور گھسنے کی کوشش کرتا ہوں' آپ فی الحال یہیں ٹھہریے۔"

"لیکن..." میں کچھ کہتے کہتے رک گیا' پھر بولا۔ "ٹھیک ہے' جاؤ! اور... سنو یہ... یہ خیال رکھنا کہ سریتا..." شدّتِ جذبات کے سبب مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"آپ مطمئن رہیں۔" اس نے مجھے تسلی دی اور پھر دوسرے ہی لمحے' میں نے اسے آندھی اور طوفان کے مانند سامنے والے مکان کی طرف جھپٹتے دیکھا۔ اس لمحے مجھے بس ایک زنّانے کا سا احساس ہوا تھا۔

یہ زنّاٹا یقیناً ہمزاد کی تیز رفتاری کے سبب ہو گا۔ وہ غالباً" دانستہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا تاکہ میں اسے دیکھ سکوں۔ مکان کے باہر بہرحال اتنی روشنی تو تھی کہ میرا ہمزاد مجھے نظر آتا رہتا۔ اس گلی میں کافی کافی فاصلے سے بجلی کے کھمبے لگے ہوئے تھے۔ ہاں مکان کے اندر مکمل اندھیرا تھا۔

شاید ایک ہی لمحہ گزرا ہو گا کہ میری سماعت سے زبردست کڑاکے کی آواز ٹکرائی اور میں اچھل پڑا۔ اسی کے ساتھ میں نے مکان کی بیرونی سمت میں بجلیوں کے کوندے سے لپکتے دیکھے۔ بجلی کے یہ کوندے میرے ہمزاد کی اطراف اس طرح پھیل گئے تھے جیسے اسے اپنی گرفت میں لے لینا چاہتے ہوں۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ بہ ظاہر جو فضا پرسکون نظر آرہی تھی حقیقتاً" پرسکون نہیں تھی۔ میرا دشمن چوکنا تھا۔ اس نے لازماً" اپنی حفاظت کا بندوبست کر رکھا تھا کہ کوئی مکان میں داخل نہ ہو سکے۔ میں نے واضح طور پر دیکھا کہ میرا ہمزاد کوندوں کے اس جال کو توڑ کر نکل گیا۔

چند ہی لمحے بعد ہمزاد اس مکان میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے یقیناً شمبھو کا حصار توڑ دیا تھا اور ایسا وہ پہلے بھی ایک بار کر چکا تھا۔ یہ واقعہ نارائن گنج کا تھا۔ ہمزاد کو غالباً" اس حفاظتی

حصار کا اندازہ ہو گیا تھا اسی لیے وہ اپنی پوری قوت اور تیز رفتاری کے ساتھ اس سے ٹکرایا تھا۔ یہ سوچ کر میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا کہ ہمزاد کو ناکامی نہیں ہوئی تھی۔

معاً" مکان کے اندر سے مجھے ایک تیز چیخ سنائی دی اور یہ تیز چیخ یقیناً سریتا ہی کی تھی۔ اس تیز چیخ نے جیسے میرے وجود کو دو نیم کر دیا۔ اور جیسے اپنے ہوش میں نہ رہا۔

"سریتا!" میں چیخ اٹھا اور پھر اسی کے ساتھ تیزی سے مکان کی طرف دوڑا۔ "میں آرہا ہوں... آرہا ہوں سریتا!" میں بھاگتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

چند فرلانگ کا فاصلہ میں نے لمحوں میں طے کر لیا۔ اس وقت نہ مجھے یہ ہوش تھا کہ اس مکان کے گرد حفاظتی حصار قائم ہے اور نہ یہ احساس تھا کہ مکان کا دروازہ اندر سے بند ہے' میں اس میں داخل نہیں ہو سکتا! آدمی ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جائے تو کب اسے کچھ یاد رہتا ہے! میں دوڑتا ہوا جیسے ہی اس مکان کے دروازے تک پہنچا کسی نادیدہ قوت نے مجھے ایک جھٹکے سے پیچھے دھکیل دیا۔ مجھے یوں لگا جسے میرے سارے جسم میں آگ سی لگ گئی ہو۔ میں زمین پر گرتے ہی ایک بار پھر اٹھا اور تکلیف و اذیت کے باوجود دوبارہ دروازے کی طرف لپکا۔ مکان کے اندر سے اب تک عجیب عجیب سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں' کبھی گھٹی گھٹی سی چیخیں' کبھی تیز سرسراہٹیں اور کبھی ایسی آوازیں جیسے تیز آندھی کا شور ساری فضا کو اپنی لپٹ میں لیے ہو۔ یقیناً میرے ہمزاد اور شمبھو کے درمیان معرکہ آرائی جاری تھی۔ اس معرکہ آرائی میں سریتا پر کیا گزر رہی تھی میں اس سے بے خبر تھا' لیکن اتنا اندازہ ضرور لگا چکا تھا کہ وہ اس ہنگامے سے الگ نہیں اور اسی کا ایک حصہ بنی ہوئی ہے۔ اسی خیال نے مجھے مضطرب اور ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا تھا ورنہ ایک بار نادیدہ حفاظتی حصار سے ٹکرا کر گرنے کے بعد دوبارہ مکان کے دروازے کی طرف نہ لپکتا۔

دوسری کوشش مجھے پہلی کوشش سے بھی زیادہ مہنگی پڑی۔ اس مرتبہ مجھے اتنی زور کا جھٹکا لگا کہ میرا سارا جسم جھنجھنا اٹھا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرے کی چادر پھیل گئی اور میں اپنے پیروں پر بھی کھڑا نہ رہ سکا۔ زمین پر گرتے ہی اپنے قریب مجھے تیز قسم کی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے کچھ ہی فاصلے پر ایک بڑے سے سیاہ سانپ کو انتہائی تیز رفتاری سے ایک طرف جاتے دیکھا۔ اس سانپ کی اطراف دودھیا روشنی سی تھی' چمکیلی دھند سی! اس ایک لمحے میں مجھے اتنا ہی نظر آسکا کہ سانپ زخمی تھا۔

شمبھو! میرے ذہن میں کوندا سا لپکا۔ اسے میں نے اپنی آنکھوں سے جون بدلتے دیکھا تھا۔ شاید وہی ہمزاد کے مقابلے میں پسپا ہونے کے بعد جون بدل کر فرار ہو رہا تھا۔ میں

صرف اتنا ہی سوچ سکا کیوں کہ اس کے بعد میرے حواس جواب دے گئے۔

"اٹھئے' جلدی اٹھئے!" جانے کتنی دیر بعد مجھے ہمزاد کی آواز سنائی دی۔

میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور دیکھا کہ اسی مکان کے دروازے کے سامنے پڑا ہوں۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میں زیادہ دیر غفلت میں نہیں رہا تھا' ہمزاد مجھے جلدی ہوش میں لے آیا تھا۔ اسی کے ساتھ غالباً" اس نے میرے جسم پر ہاتھ پھیر کر مجھے جسمانی اذیت سے بھی نجات دلا دی تھی۔ یہ اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھے اپنے جسم میں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔

اٹھتے ہی میری نظر مکان کے دروازے پر پڑی اب جو کھلا ہوا تھا۔ ہمزاد کچھ کہے بغیر میرا ہاتھ تھامے تیزی کے ساتھ اس مکان میں داخل ہو گیا۔ اندر پہنچ کر میں اس کے ساتھ ساتھ تقریباً" دوڑنے لگا۔ ایک تبدیلی میں نے یہ بھی محسوس کی کہ اب مکان کی اوپری منزل تاریک نہیں تھی۔ صحن میں سے ایک زینہ اوپری منزل پر جا رہا تھا۔ ہمزاد مجھے ساتھ لیے اب اسی زینے پر چڑھ رہا تھا۔

اوپر دو کمروں میں سے ایک کمرہ روشن تھا۔ ہمزاد مجھے اپنے ہمراہ اسی روشن کمرے میں لے آیا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی مجھے یوں معلوم ہوا جسے وہ کمرہ شدید طوفان کی زد میں رہا ہو۔ ہر چیز ٹوٹی پھوٹی پڑی تھی۔ کوئی چیز اپنی جگہ نہ تھی۔ شاید اسی سبب فوری طور پر میری نگاہ سریتا کو تلاش نہ کر سکی۔ وہ اس ملبے کے درمیان ہی ایک جگہ زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ جلد ہی ہمزاد نے مجھے اس تک پہنچا دیا۔

سریتا پر نظر پڑتے ہی جیسے میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس کا حسین چہرہ نیلا پڑا ہوا تھا اور منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔

"یہ... یہ کیا ہوا؟... کیا ہوا میری سریتا کو؟ بولو!" میں ہمزاد کی طرف پلٹ کر تقریباً" چیخ اٹھا۔ "تم... تم نے کہا تھا کہ... کہ..."

"میں... شرمندہ ہوں کہ اسے شمبھو کے وار سے نہ بچا سکا۔" ہمزاد کا سر جھک گیا۔

"بکتے ہو تم!" میں جیسے ایک بار پھر اپنے حواس میں نہ رہا۔ غصے نے میری عقل خبط کر دی تھی۔ شدید رنج اور غصے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

غصے کے باوجود معاً" مجھے سریتا کا خیال آیا۔ اس پر نزع کا سا عالم طاری تھی۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور جسم بے حرکت تھا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور پھر اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

"سریتا... "میری آواز کانپ رہی تھی۔ "سریتا... آنکھیں کھولو' دیکھو تمہارا... تمہارا صاحب... صاحب جی آگیا ہے... آ..." میرا گلا رندھ گیا اور دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔ پھر میری آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ میرے آنسو اس کے چہرے پر گر رہے تھے۔

"ابھی ایک کوشش کی جا سکتی ہے۔" معاً میں نے ہمزاد کی آواز سنی۔ "ممکن ہے یہ زندہ بچ جائے!"

اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی تو میں لمحہ بھر ہی میں حصارِ ملال سے نکل آیا۔ میں نے آنسو بھری آنکھوں سے ہمزاد کی طرف دیکھا۔

"میں ابھی آیا۔" میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے کہا اور پھر دوسرے ہی لمحے غائب ہو گیا۔

سریتا کی حالت سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی انتہائی خطرناک زہر اس پر اثر انداز ہو چکا ہے ورنہ اس کی جلد کی رنگت نہ بدلتی۔ ہمزاد نے جو کچھ کہا تھا' اس سے بھی یہی اندازہ قائم کیا جا سکتا تھا کہ سریتا اب کچھ ہی دیر کی مہمان ہے۔ جب وہ میرے انتہائی قریب تھی' میرے اور اس کے درمیان کوئی فصل نہیں تھا تو کبھی مجھے یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میں اسے اس قدر چاہتا ہوں' میرے دل میں اس کی اتنی محبت ہے! وہ سریتا مجھ سے اب شاید ہمیشہ کے لیے بچھڑنے والی تھی۔ تو جیسے احساس کی ساری گرہیں بہ یک وقت کھل گئی تھیں۔

آدمی بڑا خوش فہم ہوتا ہے اور میں بھی اس سے مبرا نہیں تھا۔ بس اچانک ہی مجھے سریتا کا نیلا چہرہ دیکھ کر ماضی کا ایک منظر یاد آگیا تھا۔ یہ واقعہ چانگام کا تھا۔ اس وقت بھی سریتا کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ شمبھو نے میری آنکھوں کے سامنے اسے سانپ بن کر ڈس لیا تھا' مگر دوسرے دن صبح وہ مجھے صحت مند نظر آئی تھی۔ میں نے اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ شاید اس وقت بھی ایسا ہی ہو۔ ممکن ہے سریتا کی یہ حالت وکیفیت وقتی ہو' میں نے سوچا اور یہ بھول گیا کہ پہلے اس کے منہ سے جھاگ نہیں بہہ رہا تھا۔

ہمزاد کی واپسی میں صرف چند ہی لمحے لگے ہوں گے' مگر مجھے یہی محسوس ہوا تھا کہ وہ بہت دیر میں لوٹا ہو۔ میں اسی لیے اس پر برس پڑا۔ "اتنی دیر لگا دی تم نے!"

اسے یقیناً میرے حال دل کی خبر تھی اس لیے کچھ نہ بولا اور تیزی سے سریتا کے قریب آکر ایک شیشی کھولنے لگا۔ میں خاموشی سے اس کی حرکت دیکھ رہا تھا۔ ہمزاد نے اس شیشی سے چند قطرے' سریتا کے ہونٹوں پر ٹپکا دیے۔

"اگر کچھ دیر میں جھاگ بہنا بند ہو گئے تو پھر اسے یہاں سے لے چلیں گے۔" ہمزاد پہلی بار بولا۔

"کہاں؟" میں بے دھیانی میں پوچھ بیٹھا۔

"محمد پور۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

میری نظریں ایک بار پھر سریتا کے چہرے پر جم گئیں۔ میرے دل سے خود بہ خود اس کے لیے دعا نکل رہی تھی۔ کچھ دیر نہ میں کچھ بولا اور نہ ہمزاد ہی نے کچھ کہا۔ اس دوران میں یہ دیکھ کر میرے دل کو اطمینان ہو رہا تھا کہ اب جھاگ کم ہوتے جا رہے تھے۔ پھر مزید چند لمحوں کے بعد جب جھاگ بہنا بالکل بند ہو گئے تو میں نے اپنی قمیض کے دامن سے اس کے ہونٹ صاف کیے اور خوشی سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "دے... دیکھو... دیکھو!... تم دیکھ رہے ہو نا کہ... کہ جھاگ..."

"ہاں۔" یہ کہہ کر اس نے شیشی دوبارہ کھولی اور چند قطرے پھر سریتا کے ہونٹوں کے درمیان ٹپکائے۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "پہلے میں سریتا کو چھوڑ آتا ہوں' پھر آپ کو یہاں سے لے جاؤں گا۔"

"بھئی... ٹھیک ہے۔" میں جلدی سے بولا اور سریتا کا سر اپنے زانو سے اٹھا کر آہستگی کے ساتھ زمین پر رکھ دیا۔

میری تمام تر توجہ سریتا پر مرکوز تھی۔ یہ موقع ہمزاد سے کچھ پوچھنے کا نہیں تھا۔ اب میرے حواس بڑی حد تک قابو میں آچکے تھے۔ یہی سبب تھا کہ جب ہمزاد' سریتا کے جسم کو فرش سے اٹھانے کے لیے جھکا تو پہلی بار میں نے اس کے چہرے پر نگاہ کی اور چونک اٹھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں سا اور نسبتاً جھلسا ہوا لگ رہا تھا۔ شمبھو سے معرکہ آرائی کے دوران میں یقیناً کسی نہ کسی حد تک وہ بھی متاثر ہوا تھا۔ اس پر کیا گزری اور شمبھو کس طرح بچ کے نکل گیا' یہ تفصیلات بعد میں بھی معلوم کی جا سکتی تھیں اس لیے کہ فی الحال سریتا کو بچانا زیادہ ضروری تھا۔ میں اسی لیے خاموش رہا اور ہمزاد میرے دیکھتے ہی دیکھتے سریتا کو لے کر غائب ہو گیا۔ ہمزاد کے جاتے ہی میرے ذہن میں ایک خطرے نے اور سر ابھارا۔ شمبھو کہیں پھر نہ پلٹ آئے! ایسا ناممکن نہیں تھا۔ اس شیطان سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ میں نے اس وقت تنہا بھی تھا اور بے حصار بھی! اس کے علاوہ یہ کہ ہمزاد بھی میرے پاس نہیں تھا۔ وہ خبیث بہ آسانی مجھ پر حملہ کر سکتا تھا۔ میں بزدل نہ تھا لیکن اس کے باوجود کچھ دیر کو اس خیال نے مجھے مضطرب ضرور رکھا۔ پھر میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ کیا ہمزاد اس طرف سے غافل ہو گا؟ کیا

اس نے یہ خطرہ محسوس نہیں کیا ہوگا؟ یقیناً ہمزاد کو میری زندگی سب سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ غافل نہیں ہو سکتا' میں نے سوچا اور اسی کے ساتھ میرا اضطراب ختم ہو گیا۔ ہمزاد ہر حال میں میرا خیال رکھتا تھا اور بارہا مجھے یہ تجربہ ہو چکا تھا۔ میرے لیے یہ امر بھی باعث حیرت نہیں تھا کہ محلے والے اس قدر ہنگامہ آرائی کے باوجود تفتیش حال کے لیے اپنے گھروں سے کیوں نہیں نکلے! ہمزاد مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ وہ مکان آسیب زدہ مشہور تھا۔ ایسی صورت میں کسی کو کیا پڑی تھی جو گھر سے نکلتا۔

عام حالات میں ہمزاد کے لیے اتنا تھوڑا فاصلہ بے معنی سا تھا۔ وہ لمحوں میں واپس آ سکتا تھا' لیکن اس رات ایسا نہ ہوا۔ اسے واپسی میں دیر لگی۔

میرے استفسار پر واپس آ کر اس نے بتایا۔ "سریتا کی حالت تیز رفتاری کی متحمل نہیں تھی۔ میں اسی لیے اس وقت آپ کو بھی ساتھ نہیں لے گیا تھا۔"

"اب کیا حال ہے اس کا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔ "کیا وہ ہوش میں آ گئی؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "ابھی کچھ... کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" وہ جھجک سا رہا تھا۔ "آپ چلیں۔"

"میں جلد سے جلد اس تک پہنچنا چاہتا ہوں اس لیے..."

مجھے علم ہے اور اسی لیے میں آپ کو..." اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

مجھے اپنا تو یاد ہے کہ میں نے اس کے ہاتھ کا لمس اپنے ماتھے پر محسوس کیا تھا' پھر میرے ذہن پر جیسے ٹھنڈا اندھیرا اترنے لگا تھا۔ اس کے بعد میں نے اپنے جسم میں تیز سنسناہٹ محسوس کی تھی اور ہوش کھو بیٹھا تھا۔

منتشر حواس مجتمع ہوئے تو میں نے خود کو اپنی خواب گاہ میں پایا۔ سامنے ہی میرے بستر پر سریتا بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے انفاس اور انفاس ہی کے سبب جسم کی خفیف سی حرکت سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ زندگی ابھی اس سے روٹھی نہیں ہے۔ میں اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ ہمزاد میرے قریب مؤدب کھڑا تھا۔ میری نگاہ سریتا کے چہرے پر پڑی تو دل کو قدرے اطمینان سا ہوا۔ اس کے چہرے کی نیلاہٹ پہلے کی نسبت اب کم ہو گئی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ میں ہمزاد سے پوچھتا' وہ خود ہی بتانے لگا۔ "کچھ زہر ایسے ہیں جن کا تریاق نہیں! اور اگر ہے تو مشروط! اگر صبح ہونے سے پہلے اسے ہوش آ گیا اور... اور..."

ہمزاد مزید کچھ بتاتے ہوئے جھجکنے لگا۔ میں بول اٹھا۔ "جھجکو مت! جو کچھ کہنا ہے

صاف صاف کہہ دو۔ میں... میں صبر... صبر کر لوں گا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میری آواز بھرّا گئی۔

"اور یہ کہ جلدی ہی دوبارہ اس پر غفلت طاری نہ ہو گئی' سو نہ گئی تو یہ ممکن ہے کہ زندہ بچ جائے۔ ہمزاد نے مجھے صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ "اسے ہوش آ جائے تو آپ کو یہ کوشش کرنا ہے کہ اسے سونے نہ دیں۔"

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی اور دوبارہ سریتا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ابھی حاضر ہوتا ہوں میں۔" ہمزاد نے ایک بار پھر کمرے کا سکوت توڑ دیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔

"یہاں اب ایک مسہری کی اور ضرورت ہے۔"

"مگر نیند کس کی آنکھوں میں ہے! سوئے گا کون!... تم میرے ہی لیے تو..."

"پھر بھی! بعد میں تو ضرورت پڑے گی!"

"تم جانو۔"

میری اجازت پاتے ہی وہ چلا گیا اور پھر کچھ ہی دیر میں لوٹ آیا۔ نئی مسہری' پہلی مسہری کے قریب ہی اس نے بچھا دی اور اس پر بستر بھی لگا دیا' پھر بولا۔ "اب آپ کی مرضی ہے کہ جاگیں یا سو جائیں۔ ویسے میرا مشورہ یہی ہے کہ سو جائیں آپ! میں بیدار ہوں۔ اگر خدانخواستہ تشویش کی کوئی بات ہوئی تو اٹھا دوں گا آپ کو۔" اس کے لہجے میں خلوص تھا۔

ہمزاد کا مشورہ غلط نہیں تھا۔ میں جاگ کر بھی کیا کرتا مگر اپنے دل کو کیسے سمجھاتا! جو کچھ کرنا تھا' ہمزاد ہی کو کرنا تھا' مگر اس کے باوجود نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں نے اسی لیے کہا۔ "میں سو نہیں سکوں گا' تم کہتے ہو تو لیٹ جاتا ہوں بستر پر!" یہ کہہ کر میں نئی مسہری پر نیم دراز ہو گیا' پھر بولا۔ "یہ بتاؤ کہ آخر ہوا کیا؟ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ وہ شیطان تم سے بچ کر نکل گیا مگر کس طرح؟"

میری بات سن کر ہمزاد نے طویل سانس لیا' پھر مجھے تفصیلات سے آگاہ

کرنے لگا۔ "مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ وہ بے خبر نہیں ہوگا اور یہ کہ اس نے اپنی قیام گاہ کی اطراف حفاظتی حصار کھینچ رکھا ہوگا۔ اس آتشی حصار سے گزرنا میرے لیے مشکل تو ضرور تھا لیکن ناممکن نہیں۔ بہرحال میں کامیاب رہا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ خبیث سنبھل سکتا' میں نے اس پر حملہ کر دیا۔ ممکن ہے سریتا وہاں نہ ہوتی اور مجھے اس کے تحفظ کا خیال نہ ہوتا تو وہ بچ کر نکل نہ پاتا۔ اس نے مجھ سے نبرد آزمائی کے دوران ہی میں موقع پا کر کئی بار یہ کوشش کی کہ سریتا پر اپنی شیطانی قوتیں آزمائے۔ نتیجتہ" میری توجہ ہٹ گئی۔ اس خبیث نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ موقع پاتے ہی جون بدل کر سریتا کو ڈسنے میں کامیاب ہو گیا۔ ادھر میری توجہ سریتا کی طرف مبذول ہوئی' ادھر اس نے اپنی اطراف چمکیلے غبار کا حصار کھینچ لیا اور پھر نکل بھاگا۔ مجھے آپ کی فکر بھی تھی کہ کہیں جاتے جاتے وہ آپ پر حملہ نہ کر دے۔ میں اسی لیے آپ کے تحفظ کی خاطر مکان سے باہر آگیا۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ اس کا ارادہ یہی تھا ورنہ ادھر کا رخ نہ کرتا جدھر آپ تھے۔ مجھے اپنے تعاقب میں پا کر وہ راستہ بدل کر بھاگ گیا۔ اسی وقت میں نے آپ کو تکلیف اور اذیت میں محسوس کیا اور دیکھا کہ آپ زمین پر پڑے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ سریتا کی چیخوں نے آپ کو مضطرب کر دیا ہوگا اور آپ شدید ہیجانی کیفیت میں آتشی حصار کو بھول گئے ہوں گے۔ جب میں آپ کے قریب پہنچا تو آپ اپنے حواس کھو چکے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا آپ کے علم میں ہے۔" ہمزاد تفصیلات بتا کر خاموش ہو گیا۔

"جب وہ جون بدل کر فرار ہو رہا تھا' میری نگاہ بھی اس پر پڑی تھی۔" میں نے کہا۔ "مجھے وہ زخمی معلوم ہوا تھا۔ کیا وہ تم سے معرکہ آرائی کے درمیان زخمی ہو گیا تھا؟"

"ہاں۔" ہمزاد نے جواب دیا۔ "میرا پہلا حملہ بہت بھرپور اور اچانک تھا۔ اگر وہ فورا" ہی سریتا کو اپنی ڈھال نہ بنا لیتا تو ممکن ہے زندہ نہ بچتا۔"

"اگر اسے یقین ہوتا کہ وہ سریتا کو اس مرتبہ بھی اپنے ساتھ لے کر فرار ہو جائے گا تو شاید اسے نہ ڈستا۔" میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"میرا قیاس یہ ہے کہ وہ سریتا کو ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے صرف اپنی زندگی بچانے کی خاطر مجبورا" ایسا کیا ہے۔" ہمزاد نے خیال آرائی کی۔

"کچھ بھی ہو' ہمیں تو نتائج دیکھنا ہیں!" میری آواز میں تلخی آگئی۔ "خواہ اس نے دانستہ سریتا کو ختم کرنا چاہا ہو یا اپنی زندگی بچانے کے لیے' بہرحال وہ ناقابل معافی ہے! میں... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا!" میرے ہاتھوں کی مٹھیاں خود بہ خود بھنچ گئیں۔

"یقیناً وہ اسی سزا کا مستحق ہے۔" ہمزاد میری تائید میں بولا۔ "اور انشاء اللہ اسے یہ سزا ضرور ملے گی۔" یہ کہہ کر ہمزاد نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی دیکھی اور پھر سریتا کی طرف بڑھنے لگا۔

میں خاموشی کے ساتھ ہمزاد کی نقل و حرکت دیکھتا رہا۔ تریاق کے چند قطرے اس نے سریتا کے ہونٹوں پر ٹپکائے تھے۔

"تمہارا اندازہ کیا ہے' سریتا کو ہوش آجائے گا' صبح سے پہلے؟" میں نے ہمزاد سے سوال کیا۔

"امید تو ہے' آگے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔" اس نے گول مول جواب دیا۔ "ایک گھنٹے کے بعد آخری خوراک اور دوں گا' پھر ضرورت نہیں رہے گی۔"

اس کے آخری الفاظ سن کر میرے دل پر چوٹ سی لگی' مگر میں کچھ بولا نہیں۔ اس کے گول مول جواب سے میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ سریتا کی طرف سے وہ بھی زیادہ پرامید نہیں ہے ورنہ اس کے الفاظ کچھ اور ہوتے' لہجہ پر یقین ہوتا۔

خدا خدا کر کے ایک گھنٹہ اور گزارا۔ سریتا اب تک بے ہوش تھی۔ ہمزاد نے تریاق کی آخری خوراک بھی اس کے ہونٹوں پر ٹپکا دی۔ اس وقت رات کے سوا تین بج رہے تھے۔ میرا اضطراب لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ نتیجتہ" میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ یہ رات سریتا کی زندگی کی آخری رات بھی ثابت ہو سکتی ہے' اس خیال نے میرے دل کو بے چین اور آنکھوں کو بے خواب کر رکھا تھا۔ میں اس بے بس و مجبور لڑکی کو شیطان صفت شمبھو کے چنگل سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا تھا' لیکن یہ کامیابی مجھے ناکامی میں بدلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی

زندگی میری کامیابی تھی اور موت ناکامی!

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔ پھر اُدھر صبح کی اذان ہوئی' اُدھر سریتا کو ہوش آگیا۔ میں اس کے سرہانے آکر بیٹھ گیا تھا۔

"سریتا!" میں چیخ اٹھا۔ "تم... تم۔" جذبات کی شدت نے میری زبان گنگ کر دی۔

اس کی آنکھیں انتہائی سرخ ہو رہی تھیں۔ معاً میں نے اس کے لبوں کو حرکت کرتے دیکھا۔ اس نے یقیناً کچھ کہا تھا مگر آواز اتنی مدھم تھی کہ ۔ کچھ سنائی نہ دیا۔ میں فوراً ہی جھک گیا۔

"کہو... کہو سریتا' کیا کہنا چاہتی ہو!" میں نے اپنے دونوں پاؤں سمیٹ کر مسہری پر بیٹھتے ہوئے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

"صا... صاحب جی!" اس نے مشکل یہ کہا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"میں... میں خوش... خوش ہوں صاحب جی کہ... کہ آپ کے زانو پر... سر رکھ... رکھ کر اس... اس دنیا سے رخصت ہو رہی..."

"نہیں سریتا!" میں بلند آواز میں بولا۔ "تم... تم مجھے... اپنے صاحب جی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتیں!... تم زندہ بچ گئی ہو!... تم نہیں مرو گی... زندہ رہو گی تم!"

"نن... نہیں... نہیں صاحب... جی! میں... میں نہیں بچوں گی۔ مجھے... معلوم ہے... معلوم ہے مجھے!" یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

مجھے ہمزاد کی تاکید یاد آئی کہ اسے سونے نہیں دینا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اس کے دونوں رخسار تھپتھپائے اور زور سے بولا۔ "آنکھیں کھولو سریتا!... آنکھیں کھولو!"

"صا... صاحب جی' مجھے نیند... بہت... زور کی نیند آ رہی ہے۔" وہ بہ مشکل اپنی آنکھیں کھولتی ہوئی بولی۔

"تمھیں ہرگز نہیں سونا سریتا!" میں نے جلدی سے تیز آواز میں کہا۔

"تمھیں جاگنا ہے... جاگنا ہے سریتا! ہر قیمت پر جاگنا ہے!" میں نے دوبارہ اسے آنکھیں بند کرتے دیکھ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"ہاں... ہاں صاحب جی!" وہ بڑبڑا کر بولی اور آنکھیں کھول دیں۔

میں نے ایک بار پھر اسے نہ سونے کی تاکید کی۔

"میرے... میرے اچھے صاحب... صاحب جی!... سونے دیں نا مجھے!" وہ التجا آمیز لہجے میں کہنے لگی۔

"نہیں!" میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ اگر وہ اس لہجے میں کچھ اور کہتی تو شاید میں انکار نہ کر سکتا' مگر اس وقت اس کی بات مان لینا' محبت نہیں دشمنی تھی۔

اس کی آنکھوں کے پپوٹے بھاری اور سوجے سوجے سے دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں آنکھیں نیم وا سی تھیں۔ کوشش کے باوجود وہ شاید پوری طرح آنکھیں کھولنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ چہرے پر اب نیلاہٹ بس برائے نام رہ گئی تھی۔

"اسے بیدار رکھنے کا ایک طریقہ اور بھی ہے۔" معاً ہمزاد مجھ سے مخاطب ہوا جو مسہری کے قریب ہی کھڑا تھا۔

"وہ کیا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"شور ہنگامہ!" وہ بولا۔ "اتنا شور کہ یہ سو نہ سکے' لیکن یہ... ممکن معلوم نہیں ہوتا۔"

"کیوں ممکن نہیں؟" میں بغیر سوچے سمجھے بے دھیانی میں کہہ گیا۔

"سارا محلہ جاگ جائے گا۔" ہمزاد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ شور باہر سنائی نہ دے؟" میں نے چند لمحے خاموش رہ کر سوچتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی فجر کی اذان ہو چکی ہے۔ دن تو..."

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن شور سن کر لوگ یقیناً اس طرف متوجہ ہو جائیں گے۔" ہمزاد بولا۔ "آپ ایسی صورت میں کیا کہیں گے لوگوں سے؟ اور یہ ممکن نہیں کہ شور باہر نہ سنائی دے۔" یہ کہتے ہی ہمزاد نے میری توجہ سریتا کی طرف مبذول کرائی۔ "اس نے پھر آنکھیں بند کر لی ہیں۔"

عام حالات میں یقیناً میرا عمل وحشیانہ ہی کہا جاتا مگر عمل کا انحصار بڑی حد تک حالات کا رہین منت ہوتا ہے۔ ایک ہی عمل بعض حالات میں ناگوار اور بعض میں ضرورت محسوس ہوتا ہے۔ میں نے اپنے دل پر جبر کرکے سریتا کی دراز زلفیں اپنی مٹھی میں جکڑلی تھیں اور اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

اس نے کراہ کر ایک دم آنکھیں کھول دیں اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں شکایت کی تحریر بھی پڑھ لی تھی۔ اسے بھی مجھ سے یہ توقع نہیں رہی ہوگی۔

"سریتا! اٹھ کر بیٹھ جاؤ!" میں نے سختی سے کہا اور پھر اسے سہارا دے کر اٹھانے لگا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی ترکیب آئی تھی۔ وہ بغیر کچھ کہے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"تم اگر اب سو گئیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا!" میں نے ایک بار پھر اس کے بالوں کو جھٹکا دیا۔ اب وہ میرے سہارے بیٹھی ہوئی تھی۔

اس کے منہ سے سسکی سی نکلی اور اس کے ساتھ اس نے گلہ بھی کیا۔

"... صاحب جی! کیا... آپ کو کیا ہو گیا ہے؟... پہلے... پہلے تو کبھی آپ نے..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"پہلے تم کبھی موت سے اتنے قریب نہیں ہوئی تھیں۔" میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"موت... موت تو آنا ہی ہے صاحب جی!" وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ "اگر آج... آج آپ نے مجھے بچا لیا تو... تو کل پھر وہ... وہ..." اس کی آواز میں خوف جھلکنے لگا۔

"بھول جاؤ اس شیطان کو!" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "اب وہ تمہیں مجھ سے چھین کر نہیں لے جا سکے گا!"

"شاید... شاید..." وہ غنودہ سی آواز میں بولی اور پھر اپنا سر میرے شانے سے ٹکا دیا۔

"سر ہٹالو میرے شانے سے!" میری آواز میں برہمی تھی۔

"مجھے آرام... آرام مل رہا تھا صاحب جی اس طرح!" وہ رک رک کر ...سے لہجے میں بولی۔

"اس وقت آرام ہی تو تمہارے لیے خطرناک ہے!" یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھ سے اس کا سر اپنے شانے سے ہٹا دیا۔

کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ یہ ترکیب بھی کارگر نہیں رہی۔ وہ میرے سہارے بیٹھ کر پھر سو گئی تھی۔ میں نے اسے ایک بار پھر جھنجوڑ ڈالا' اگر اب کے ...نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

"ہمزاد!" میں تقریباً چیخ اٹھا۔ "یہ... یہ کیا... کیا ہو گیا اسے؟... یہ... یہ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہی؟"

"اب وقت گزر چکا ہے' صبر کیجئے!" ہمزاد مردہ سی آواز میں بولا۔ "اب یہ لڑکی چند لمحوں کی مہمان ہے۔"

"نہیں!... یہ نہیں ہو سکتا!... ایسا نہ کہو!... نہ کہو!" میری آواز بھرا ...

"لٹا دیں اسے! آپ دیکھ نہیں رہے کہ تنفس کتنا کم ہو گیا ہے! برائے نام ...آ رہا ہے۔" ہمزاد قریب آ گیا۔ پھر خود اسی نے سریتا کو سیدھا لٹا دیا۔

"سریتا!... سریتا! میں پاگلوں کی طرح چیخنے لگا اور اس کے شانوں کو دونوں ہاتھوں میں لے کر زور زور سے ہلانے لگا۔ "آنکھیں کھولو سریتا!"

"صبر کریں۔" ہمزاد نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں!" میں نے پلٹ کر ہمزاد کو ڈانٹ دیا۔ "چیخنے دو مجھے... چیخنے دو! ...جاؤ میرے پاس سے!" مجھ پر ایک جنونی کیفیت سی طاری ہونے لگی۔ "میں ...سونے نہیں دوں گا!"

"ہوش میں آئیں' سریتا دم دے چکی ہے اور اب آپ کے چیخنے چلانے ...کو حاصل نہیں ہوگا۔" ہمزاد نے مجھے ایک بار پھر سمجھایا۔

"بکتے ہو تم!" میں چیخا۔ جنونی کیفیت اب کچھ اور سوا ہو گئی تھی۔ میرا جی ...تا تھا کہ ہر شے کو توڑ پھوڑ ڈالوں اور خود بھی ٹوٹ جاؤں' بکھر جاؤں! اور...

اور...

میں نے اسی عالم میں ہمزاد کے ہاتھ کا لمس اپنے ماتھے پر محسوس کیا۔ یوں جیسے میرے سارے وجود میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ میرے ذہن پر ٹھنڈا اندھیرا پھیل گیا۔ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا! اس لمحے میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔

جانے کتنی دیر میرا وجود اس ٹھنڈے اندھیرے میں دفن رہا۔ پھر مجھے کچھ حرارت سی محسوس ہوئی تو یوں لگا جیسے زندگی ایک بار پھر مجھ میں لوٹ آئی ہے۔ میں کون ہوں، کہاں ہوں؟ کچھ دیر کو بھی کچھ میرے ذہن سے محو ہو گیا۔ ذہن پر ایک سناٹا سا طاری تھا۔

کتنی یہ ساعتیں اسی طرح گزر گئیں اور پھر دھیرے دھیرے میرا شعور بیدار ہونے لگا۔ مجھے سب کچھ یاد آتا گیا۔ یادوں کا کارواں جب لمحہ موجود کی دہلیز آ کے رک گیا تو میں نے ایک دم آنکھیں کھول دیں اور اسی جانے والے کو پکارا، اب کبھی لوٹ کر آنے والا نہیں تھا۔ میں فوراً" اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بستر خالی تھا، وہاں سریتا نہیں تھی۔

"کہاں گئی وہ؟... کہاں گئی سریتا؟" میں یہ دیکھے بغیر چیخ اٹھا کہ کمرے میں میرے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ میری حالت اس وقت بالکل دیوانوں کی سی تھی۔ مسہری سے اتر کر میں خواب گاہ میں چکرانے لگا۔ اگر میرا ذہن قابو میں ہوتا تو شاید مجھے فوراً" ہی ہمزاد کا خیال آ جاتا مگر اس میں دیر لگی۔ سریتا کی اچانک موت کے صدمے نے یقیناً میرے ذہن کو متاثر کیا تھا۔ "ہمزاد کہاں گیا؟... مجھے اس کو چاہیے!" میں بڑبڑانے لگا اور پھر اچانک بلند اور تیز آواز میں اسے پکارا۔ "ہمزاد!"

دوسرے ہی لمحے وہ میرے ساتھ تھا۔

"کہاں تھے تم؟... اور.... سریتا کہاں ہے؟" میں نے اس کے ظاہر ہوتے ہی بے تابی سے پوچھا۔

"میں اس کی آخری رسوم ادا کر رہا تھا کہ..."

"کیا؟... کیا کہہ رہے ہو تم.... تم میرے.... مجھ سے پوچھے بغیر یہ.... یہ سب کچھ کیا کر رہے ہو؟... کیا کر رہے ہو تم... تم نے... تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ

کہ... کیا تم یہ بھی نہیں چاہتے کہ... کہ میں آخری بار اس... اس کی صورت بھی دیکھ سکوں؟ بتاؤ!" میں اس کی بات کاٹ کر چیخ اٹھا۔

"آپ کا ذہن قابو میں نہیں تھا۔" ہمزاد پرسکون آواز میں بتانے لگا۔ "میں نے اسی لیے آپ کو گہری نیند سلا دیا تھا، اگر ایسا نہ کرتا تو..."

"اور تم مجھے گہری نیند سلا کر اسے یہاں سے اٹھا لے گئے! یہ سوچے بغیر کہ مجھ پر کیا گزرے گی! کہاں ہے وہ؟" میرے لہجے میں تلخی تھی۔

"مرگھٹ میں۔" ہمزاد نے جواب دیا۔ "اس کی چتا میں آگ لگائی جانے والی تھی کہ آپ نے مجھے بلا لیا۔"

"چتا.. سریتا کی چتا!" میں کھو سا گیا۔

"جی ہاں۔ اب اس حقیقت کو آپ قبول کر لیں تو بہتر ہے اور مجھے جانے دیں تاکہ اس کی آخری رسوم ادا ہو سکیں۔"

"مجھے... مجھے بھی لے چلو وہاں! میں... میں آخری بار اپنی سریتا کا چہرہ... دیکھنا چاہتا ہوں۔" میرے سینے میں کرچیاں سی بکھرنے لگیں۔

پھر جو کچھ ہوا، میرے لیے ایک خواب سا تھا۔ میں نے اسی عالم میں سریتا کو چتا پر لیٹے دیکھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مری نہ ہو، سو رہی ہو۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ ہمزاد مجھے پیچھے ہٹا لایا اور پھر چند ہی لمحے بعد وہ نازک سا حسین جسم شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ شعلے جیسے سریتا کی چتا سے نہیں، میرے وجود سے اٹھ رہے تھے۔ وہ ہولناک اور روح فرسا منظر میری آنکھوں میں بس گیا تھا، چتا سے اٹھتے ہوئے شعلے اور میرا جلتا جھلستا ہوا وجود! میں زیادہ دیر اس منظر کی تاب نہ لا سکا۔ ہمزاد نے میری کیفیت محسوس کر لی اور پھر مجھے وہاں سے لے آیا۔

شام ہونے تک میری آنکھیں ساون بھادوں بنی رہیں۔ اتنا رنج شاید مجھے کسی کے بچھڑنے کا نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کا سبب میرا بدلا ہوا طرز فکر تھا۔ اب زندگی اور موت کے معنی میرے نزدیک کچھ اور تھے۔ شاید اب میں خود غرض نہیں رہا تھا، میرا سینہ کدورت سے پاک ہو چکا تھا۔ اگر ایسے میں ہمزاد میرے زخموں پر مرہم نہ رکھتا تو شاید میں یہ صدمہ برداشت نہ کر پاتا۔

شام ہوئی' پھر اندھیرا پھیلنے لگا۔ ہمزاد نے روشنی کرنا چاہی مگر میں نے اسے روک دیا۔ "میرے اندر اندھیرا پھیلا ہوا ہے تو باہر بھی اندھیرا ہی رہنے دو!"

ہمزاد پلٹ آیا' پھر میرے قریب آ کر آہستہ سے بولا۔ "کچھ کھا لیں' صبح سے آپ نے..."

"نہیں۔" میں نے انکار کر دیا۔ "مجھے بس یونہی لیٹا رہنے دو۔ جی نہیں چاہ رہا کچھ کھانے کو۔"

"اسی وقت نیچے دروازے پر دستک ہوئے اور میں چونک اٹھا۔ مجھے اس وقت خیال ہی نہ آیا کہ دستک دینے والا کون ہو سکتا ہے! اسی لیے ہمزاد کو اشارہ کیا۔"

"نفیسہ ہے۔" ہمزاد نے آ کر بتایا۔ "کہیں تو بلا لوں؟"

"نہیں۔ جب دروازہ نہیں کھلے گا تو گھر میں اندھیرا دیکھ کر خود ہی چلی جائے گی۔ میں... میں کسی سے... کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتا۔"

کچھ دیر مزید دستکیں سنائی دیں اور پھر شاید نفیسہ مایوس ہو کر لوٹ گئی۔

دوسرے دن صبح ہمزاد نے گویا بالجبر مجھے تھوڑا بہت ناشتہ کرایا۔ رات کو جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی تھی! اضطراب' رنج اور بے چینی کے باوجود میں گہری نیند سویا تھا' اس کا سبب ہمزاد ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے ہی مجھے گہری نیند سلا دیا ہو گا تاکہ گہری نیند میرے ذہن کو قدرے پر سکون کر دے' مگر میں نے ہمزاد سے اس سلسلے میں کوئی استفسار نہیں کیا۔ اس کا فعل میری بہتری ہی کے لیے ہوتا تھا۔

وقت بڑا مرہم ہے' اس کا اندازہ مجھے دو دن گزرنے کے بعد ہوا۔ ان دنوں میں گویا قلعہ بند رہا تھا۔ میں دریچے تک بھی نہیں گیا تھا۔ دو دنوں کے دوران میں کئی بار گھر کے دروازے پر دستکیں ہوئی تھیں مگر میں اپنی خلوت سے نہیں نکلا تھا۔ اس عرصے میں ہمزاد ہر لمحہ میرے قریب رہا تھا۔ تیسرے دن شام تک میں بڑی حد تک سنبھل چکا تھا۔ ہمزاد دن بھر مجھے ہموار کرتا رہا تھا کہ آج دروازے پر دستک ہو تو میں دروازہ کھولنے سے انکار نہ کروں۔

اس کا اندازہ مجھے بھی کچھ کچھ تھا کہ نفیسہ میری طرف سے فکر مند ہو

گی کہ اچانک میں کہاں چلا گیا؟

"ٹھیک ہے۔" میں نے رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔ "اگر تم کہتے ہو تو میں' نفیسہ سے مل لوں گا۔"

پھر جب حسب معمول اس شام بھی دروازے پر دستک ہوئی تو میں خود ہی دروازہ کھولنے کے لیے نیچے چلا گیا۔ اس وقت ہمزاد کے چہرے پر مجھے اطمینان نظر آیا تھا۔ وہ یقیناً اس بات پر خوش ہو گا کہ میں دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ رہا ہوں۔

دروازہ کھلتے ہی نفیسہ تیز ہوا کے جھونکے کی طرح اندر آ گئی اور میں نے دروازہ بند کر لیا۔

"تھے کہاں آپ کئی دن سے؟" وہ چھوٹتے ہی بولی۔

"کہیں نہیں' بس یونہی ذرا... آؤ تو سہی تم!" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا' پھر بولا "کہاں بیٹھو گی؟ اوپر یا..." میں نے نشست گاہ کی طرف اشارہ کیا۔

"میں کوئی مہمان تو ہوں نہیں۔" وہ بے تکلفی سے کہنے لگی۔ "اوپر ہی چلتے ہیں"

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں' کہاں گیا تھا؟

"چہرہ کچھ اترا اترا سا لگ رہا ہے۔ کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" وہ میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولی۔

"ہاں" ٹھیک ہی ہوں۔" میں نے طویل سانس لیا۔

"لگتے تو نہیں۔" وہ مسکرائی۔ اسے کیا خبر تھی کہ مجھ پر کیا گزر چکی ہے۔

"تین دن سے آپ کے گھر میں اندھیرا نظر آ رہا تھا۔" وہ کہنے لگی۔ "اس دوران میں کئی بار میں آئی مگر شاید تھے نہیں آپ گھر میں!"

"ہاں کبھی کبھی آدمی ہو کر بھی نہیں ہوتا۔" میں نے خواب گاہ میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ دوسری مسہری... پہلے تو نہیں تھی شاید!" وہ خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی چونک کر بولی۔

"ہاں نئی منگوائی ہے اس لیے کہ کوئی مہمان وغیرہ آجائے تو اسے زحمت نہ ہو۔"

تو مہمان بھی آتے ہیں یہاں!" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

ہم دونوں آرام دہ کرسیوں پر آ بیٹھے۔ میں نے اس کے معنی خیز جملے کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ بیٹھنے کے بعد پہلی بار میں نے اس پر بھرپور نظر ڈالی۔ وہ بڑی باغ و بہار نظر آ رہی تھی۔ سبز شلوار سوٹ اس پر جچ رہا تھا۔ یوں بھی جسم بے ڈول نہ ہو تو عورت پر ہر کپڑا جچتا ہے۔ میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی آمد سے میرے غم خانے کی فضا کچھ بدل گئی ہے۔ شاعر نے وجودِ زن کو تصویرِ کائنات کا رنگ یوں ہی نہیں کہا۔ یقیناً عورت کا وجود ماحول کا رنگ بدل دیتا ہے۔

"بتایا نہیں آپ نے کہاں گئے تھے؟" وہ اپنے شانے پر دوپٹے کا پلّو سنبھالتے ہوئے بولی۔ "میں آپ سے ملنے کے لیے یوں اور بے چین تھی کہ ایاز کے بارے میں بتا سکوں۔"

آیاز کے متعلق وہ مجھے پہلے بھی بتا چکی تھی کہ اس کے دفتر کا ساتھی ہے۔ آیاز اس سے محبت کرتا تھا۔ اس نے اسی لیے شادی بھی نہیں کی تھی۔ میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "تو بتاؤ کیا ہوا آیاز کو؟" میری نگاہ اس کے چہرے پر تھی۔

"میں ہی بتائے جاؤں' آپ کچھ نہیں بتائیں گے!" اس نے نگاہ اٹھائی۔ اس کے لہجے میں دوستانہ شکایت تھی۔ "یہ دوستی تو نہ ہوئی! دوستی کا مطلب تو یہ ہے کہ آدمی ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر کا شریک ہو! آپ کا بجھا بجھا چہرہ اور لہجے کی اُداسی بہت کچھ کہہ رہی ہے۔ اس دوران میں کوئی نہ کوئی ایسی بات تو ضرور ہوئی ہے جس نے آپ کو ملول کر دیا ہے۔ بولیں' غلط کہہ رہی ہوں میں؟"

اس نے مجھے عجب کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس سے جھوٹ بولوں' لیکن اس وقت اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی میں نے ایک کوشش اور کرلی۔ میں نے کہا۔ "نفیسہ! یاد ہو گا تمہیں' میں نے کہا تھا کہ کچھ باتوں کا نہ جاننا اچھا ہوتا ہے۔ تو مجھے مجبور نہ کرو اس پر! اس ذکر سے میں اور

ملول ہو جاؤں گا اور یقیناً تم مجھے اداس دیکھنا..."

میری کوشش رائگاں نہیں ہوئی۔ وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ "اگر کوئی بات ہے تو رہنے دیں۔ میرا مقصد آپ کو اداس کرنا نہیں۔"

"شکریہ!" میں نے کہا۔ "تم نے مجھے ایک ذہنی الجھن سے بچا لیا ہاں وہ تم کیا کہہ رہی تھیں' ایاز کے بارے میں؟"

"آپ کے مشورے پر میں نے آیاز کے ساتھ اپنا رویّہ بدل دیا۔ پہلے ہی مجھے شدید حیرت ہوئی۔ آپ کا اندازہ قطعی درست تھا۔ میں نے فوراً" یہ یہ محسوس کرلی کہ وہ اب بھی مجھے ٹوٹ کر چاہتا ہے۔"

"پھر کیا ارادہ ہے تمہارا؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"مسئلہ بس وہی ہے۔" اس نے طویل سانس لے کر کہا۔ "اگر وہ اب بھی ے والدین کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہوا اور اس نے اپنی پہلی ضد نہ چھوڑی ..."

"سنو!" میں درمیان میں بول اٹھا۔ "دراصل مسئلہ وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔"

"پھر؟"

"دیکھو نفیسہ' آدمی کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔" میں سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں کہیں' میں قطعی برا نہیں مانوں گی۔" وہ فوراً" بول اٹھی۔ اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

"تو سنو' اصل مسئلہ تمہارے والدین اور ان کی گزر بسر کا ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا' پھر بغیر رکے مزید بولا۔ "اس بات کو یوں سمجھو کہ اگر تم دونوں کے درمیان یہ مسئلہ نہ ہوتا تو یقیناً اب تک ایک دوسرے کو اپنا چکے ہوتے۔ تم خود ہی بتاؤ' میرا کہنا بجا ہے یا نہیں؟"

"یہ تو خیر آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس نے ٹھنڈا سانس بھرا' پھر کہنے

گی۔ "لیکن اس مسئلے کا حل کیا ہو؟ یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"پہلی بات تو تم اپنے ذہن سے یہ نکال دو کہ نوکری چھوڑ کر اس پر بوجھ بن جاؤ گی۔"

"یعنی آپ کا مشورہ یہ ہے کہ میں اس کی مرضی کے مطابق نوکری چھوڑ دوں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"پہلے پوری بات تو سن لو۔ میں نے ابھی یہ بات کب کی ہے! میرے ایک سوال کا جواب دو۔ یہ بتاؤ' ایاز کو اتنی تنخواہ مل جاتی ہے کہ وہ تمہارا اور تمہارے والدین کا خرچ پورا کر سکے؟"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں!... مگر..."

"سنو!" میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "میرے ذہن میں جو کچھ ہے' وہ کہنے دو' اس کے بعد 'اگر' 'مگر' کرنا۔ تم غالباً" مجھے بتا چکی ہو کہ وہ پہلے بھی تمہارے والدین کے اخراجات اٹھانے پر آمادہ تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ انھیں اپنے ساتھ رکھنے پر راضی نہیں تھا اور نہ ان کے ساتھ رہنے پر! یہی بات تھی نا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں یہی تھا۔"

"میرے خیال میں یہ اس کی زیادتی تھی۔"

"کیا؟" اس نے پوچھا۔

"یہی کہ وہ تمہارے والدین کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اس نے اس طرح تمہاری عزت نفس کا خیال نہیں کیا اور اسی سے بات بگڑ گئی۔ بات بنانے کی اب ایک ہی صورت ہے کہ اس کے کچھ مطالبے تم مان لو اور کچھ وہ اپنے رویے میں لچک پیدا کر لے جیسا کہ غالباً" میں نے پہلے بھی کہا تھا۔"

نفیسہ نے مجھ سے واضح الفاظ میں وضاحت چاہی۔

"میرا دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ اگر ایاز چاہتا ہے کہ تم نوکری چھوڑ دو تو تمھیں اس پر عمل کرنا چاہیے۔ دیکھو نفیسہ' اگر ہر عورت یہی سوچنے لگے کہ وہ اپنے مرد پر بوجھ ہے تو پھر ہمارے ہاں کی گھریلو زندگی کا ڈھانچا ہی ٹوٹ کر بکھر

جائے۔ میرے نزدیک یہ مریضانہ طرز فکر ہے۔ اگر آج کی عورت اس طرح سوچتی ہے تو یقیناً یہ غلط ہے۔ یہ مغربی طرز فکر ہے' مشرقی نہیں! اور مغرب کو اس طرز فکر کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑی ہے اور ابھی تک یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ مرد سے برابری کا دعویٰ دراصل احساس کمتری کی دلیل ہے۔ اس گمراہ کن نعرے نے بہت سے گھر اجاڑ دیے ہیں' بہت سی عورتوں کو ذہنی مریض بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی ذمے داریاں پوری کرتے ہیں۔ عورت گھر کی ذمے داریاں سنبھالتی ہے اور مرد باہر کی۔ ذمے داریوں کی یہ تقسیم فطری ہے۔ اس میں نہ کوئی بڑا ہے اور نہ چھوٹا۔ دونوں ہی گویا ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ عورت مرد کے بغیر ادھوری ہے اور مرد عورت کے بغیر! سمجھ رہی ہو نا تم!"

میں نے اس کا چہرے کا جائزہ لیا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی تو میں نے مزید کہا۔ "تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم اگر ایاز کے کہنے پر نوکری چھوڑ دیتی ہو تو غلط نہیں۔ ہاں اس کا یہ اصرار البتہ غلط ہو گا کہ تم اپنے والدین کے ساتھ نہ رہو۔ تو میرا خیال ہے کہ وہ اب یہ اصرار نہیں کرے گا۔"

"یعنی ہمارے ساتھ رہنے پر راضی ہو جائے گا؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ اسے نہیں جانتے' وہ بڑا ضدی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی اس پر راضی نہیں ہو گا۔"

"مجھے..." وہ سوچ میں پڑ گئی' پھر کچھ دیر بعد بولی۔ "ٹھیک ہے' میں... اسے اپنانے کی خاطر یہ قربانی دے سکتی ہوں۔"

"تو پھر جب تم راضی ہو تو مجھے یہ یقین ہے کہ وہ بھی راضی ہو جائے گا کہ تمہارے والدین کے ساتھ رہے۔ تم کل اس سے صاف صاف بات کرو' پھر بتاؤ مجھے۔"

"اور رشید؟"

"وہ بات بعد کی ہے۔ ایاز راضی ہو گیا تو پھر یہ معاملہ ختم کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہو گی۔" میں بولا۔

"رشید بہت کینہ پرور اور سازشی ہے۔ وہ اس معاملے میں کوئی نہ کوئی روڑا ضرور ڈالے گا۔" اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" میں نے کہا' پھر معاً مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ "یہ بتاؤ کیا رشید تمھارے ماضی سے باخبر ہے؟"

"ہاں اسے سب کچھ معلوم ہے۔" نفیسہ نے بتایا۔

"بس اس کے ہاتھ میں یہی ایک پتا ہے۔" میں سر ہلا کر بولا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"وہ اپنی پتنگ کٹتے دیکھ کر ایاز کو تمھارے ماضی سے آگاہ کر دے گا تاکہ معاملہ بگڑ جائے اور وہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا سکے۔"

"پھر؟" وہ فکرمند ہو گئی۔ "پھر کیا ہو گا... یہ ... یہ بات تو میرے ذہن ہی میں نہیں تھی۔"

"یہ کوئی ایسی تشویش کی بات نہیں۔ اس کا تدارک ہو سکتا ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کیسے؟" وہ بے چین نظر آ رہی تھی۔

"وہ تمھیں چاہتا ہے' اس کا اقرار خود تم بھی اپنی زبان سے کر چکی ہو اور تم بھی جانتی ہو' میں بھی کہ ماضی میں تمھارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا' اس کی ذمے داری تم پر بہرحال نہیں ہے۔ تم بے گناہ ہو' مظلوم ہو! اگر واقعی ایاز کے دل میں تمھاری محبت ہے تو وہ سب کچھ جان لینے کے باوجود تمھیں اپنانے سے گریز نہیں کرے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسے یہ ساری باتیں کسی اور سے نہیں خود تمھی سے معلوم ہونا چاہئیں تاکہ وہ بعد میں یہ سوچنے پر مجبور نہ ہو' تم نے اسے دانستہ اندھیرے میں رکھا تھا' دھوکا دیا تھا۔ ایک بات کوئی خود بتا دے اپنے بارے میں اور وہی بات کسی دوسرے کے توسط سے علم میں آئے' ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ تم یقیناً میری بات سمجھ رہی ہو گی۔ بالفرض تم اسے خود ہی سب کچھ بتا دیتی ہو اور بعد میں یہی باتیں اسے رشید کے ذریعے معلوم ہوتی ہیں تو اس پر کوئی غلط اثر مرتب نہیں ہو گا۔"

میری بات سن کر نفیسہ کچھ دیر خاموش رہی۔ چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہو۔

"کیوں' کیا بات ہے؟" میں نے اسے ٹوکا۔ "کیا تم میری تجویز سے متفق نہیں ہو؟"

"نہیں' یہ بات نہیں ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "میں دراصل یہ سوچ رہی تھی کہ میرا ماضی کہیں اسے پچھتاوے کی آگ میں جلنے پر مجبور نہ کر دے۔ میرے خیال سے مرد سب کچھ برداشت کر لیتا ہے لیکن چاہت کتنی ہی کیوں نہ ہو' یہ معاملہ ایسا ہے کہ..." وہ جھجکی اور اس کا جھجکنا بجا تھا۔ بات ہی ایسی تھی جسے زبان پر لانا اس کے لیے مشکل تھا۔ اس کے باوجود اس نے مثال دے کر اپنی بات کہہ ہی دی کہ یہ بھی بات کہنے کا ایک طریقہ ہے۔ "دیکھیے ناجان بوجھ کر مکھی کون کھاتا ہے!"

بڑی حد تک اس نے سچی بات کہی تھی۔ یہ بات خود مجھ پر بھی صادق آئی تھی۔ اگر اس کا ماضی آڑے نہ آ گیا ہوتا تو بھلا میں ہی کیوں پیچھے ہٹ جاتا! پھر بھی یہ کوئی کلیہ نہیں۔ ممکن ہے ایاز کی محبت میں اتنی وارفتگی ہو کہ وہ اس کی پروا نہ کرے' میں نے سوچا' پھر اسے تسلی دینے کی خاطر کہا۔ "سنو نفیسہ! آدمی ایک حد تک ہی وقت اور حالات کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے یا گزارنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ ہر بات اس کی مرضی و خواہش کے مطابق نہیں ہوتی' لیکن جدوجہد جاری رکھنا چاہیے کہ یہی زندگی ہے۔ تم قدم تو اٹھاؤ' ممکن ہے خود بہ خود راستے تمھارے حق میں ہموار ہوتے چلیں جائیں۔ دیکھو کچھ معاملات اس ذات واحد پر بھی چھوڑ دینا چاہئیں جو ہر شے پر قادر ہے۔"

اس کے چہرے سے قدرے اطمینان جھلکنے لگا۔ میں اسے مزید کچھ دیر سمجھاتا رہا اور پھر وہ دوسرے دن شام کو آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ اس وقت مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ میں نے اسے رخصت کر کے نماز پڑھی۔ اس کے بعد ایک بار پھر میرا ذہن سریتا کی طرف منتقل ہو گیا۔ وہ میری ہی وجہ سے بے گناہ ماری گئی تھی۔ شمبھو کا عمل بالکل اس بلی کی طرح تھا جو کھاتی نہیں تو اوندھا دیتی ہے۔

گی۔ "لیکن اس مسئلے کا حل کیا ہو؟ یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"پہلی بات تو تم اپنے ذہن سے یہ نکال دو کہ نوکری چھوڑ کر اس پر بوجھ بن جاؤ گی۔"

"یعنی آپ کا مشورہ یہ ہے کہ میں اس کی مرضی کے مطابق نوکری چھوڑ دوں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"پہلے پوری بات تو سن لو۔ میں نے ابھی یہ بات کب کی ہے! میرے ایک سوال کا جواب دو۔ یہ بتاؤ' ایاز کو اتنی تنخواہ مل جاتی ہے کہ وہ تمھارا اور تمھارے والدین کا خرچ پورا کر سکے؟"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں!... مگر..."

"سنو!" میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "میرے ذہن میں جو کچھ ہے' وہ کہنے دو' اس کے بعد 'اگر' 'مگر' کرنا۔ تم غالباً" مجھے بتا چکی ہو کہ وہ پہلے بھی تمھارے والدین کے اخراجات اٹھانے پر آمادہ تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ انھیں اپنے ساتھ رکھنے پر راضی نہیں تھا اور نہ ان کے ساتھ رہنے پر! یہی بات تھی نا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں یہی تھا۔"

"میرے خیال میں یہ اس کی زیادتی تھی۔"

"کیا؟" اس نے پوچھا۔

"یہی کہ وہ تمھارے والدین کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اس نے اس طرح تمھاری عزت نفس کا خیال نہیں کیا اور اسی سے بات بگڑ گئی۔ بات بنانے کی اب ایک ہی صورت ہے کہ اس کے کچھ مطالبے تم مان لو اور کچھ وہ اپنے رویے میں لچک پیدا کرلے جیسا کہ غالباً" میں نے پہلے بھی کہا تھا۔"

نفیسہ نے مجھ سے واضح الفاظ میں وضاحت چاہی۔

"میرا دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ اگر ایاز چاہتا ہے کہ تم نوکری چھوڑ دو تو تمھیں اس پر عمل کرنا چاہیے۔ دیکھو نفیسہ' اگر ہر عورت یہی سوچنے لگے کہ وہ اپنے مرد پر بوجھ ہے تو پھر ہمارے ہاں کی گھریلو زندگی کا ڈھانچا ہی ٹوٹ کر بکھر

ئے۔ میرے نزدیک یہ مریضانہ طرز فکر ہے۔ اگر آج کی عورت اس طرح سوچتی ہے تو یقیناً یہ غلط ہے۔ یہ مغربی طرز فکر ہے' مشرقی نہیں! اور مغرب کو اس طرز فکر کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑی ہے اور ابھی تک یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ مرد سے برابری کا دعوی دراصل احساس کمتری کی دلیل ہے۔ اس گمراہ کن نعرے نے بہت سے گھر اجاڑ دیے ہیں' بہت سی عورتوں کو ذہنی مریض بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی ذمے داریاں پوری کرتے ہیں۔ عورت گھر کی ذمے داریاں سنبھالتی ہے اور مرد باہر کی۔ ذمے داریوں کی یہ تقسیم فطری ہے۔ اس میں نہ کوئی بڑا ہے اور نہ چھوٹا۔ دونوں ہی گویا ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ عورت مرد کے بغیر ادھوری ہے اور مرد عورت کے بغیر! سمجھ رہی ہو نا تم!"

ں نے اس کا چہرے کا جائزہ لیا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی تو میں نے مزید ا۔ "تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم اگر ایاز کے کہنے پر نوکری چھوڑ دیتی ہو تو غلط یں۔ ہاں اس کا یہ اصرار البتہ غلط ہوگا کہ تم اپنے والدین کے ساتھ نہ رہو۔ تو را خیال ہے کہ وہ اب یہ اصرار نہیں کرے گا۔"

"یعنی ہمارے ساتھ رہنے پر راضی ہو جائے گا؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ اسے نہیں جانتے' وہ بڑا ضدی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی ں پر راضی نہیں ہوگا۔"

"مجھے..." وہ سوچ میں پڑ گئی' پھر کچھ دیر بعد بولی۔ "ٹھیک ہے' میں اسے اپنانے کی خاطر یہ قربانی دے سکتی ہوں۔"

"تو پھر جب تم راضی ہو تو مجھے یہ یقین ہے کہ وہ بھی راضی ہو جائے گا کہ ھارے والدین کے ساتھ رہے۔ تم کل اس سے صاف صاف بات کرو' پھر بتاؤ ۔"

"اور رشید؟"

"وہ بات بعد کی ہے۔ ایاز راضی ہو گیا تو پھر یہ معاملہ ختم کرنے میں کوئی نہیں ہوگی۔" میں بولا۔

"رشید بہت کینہ پرور اور سازشی ہے۔ وہ اس معاملے میں کوئی نہ کوئی روڑا ضرور ڈالے گا۔" اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" میں نے کہا' پھر معاً" مجھے ایک بات یاد آگئی۔ "یہ بتاؤ کیا رشید تمہارے ماضی سے باخبر ہے؟"

"ہاں اسے سب کچھ معلوم ہے۔" نفیسہ نے بتایا۔

"بس اس کے ہاتھ میں یہی ایک پتّا ہے۔" میں سر ہلا کر بولا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"وہ اپنی پتنگ کٹتے دیکھ کر ایاز کو تمہارے ماضی سے آگاہ کر دے گا تاکہ معاملہ بگڑ جائے اور وہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا سکے۔"

"پھر؟" وہ فکرمند ہو گئی۔ "پھر کیا ہو گا... یہ... یہ بات تو میرے ذہن میں نہیں تھی۔"

"یہ کوئی ایسی تشویش کی بات نہیں۔ اس کا تدارک ہو سکتا ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کیسے؟" وہ بے چین نظر آ رہی تھی۔

"وہ تمہیں چاہتا ہے' اس کا اقرار خود تم بھی اپنی زبان سے کر چکی ہو اور تم بھی جانتی ہو' میں بھی کہ ماضی میں تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا' اس کی ذمے داری تم پر بہرحال نہیں ہے۔ تم بے گناہ ہو' مظلوم ہو! اگر واقعی ایاز کے دل میں تمہاری محبت ہے تو وہ سب کچھ جان لینے کے باوجود تمہیں اپنانے سے گریز نہیں کرے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسے یہ ساری باتیں کسی اور سے نہیں خود تمہی سے معلوم ہونا چاہئیں تاکہ وہ بعد میں یہ سوچنے پر مجبور نہ ہو' تم نے اُسے دانستہ اندھیرے میں رکھا تھا' دھوکا دیا تھا۔ ایک بات کوئی خود بتا دے اپنے بارے میں اور وہی بات کسی دوسرے کے توسط سے علم میں آئے' ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ تم یقیناً میری بات سمجھ رہی ہو گی۔ بالفرض تم اسے خود ہی سب کچھ بتا دیتی ہو اور بعد میں یہی باتیں اسے رشید کے ذریعے معلوم ہوتی ہیں تو اس پر کوئی غلط اثر مرتب نہیں ہو گا۔"

میری بات سن کر نفیسہ کچھ دیر خاموش رہی۔ چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہو۔

"کیوں' کیا بات ہے؟" میں نے اسے ٹوکا۔ "کیا تم میری تجویز سے متفق نہیں ہو؟"

"نہیں' یہ بات نہیں ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "میں دراصل یہ سوچ رہی تھی کہ میرا ماضی کہیں اسے پچھتاوے کی آگ میں جلنے پر مجبور نہ کر دے۔ میرے خیال سے مرد سب کچھ برداشت کر لیتا ہے لیکن چاہت کتنی ہی کیوں نہ ہو' یہ معاملہ ایسا ہے کہ..." وہ جھجکی اور اس کا جھجکنا بجا تھا۔ بات ہی ایسی تھی جسے زبان پر لانا اس کے لیے مشکل تھا۔ اس کے باوجود اس نے مثال دے کر اپنی بات کہہ ہی دی کہ یہ بھی بات کہنے کا ایک طریقہ ہے۔ "دیکھیے ناجان بوجھ کر مکھی کون کھاتا ہے!"

بڑی حد تک اس نے سچی بات کہی تھی۔ یہ بات خود مجھ پر بھی صادق آتی تھی۔ اگر اس کا ماضی آڑے نہ آگیا ہوتا تو بھلا میں ہی کیوں پیچھے ہٹ جاتا! پھر بھی یہ کوئی کلیہ نہیں۔ ممکن ہے ایاز کی محبت میں اتنی وارفتگی ہو کہ وہ اس کی پروا نہ کرے' میں نے سوچا' پھر اسے تسلی دینے کی خاطر کہا۔ "سنو نفیسہ! آدمی ایک حد تک ہی وقت اور حالات کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے یا گزارنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ ہر بات اس کی مرضی و خواہش کے مطابق نہیں ہوتی' لیکن جدوجہد جاری رکھنا چاہیے کہ یہی زندگی ہے۔ تم قدم تو اٹھاؤ' ممکن ہے خود بہ خود راستے تمہارے حق میں ہموار ہوتے چلیں جائیں۔ دیکھو کچھ معاملات اس ذاتِ واحد پر بھی چھوڑ دینا چاہئیں جو ہر شے پر قادر ہے۔"

اس کے چہرے سے قدرے اطمینان جھلکنے لگا۔ میں اسے مزید کچھ دیر سمجھاتا رہا اور پھر وہ دوسرے دن شام کو آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ اس وقت مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ میں نے اسے رخصت کر کے نماز پڑھی۔ اس کے بعد ایک بار پھر میرا ذہن سریتا کی طرف منتقل ہو گیا۔ وہ میری ہی وجہ سے بے گناہ ماری گئی تھی۔ شمبھو کا عمل بالکل اس بلّی کی طرح تھا جو کھاتی نہیں تو اوندھا دیتی ہے۔

اب تک میں دانستہ شمبھو کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹکتا رہا تھا۔ دکھ میں اگر شدید غصہ بھی شامل ہو جائے تو آدمی اپنا ذہنی توازن برقرار نہیں رکھ پاتا۔ عموماً اس کے نتائج بہتر نہیں نکلتے۔ میں اسی لیے دکھ کا کچھ بوجھ کم ہونے کے انتظار میں تھا' لیکن اب مجھ میں مزید انتظار کا مادہ نہیں رہا تھا۔ میں یہ جاننے کے لیے مضطرب تھا کہ شمبھو' ڈھاکہ سے فرار ہو کر کہاں گیا ہے؟ اس کے بعد ہی مستقبل کے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب کر سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے ہمزاد کو طلب کر لیا۔

"مجھے علم تھا کہ جلد یا بدیر آپ مجھ سے یہ سوال ضرور کریں گے۔" ہمزاد میری بات سن کر بولا' پھر بغیر رکے اس نے مزید کہا۔ "میں نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کر لی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔

"تو پھر بتاؤ نا!" میری آواز میں بے چینی تھی۔

"وہ شدید زخمی حالت میں فرار ہوا تھا اور اسی لیے اسے کچھ دن مکمل طور پر آرام کی ضرورت تھی۔ غالباً یہی سوچ کر اس نے اپنی دانست میں ایک محفوظ پناہ گاہ کا انتخاب کیا ہے۔"

"کیا تمہارے نزدیک بھی وہ پناہ گاہ محفوظ ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"بڑی حد تک۔"

"یعنی؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"شمبھو نے جس شخص سے شیطانی علوم کی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی' اس کی سکونت کلکتے میں ہے اور شمبھو نے اسی کے پاس پناہ لی ہے۔"

"کلکتہ!" میں زیر لب بولا اور میرے ذہن میں جھماکے سے ہونے لگے۔ اس شہر میں میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

کچھ دیر کو میں ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔ یکے بعد دیگرے کتنے ہی چہرے صفحہ ذہن پر ابھرے اور معدوم ہو گئے۔ یہ شہر گویا میرے ماضی کا حصہ تھا۔ یہیں مہ پارہ نے خودکشی کی تھی' یہیں سے میں ڈھاکہ آیا تھا۔ اب یہ شہر پرایا ہو گیا تھا لیکن میرے لیے نہیں۔ اب بھی اس کے گلی کوچے جیسے میرے وجود میں آباد تھے۔ اس شہر کا جادو ہی کچھ اور تھا' نشہ ہی کچھ مختلف تھا۔ برسوں پہلے حالات کچھ

اور تھے۔ ان حالات میں میرے لیے یہی مناسب تھا کہ اس شہر کو خیر آباد کہہ دوں' لیکن اب حالات بدل چکے تھے۔ میں وہ شیخ کرامت نہیں رہا تھا جو کبھی تھا' نہ اپنے ظاہر میں نہ باطن میں! اب وہاں میرے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ہمزاد مجھے گم صم دیکھ کر جانے کیا سمجھا اور مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"آپ فکر مند نہ ہوں' کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔ ہاں فی الحال کچھ دن کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ ادھر کا رخ نہ کیا جائے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے بے خیالی میں یونہی پوچھ لیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اس وقت سے فائدہ اٹھا کر پوری معلومات حاصل کر لوں۔ میرے نزدیک اب شمبھو سے زیادہ اہم اس کا گرو ہے جس نے اسے پناہ دی ہے۔ اب اصل معرکہ آرائی شمبھو سے نہیں اس کے گرو سے ہوگی۔ اس کا نام گرو گوبند ہے فی الحال اس سے زیادہ مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔" ہمزاد نے بتایا۔

"تمہیں یہ معلومات حاصل کرنے میں کتنے دن لگ جائیں گے؟" میں اب پوری طرح ہمزاد کی طرف متوجہ ہو چکا تھا اور اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔

"یہ بتانا فی الحال میرے لیے مشکل ہے' لیکن میری کوشش یہی ہوگی کہ جلد سے جلد سب کچھ معلوم کر لوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں طویل سانس لے کر بولا۔ مجھے تمہارا مشورہ قبول ہے۔"

"اب اجازت ہے مجھے؟"

"ٹھہرو!" میں نے کچھ سوچتے ہوئے اسے روک لیا۔ دراصل دکھوں کی دھند چھٹتے ہی مجھے ایک اور بھولا ہوا قصہ یاد آ گیا تھا۔ یہ معاملہ ایک بے گناہ شخص کے قتل کا تھا میں نے قدرے توقف کے بعد ہمزاد سے کہا۔ "جس رات شمبھو نے تم پر قاتلانہ حملہ کیا تھا' میں نے تمہیں ثمینہ' زاہد اور شوکت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے بھیجا تھا۔ یاد آیا؟"

"جی ہاں۔" وہ بولا۔

"میں چاہتا ہوں کہ میرے ضمیر پر یہ بوجھ بھی نہ رہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟" میں نے مختصراً کہا' اس یقین کے ساتھ کہ میری بات کا ابلاغ یقیناً ہو جائے گا۔

ہمزاد نے مجھے مایوس نہیں کیا اور مجھے اس سے یہی توقع بھی تھی۔ اس نے کہا۔ "آپ مطمئن رہیں' اگر اب تک قتل کا یہ معاملہ آگے نہیں بڑھا اور شوکت زندہ ہے تو پھر میں اسے قتل نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے آپ کے جذبات و احساسات کا پوری طرح خیال ہے۔"

"ایک مسئلہ اور بھی تھا۔" میں قدرے جھجکتے ہوئے بولا۔ پھر میں نے اسے نفیسہ کے مسئلے سے بھی آگاہ کر دیا۔ اس مسئلے کے حل کیلئے ہمزاد کو نفیسہ کے عاشق ایاز سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ایاز کے ذہن کو قابو میں کر کے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ میرے نزدیک یہ بھی کار خیر ہی تھا۔

"یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔" ہمزاد نے مجھے یقین دلایا۔ "آپ اپنے ذہن پر کوئی بوجھ نہ رکھیں اور جتنا زیادہ آرام کر سکیں بہتر ہے۔" اس کے لہجے میں خلوص تھا۔

"مجھے آرام کے سوا اور کام بھی کیا ہے!" میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "اب تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔"

ہمزاد چلا گیا۔ اسے سب کچھ بتا کر یقیناً میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ مجھے اس پر بھروسا تھا کہ وہ معاملات کو بہ حسن و خوبی سنبھال لے گا۔ میرے نزدیک اب تشویش ناک مسئلہ صرف شبھو کا تھا۔ میں اسے کسی صورت نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ کلکتے تو کیا وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں چلا جاتا' میں اس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔ اس نے میرے دل پر ایسا زخم لگایا تھا جس کا بھرنا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ اس زخم کی کسک شاید زندگی بھر مجھے تڑپاتی رہتی۔

دنیا میں تنہائی سے بڑھ کر شاید اور کوئی عذاب نہیں۔ اس کا پورا اندازہ مجھے گویا نئی زندگی اپنا کر ہوا تھا۔ پہلے میں نے کبھی اتنی تنہائی محسوس نہیں کی تھی اور اس کا سبب تھا۔ میں اپنی خلوتیں رنگوں اور خوشبوؤں سے آباد رکھتا تھا' لیکن

اب ایسا نہیں تھا۔ میں نے توبہ کر لی تھی اور شاید توبہ قبول کرنے والے نے میری توبہ قبول بھی کر لی تھی۔ میں نے صدق دل سے توبہ کی تھی اسی لیے یہ یقین بھی تھا۔ میں اس یقین کو بے یقینی میں بدلنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس وقت بھی مجھے بے حد تنہائی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اپنی تنہائی کا زیادہ وقت عموماً" اب مطالعے میں صرف کرتا تھا۔ اس وقت بھی مجھے یہی خیال آیا۔ اس عذاب سے نجات پانے کی اس سے بہتر کوئی اور صورت نہیں تھی۔ خواب گاہ سے متصل کمرے کو ہمزاد نے مطالعہ گاہ بنا دیا تھا۔ وہاں ہر موضوع پر ترتیب کے ساتھ کتابیں موجود تھیں۔ میرے قدم جیسے خود بخود اس کمرے کی طرف اٹھ گئے۔

وہاں کتابیں بڑے سلیقے اور ترتیب کے ساتھ ریکوں میں لگی ہوئی تھیں۔ کمرے میں روشنی کرنے کے بعد میں نے ان ریکوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ ہر ریک پر چٹ لگی ہوئی تھی جو اس ریک میں رکھی ہوئی کتابوں کے موضوع سے متعلق تھی۔ میں ان چٹوں کو پڑھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اب سے پہلے میں نے ان کتابوں پر نگاہ نہیں ڈالی تھی اور اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ مجھے ڈھاکہ آنے کے بعد اتنی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ مجھے ان ریکوں پر نگاہ ڈال کر اندازہ ہوا کہ ہمزاد نے وہاں مختلف موضوعات پر بہترین کتابیں جمع کر دی ہیں۔ بالآخر میں ایک ریک کے پاس رک گیا۔ ریک پر "قدیم پراسرار علوم" کی چٹ لگی ہوئی تھی۔

ادب کے ساتھ ساتھ ہی یہ موضوع بھی ہمیشہ سے میری دلچسپی رہا ہے۔ میں اس ریک میں رکھی ہوئی کتابوں کو نکال نکال کر دیکھنے لگا۔ اردو' ہندی' فارسی اور انگریزی' یہ چاروں زبانیں مجھے آتی تھیں۔ ہمزاد نے وہاں کتابیں جمع کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا تھا۔ ان زبانوں کے سوا وہاں کسی اور زبان کی کتاب نہیں تھی۔ انگریزی زبان کی ایک کتاب کے پشتے پر مجھے "ان بلیو ایبل انڈیا" لکھا ہوا نظر آیا "یعنی ناقابل یقین ہندوستان! مصنف ایک انگریز ہی تھا۔ میں نے وہ کتاب ریک سے کھینچ لی اور قریب ہی پڑی ہوئی ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ وہ کتاب برطانیہ کے ایک اشاعتی ادارے نے شائع کی تھی اور اسے شائع ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ مصنف کی چھوٹی سی تصویر کے

ساتھ کتاب کے پس ورق پر ایک مختصر سی تحریر مصنف کے بارے میں تھی کہ اس نے اپنی زندگی کا بڑا حصّہ ہندوستان میں گزارا ہے اور یہ کہ اس کا مقصد ہی ہندوستان کے پُراسرار علوم پر تحقیق کرنا تھا۔ مجھے وہ کتاب کچھ دلچسپ معلوم ہوئی اور میں اس کا پیش لفظ پڑھنے لگا جو مصنف ہی کا لکھا ہوا تھا۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ کتاب میں جو واقعات لکھے گئے ہیں' وہ من گھڑت' سنے سنائے یا غیر معتبر نہیں ہیں۔ ان میں سے اکثر واقعات اس کے مطالعے اور مشاہدے میں آ چکے ہیں۔ پیش لفظ پڑھنے کے بعد میں نے کتاب کی فہرست مضامین پر نظر ڈالی تو اس میں ہمزاد پر بھی ایک باب نظر آیا۔ میں نے یہ جاننے کے لیے کہ مصنف کا دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے یا نہیں' کتاب کا وہ باب پڑھ لیا۔ چند جزئیات سے قطع نظر اس نے ہمزاد کے بارے میں تمام ہی باتیں درست لکھی تھیں۔ جزئیات کی مجھے اس سے توقع بھی نہیں تھی اور نہ یہ کہ وہ ہمزاد کو قابو میں کرنے کا عمل بھی اپنی کتاب میں لکھے گا۔ بہرحال اس سے اتنا ضرور ہوا کہ میرا اشتیاق بڑھ گیا اور میں نے کتاب کے دیگر ابواب بھی پڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک طویل باب کا عنوان تھا "جرنی آف پاسٹ" یعنی ماضی کا سفر! اس عنوان نے مجھے چونکا دیا۔ پُراسرار علوم کے حوالے سے ماضی کا سفر یقیناً چونکا دینے والی بات تھی۔ یہ پورا باب ایک ہندوستانی جوگی لیش پال کے پُراسرار تجربات و واقعات پر مشتمل تھا۔ مصنف نے لکھا تھا کہ وہ خود ایک بار اپنے نوجوانی کے زمانے میں جوگی لیش پال سے ملا تھا۔ یہ ملاقات شملے میں ہوئی تھی۔ مصنف جوگی لیش پال سے مل کر بہت متاثر ہوا تھا۔ جوگی لیش پال نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ اپنی ریاضت اور روحانی قوت کے سبب بہت جلد اس قابل ہو جائے گا کہ گزرے ہوئے زمانوں کا سفر کر سکے اور یہ سفر صرف خیالی نہیں' جسمانی ہو گا۔ اس کے بعد جوگی لیش پال سے مصنف پھر کبھی نہیں مل سکا تھا۔ ہندوستان میں طویل عرصے سکونت کے سبب مصنف یہاں بولی جانے والی کئی زبانوں پر عبور حاصل کر چکا تھا۔ وہ ہندی اور اردو بول بھی سکتا تھا اور لکھنے پڑھنے پر بھی قدرت حاصل کر چکا تھا۔ جوگی لیش پال سے ملاقات کے تقریباً" بیس پچیس سال بعد ایک کتاب اس کے مطالعے میں آئی۔ یہ کتاب ہندی میں تھی۔ کتاب کا نام تھا' جوگی جی کی جیون کتھا! انگریز مصنف

نے اس کتاب کے لکھنے والے کا جو نام تحریر کیا' اسے پڑھ کر میں چونک اٹھا۔ جوگی جی کی جیون کتھا" لکھنے والے کا نام گرو گوبند تھا۔

"گرو گوبند!" میں زیر لب بڑبڑایا۔ میرے چونک اٹھنے کا سبب یہ تھا کہ آج ہی میں نے ہمزاد کی زبانی یہ نام سنا تھا۔ شمبھو کے سلسلے میں ہمزاد نے گرو گوبند کا ذکر کیا تھا۔ شمبھو اب کلکتے میں اسی کی پناہ میں تھا۔ یہ مماثلت محض اتفاق بھی ہو سکتی ہے' اس کے باوجود میرا تجسّس کم نہ ہوا۔ میں نے کتاب کا پورا باب پڑھ لیا۔ اس باب کا انحصار گرو گوبند کی کتاب ہی پر تھا۔ انگریز مصنف نے لکھا تھا کہ اب گرو گوبند کی یہ کتاب تقریباً" نایاب ہے اور دنیا میں اس کے چند ہی نسخے باقی ہیں جن میں سے ایک برٹش میوزیم کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ خود انگریز مصنف ہی نے اپنا نسخہ' برٹش میوزیم کی لائبریری کو تحفتہً" دے دیا تھا۔ "جوگی جی کی جیون کتھا" میں گرو گوبند نے جوگی لیش پال ہی کے حالات زندگی اور پُراسرار روحانی تجربات تحریر کیے تھے۔ گرو گوبند نے خود کو جوگی لیش پال کا داس لکھا تھا' یعنی خدمت گار' چیلا! گرو گوبند نے اپنی کتاب میں لکھتا تھا کہ اس کے گرو جوگی لیش پال نے اپنی ریاضت و عبادت کے سبب اتنی رُوحانی قوت حاصل کر لی تھی کہ وہ جسمانی طور پر ماضی کا سفر کر سکیں۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ اس کے گرو گزشتہ دس سال سے مغل تاج دار اکبر اعظم کے عہد میں رہ رہے ہیں اور وہ خود بھی وہاں جا کر اپنے گرو جوگی لیش پال سے مل چکا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ خود گرو گوبند بھی ماضی میں سفر کرنے کا اہل تھا انگریز مصنف نے لکھا تھا کہ گرو گوبند نے اپنی کتاب "جوگی جی کی جیون کتھا" میں عبادت و ریاضت کے وہ تمام طریقے اور وظائف تحریر کیے ہیں جن پر عمل کر کے کوئی بھی شخص ماضی کا سفر کر سکتا ہے' شرط صرف یہ ہے کہ کوئی راہ دکھانے والا ہو' گرو ہو ورنہ یہ روحانی اور جسمانی سفر اختیار کرنے والا موت کی آغوش میں بھی پہنچ سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک اور بات نے بھی چونکایا۔ انگریز مصنف نے گرو گوبند سے ملنے کی خاطر کلکتے تک کا سفر بھی کیا تھا' مگر گرو گوبند سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ گرو گوبند کے چیلوں نے اسے بتایا تھا کہ گرو گوبند گزشتہ ڈیڑھ سال سے غائب ہے اور اس کے بارے

میں انھیں کچھ علم نہیں کہ کہاں ہو گا! اس سے انگریز مصنف نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اپنے گرو جوگی لیش پال کی طرح گرو گوبند بھی ماضی کے کسی عہد میں سکونت اختیار کر چکا ہو گا۔ اس کے بعد انگریز مصنف رچرڈ نے گرو گوبند کو مزید تلاش نہیں کیا۔

نام اور مقام دونوں ہی ایک تھے، مجھے اسی لیے یہ مماثلت اتفاقی معلوم نہیں ہوئی۔ پھر یہ کہ ہمزاد نے جس گرو گوبند کا ذکر کیا تھا، وہ بھی پراسرار قوتوں کا مالک تھا اور اسی نے شمبھو کو ابتدائی پراسرار علوم کی تعلیم دی تھی۔ انگریز مصنف نے اپنی کتاب میں گرو گوبند کے حوالے سے جو کچھ لکھا تھا، اگر وہ سچ تھا، افسانہ طرازی نہیں تھی تو میرے نزدیک یہ انتہائی عجیب اور حیرت انگیز تھی۔ ہرچند کہ میں خود انتہائی پراسرار اور ناقابل یقین حالات سے گزر چکا تھا لیکن جسمانی طور پر کسی شخص کا ماضی میں پہنچ جانا میرے خیال میں ناممکن سی بات تھی۔ اگر گرو گوبند کی لکھی ہوئی نایاب کتاب کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کی لائبریری میں موجود تھا تو ہمزاد کے ذریعے اسے حاصل کرنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ انگریز مصنف رچرڈ نے لکھا تھا کہ اس کتاب میں ماضی کا سفر کرنے کے وہ تمام طریقے اور وظائف موجود ہیں جن پر عمل کر کے کوئی شخص بھی عہد ماضی میں پہنچ سکتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ گرو گوبند کی لکھی ہوئی اس کتاب کا مطالعہ ضرور کروں گا۔

دوسرے دن صبح ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے ہمزاد سے اس کتاب کے حصول کی خواہش کا اظہار کیا اور اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ کتاب کہاں مل سکتی ہے!

میرا حکم پاتے ہی وہ کتاب لینے روانہ ہو گیا۔

ڈھاکہ سے لندن تک کا طویل سفر ہمزاد کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ میری توقع سے کچھ پہلے ہی لوٹ آیا۔ وہ کتاب بڑی خراب و خستہ حالت میں تھی لیکن اسے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک پلاسٹک کوَر میں محفوظ کر دیا تھا۔ کوَر ہی کے پشتے پر لمبائی میں ایک چٹ لگی ہوئی تھی۔ اس پر انگریزی میں کتاب کا موضوع، نام اور مصنف کے علاوہ کچھ نمبر لکھے ہوئے تھے۔ پلاسٹک کوَر کے اوپری حصے پر بائیں طرف چوڑائی میں ایک اور چٹ چسپاں تھی۔ اس پر دیگر تفصیلات

درج تھیں۔ ان تفصیلات کے مطابق یہ کتاب اب سے تقریباً" چالیس سال قبل ایک انگریز رچرڈ نے برٹش میوزیم کو تحفتہً دی تھی۔ اسی چٹ پر کتاب کا سن اشاعت ۱۸۹۰ء درج تھا، گویا اس کتاب کو شائع ہوئے ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ یہ ظاہری بات تھی کہ کتاب کی اشاعت کے وقت اس کا مصنف یقیناً" سن شعور کو پہنچ چکا ہو گا۔ کم سے کم بھی مصنف کی عمر اس وقت پچیس اور تیس سال کے درمیان تو رہی ہو گی۔

"یہ کوئی اور ہی گرو گوبند ہے۔" میں بے خیالی میں بڑبڑایا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" مجھے اپنے ہمزاد کی آواز سنائی دی جو قریب ہی کھڑا تھا۔

میں اپنے خیالوں میں اتنا سرگرداں تھا کہ وہاں ہمزاد کی موجودگی کو بھول ہی گیا تھا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، پھر کہا۔ "نہیں۔ تم چاہو تو جا سکتے ہو، میں کچھ دیر اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"اگر آپ خود مجھ سے یہ کتاب نہ منگواتے تو شاید میں بھی آپ کو اس کے مطالعے کا مشورہ دیتا۔" ہمزاد نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"وہ کیوں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس لیے کہ جب کوئی مصنف کسی کے بارے میں کچھ لکھتا ہے تو دانستہ یا نادانستہ اپنے متعلق بھی بہت سی باتیں لکھ جاتا ہے۔ میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی لیکن مجھے یقین ہے کہ اس میں گرو گوبند نے اپنے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہو گا۔"

یہ کہہ کر ہمزاد چپ ہو گیا حالانکہ میں اس سے مزید کچھ بولنے کی توقع کر رہا تھا۔

"لیکن اس سے میرا یا تمہارا کیا تعلق؟" میں نے وضاحت کی خاطر یہ سوال کیا۔

"پہلے تو کوئی تعلق نہیں تھا لیکن شاید اب تعلق پیدا ہو جائے کیوں کہ میری معلومات کے مطابق یہ کتاب اسی گرو گوبند کی لکھی ہوئی ہے جس کے پاس شمبھو نے پناہ لی ہے۔" ہمزاد نے گویا انکشاف کیا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم!... یہ کیسے ممکن ہے؟... اس کا مطلب تو ہوا کہ... کہ

گرو گوبند اب تک زندہ ہے اور... اگر واقعی ایسا ہی ہے تو اس کی عمر میرے اندازے کے مطابق پونے دو سو سال ہونا چاہیے۔"

"آپ کا اندازہ تقریباً" درست ہے۔ اس کی عمر لگ بھگ اتنی ہی ہو گی۔"

"مگر وہ... وہ اب تک زندہ کیسے ہے؟" میں اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"آپ نے کبھی اپنے بارے میں بھی سوچا!"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ آپ کی عمر کتنی ہے؟ اور کیا یہ تعجب خیز بات نہیں؟" ہمزاد نے گویا دلیل پیش کی۔ "جب آپ نے پہلی بار مجھے مسخر کیا تھا تو آپ کی عمر تیس سال تھی' پھر دوبارہ ایک سو تیس سال کی عمر کو پہنچ کر آپ نے مجھے قابو میں کر لیا۔ یوں گویا آپ ایک سو انتیسویں سال میں ہیں اور اب کوئی بھی آپ کو دیکھ کر تیس سال سے زیادہ کا نہیں کہہ سکتا۔ کیا یہ کم حیرت انگیز بات ہے؟ ان حسابوں گرو گوبند آپ سے صرف پچاس سال بڑا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ ہڈیوں کا پنجر ہو گیا اور آپ ابھی جوان ہیں۔"

"تو گویا تم نے گرو گوبند کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لی ہیں؟" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"جی نہیں' ابھی میں مکمل معلومات حاصل نہیں کر سکا ہوں۔"

"پھر بھی اب تک کچھ تو معلوم ہوا ہو گا۔"

"ہاں صرف اس قدر کہ وہ انتہائی پراسرار قوتوں کا مالک ہے اور وہی میں ابھی آپ کو بتا چکا ہوں' یعنی یہ کہ اس کی عمر بہت طویل ہے۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اپنے عہد جوانی میں اس نے اپنے گرو جوگی لیش پال کے بارے میں کوئی کتاب بھی لکھی تھی جو اب تقریباً" نایاب ہے۔ ممکن ہے میں اس کتاب کا سراغ لگا لیتا کہ آپ نے میری مشکل آسان کر دی۔"

"گویا میں اور تم دانستگی میں ایک ہی سمت بڑھ رہے تھے!" یہ کہہ کر

ہمزاد کو انگریز مصنف رچرڈ کی کتاب کے متعلق بتایا' پھر بولا۔ "اب اس کتاب کو پڑھنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ ممکن ہے' تمہارے اندازے کے مطابق اس کے مطالعے سے گرو گوبند کے بارے میں بہت سی کام کی باتیں معلوم ہو جائیں۔ شمبھو پر ہاتھ ڈالنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اسے پناہ دینے والے کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہو جائیں۔"

ہمزاد نے مجھ سے اتفاق کیا اور پھر میری اجازت پا کر رخصت ہو گیا۔

ہمزاد چلا گیا تو میں نے پلاسٹک کور کھول کر اس کتاب کے بوسیدہ اوراق باہر نکال لیے۔ کتاب کے اوراق کو جگہ جگہ سے دیمک چاٹ گئی تھی اور آخری حصہ تو بہت ہی خستہ حالت میں تھا۔ کتاب کی زبان قدرے سنسکرت آمیز تھی مگر اتنی نہیں کہ میں سمجھ ہی نہ سکوں۔ میں بہت احتیاط کے ساتھ ایک ایک ورق الٹ رہا تھا' درمیان میں سے چند صفحات غائب بھی تھے اور جہاں تک میرا اندازہ تھا کسی نے دانستہ یہ صفحات غائب کیے تھے۔ کیوں کہ انھی صفحات میں ماضی کا ایک سفر کرنے کے وظائف اور طریقہ کار درج ہونا چاہیے تھا۔ تسلسل کے ساتھ پڑھنے سے یہی معلوم ہوتا تھا۔

وہ کتاب سو سوا سو صفحات کی تھی اس لیے جلد ہی میں اسے پڑھ گیا۔ اس کی ایک سبب کتاب کا دلچسپ انداز تحریر بھی تھا۔ گرو گوبند نے جوگی لیش پال کی روداد زندگی کو کہانی کی صورت میں لکھا تھا۔ اس کہانی کا ایک کردار خود گرو گوبند ہی تھا۔ وہ گیارہ سال کی عمر سے اپنی نوجوانی تک جوگی لیش پال کے ساتھ رہا تھا اور اپنے گرو کی خدمت کی تھی۔ اسی خدمت کے صلے میں جوگی لیش پال نے اسے بڑا کمال پہنچایا تھا۔ اس نے تمام روحانی علوم کی تربیت جوگی لیش پال سے لی تھی۔ انھی میں ایک حیرت انگیز علم' ماضی کا سفر تھا۔ جوگی لیش پال' ماضی کے سفر پر جانے سے پہلے اسے یہ علم سکھا گیا تھا اور اسی علم کی بدولت خود اس نے ماضی کا سفر کیا تھا اور مغلیہ تاج دار اکبر اعظم کے عہد میں پہنچ کر جوگی لیش پال سے ملاقات کی تھی۔ اپنے متعلق ان مختصر سی باتوں کے سوا گرو گوبند نے اور کچھ نہیں لکھا تھا۔ بقیہ کتاب جوگی لیش پال کی عبادات و رضیات کے ذکر اور اس کے محیر العقول واقعات سے بھری

پڑی تھی۔ ان واقعات میں سب سے حیرت انگیز واقعہ وہ تھا جب جوگی لیش پال ہمیشہ کے لیے یہ دنیا چھوڑ کر ماضی کے سفر پر جا رہا تھا۔ گرو گوبند نے لکھا تھا کہ میں ان دنوں اپنے گرو جی کے ساتھ ہمالیہ پربت (پہاڑ) کی ایسی گھاٹیوں میں تپسیا (عبادت) کر رہا تھا جہاں سال بھر برف جمی رہتی ہے۔ ایک دن بھور سے (علی الصبح) گرو جی نے مجھے سوتے سے جگایا اور کہا کہ بچہ! اب اس جگ میں ہمارے دن پورے ہوئے' سو ہمارے چلنے کا پربندھ (بندوبست) کرا پھر انہوں نے مجھے سات ہاتھ گہرا گڑھا کھودنے کا حکم دیا۔ میں گرو جی کے حکم پر کدال لے کر گڑھا کھودنے لگا۔ وہاں مٹی تو تھی نہیں' ہر طرف برف ہی برف تھی' سو میں نے برف ہی کھود کر گڑھا بنایا۔ گڑھا کھد گیا تو گرو جی اس میں اتر گئے اور مجھ سے بولے کہ جب میں لیٹ جاؤں تو گڑھے کو برف سے پاٹ دینا۔ میں بہت گھبرایا تو گرو جی نے میری ہمت بندھائی اور بتایا کہ اب وہ ماضی کے سفر پر جا رہے ہیں اور سدا وہیں رہیں گے۔ میرے اسرار پر انہوں نے یہ بھی بتا دیا کہ کہاں اور ماضی کے کس عہد میں جا رہے ہیں! اسی کے ساتھ انہوں نے مجھے یہ آگیا (اجازت) بھی دی کہ اگر میں کبھی چاہوں تو آ کر مل سکتا ہوں۔ پھر گرو جی گڑھے میں لیٹ گئے اور مجھے گڑھا پاٹنے کا حکم دیا۔ مجبوراً" مجھے ان کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔ گڑھا برابر کرنے کے بعد میں وہاں سے چل دیا' پر میرا من (دل) گرو جی ہی پر پڑا رہا۔ نتیجۃً" کچھ ہی دیر بعد میں پھر اسی جگہ لوٹ آیا جہاں گرو جی کو زندہ دفن کیا تھا۔ جانے کیوں میرے من (دل) میں یہ آیا کہ مجھے گڑھا کھود کر دیکھنا چاہیے۔ یہ خواہش اتنی بڑھی کہ میں مجبور ہو گیا۔ گڑھا کھود کر دیکھا تو اس میں گرو جی کا گیروا لباس تو مل گیا پر ان کا شریر (جسم) غائب تھا۔ یہ دیکھ کر مجھ پر ایسی دہشت سوار ہوئی کہ پھر وہاں رک نہ سکا اور گڑھے کو یونہی کھلا چھوڑ کر بھاگ آیا۔ پھر کوئی سات ورش (برس) بیت جانے کے بعد میں نے گرو جی کے سکھائے ہوئے علم پر عمل کر کے ماضی کا سفر کیا اور گرو جی سے بھینٹ (ملاقات) کی۔

اسی پُراسرار اور ناقابل یقین واقعے کو تحریر کرنے کے بعد گرو گوبند نے لکھا ہے کہ اب میں آئندہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ وہ طریقہ کار اور وظائف

لکھوں گا جن پر عمل کر کے ہر شخص میری طرح ماضی کا سفر کر سکتا ہے پرنتو (مگر) اس کے لیے کسی گرو کی آگیا (اجازت) اور رہنمائی لازمی ہے کتاب میں سے کئی صفحات غائب تھے۔

پوری کتاب پڑھنے کے بعد میں' گرو گوبند کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ اور نہ جان سکا کہ وہ انتہائی پراسرار شخصیت کا مالک ہے اور یہ کہ اسے بڑی روحانی قوتیں حاصل ہیں۔ یہ باتیں مجھے ہمزاد بھی بتا چکا تھا۔ کتاب پڑھ کر کوئی نئی بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ میں نے کتاب کو احتیاط کے ساتھ پلاسٹک کور میں رکھا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ مسلسل مطالعے اور غور و فکر سے عموماً" ذہن پر غنودگی سوار ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی مجھے غنودگی سی محسوس ہو رہی تھی اسی لیے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی میرا ذہن پوری طرح نیند کی آغوش میں نہیں پہنچ سکا تھا کہ میں نے اپنے جسم میں ایک تیز قسم کی سنسناہٹ محسوس کی۔ پھر میرے حواس پر دو شعلے سے محیط ہو گئے۔ ان شعلوں کی تپش میں اپنی آنکھوں پر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولنا چاہیں مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ چند ہی لمحے بعد شعلوں کی تپش کم ہو گئی اور وہ کچھ فاصلے پر نظر آنے لگے۔ میں بند آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ شاید یہ میری چشم تصوّر کا اعجاز تھا۔ میری چشم تصوّر ان شعلوں پر جمی ہوئی تھی کہ معاً" میں نے محسوس کیا' وہ دو شعلے نہیں دو آنکھیں ہیں۔ اسی کے ساتھ ایک اجنبی چہرے کے دھندلے دھندلے سے نقوش واضح ہونے لگے۔ وہ چہرہ باریش تھا اور اس کی چوڑی پیشانی کے نیچے حلقوں میں دو چراغ سے روشن تھے جنہیں میں پہلے شعلے سمجھا تھا۔ اچانک سفید باریش چہرے کے پتلے پتلے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔

"شیخ کرامت؟" میں نے ایک بھاری گونج دار آواز سنی۔ "ہماری کھوج نہ کر! ہمیں کھوجنے کی چیشٹا (کوشش) کرے گا تو خود کو بھول جائے گا۔ تیرا شترو (دشمن) ہماری شانتی بھنگ کرنے (سکون تباہ کرنے) یہاں آیا تھا پرنتو (لیکن) ہم نے اسے بھگا دیا۔ یہ تیرا اور اس کا معاملہ ہے' ہم اس بیچ میں پڑنا نہیں چاہتے۔ ہمیں

خبر ہے کہ اس نے تیرے ساتھ اچھا نہیں کیا پر برائی کا بدلہ برائی نہیں ہے۔ اگر ہو سکے اور تیرا من اس پر راضی ہو جائے تو اسے معاف کر دے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ آواز معدوم ہو گئی اور چہرے کے خطوط بھی جیسے تحلیل ہو گئے۔

آنکھ کھلی تو میرا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ میرے جسم میں اب تک ہلکی ہلکی سی سنسناہٹ تھی اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر میرے حواس منتشر رہے۔ میں فیصلہ نہ کر پایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا ہے' وہ خواب تھا یا حقیقت! حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے ہمزاد کو طلب کر لیا۔

ہمزاد کو میں نے پہلے اس کتاب کے بارے میں بتایا کہ اس سے گرو گوبند کے متعلق کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہو سکی' پھر اسے ابھی پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کیا۔ وہ پوری توجہ سے میری بات سنتا رہا۔ میرے خاموش ہو جانے کے باوجود بھی کچھ دیر ہمزاد نے کوئی تبصرہ نہیں کیا حالانکہ میں اس کے بولنے کا منتظر تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو۔

"یہ دھوکا بھی ہو سکتا ہے" ہمزاد کی آواز سنائی دی۔ "بہ ظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود گرو گوبند نے آپ سے ذہنی رابطہ قائم کر کے یہ ساری باتیں کی ہیں مگر یہ شمبھو کی چال بھی ہو سکتی ہے۔"

"لیکن وہ آواز شمبھو کی نہیں تھی۔" میں نے کہا۔

"آواز بدلی بھی جا سکتی ہے۔" ہمزاد بولا۔ "خود میں بہ یک وقت متعدد آوازوں کی نقل کر سکتا ہوں۔"

"اور وہ اجنبی چہرہ؟" میں نے سوال کیا۔

"آپ نے اسے واضح طور پر دیکھا تھا؟" ہمزاد نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ مجھے اس کے خط و خال بتا سکتے ہیں؟"

"ہاں کیوں نہیں!" یہ کہہ کر میں نے کچھ دیر پہلے دیکھے ہوئے چہرے کے خط و خال بیان کر دیے۔

"یہ تو خود گرو گوبند ہی معلوم ہوتا ہے۔" ہمزاد بے ساختہ بول اٹھا۔

"کیوں' کیا تم اسے دیکھ چکے ہو؟" میں نے معلوم کیا۔

"ہاں۔" یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگا' پھر بولا۔ "ٹھہریں' میں ابھی تصدیق کیے لیتا ہوں۔"

"کس بات کی تصدیق؟" میں کچھ نہ سمجھا تو پوچھا۔

"اس کی تصدیق کی شمبھو اب بھی گرو گوبند کی پناہ میں ہے یا نہیں!" ہمزاد نے جواب دیا اور پھر دوسرے ہی لمحے غائب ہو گیا۔

اسی وقت میری نگاہ' مسہری کے سرہانے کی طرف اٹھی۔ وہاں سے گرو گوبند کی کتاب غائب تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سونے سے پہلے میں نے اس کتاب کو پلاسٹک کور میں بند کر کے وہیں رکھا تھا۔ پھر میں نے سارا کمرا کھنگال ڈالا مگر کتاب کہیں نہیں ملی۔ میں عالم اضطراب میں ٹہلنے لگا۔ اس کتاب کا میری خواب گاہ سے غائب ہو جانا عجیب سی بات تھی۔ وہ کتاب کیوں اور کس نے غائب کی؟ یہ سوال میرے لیے کسی معمے سے کم نہیں تھا' خصوصاً" ایسی صورت میں جب میں وہ کتاب پڑھ چکا تھا۔

ہمزاد کو خلاف معمول لوٹنے میں دیر ہونے لگی تو میری پریشانی اور بڑھ گئی۔ شمبھو کا معاملہ طول اختیار کرتا جا رہا تھا۔ پہلے تو صرف وہی مقابل تھا مگر اب گرو گوبند بھی سامنے آ گیا تھا۔

دوپہر ہونے تک میں اضطراب اور بے چینی کا شکار رہا کیوں کہ ہمزاد دوپہر ہونے سے پہلے واپس نہ آ سکا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ انتہائی نڈھال اور بے حال نظر آ رہا تھا۔

"کیا ہوا تمہیں؟" میں اس کی حالت دیکھ کر بے چین ہو گیا۔

"میں... میں ٹھیک ہوں آپ فکر نہ کریں۔" وہ بولا تو اس کی آواز سے نقاہت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"لیکن تمہاری یہ حالت کیسے ہو گئی؟"

"اس شیطان نے مجھے مندر کی حدود میں قید کر دیا تھا تاکہ میں آپ کے پاس واپس نہ آ سکوں۔" ہمزاد نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے بتایا۔

"کس نے؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہ مجھے نہیں معلوم۔" ہمزاد کی آواز اب قدرے پرسکون تھی۔ "لیکن میرا اندازہ ہے کہ گرو گوبند ہی ہو گا۔"

"ذرا تفصیل سے بیان کرو' ہوا کیا؟"

"میں غالباً" آپ کو بتا چکا ہوں کہ کلکتے کے نواح میں دریائے ہگلی کے کنارے وہ قدیم مندر ہے جہاں گرو گوبند کی سکونت ہے۔ شمبھو بھی وہیں پہنچا تھا۔ ہوا یہ کہ میں جیسے ہی مندر کی حدود میں داخل ہوا' مجھے خطرے کا احساس ہو گیا۔ مندر بالکل ویران پڑا تھا اور دن کے وقت بھی خلاف معمول وہاں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔" ہمزاد تفصیل سے بتانے لگا۔ "یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہاں کوئی ذی روح نہ ہو۔ اس سے پہلے جب میں وہاں گیا تھا تو قدم قدم پر مجھے حسین و نوجوان داسیاں نظر آئی تھیں۔ میں اس غیر فطری اندھیرے سے اجالے کی طرف پلٹا تو اچانک چمکیلا غبار میری راہ میں حائل ہو گیا۔ میں نے پلٹ کر دوسری طرف سے نکلنا چاہا مگر اس چمکیلے غبار نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ کچھ دیر اندھیرے میں بھٹکنے کے بعد مجھے احساس ہو گیا کہ میں اس مندر کی حدود میں قید کیا جا چکا ہوں۔ یہ احساس میرے لیے سوہان روح تھا۔ میں نے اپنی تمام تر قوتیں مجمع کر کے ایک آخری کوشش کی اور میری یہ کوشش ناکام نہیں رہی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس چمکیلے غبار کو عبور کرتے ہوئے میرا سارا وجود جیسے جھلس کر رہ گیا۔ وقتی طور پر مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میری ساری قوتیں سلب کر لی ہوں۔ میں ایک جھٹکے سے دور جا کر گرا تھا اور مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اٹھ کر بیٹھ سکوں۔ سامنے ہی مجھے وہ قدیم مندر نظر آ رہا تھا جو اب بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ آپ میری طرف سے فکر مند ہوں گے اسی لیے جیسے ہی میرے حواس بحال ہوئے' میں وہاں سے چلا آیا' لیکن شاید... شاید کچھ دن...." ہمزاد کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"ہاں ہاں کہو' کچھ دن کیا؟" میں بول اٹھا۔

"کچھ دن شاید میں آپ کی خدمت نہ کر سکوں۔ میں انتہائی کمزوری اور نقاہت محسوس کر رہا ہوں۔" اس نے وہ بات کہہ ہی دی جسے کہتے ہوئے جھجک رہا

"کوئی بات نہیں' تم آرام کرو' میں... میں تمھیں تکلیف نہیں دوں گا۔" میرا لہجہ جذباتی تھا۔ "آخر تم نے میری ہی خاطر تو اس عذاب سے گزرے ہو!"

"ممکن ہے دو ایک دن میں یہ کیفیت ختم ہو جائے اور میں پہلے کی طرح بالکل ٹھیک ہو جاؤں' اس وقت تک آپ کو بہت محتاط اور چوکنا رہنا پڑے گا۔" ہمزاد کہنے لگا۔ "بہتر صورت یہ ہے کہ میں جانے سے پہلے اس مکان کی اطراف حفاظتی حصار کھینچ دوں' اس سے مجھے اطمینان رہے گا۔ آپ اس دوران میں نہ کسی کو یہاں بلائیں نہ خود گھر سے باہر قدیم رکھیں۔ روانگی سے قبل میں آپ کے لیے کھانے پینے کا بندوبست بھی کر جاؤں گا۔ تاکہ آپ کو گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔"

ہمزاد کی بات سن کر میں فکر مند ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ اپنی قوتیں بحال ہونے تک تم بھی یہیں میرے پاس رہو؟"

"ایسا ممکن ہوتا تو میں کبھی آپ کو تنہا چھوڑ کر جانا پسند نہ کرتا۔" ہمزاد بولا" بولا۔ "اپنی قوتیں پوری طرح بحال کرنے کے لیے میرا آپ سے الگ رہنا ضروری ہے۔"

"پھر تو مجبوری ہے۔" میں نے طویل سانس لیا۔

"دور رہنے کے باوجود میں آپ کی طرف سے غافل نہیں رہوں گا۔" ہمزاد محبت سے بولا۔ "یہ دوری اگر مجبوری نہ ہوتی تو میں اسے گوارا نہ کرتا۔" اس کے لہجے سے اب بھی نقاہت عیاں تھی۔ نہ جانے اسے کیا روحانی اذیت پہنچی تھی جسے سمجھنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

پھر جب کچھ دیر بعد میرے لیے خورونوش کا بندوبست کر کے ہمزاد رخصت ہو رہا تھا تو لمحہ بھر کو مجھے نفیسہ کے معاملے کا خیال آیا تھا۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں ثمینہ کے بے گناہ شوہر شوکت کے متوقع قتل کا واقعہ بھی تازہ ہو گیا تھا۔ میں نے یہ دونوں معاملات ہمزاد کے سپرد کر دیے تھے' لیکن مجھے اس سے کچھ پوچھنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ کیا پیش رفت ہوئی! ہمزاد سے اس موقع پر کسی قسم کا استفسار مجھے اچھا معلوم نہیں ہوا۔ میرے نزدیک یہ خود غرضی تھی کیوں کہ اس وقت وہ

اپنے ہی عذاب میں مبتلا تھا۔ اس سے قطع نظر شمبھو کے معاملے نے میری توجہ بھی اپنی طرف مبذول کر لی تھی۔ میں اسی لیے خاموش رہا اور ہمزاد مکان کے گرد حفاظتی حصار کھینچ کر رخصت ہو گیا۔

اب گویا جب تک ہمزاد لوٹ نہ آتا میری حیثیت اس مکان میں ایک نظر بند۔کی سی تھی' نہ باہر نکل سکتا تھا اور نہ کسی کو اپنے پاس بلا سکتا تھا۔ مجھے زیادہ فکر نفیسہ کی طرف سے تھی۔ وہ بہرحال حسب معمول شام کو ضرور آتی۔

وہ سارا دن میں نے آرام کرتے اور سوتے ہوئے گزارا۔ میں نے احتیاطاً" گھر کی ساری کھڑکیاں بند کر دی تھیں اور روشنی نہ کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا تاکہ نفیسہ یہی سمجھے کہ گھر میں کوئی نہیں۔ اس کے باوجود عصر اور مغرب کے درمیان وہ واقعہ پیش آ ہی گیا جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ نہ یہ بات شاید ہمزاد کے ذہن میں آئی تھی اور نہ میں نے سوچا تھا کہ حفاظتی حصار کھینچے جانے کے بعد اگر کوئی میرے مکان کے دروازے تک آیا تو اس پر کیا گزرے گی!

"وہ نسوانی چیخ نفیسہ ہی کی ہو سکتی تھی۔ جو مجھے نیچے سے سنائی دی تھی۔ میں کوشش کے باوجود خود پر قابو نہ رکھ سکا اور لپک کر برابر والے کمرے کی کھڑکی تک پہنچ گیا۔ وہاں سے نیچے گلی کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ میں نے آہستگی سے کھڑکی کھولی اور تھوڑی سی جھری پیدا کر کے نیچے دیکھا۔ نفیسہ مجھے گلی میں بے سدھ پڑی نظر آئی۔ وہ غالباً" بے ہوش ہو گئی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس پر کیا گزری ہو گی! یقیناً" وہ دستک دینے میرے گھر کے دروازے کے قریب آئی ہو گی اور حفاظتی حصار سے ٹکرا کر اپنے ہوش کھو بیٹھی ہو گی۔ ذرا سی دیر میں راہ گیر اس کی اطراف جمع ہو گئے۔ پھر انھی میں مجھے نفیسہ کا منگیتر رشید نظر آیا۔ وہ لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ غالباً" آج وہ اپنے دفتر سے سیدھا نفیسہ کے گھر آ گیا تھا۔ میں کھڑکی بند کر کے دوبارہ اپنی خواب گاہ میں آ گیا۔ مجھے اس واقعے سے تکلیف پہنچی تھی۔ خواہ مخواہ نفیسہ کو میری وجہ سے یہ دکھ اٹھانا پڑا تھا۔ اگر پہلے سے مجھے یہ خیال آ گیا ہوتا تو شاید ایسا نہ ہوتا' نفیسہ نادانستگی میں حفاظتی حصار سے نہ ٹکراتی۔

نفیسہ کی طرف سے میں کیوں کہ تشویش میں مبتلا تھا اس لیے اپنی چشم تصور کے سہارے اس کا حال جاننے کے لیے بے چین ہو گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اس کا تصور کیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا حسین چہرہ میرے سامنے تھا۔ میں نے تصور کے دائرے کو وسعت دی تو معلوم ہوا رشید اسے اپنے بازوؤں پر اٹھائے سامنے والے مکان کے دروازے میں داخل ہو رہا تھا۔ گلی میں لوگ طرح طرح کی چہ میگوئیاں اور قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا کہ نفیسہ بے ہوش ہو گئی تھی ورنہ رشید اسے اٹھا کر نہ لے جاتا۔ نفیسہ کے والدین کو شاید ابھی اس واقعے کی خبر نہیں تھی۔ پھر جب چند لمحے بعد رشید بے ہوش نفیسہ کو بازوؤں پر اٹھائے گھر میں پہنچا تو نفیسہ کی ماں چیخ اٹھی۔ "کیا ہوا میری بچی کو؟" اب میری قوت سماعت بھی پوری طرح بیدار تھی۔

"مجھے نہیں معلوم۔" رشید نے منہ بنا کر جواب دیا۔ "یہ نیچے گلی میں بے ہوش پڑی تھی' سامنے والے دروازے کے گھر کے پاس!" یہ کہتے ہوئے اس نے بے ہوش نفیسہ کو پلنگ پر لٹا دیا۔

"کسی... کسی ڈاکٹر... کسی ڈاکٹر کو بلاؤ!" نفیسہ کا باپ بھی گھبرا گیا جو رشید کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ "اسے... اسے آخر ہوا کیا؟"

"اسی نے کچھ کیا ہو گا جس کے گھر جانے سے میں نے منع کیا تھا۔" رشید نے میرے سر الزام تھوپ دیا۔

"لیکن ابھی... ابھی تو یہ گئی تھی اتر کے!" نفیسہ کی ماں مضطرب آواز میں بولی۔ "اتنی... اتنی جلدی کیا... کیا ہو سکتا ہے"

"تم لوگ باتیں ہی بناتے جاؤ گے یا کسی ڈاکٹر کو..." نفیسہ کے باپ کی بات ادھوری رہ گئی کیوں کہ اسی وقت نفیسہ کے کراہنے کی آواز سنائی دی تھی۔

"اسے... اسے شاید ہوش... ہوش آ رہا ہے۔" نفیسہ کی ماں جیسے تڑپ کر پلنگ کی پٹی کے پاس بیٹھ گئی اور پھر اپنی بیٹی کو پکارنے لگی۔ "آنکھیں کھولو نفیسہ... آنکھیں کھولو بیٹی!"

"آگ!... آگ!..." معاً" نفیسہ چیخ اٹھی اور پھر یک دم اٹھ کر بیٹھ

گئی۔ وہ وحشت زدہ سی نظر آ رہی تھی۔

میں سمجھ رہا تھا کہ سب اسی حفاظتی حصار سے ٹکرانے کا اثر ہے۔ بہرحال میں یہ دیکھ کر مطمئن تھا کہ اسے ہوش آ گیا تھا۔

"پانی!... پانی!" نفیسہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھرتی ہوئی گویا بہ مشکل بولی۔

نفیسہ کی ماں نے جلدی سے اسے ایک کٹورے میں پانی پلایا' پھر روہانسی آواز میں کہا۔ "تجھے کیا ہو گا تھا بیٹی!"

"مجھے... مجھے کچھ نہیں معلوم! میرے سارے جسم میں آگ سی لگ رہی ہے... آگ!... میں جل رہی ہوں امی!... اندر سے جل رہی ہوں۔"

"مگر کچھ بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا تھا؟" نفیسہ کا باپ بول اٹھا۔

"وہ کہہ رہی ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں' تم کیوں اسے پریشان کر رہے ہو!" نفیسہ کی ماں اپنے شوہر پر بگڑ گئی۔

"تم جانو اور تمہاری بیٹی جانے! میں کون ہوتا ہوں پوچھنے والا!" بوڑھے نے کہا اور پھر غصے میں بڑبڑاتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

"ان کی عقل پر تو پتھر پڑ گئے ہیں! ہر وقت غصہ ناک پہ دھرا رہتا ہے۔" نفیسہ کی ماں' رشید کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تو جا بیٹا' جلدی سے کسی ڈاکٹر کو بلا لا۔"

تعمیل حکم میں رشید فوراً ہی روانہ ہو گیا۔ اب کمرے میں نفیسہ اور اس کی ماں کے سوا کوئی نہیں تھا۔

"نہاؤں گی... میں نہاؤں گی امی! گرمی سے میرا جسم جلا جا رہا ہے۔" معاً نفیسہ بول اٹھی۔

"مگر اس وقت تو خنکی ہے بیٹا! ڈاکٹر کو آ جانے دے' کہیں نہانے سے کوئی نقصان نہ ہو۔"

"نہیں!" نفیسہ نے دوپٹا ایک طرف اتار کر پھینک دیا۔ اس کے چہرے سے تکلیف و اذیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ "میں... مجھے نہانے دیں!" یہ کہہ کر وہ

ں کے ساتھ پلنگ سے اتری اور تقریباً دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

میں اسی لمحے مجھے اپنے جسم میں ہلکی سی مانوس سنسناہٹ محسوس ہوئی اور ں کے ساتھ میرے تصور کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مجھے اپنے ذہن پر غنودگی سی وس ہوئی اور پھر کوشش کے باوجود میں اپنی آنکھیں بند ہونے سے نہ روک سکا۔ یرا جی چاہا کہ بستر پر دراز ہو جاؤں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ اسی کیفیت میں دو ے میرے ذہن پر محیط ہو گئے۔ خواب اور بیداری کی سی یہ ملی جلی کیفیت رے لیے نئی نہیں تھی۔ مجھے علم تھا کہ اب کیا ہو گا! پھر وہی ہوا۔ وہ شعلے دور تے ہوتے دہکتی ہوئی دو آنکھوں میں تبدیل ہو گئے۔ یہ آنکھیں بھی میرے لیے ی نہیں تھیں۔ پھر ایک آشنا چہرے کے خطوط واضح ہو گئے۔

"بچہ!" معاً اس چہرے کے لبوں کو حرکت ہوئی۔ آواز وہی گونج دار ی۔ "ہم نے تجھ سے کہا تھا کہ ہماری کھوج نہ کر! مگر تو نہ مانا۔ تیرا ہمزاد ہماری تی (سکون) بھنگ (غارت) کرنے آ گیا۔ ہم تو پہلے ہی سنسار (دنیا) کو تیاگ رک) چکے ہیں' پھر تو ہمیں کیوں چھیڑتا ہے! اس بار تو ہم نے تیرے ہمزاد کو تھوڑا ا شراپ (سزا) دے کر چھوڑ دیا پر اب اس نے ادھر کا رخ کیا تو ہم اسے نشٹ د) کر دیں گے۔ برے ارادے سے ہماری اور (طرف) آنے والے کبھی سپھل امیاب) نہیں ہوتے۔ ہاں ہمارا بھگت (خادم) بن کر آ تو ہم تجھے اپنے چرنوں قدموں) میں بٹھا لیں گے۔ پھر تو جیون کا وہ سکھ پائے گا جس کا کبھی دھیان بھی ہیں کیا ہو گا۔ بول تیری کیا اِچھا (مرضی) ہے۔ ہم تیرے من کی آواز سن رہے یں۔"

لیکن تو ہے کون؟ میرے سرکش ذہن نے جیسے اس سے سوال کیا۔

"اپنے من کی آنکھیں کھول بچہ! ہمیں پہچان! ہم گرو گوبند ہیں اور تجھے اپنے چرنوں (قدموں) میں دیکھنا چاہتے ہیں۔" جواباً وہی گونج دار آواز سنائی دی۔

یہ بڑبولا جانے خود کو کیا سمجھ رہا ہے! مجھے اس سے نفرت محسوس ہوئی۔

"دنیا کو نفرت سے نہیں' محبت سے جیتا جا سکتا ہے بچہ! اس نے جیسے میری فرت محسوس کر لی۔ "تجھے جیسے باغیوں کو سدھانا ہمیں خوب آتا ہے۔" پھر بھی ہم

تجھے اس سے (وقت) چھما (معاف) کرتے ہیں کہ تو اپنی ہی کرنی بھوگ رہا ہے اور بے بس ہے' پر آج نہیں تو کل تجھے ہمارے چرنوں میں آنا ہی ہو گا اور ہمارے چرنوں میں آکر تو گھاٹے میں نہیں رہے گا۔" وہ گونج دار آواز مدھم ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی اور پھر وہ چہرہ بھی غائب ہو گیا۔

میں کچھ ہی دیر بعد اپنے حواس میں آگیا۔ میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا' مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ میں بستر سے اٹھا ہی تھا کہ مغرب کی اذان سنائی دی۔

نماز پڑھنے کے بعد میرے دل کو قدرے سکون ہوا۔ ابھی تک میرے ذہن پر گرو گوبند کا خیال مسلط تھا۔ حیرت انگیز پر اسرار قوتوں نے اسے یقیناً" مغرور بنا دیا تھا۔ اس کے لہجے میں نرمی کے باوجود بے حد تکبر اور بڑائی تھی' بڑائی جو صرف ایک ہی ذات کے لیے مخصوص ہے۔ میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ اس سے کس طرح نمٹا جا سکتا ہے' مگر کوئی راہ سمجھ میں نہیں آئی۔

اس رات سونے سے پہلے میں نے نفیسہ کے بارے میں جاننا ضروری سمجھا کہ اب وہ کس حال میں ہے! میں نے اپنی چشم تصور وا کی اور اسے بے خبر سوتے دیکھا۔ اس کے والدین کی گفتگو سن کر مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اسے کوئی سکون آور انجکشن دے کر چلا گیا ہے اور اسی کے زیر اثر وہ سو رہی ہے۔ یہ باتیں وہ دونوں ان عزیزوں اور پاس پڑوس والوں کو بتا رہے تھے جو عیادت کے لیے آئے تھے۔ نفیسہ کا منگیتر رشید بھی اب تک وہاں سے ٹلا نہیں تھا۔ کسی کے پوچھنے پر نفیسہ کی ماں نے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر نے دو ایک دن مکمل آرام کے لیے کہا ہے۔

نفیسہ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں سو گیا۔ یقیناً" اس کی حالت زیادہ تشویش ناک نہیں تھی۔ مجھے یہ سن کر بھی اطمینان ہی ہوا تھا کہ ڈاکٹر نے اسے دو ایک دن مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ نتیجتہ" اس دوران میں وہ مجھ سے ملنے کی کوشش بھی نہ کرتی اور اس طرح دوبارہ حفاظتی حصار سے نہ ٹکراتی۔

دوسرا دن تمام ہوتے ہوتے ہمزاد لوٹ آیا۔ اس کی واپسی میرے لیے غیر متوقع ہی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس کی قوتیں بحال ہونے میں شاید ابھی وقت لگے

ا۔ بہ ظاہر وہ بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آ رہا تھا' پھر بھی میں نے پوچھ ہی لیا۔ "اب کیا ل ہے تمہارا؟ ٹھیک ہو گئے بالکل؟"

"نہیں۔" اس کی آواز میں تھکن سی تھی۔

ہمزاد کے انکار نے مجھے چونکا دیا۔ اگر ایسا ہی تھا تو پھر وقت سے پہلے وہ یوں لوٹ آیا؟ پھر یہی سوال میری زبان پر بھی آگیا۔

"دراصل میں آپ کو ایک خطرے سے آگاہ کرنے آیا تھا۔" اس نے ایا" کہا۔ "میں آپ سے کہہ ہی چکا تھا کہ آپ کی طرف سے غافل نہیں رہوں ا۔ مجھے پہلے ہی کچھ کچھ اندیشہ تھا۔"

"کس بات کا اندیشہ؟ کہ شاید گرو گوبند آپ کو اغوا کرنے کی کوشش ے گا۔" ہمزاد نے بتایا۔

"مگر کیوں؟... اور پھر حفاظتی حصار کے ہوتے کیا وہ ایسا کر سکتا ہے؟"

"حفاظتی حصار کی موجودگی میں یقیناً" وہ آپ کو اغوا کرنے میں کامیاب یں ہو سکتا مگر اس کا ارادہ کچھ اور ہے۔ وہ اس سے واقف ہے کہ مکان کے گرد صار کھنچا ہوا ہے۔"

"پھر؟"

"وہ دراصل یہ کوشش کرے گا کہ آپ خود بہ خود حصار سے باہر نکل یں۔ اس کے لیے وہ کیا راستہ اختیار کرے گا' کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" ہمزاد بولا۔

"یہ تو بعد کی بات ہے' لیکن وہ مجھے اغوا ہی کیوں کرنا چاہتا ہے؟ اس کا ای تو سبب ہو گا۔" میں نے کہا۔

"وہی سبب جاننے کے بعد تو میں آپ کے پاس آیا ہوں کیوں کہ مجھے علوم تھا' آپ مجھ سے یہ ضرور پوچھیں گے۔" ہمزاد نے طویل سانس لیا' پھر کہنے ا۔ "ہرچند کہ گرو گوبند بہت سی پُراسرار قوتوں کا مالک ہے لیکن اس کی ہوس ابھی ری نہیں ہوئی۔ وہ ہمیشہ مزید قوتیں حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ اس لے میں اس کا طریقہ کار مختلف ہے۔ وہ اب خود ان کے حصول کی خاطر ریاضت و نت نہیں کرتا بلکہ دوسروں کی ریاضت و محنت پر ہاتھ صاف کر دیتا ہے۔ یوں

سمجھیں کہ وہ اپنی پراسرار قوتوں کے بل بوتے پر دوسرے شخص کی قوتیں سلب کر کے انھیں اپنی قوتوں کا حصہ بنا لیتا ہے۔ جہاں تک قیاس کام کرتا ہے' اسے شمبھو سے آپ کی پراسرار قوتوں کے بارے میں معلوم ہوا ہو گا۔ حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے لیکن گمان غالب یہی ہے کہ شاید ایسا ہی ہو۔ بہر حال اس کی ہوس جاگ اٹھی ہے' مزید صاحب قوت ہونے کی ہوس! شمبھو کو اس نے پاس سے بھگا دیا نہیں؟ یہ اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتا جب تک میری قوتیں بحال نہ ہو جائیں۔ اگر شمبھو کو واقعی اس نے پناہ نہیں دی ہو گی تو میں اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ ویسے یہ اس کا فریب ہی لگتا ہے۔ اس طرح وہ شمبھو کو بچانے کے لیے آپ کو دھوکے میں رکھنا چاہتا ہو گا۔ خیر... تو میں آپ کو یہ بتانے آیا تھا کہ آج رات وہ کسی نہ کسی طرح یہ کوشش کرے گا' آپ خود حصار سے باہر نکل آئیں۔ تو آپ تو کسی بھی قیمت پر گھر سے باہر قدم نہیں رکھنا۔"

ہمزاد کی باتیں سن کر میں کچھ غور کرتا رہا' پھر کہا۔ "ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کیا؟" اس نے پوچھا۔

"ممکن ہے کہ گرو گوبند اب تک ایسا کرتا رہا ہو جیسا تم نے بتایا ہے' لیکن کسی کے ہمزاد کو اپنے قابو میں کر لینا کس طرح ممکن ہے؟"

"اسے یہی تو غلط فہمی ہے۔" ہمزاد بولا۔ "اور ہمیں اس کی اسی غلط فہمی سے فائدہ اٹھانا ہے۔ کوئی بھی کسی کے ہمزاد کو اپنے قابو میں نہیں کر سکتا۔"

ہمزاد سے یہ سن کر مجھے کچھ اطمینان ہوا اور میں نے کہا۔ "تم بے فکر رہو' وہ مجھے حفاظتی حصار سے باہر نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔"

"بس شاید ایک دن اور ایک رات کی بات ہے' پھر آپ پر اتنا دباؤ نہیں رہے گا' میری قوتیں بحال ہو جائیں گی۔ میں نے گرو گوبند اور شمبھو سے نمٹنے کے لیے ایک اور راستہ سوچا ہے۔ صحت مند ہو جانے کے بعد میں آپ سے اس سلسلے میں گفتگو کروں گا۔ فی الحال مجھے اجازت دیں۔"

ہمزاد نے یہ بتا کر میرے دل میں تجسس پیدا کر دیا تھا کہ وہ گرو گوبند اور

شمبھو سے نمٹنے کے لیے کچھ سوچ چکا ہے مگر میں نے اپنے تجسس کو دبا کر اسے رخصت کی اجازت دے ہی دی۔ وہ مجبوراً" ہی میرے پاس آیا تھا اور اسے زیادہ دیر روکے رکھنا ٹھیک نہیں تھا۔

آدمی پہلے ہی سے بے حد چوکنا اور محتاط ہو تو ذرا سی بھی آہٹ پر چونک اٹھتا ہے۔ یہی حال اس شب میرا تھا' لیکن نصف شب گزر جانے کے باوجود کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا اور نیند میری آنکھوں میں کروٹیں لینے لگی۔ غالباً" میرے ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ کہ میری سماعت سے گھنگھرو بجنے کی آواز ٹکرائی۔ میں نے چوکنا ہو کر آنکھیں کھول دیں۔ ہر طرف تاریکی تھی۔ "چھم چھم چھم" گھنگھرو پھر بجے اور میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اسی لمحے کہیں دور سے ایک عجیب سی پرکشش اور سحر انگیز موسیقی سنائی دینے لگی۔ میرا جی چاہا کہ موسیقی کی لے اور تال پر رقص کرنے لگوں۔ رفتہ رفتہ وہ سحر انگیز موسیقی میرے حواس پر چھاتی جا رہی تھی۔ معاً" اندھیرے میں ایک شعلہ سا لپکا اور میرا سارا وجود جیسے جھنجھنا اٹھا۔ وہ شعلہ حسن مجھے بس ایک لمحے کو لے اور تال پر رقصاں نظر آیا تھا' پھر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا' مگر میں بے خود سا ہو کر اس کے پیچھے پیچھے لپکا تھا۔ ایک بار پھر جھماکا سا ہوا اور اس بار یہ جھماکا میری خواب گاہ کے دروازے سے باہر ہوا تھا' پھر بھی میری نظروں کی دسترس میں تھا۔ اس رقصاں قیامت کے جسم سے روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔ اس نے رقص کرتے ہوئے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا اور اسی کے ساتھ پھر اندھیرا چھا گیا۔ میں جیسے نشہ حسن میں سرشار آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا کہ جیسے کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ موسیقی کے لے پھر اپنے عروج پر پہنچی اور میں نے خود کو روشنی' خوشبو اور رنگوں کی آغوش میں محسوس کیا۔ وہ شعلہ رقصاں مجھے گویا اپنی بانہوں میں سمیٹے ہوئے نہ جانے کہاں لیے جا رہا تھا! مجھ پر بے خودی سی طاری تھی کہ اچانک ایک تیز آواز نے میرے حواس کو جھنجھوڑ دیا۔ اس آواز نے مجھے جیسے رنگوں اور خشبوؤں کی دنیا سے باہر گھسیٹ لیا اور یہ آواز میری اپنی ہی آواز تھی' میرے ہمزاد کی آواز! غالباً" اس نے مجھ سے رک جانے کو کہا تھا اور اسی کے ساتھ میرے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے تھے۔

اس کے بعد جیسے سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ اب نہ میں کسی شعلہ رقصاں کی آغوش میں تھا اور نہ سحرانگیز موسیقی سنائی دے رہی تھی۔ وہ سب کچھ یقیناً بصارت اور سماعت کا فریب تھا۔ میں اب اپنے گھر کے کھلے ہوئے صدر دروازے پر کھڑا تھا۔ کچھ دیر تک میں یونہی سناٹے کے عالم میں کھڑا رہا۔ میرے حواس جیسے گم ہو گئے تھے اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے! میں نے جانے کب اور کس عالم میں گھر سے باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھول لیا تھا! قید اور رہائی کے درمیان بس ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا، یقیناً اس کے پس پشت گرو گوبند ہی کی شخصیت تھی۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو نہ جانے مجھ پر کتنے نئے دکھوں کے دروازے کھل جاتے! وہ ایک ایسا طاقت ور دشمن تھا جس کی قوتوں کا صحیح اندازہ ابھی مجھے نہیں تھا۔ اس نے مجھے زیر دام لانے کے لیے بڑا انوکھا حربہ آزمایا تھا جس کا تصور بھی میرے ذہن کے کسی گوشے میں نہیں تھا ورنہ میں اتنی آسانی سے اس کا شکار نہ ہو جاتا۔ وہ یقیناً اپنے مقصد میں کامیاب رہتا اگر میرا ہمزاد بروقت مجھے چوکنا نہ کر دیتا۔ یہ سوچ کر میرے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے فوراً ہی آگے بڑھ کر گھر کا دروازہ بند کر دیا۔

اپنی خواب گاہ میں واپس آنے کے بعد کافی دیر تک نیند میری آنکھوں سے روٹھی رہی۔ میں دوبارہ سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ بس اچانک ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کمرے کی چھت مجھ پر گر پڑے گی اور دیواریں بھی اپنی جگہ قائم نہ رہ سکیں گی۔ ایک عجیب سے خوف نے میرے حواس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میرا دل انتہائی تیزی سے دھڑکنے لگا اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ہمزاد کے عمل کے دوران میں کئی بار میں ایسی کیفیت سے گزر چکا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود بھی کہ یہ خوف بے سبب ہے، میں خود پر قابو نہیں پا سکا۔ خوف، اضطراب، گھبراہٹ اور بے چینی کی وجہ سے میں بیٹھا نہ رہ سکا اور بستر سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ رفتہ رفتہ مجھے اپنی خواب گاہ میں بے حد گھٹن اور حبس کا احساس ہونے لگا۔ بار بار میرا دل یہی چاہ رہا تھا کہ وہاں سے نکل جاؤں۔ اس گھٹن سے نجات پانے کے لیے میں نے گھر کے سارے دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں مگر اس سے بھی کچھ حاصل

نہیں ہوا، حبس بہ دستور رہا۔ شعوری طور پر میں اس کا سبب سمجھ چکا تھا اس لیے ق کے ساتھ اپنے دل میں پیدا ہونے والی اس خواہش کو کچل دیا کہ اس حبس سے نجات حاصل کرنے کے لیے مجھے گھر سے نکل جانا چاہیے۔ اپنا ایک حربہ ناکام ہونے کے بعد اب یقیناً گرو گوبند دوسرا حربہ آزما رہا تھا۔

گھٹن سے بچنے اور تازہ ہوا کی خاطر میں اب اوپری منزل کی ایک کھڑکی میں آکھڑا ہوا تھا۔ سامنے ہی نفیسہ کا مکان نظر آرہا تھا جس کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اندر کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں اپنی توجہ کسی دوسری جانب مبذول کرنے کی خاطر ہی اس طرف دیکھنے لگا تھا۔ معاً میں نے سامنے والے گھر کے اندھیرے کمرے میں روشنی کی لکیر سی دیکھی۔ جیسے کسی نے چھوٹی سی ٹارچ جلائی ہو۔ اندھیرے میں ذرا سی روشنی بھی بہت معلوم ہوتی ہے۔ روشنی کا وہ دائرہ حرکت کرتا ہوا ایک جگہ رک گیا اور اس کے ساتھ میں چونک اٹھا۔ اب روشنی کے دائرے میں نفیسہ کا چہرہ تھا۔ اب مجھے اس کمرے میں دو متحرک ہیولے بھی نظر آرہے تھے۔ میں نے انہی میں سے ایک کو نفیسہ کے منہ پر رومال رکھتے دیکھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا یقیناً نفیسہ کو بے ہوش کرنا چاہتا تھا۔ رومال میں بے ہوشی ہی کی کوئی دوا ہو سکتی تھی۔ میرے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ میرے لیے اب یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ کہ نفیسہ کو اغواء کیا جا رہا ہے۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان میں سے ایک ہیولے نے نفیسہ کو بستر سے اٹھا لیا۔ میری آنکھیں اب بڑی حد تک اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد ایک ہیولا آگے آگے ٹارچ جلائے ہوئے چلنے لگا اور دوسرا نفیسہ کو اٹھائے دبے قدموں پیچھے ہو لیا۔ ابھی وہ دونوں کمرے کے دروازے تک پہنچے تھے کہ ان میں سے ایک شاید کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ زوردار آواز کے ساتھ کوئی چیز گری اور اسی کے ساتھ ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی۔ نفیسہ کی ماں غالباً اسی کمرے میں سو رہی تھی، زوردار آواز ہونے سے شاید اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ چیخنے لگی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی یقیناً اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس کی بیٹی کو اغوا کیا جا رہا ہے۔ وہ اسی لیے زور زور سے چیخ رہی تھی۔

"بچاؤ!... بچاؤ!... میری بچی کو بچاؤ!"

اسی دوران میں وہ دونوں ہیولے رکے بغیر تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئے تھے۔ نفیسہ کی ماں کے چیخنے چلانے سے غالباً" دوسرے کمرے میں سویا ہوا بوڑھا باپ بھی جاگ گیا تھا۔ جاگتے ہی وہ بھی اپنی بیوی کی طرح کچھ سوچے سمجھے بغیر چیخنے لگا تھا۔ چند ہی لمحوں میں نفیسہ کے گھر کے زینے میں مجھے بھاری قدموں کی دھمک سنائی دی۔ نفیسہ کو اغوا کر کے لے جانے والے یقیناً" اب جلدی جلدی سیڑھیاں عبور کر کے نیچے آ رہے تھے۔ نیچے گلی میں پہنچنے کے بعد انھیں فرار ہونے سے کوئی نہ روک سکے گا' یہ خیال آتے ہی میرے جسم میں جیسے بجلیاں سی کوند گئیں۔ میں گویا جستیں بھرتا ہوا نیچے پہنچا اور اپنے گھر کا دروازہ کھول دیا۔ اسی وقت سامنے والے مکان کے دروازے سے تیزی کے ساتھ دو سیاہ پوش باہر آئے جن میں سے ایک نے نفیسہ کو اٹھا رکھا تھا۔ وہ مجھ سے چند ہی قدم کے فاصلے پر تھے۔

میں نے ان دونوں کو للکارا پھر میں چاہتا تھا' جھپٹ کر ان تک پہنچ جاؤں کہ جیسے ایک تیز آواز میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔ "رک جائیے!... ہوش میں آیئے!" یہ آواز میرے ہمزاد کے سوا کسی اور کی نہیں تھی۔

میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ میرا سارا جوش لمحہ بھر میں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ گلی میں اب کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چند لمحے پہلے نفیسہ کے گھر کا دروازہ جو مجھے کھلا ہوا نظر آیا تھا' بند تھا۔ نفیسہ کے والدین کی چیخیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں۔

میں نے لمحہ حیرت سے نکلنے کے بعد گھر کا دروازہ بند کیا اور پلٹ آیا۔ گرو گوبند نے گویا ایک ہی رات میں تیسری بار مجھے آزمائش میں ڈالا تھا۔ ہمزاد میری طرف سے غافل ہوتا تو شاید اس مرتبہ تو وہ مجھے حفاظتی حصار سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو ہی جاتا۔ اس نے مجھے بڑی خوبصورتی کے ساتھ فریب دینے کی کوشش کی تھی۔ مجھے اس نے یہ سوچنے کا موقع بھی نہیں دیا تھا کہ آخر نفیسہ کے والدین کی چیخ پکار سن کر میرے سوا کوئی اور پڑوسی اپنے گھر سے کیوں نہیں نکلا! غالباً" جذباتی ہیجان کے دوران میں آدمی ایسی باتوں کی طرف توجہ نہیں دیتا۔

اسی کشمکش میں ساری شب گزر گئی تھی اور اب صبح ہونے والی تھی۔ گھر کے سارے دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے کے بعد میں نے فجر کی نماز پڑھی کیوں کہ اسی دوران میں اذان ہو چکی تھی' پھر میں بستر پر دراز ہو گیا اور میری آنکھ لگنے میں دیر نہ لگی۔

ساری رات جاگتے گزری تھی اس لیے مجھے گہری نیند آئی اور میں دوپہر کے قریب سو کر اٹھا۔

گزری ہوئی شب کے روح فرسا واقعات ابھی تک میرے ذہن میں تازہ تھے۔ کسل مندی دور کرنے کے لیے میں نے غسل کیا اور پھر ظہر کی نماز پڑھی۔ بھوک محسوس ہوئی تو میں نے کچھ پھل کاٹ کر کھا لیے۔

پے در پے واقعات نے مجھے اب تک اتنی مہلت نہیں دی تھی کہ ثمینہ کے شوہر شوکت کے متوقع قتل کی بابت معلومات حاصل کر سکتا۔ یہ مسئلہ ابھی تک میرے ضمیر پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ اس وقت بھی جانے کیوں مجھے اس کا خیال آ گیا تھا! شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ فی الوقت میں کسی مسئلے سے دوچار نہیں تھا۔ خطرات گزر چکی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ میں اس سلسلے میں اپنی چشم تصور سے کام لے کر بھی تو از خود بہت کچھ معلوم کر سکتا ہوں۔ اسی کے ساتھ میری قوت سماعت بھی بیدار ہو جاتی۔ پھر شام ہونے تک میرا یہی مشغلہ رہا۔ میرے ذہن میں جو بھی سوالات تھے۔ مجھے ان کے جواب مل گئے۔

میں نے اپنی چشم تصور کی حیرت انگیز قوت کے سہارے جو معلومات حاصل کیں ان کا خلاصہ یہ تھا کہ ثمینہ اپنے بچوں کی محبت سے مجبور ہو کر اپنے نوجوان عاشق زاہد کے ساتھ ڈھاکہ لوٹ آئی تھی۔ ڈھاکہ آ کر اس نے اپنے والدین کے گھر پناہ لی تھی۔ والدین بہرحال والدین ہوتے ہیں۔ انھوں نے پہلے تو اپنی بیٹی کو سمجھا بجھا کر شوہر کے گھر بھیجنے کی کوشش کی مگر جب بیٹی اس پر راضی نہ ہوئی تو مجبوراً انھیں شوکت سے طلاق کا مطالبہ کرنا پڑا۔ اسی دوران میں ثمینہ نے اپنے والدین کو اس پر راضی کر لیا کہ وہ شوکت سے طلاق دے کر زاہد سے شادی کرے گی۔ شوکت نہ تو ثمینہ کو طلاق دینے پر آمادہ تھا اور نہ بچوں کو ثمینہ کے پاس چھوڑنے پر

راضی۔ بات عدالت تک پہنچ چکی تھی۔ شوکت محض انتقاماً" ثمینہ کو طلاق دینے سے گریز کر رہا تھا ورنہ اسے ثمینہ سے محبت نہیں تھی۔ کیس کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ شاید عدالت' بچوں کے بارے میں شوکت کا مطالبہ مان لیتی۔ شوکت بچوں کو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ ثمینہ کے نوجوان عاشق کے نزدیک اس مسئلے کا حل صرف یہ تھا کہ شوکت کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ اس طرح بچے بھی ثمینہ کی تحویل میں آجاتے اور وہ زاہد کو بھی اپنا سکتی۔ آج شام بھی ان دونوں کے درمیان اسی مسئلے پر گرماگرم بحث ہوئی تھی۔ مجھے ثمینہ کچھ نیم راضی سی نظر آئی تھی۔ بس وہ یہ چاہتی تھی کہ شوکت کے قتل کا الزام اس کے نوجوان عاشق پر نہ آئے زاہد نے اسے یقین دلایا تھا' وہ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھائے گا اور کوئی ایسا ثبوت نہیں چھوڑے گا کہ اس پر شک کیا جاسکے۔

میرے نزدیک شوکت بھی زیادتی کر رہا تھا اور زاہد تو تھا ہی غلط راستے پر بہرحال ابھی وقت تھا۔ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل سکتا تھا۔ اس خیال سے میرے دل کو کچھ اطمینان ہوا کہ ابھی شوکت کو قتل نہیں کیا گیا۔ اس کا رویہ اپنی بیوی ثمینہ کے ساتھ غلط تھا یا صحیح' اس سے قطع نظر وہ بہرحال قتل ایسی سزا کا مستحق نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس معاملے کو اس حد تک نہیں بڑھنے دوں گا۔ اگر یہ واقعات میرے علم میں نہ آئے ہوتے تو دوسری بات تھی' میں خود کو اپنے ضمیر کی عدالت میں جواب دہ نہ سمجھتا۔

اس مشغلے سے فارغ ہونے کے بعد جیسے رات قریب آنے لگی میرے دل میں وسوسے اور اندیشے پیدا ہونے لگے۔ کہ آج رات نہ جانے کیا گزرے؟ گرو گوبند مجھے حفاظتی حصار سے نکالنے کے لیے نہ جانے کون سا نیا حربہ آزمائے؟ ہرچند کہ میرے ہمزاد نے مجھے صرف گزشتہ رات کے بارے میں خطرے سے آگاہ کیا تھا لیکن میں اس کے باوجود مضطرب تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ گرو گوبند ایک بار ناکام ہونے کے بعد دوسری مرتبہ کامیابی کی کوشش نہ کرتا۔

پھر میرے اندیشے غلط ثابت نہ ہوئے۔ نصف شب گزرتے ہی کھیل شروع ہو گیا۔ میرے کمرے میں روشنی کے جھماکے سے ہونے لگے اور پھر جیسے تیز

آندھی کا شور سنائی دیا اور میں کانپ کر رہ گیا۔ وہ آواز اتنی ہی ہیبت ناک تھی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ تیز آندھی مجھے بھی کسی تنکے کی طرح اپنے ساتھ اڑا لے جائے گی۔ میں نے مضبوطی سے مسہری کی پٹیاں پکڑلی تھیں۔ کمرے کی ہر شے جیسے گردش میں تھی۔ پھر یہ گردش بھی تھم گئی اور اچانک اندھیرے میں ایک بھیانک روشن وجود نمودار ہوا۔ اس کے جسم سے روشنی پھوٹ رہی تھی اور وہ میری مسہری کے قریب زمین پر بیٹھا ہوا مجھے بڑی قہرناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ مکمل طور پر نہ تو انسان معلوم ہو رہا تھا نہ حیوان۔ اس سے پہلے کبھی میری نظر سے کوئی ایسا وجود نہیں گزرا تھا۔ کمرے میں اسی روشن ہیبت ناک وجود ہی کے سبب روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

یہ سب فریب نظر ہے' کچھ بھی نہیں۔ میں اپنے دل کو تسلی دے رہا تھا۔ اسی وقت اس شیطانی وجود کی آنکھوں سے دو شعلے لپکے اور دوسرے ہی لمحے میرے بستر میں آگ لگ گئی میں نے جلنے سے بچنے کے لیے بستر سے چھلانگ لگا دی۔ پھر تو چند ہی لمحوں میں ہر طرف شعلے لپکنے لگے۔ میں خواب گاہ کے وسط میں کھڑا ہوا خوف اور حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ پھر بڑھتے بڑھتے شعلے میرے وجود کو بھی اپنی لپیٹ میں لینے لگے۔ مجھے ان کی حدت واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ دھویں کی وجہ سے اب مجھے سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ مجبوراً" مجھے خواب گاہ سے نکلنا پڑا۔ وہ شیطانی وجود بھی میرے ساتھ ہی ساتھ باہر آگیا۔

معاً" مجھے محسوس ہوا کہ وہ شیطانی وجود مجھ پر جھپٹنے والا ہے۔ اسی کے ساتھ میں نے زینے کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ میرے تعاقب میں تھا۔ چھلانگیں بھرتے ہوئے میں نے سیڑھیاں طے کیں اور نیچے پہنچ گیا' لیکن وہ مجھ سے بھی تیز ثابت ہوا۔ اس نے اپنا بدہیئت ہاتھ آگے بڑھا کر میرا راستہ روک لیا۔ وہ جانے کیسے مجھ سے پہلے نیچے پہنچ گیا تھا۔ میں نے راستہ کاٹ کر نکل جانا چاہا مگر اس نے مجھے اتنی مہلت نہیں دی۔ اس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ گرفت اتنی سخت تھی کہ مجھے اپنے جسم کی ہڈیاں چٹختی محسوس ہوئیں اور میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنا بھاری ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا اور میری دوسری چیخ

حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ میں اپنے ہمزاد کو مدد کے لیے پکارنا چاہتا تھا مگر شاید اب وقت گزر چکا تھا۔ میرا سانس رک گیا تھا' مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ میرا آخری احساس یہ تھا کہ کیا گرو گوبند اپنے مقصد میں ناکام ہونے کے بعد انتقاماً" مجھے ختم کر دینا چاہتا ہے؟ اس کے بعد میرا دل ڈوبنے لگا اور میرے ذہن پر اندھیرا پھیل گیا۔

○○.....○.....○○

تو نہیں تو زندگی میں اور کیا رہ جائے گا
دور تک تنہائیوں کا سلسلہ رہ جائے گا
تازہ منظر دل میں کھو جائے گی مگر
دل پرانے موسموں کو ڈھونڈتا رہ جائے گا

اپنی ہی آواز میں نے کئی بار سماعت میں گونجتی محسوس کی تو آنکھیں کھول دیں۔ "کچھ دیر مجھے یاد ہی نہ آیا کہ میں کہاں اور کس حال میں ہوں! میرے ذہن پر نیم غنودگی سی طاری تھی۔ ہاں یہ احساس میرے لیے اطمینان بخش تھا کہ اپنے ہمزاد کو میں نے قریب ہی دیکھا۔ یقیناً اسی نے مجھے پکارا تھا۔ وہ میرا ہی عکس اور جسم لطیف تھا۔ اس کی آواز بھی گویا میری آواز تھی۔ اس کے چہرے پر مجھے فکر مندی کے آثار نظر آئے۔ اسی کے ساتھ میرے منہ سے کراہ نکل گئی۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ پھر مجھے سب کچھ یاد آتا چلا گیا کہ میں کس قدر شدید کرب اور اذیت سے گزرا تھا! مجھے وہ ہیبت ناک وجود بھی یاد آگیا جو مکمل طور پر انسان تھا نہ حیوان۔ اسی نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور میرے ذہن پر اندھیرا پھیل گیا تھا۔ ہوش کھونے سے پہلے میں نے سوچا تھا کہ کیا گرو گوبند اپنے مقصد میں ناکام ہونے کے بعد مجھے ختم کر دینا چاہتا ہے؟

میں اس وقت اپنی خواب گاہ ہی میں بستر پر دراز تھا۔ مجھے میرا دشمن خطرناک اور شدید ترین حملے کے باوجود اپنے راستے سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکا' یہ احساس میرے لیے ایک نئی زندگی کی خوش خبری تھا۔ اس پر میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہی ہر شے پر قادر ہے۔

جسم میں درد کی پھر ایک لہر اٹھی تو دوبارہ میرے منہ سے کراہ نکل گئی۔ ہمزاد جو سرہانے ہی کھڑا تھا' تیزی سے مجھ پر جھکا اور اپنا ہاتھ میرے جسم پر پھیرا۔ اس لمحے مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے جسم کا سارا درد کھینچ لیا ہو۔ یہ تجربہ مجھے

پہلے بھی کئی مرتبہ ہو چکا تھا۔

"اب یقیناً" آپ کی تکلیف ختم ہو چکی ہے۔" ہمزاد یہ کہہ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"ہاں۔" میں نے اطمینان و سکون کا گہرا سانس لیا اور سرہانے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ کمرے میں روشنی تھی۔ ذرا توقف کے بعد میں نے ہمزاد سے پوچھا۔ "تم خود بہ خود طلب کیے بغیر کب اور کیسے یہاں پہنچ گئے؟ میں نے تو اپنی زندگی کی طرف سے قطعی مایوس ہو چکا تھا۔"

"یہ بات تو آپ کے علم میں ہے کہ میں گزشتہ رات بھی غافل نہیں رہا۔" ہمزاد کہنے لگا۔ "اگر میں چوکنا نہ رہتا تو گرو گوبند گزشتہ رات ہی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔ وہ آپ کو میرے کھینچے ہوئے حصار سے نکلنے پر مجبور کر دیتا۔ اس نے یہ کوشش کی بھی تاکہ آپ حصار سے نکل جائیں۔ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے! حصار سے باہر قدم رکھتے ہی وہ آپ کو اغوا کر لیتا' مگر میں آپ کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ میں نے بروقت آپ کو چوکنا کر دیا۔ یوں وہ ناکام رہا۔ آج رات اس نے اپنا آخری حربہ آزمایا تھا۔ اس غرض سے گرو گوبند نے اپنے ایک خاص چیلے کی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تاکہ وہ حصار میں داخل ہو کے آپ کو اغوا کر لے جائے۔ گرو گوبند نے اسے ایک وحشت ناک وجود میں تبدیل کر کے اپنی پُراسرار قوتوں کے ذریعے یہاں بھیج دیا۔ میرے کھینچے ہوئے حصار کے اندر قدم رکھنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا' اگر میں خود ہی ایسا نہ چاہتا۔ میں نے اسی لیے لمحے بھر کو حصار اٹھا لیا تاکہ وہ غلط فہمی کا شکار ہو جائے اور اسے بھی اپنے گرو کا کمال سمجھے۔"

ہمزاد لازماً کچھ اور بھی کہتا کہ میں بول اٹھا۔ "تم نے حصار کیوں اٹھا لیا؟"

"اس لیے کہ میں چاہتا تھا کہ گرو گوبند کا وہ خاص چیلا جس پر اسے بہت ناز تھا' یہاں سے زندہ واپس نہ جا سکے۔" ہمزاد نے وجہ بیان کی' پھر خود ہی بتانے لگا۔ "وہ جیسے ہی مکان میں داخل ہوا' میں نے دوبارہ حصار کھینچ دیا۔ اب وہ یہاں سے

کسی صورت میں نہیں نکل سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے آپ کا خیال بھی تھا کہ وہ کہیں آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ مجھے یقین تھا کہ میں جیسے ہی حصار کھینچوں گا' گرو کے خاص چیلے کو اپنی پُراسرار قوتوں کے ذریعے اس کا پتا چل جائے گا۔ میرے اندازے کے مطابق ایسی صورت میں وہ پہلے اپنے بچاؤ کی فکر کرے گا' مگر اس بدبخت نے ایسا نہیں کیا۔ وہ انتقام پر اتر آیا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اب وہ آپ کو اغوا کر کے نہیں لے جا سکے گا۔ گرو گوبند نے اسے یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ آپ کو ختم کر دے' یہ خود اس کا ذاتی فیصلہ تھا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ آپ کو ختم کر کے وہ اپنی پُراسرار قوتیں آزمائے گا۔ وہ یقین اور بے یقینی کی کیفیت کا شکار تھا کہ شاید حصار سے زندہ بچ کر نکل جائے یا پھر مارا جائے۔ وہ بس ذرا سی دیر کا کھیل تھا۔ اس نے آپ کو فریب نظر میں مبتلا کیا اور پھر بقیہ حواس کو بھی اپنے زیر اثر لے لیا۔ آپ کو اسی سبب بھڑکتے شعلوں کے ساتھ ان کی حدت بھی محسوس ہوئی۔ مجبوراً جب دھوئیں سے آپ نے اپنا سانس گھٹتا محسوس کیا تو خواب گاہ سے نکل کر بھاگے۔ وہ آپ کے تعاقب میں تھا۔ میرا منشا یہ تھا کہ جب اس کی تمام تر توجہ صرف آپ پر مرکوز ہو جائے تو اچانک اسے قابو میں کر لوں۔ گرو کا یہ خاص چیلا بھی حیرت انگیز پُراسرار شیطانی قوتوں کا مالک تھا۔ اس پر قابو پانا آسان نہیں تھا۔ اس کی پُراسرار قوتیں شمبھو سے کم نہیں تھیں۔ ان حقائق کی روشنی میں بس یہی ممکن تھا کہ غفلت کے وقت اس پر حملہ کیا جائے۔ یہ موقع مجھے اس وقت ملا جب وہ آپ کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ ہرچند کہ آپ چند لمحوں سے زیادہ اس کی گرفت میں نہیں رہے لیکن مجھے خبر ہے' اس دوران میں آپ پر کیا گزر گئی ہو گی! آپ اسے مصلحت وقت اور مجبوری کا نام دے سکتے ہیں۔ جیسے ہی وہ پوری طرح آپ کی طرف متوجہ ہوا' میں نے عقب سے اس پر وار کیا۔ گھبرا کر اس نے آپ کو چھوڑ دیا۔ آپ گر کر زخمی نہ ہو جائیں' میں اس خیال سے تیزی کے ساتھ آگے بڑھا۔ میں نے آپ کو وہیں زمین پر لٹا دیا۔ اسی وقت مجھے اس کی بھیانک چیخ سنائی دی۔ حصار سے نکلنے کی کوشش میں وہ آپ کے قریب ہی آ کے گرا اور تڑپنے لگا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا' میں نے اس پر آخری وار کیا جو کاری ثابت ہوا۔"

ہمزاد کے خاموش ہوتے ہی میں نے مزید وضاحت کی غرض سے پوچھا۔ " کیا وہ ختم ہو گیا؟ تم نے اسے قتل کر دیا؟"

"ہاں" وہ اپنے گناہوں کی آگ میں زندہ جل کر خاک ہو گیا۔" ہمزاد نے یہ بتاتے ہوئے گہرا سانس لیا۔

معاً" مجھے ہمزاد کی حالت کا خیال آیا۔ گرو گوبند سے ایک مقابلے سے وہ بھی تو شدید زخمی ہو گیا تھا۔ اسے گرو گوبند نے ایک مندر میں قید کر دیا تھا۔ وہاں سے وہ فرار تو ہو گیا تھا مگر اس کا وجود جھلس کے رہ گیا تھا۔ ہمزاد نے مجھے بتایا تھا کہ اپنی قوتوں کی بحالی میں اسے مزید ایک دن اور ایک رات کی ضرورت ہے۔ یہ گزشتہ رات کی تھی۔ چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ پھر بھی تصدیق کی خاطر میں اس سے دریافت کیا۔ "اب تمہارا حال کیا ہے؟ تم پوری طرح صحت یاب ہو گئے؟"

"جی ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "اب میری تمام تر قوتیں پہلے کی طرح بحال ہو چکی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید میں آپ کو نہ بچا سکتا۔"

مجھے یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی اور میں نے ہمزاد سے اس کا اظہار بھی کیا۔ پھر مجھے وہ اہم بات یاد آ گئی جو ہمزاد نے گزشتہ شب ہی مجھ سے کہی تھی۔ اس کو مد نظر رکھ کر میں نے اس سے سوال کیا۔ "تم نے کہا تھا کہ گرو گوبند اور شبھ سے نمٹنے کے لیے ایک اور راستہ سوچا ہے' وہ کیا ہے؟"

"اس وقت خاصی رات گزر چکی ہے اور آپ کی آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں۔" ہمزاد بولا۔ پھر اس نے مشورہ دیا۔ " آپ شدید ترین ا سے گزرے ہیں اور ایسی حالت میں آرام کی ضرورت ہے۔ فی الحال آپ جائیے۔ اس موضوع پر ہم کل بھی گفتگو کر سکتے ہیں۔"

ہمزاد نے غلط نہیں کہا تھا۔ میرے ذہن پر واقعی نیند کا غبار چھایا ہوا تھا میں نے اس کا مشورہ قبول کر لیا۔ پھر بھی مجھے گرو گوبند کی طرف سے فکر تھی۔ میں نے اس کا اظہار ضروری سمجھا۔ میں نے بستر پر دراز ہو کر ہمزاد سے کہا۔ " گوبند کے خاص چیلے کو تم نے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ یقیناً" وہ اس سے

خبر نہیں رہے گا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ آج ہی رات کوئی انتقامی قدم اٹھا بیٹھے! یہ امکان بھی تمہاری نظر میں ہے؟"

"بالکل ہے۔" ہمزاد نے جواب دیا۔ "لیکن اتنے بڑے نقصان کے بعد وہ فوری طور پر اچھی طرح سوچے سمجھے بغیر کوئی قدم اٹھانے کی حماقت نہیں کرے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو پچھتاوے کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا کیوں کہ اب میں مکمل طور پر صحت یاب ہوں اور اس کے ہر وار کا توڑ کر سکتا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔"

ہمزاد کے اطمینان دلانے پر میں نے اپنے ذہن سے اس اندیشے کو جھٹک دیا اور بولا۔ "تو پھر تم کمرے کی بتی بجھا دو اور جاؤ! انشاء اللہ کل ملاقات ہو گی۔"

"انشاء اللہ" ہمزاد نے کہا اور پھر میرے حکم کی تعمیل میں بتی بجھا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کمرے میں اندھیرا پھیل گیا تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ ہی دیر میں مجھے نیند آ گئی۔

دوسرے دن صبح میں دیر سے سو کر اٹھا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر میں نے غسل کیا اور کپڑے بدل لیے۔ فجر کی نماز میں نے قضا ادا کی۔ نماز پڑھ کر مجھے نفیسہ کا خیال آیا۔ اس کی حالت جاننے کے لیے میں نے اپنے تصور کی قوت آزمائی۔ بند آنکھوں سے میں نے اسے دیکھا۔ اس کی مسہری کے قریب مجھے چینگ رو رشید نظر آیا جو ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں نفیسہ کی بوڑھی ماں بھی تھی۔ رشید کی گفتگو سے پتا چلا کہ ابھی ذرا دیر پہلے ہی نفیسہ کو ڈاکٹر دیکھ کر گیا تھا۔ وہ نفیسہ کی ماں کو دواؤں کا ایک تھیلا دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ کل تک نفیسہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

"مگر بیٹے' تم کیوں اپنا نقصان کر رہے ہو؟" نفیسہ کی ماں بولی۔

"میں نے دفتر سے آج کی چھٹی بھی لے لی ہے' خاص طور پر اس لیے کہ نفیسہ کو وقت پر دوائیں دے سکوں۔ آپ کو بس یہ خیال رکھنا ہے کہ اب نفیسہ' شیخ کرامت سے نہ مل سکے۔ اس کی حالت کا ذمے دار وہی شخص ہے۔"

رشید نے مجھ پر الزام لگایا۔

نفیسہ اس موقع پر خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے کہا۔ "یہ بالکل غلط بات ہے۔ میری بیماری کا شیخ صاحب سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو میرے ہمدرد اور خیر خواہ ہیں۔"

"دیکھ لیجیے' یہ ابھی تک اسی شخص کا دم بھر رہی ہے!" رشید نے نفیسہ کی ماں کو مخاطب کیا۔

"بیٹی! جب رشید کو تمھارا شیخ کرامت سے ملنا پسند نہیں تو پھر کیوں اس سے ملتی ہو!" نفیسہ کی ماں اسے سمجھانے لگی۔

"لیکن انھیں مجھ پر حکم چلانے کا کیا حق ہے؟ میں کسی سے بھی ملوں انھیں کیا!" نفیسہ کے لہجے میں غصہ تھا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو نفیسہ بیٹی! تمھیں اب رشید کے ساتھ ہی تو اپنی زندگی گزارنی ہے۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ اب جلد سے جلد رشید کے ساتھ تمھاری شادی کردوں۔"

"ہرگز نہیں!" نفیسہ نے صاف انکار کر دیا۔ "ابھی میں قطعی اس پر آمادہ نہیں ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" رشید ڈھٹائی سے بولا۔ "ایک نہ ایک دن تو تمھیں اس پر آمادہ ہونا ہی پڑے گا۔"

"اور وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔ اب تم جاؤ یہاں سے! میں ٹھیک ہوں اور خود بھی وقت پر دوا پی سکتی ہوں۔" نفیسہ نے یہ کہہ کر رشید کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

"یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ میرے سوا اس دنیا میں تمھیں کوئی اور قبول نہیں کر سکتا۔" رشید کا لہجہ بھی بدل گیا۔ "میری زبان نہ کھلواؤ تو اچھا ہے۔"

نفیسہ کی ماں نے بات بڑھتے دیکھ کر رشید کو سمجھا بجھا کر اس کا غصہ ٹھنڈا کیا اور بولی۔ "اس کی باتوں کا برا نہ مانا کرو بیٹا! یہ تو پاگل ہے۔ اسے اپنے برے بھلے کی کوئی خبر نہیں۔ تم جاؤ' میں اسے سمجھا دوں گی۔ بیماری کی وجہ سے بھی یہ

چڑچڑی ہو رہی ہے۔"

"کرو بھلائی آئے برائی۔" رشید نے منہ بنا کر کہا۔ "میں نے تو اس کی وجہ سے چھٹی لی تھی اور.... خیر آپ کہتی ہیں تو میں چلا جاتا ہوں۔" وہ یہ کہتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں اور تصور کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اچانک افتاد پڑ جانے کے سبب نفیسہ میرے مشورے پر عمل نہیں کر سکی تھی۔ اسے ایاز کو اپنے ماضی سے آگاہ کرنا تھا۔ میں نے سوچا کہ کل تک تو وہ ٹھیک ہو ہی جائے گی اور دفتر جانے لگے گی۔ پھر ایاز سے بات کرنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ مجھے وہ بتا چکی تھی کہ ایاز اب بھی اسے چاہتا ہے اسی لیے اس نے کسی سے شادی بھی نہیں کی تھی۔ اسی چاہت کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یقین سا تھا کہ نفیسہ کے ماضی سے آگاہ ہو جانے کے باوجود ایاز کی چاہت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ وہ نہ تو گھر داماد بننے پر راضی تھا' نہ نفیسہ کے والدین کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے نفیسہ کا نوکری کرتے رہنا بھی پسند نہیں تھا۔ ہاں وہ نفیسہ کے ساتھ الگ رہ کر اس کے والدین کا خرچہ اٹھانے پر آمادہ تھا' مگر یہ صورت نفیسہ کو قبول نہیں تھی۔ اس الجھی ہوئی گتھی کو میرے لیے ہمزاد کی مدد سے سلجھانا کوئی دشوار نہیں تھا' لیکن میرے پیش نظر اس وقت گرو گوبند اور شمبھو سے نمٹنے کا معاملہ ترجیح کا حامل تھا۔

گذشتہ رات ہمزاد سے میری تفصیلی گفتگو نہیں ہو سکی تھی۔ میں نے یہی سوچ کر اسے طلب کیا۔ ابھی تک میں ناشتہ بھی نہیں کر سکا تھا اس لیے ہمزاد کے آتے ہی پہلے اس سے اسی خواہش کا اظہار کیا۔ مجھے کچھ بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔

ہمزاد نے میرے خواہش کی تکمیل میں دیر نہیں لگائی۔ وہ جانے لگا تو میں نے اسے روک لیا۔ "ٹھہرو! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

"پہلے آپ ناشتہ تو کر لیجیے۔" ہمزاد بولا۔ "باتیں کرنے کو تو سارا دن پڑا ہے۔"

"دونوں کام ایک ساتھ بھی تو ہو سکتے ہیں!" میں نے کہا۔ "مجھے دراصل یہ جاننے کی بے چینی لگی ہوئی ہے کہ دشمنوں کو زیر کرنے کے لیے تم نے کیا سوچا ہے؟"

"خاصے سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اپنے پُراسرار اور طاقتور دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے آپ کو مزید قوتیں حاصل کرنی پڑیں گی۔"

"اور ان مزید قوتوں کا حصول کس طرح ممکن ہو گا؟" میں نے سوال کیا۔

"ایک وظیفے کے ذریعے۔" ہمزاد نے بتایا۔ "اس وظیفے کی مدت انیس دن ہے۔"

"کیا تمھیں وہ وظیفہ معلوم ہے؟" میں نے ناشتہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" ہمزاد نے جواب دیا۔ "مجھے بس اتنا علم ہے کہ جس قلمی نسخے میں مختلف وظائف درج ہیں' اسی میں مطلوبہ وظیفہ درج ہے۔ وظیفے کی تمام شرائط بھی قلمی نسخے میں لکھی ہوئی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ شرائط بہت سخت ہوں گی' لیکن انھیں بہرحال پورا کرنا پڑے گا کیوں کہ اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ ہمزاد کس قلمی نسخے کا ذکر کر رہا تھا! یہ وہی قلمی نسخہ تھا جس میں ہمزاد کا عمل میں نے پڑھا تھا۔

"اس وظیفے کی تکمیل کے بعد آپ بڑی سے بڑی شیطانی قوت کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔" ہمزاد نے مزید بتایا۔ "اس کے لیے بہتر صورت یہ ہے کہ آپ یہاں سے واپس چاٹگام چلیں۔ وہیں قلمی نسخہ بھی موجود ہے۔ یوں بھی اب یہاں رہنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ہم خبیث شمبھو کے تعاقب میں یہاں آئے تھے جو فرار ہو چکا ہے۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم وہ قلمی نسخہ یہیں لے آؤ۔" میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "وظیفہ یہاں بھی تو پڑھا جا سکتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں' مگر یہاں کی نسبت چاٹگام میں آپ زیادہ محفوظ ہوں گے۔ یہ مکان بہرحال کرائے کا ہے۔ آپ کے تو علم میں ہے کہ وظیفے کے لیے وقت

ر جگہ کی شرط بھی ہوتی ہے۔ آپ یہ وظیفہ پورا نہ کر سکیں' گرو گوبند اس کے لیے مختلف حربے آزما سکتا ہے وہ کسی طرح بھی یہ نہیں چاہے گا کہ آپ کو مزید قتیں حاصل ہو جائیں تاکہ اس کے مقابلے پر آ سکیں۔ اندازے کے مطابق وہ پہلا بہ یہی استعمال کرے گا کہ مالک مکان آپ سے یہ مکان خالی کرا لے۔ ظاہر ہے کہ ظیفہ شروع کرنے کے بعد یہ آپ کے لیے ممکن نہیں ہو گا۔" ہمزاد نے مجھے متوقع طرے سے آگاہ کیا۔

"لیکن کیا تم گرو گوبند کے ان حربوں کو ناکام نہیں بنا سکتے؟" میں نے ریافت کیا۔

"وظیفے کے دوران میں آپ کی کوئی مدد کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہو گا۔" مزاد نے وضاحت کی۔ "اگر میں نے ایسی کوئی کوشش کی تو خود میرا وجود خطرے یں پڑ سکتا ہے۔ اس کا کیا ہول ناک نتیجہ ممکن ہے' آپ بھی اس سے باخبر ہیں۔ ری زندگی کے ساتھ آپ کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ انیس دن تک تم سے میرا رابطہ منقطع رہے" میں نے فکر مند سا ہو گیا۔

"نہیں' آپ سمجھے نہیں۔" ہمزاد بولا۔ "بات صرف اتنی ہے کہ وظیفے کی تک میں کسی قسم کی معاونت یا مداخلت نہیں کر سکوں گا۔ اس سلسلے میں ہر طے سے آپ کو خود ہی نمٹنا پڑے گا۔ ہاں اس وظیفے سے قطع نظر میں آپ کی ہر ت بجا لا سکتا ہوں۔"

ہمزاد سے مزید کچھ دیر گفتگو کر کے میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ مجھے چاٹگام واپس ای پڑے گا۔ فی الحال اس شہر کو چھوڑ کر نہ جانے کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو مجھے ہ کو اس کی منزل سے ہمکنار کرنا تھا' دوسرے ایک بے گناہ شخص کو قتل نے سے بچانا تھا۔ ثمینہ کا نوجوان عاشق زاہد اپنی شادی شدہ محبوبہ کے شوہر شوکت راستے سے ہٹانے والا تھا۔ یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی۔ میرا ضمیر اس بات وارا کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا کہ میں ان دونوں معاملات کو ادھورا چھوڑ کر شہر سے چلا جاؤں۔ میری نظر میں یہ خود غرضی ہوتی۔ اس سے ایک طرف تو

نفیسہ کی زندگی تباہ ہو جاتی' دوسری جانب شوکت مارا جاتا۔

اپنے ان احساسات و خیالات سے میں نے ہمزاد کو بھی بے خبر نہیں رکھا۔

"آپ کے اندر میں یہ ایک بڑی مثبت اور خوشگوار تبدیلی دیکھ رہا ہوں۔" ہمزاد کے لہجے سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ "پہلے آپ صرف اور صرف اپنے لیے سوچتے تھے' لیکن اب ایسا نہیں رہا۔ آپ دوسروں کے کام بھی آنے لگے ہیں' وہ بھی کسی ذاتی غرض کے بغیر! میری نظر میں یہ بڑی بات ہے۔ آپ کے خیالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب یہی بہتر ہے کہ ان دونوں معاملات کو نمٹا کر ہی چاٹگام واپس چلا جائے۔ اس طرح آپ مکمل ذہنی یک سوئی کے ساتھ وظیفہ شروع کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں آپ مجھے جو بھی حکم دیں' میں اس پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔"

کچھ دیر تک میں نے دونوں معاملات پر غور کیا کہ پہلے کسے ترجیح دینی چاہیے! میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہمزاد کی مدد سے بہ یک وقت معاملات کو نمٹایا جا سکتا ہے۔ اس طرح زیادہ وقت بھی نہ لگتا۔ یہی سوچ کر میں نے ہمزاد کو مخاطب کیا۔

"تم پہلا کام تو یہ کرو کہ نفیسہ کو حصار سے ٹکرانے کے سبب جو عارضہ لاحق ہو گیا ہے' اس سے اسے نجات دلا دو۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ آج ہی دفتر جا کر اپنے محبوب ایاز سے ملاقات کرلے۔ تم اس کام سے نمٹ کر آؤ تو پھر میں تمہیں دوسرا کام بتاؤں گا۔ اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ دونوں معاملات پر ایک ساتھ توجہ دی جا سکے۔"

"حصار سے ٹکرا کر نفیسہ کے جسم کو جو نقصان پہنچا تھا اور وہ جس بیماری میں مبتلا ہو گئی ہے' اس کا علاج کسی ڈاکٹر یا طبیب کے بس میں نہیں۔" ہمزاد نے بتایا۔

"لیکن میں نے اپنے تصور کی قوت آزما کر تو کچھ اور ہی معلوم کیا ہے۔" میں نے یہ کہہ کر ہمزاد کو حاصل کردہ معلومات سے آگاہ کر دیا۔

"وہ ڈاکٹر جھوٹ بولتا ہے۔" ہمزاد بولا۔ "دواؤں کے ذریعے وقتی طور پر ڈاکٹر اس کے جسم کی حدت پر قابو تو پا سکتا ہے' مگر اسے ختم نہیں کر سکتا۔ جیسے ہی

بند کر دی گئی' وہ پھر اپنی پہلی حالت پر لوٹ جائے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی علاج ہوا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے ہمزاد کے خیال سے اتفاق کیا۔ "مجھے یہ علم تھا' مگر تم تو اسے قطعی طور پر صحت یاب کر سکتے ہو؟"

"جی ہاں' حصار سے ٹکرانے کا اثر ختم کرنا میرے لیے ممکن ہے۔" ہمزاد ... "ذرا سی دیر میں وہ بستر علالت سے اٹھ کر کھڑی ہو سکتی ہے۔"

"تو پھر جاؤ اور اسے ایاز سے ملنے پر بھی مجبور کر دو!" میں نے ہمزاد کو حکم ...

میرے حکم کی تعمیل میں ہمزاد فوراً روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی میں ... اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ اپنے تصور کی قوت بروئے کار لا سکوں۔ چند ہی ... گزرے ہوں گے کہ میں نے اپنے صفحہ ذہن پر نفیسہ کا حسین چہرہ ابھرتے ... پھر میں نے اپنے تصور کا دائرہ وسیع کیا۔ اس وقت نفیسہ اپنے کمرے میں ... تھی۔

معاً میں نے اسے پہلے چونکتے اور پھر بڑبڑاتے دیکھا۔ "یہ... یہ میرے ... پر کون... کون ہاتھ پھیر رہا ہے؟" ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر حیا ... سرخی پھیل گئی۔ میرے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ نفیسہ کے جسم پر ہاتھ ... پھیرنے والا ہمزاد کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ذرا توقف سے نفیسہ پھر ... بڑبڑائی۔ "اب... اب تو مجھے بالکل گرمی محسوس نہیں ہو رہی۔ میرے جسم میں ... سی ٹھنڈک پھیل گئی ہے... ہاں مجھے آج ہی دفتر جا کر ایاز سے ملنا چاہیے۔ ... اسے سب کچھ بتا دوں گی کیوں کہ پانی اب سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ میں' ... کے اس دعوے کو قطعی غلط ثابت کر دوں گی کہ اس کے سوا مجھے کوئی قبول ... کر سکتا۔" یہی بڑبڑاتی ہوئی وہ اٹھی اور کمرے ہی میں موجود ایک الماری کھول ... کپڑے نکالنے لگی۔

اسی وقت نفیسہ کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ نفیسہ الماری سے ... کپڑے نکال چکی تھی۔

"میں اس لیے آئی تھی نفیسہ بیٹی کہ تمھاری دوا کا وقت ہو گیا ہے' دوا پی..."

"اب مجھے کسی دوا کی ضرورت نہیں امی!" نفیسہ نے اپنی ماں کی بات کاٹ دی۔ میں سمجھ گیا کہ نفیسہ ابھی تک میرے ہمزاد کے زیر اثر ہے۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے نفیسہ نے اپنی ماں سے یہ بھی کہا۔ "میں دفتر جا رہی ہوں امی!"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو نفیسہ بیٹی!" نفیسہ کی ماں حیرت سے بولی۔ "ڈاکٹر نے تو کہا تھا کہ تمھیں مزید ایک دن آرام کی ضرورت ہے۔ پھر یہ تم چھٹی کی درخواست..." "درخواست سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں آج ہی دفتر جا کے مزید چھٹیاں ختم کرا دوں گی۔" نفیسہ بول اٹھی۔

"لیکن بیٹی' اس کی ضرورت کیا ہے؟"

"ضرورت ہے امی! میں اسی لیے دفتر جا رہی ہوں!" نفیسہ نے زور دے کر کہا۔

جو والدین کسی سبب اپنی اولاد کے محتاج ہو جاتے ہیں' انھیں اولاد کی ضد کے آگے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ یوں بھی نفیسہ میرے ہمزاد کے زیر اثر آ کر کس طرح دفتر جانے سے رک جاتی! میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ ہمزاد کو اس کی کوشش میں کامیاب دیکھ کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چند لمحوں بعد ہی ہمزاد واپس آ گیا۔

"آپ کے پہلے حکم کی تعمیل ہو گئی۔" ہمزاد نے بتایا۔

"ہاں میں خود بھی اپنے چشم تصور سے دیکھ چکا ہوں کہ نفیسہ دفتر جانے والی ہے۔" میں بولا۔ "اب تم ثمینہ' اس کے شوہر شوکت اور نوجوان عاشق زاہد کی خبر لو کہ یہ تینوں کہاں اور کس حال میں ہیں! اپنے رقیب شوکت کو راستے سے ہٹانے کے لیے زاہد نے ابھی کوئی قدم اٹھایا کہ نہیں؟ تمھیں تمام معلومات حاصل کرنی ہیں۔"

ہمزاد نے اقرار میں سر ہلایا اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ واپسی

میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں اس کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں تو وہ بتانے لگا۔ "آپ نے اگر مجھے آج ان لوگوں کی خبر لینے کے لیے نہ بھیجا ہوتا تو شوکت مارا جاتا۔ شوکت کی زندگی کا آج آخری دن ہوتا۔"

"وہ کیسے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ "زاہد خود اپنے رقیب کو قتل کرنے والا تھا یا کسی کے ذریعے اسے قتل کرا رہا تھا؟"

"زاہد نے اس سلسلے میں ایک بنگالی ہندو ساحر شیو نندن سے شوکت کے قتل کا سودا کیا تھا۔" ہمزاد نے جواب دیا۔ "شیو نندن یہ شیطانی عمل شروع کر چکا ہے۔ آج اس عمل کی آخری رات ہے۔ بارہ بجے رات کو شیو نندن یہ عمل شروع کرے گا۔ اسی کے نتیجے میں شوکت کل صبح مردہ پایا جاتا۔ بہ ظاہر اس کی اچانک موت حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب واقع ہوتی۔ کسی کو پتا نہ چلتا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ ساحر شیو نندن نے زاہد سے اس قتل کا بھاری معاوضہ وصول کیا ہے۔ اپنے بوڑھے والدین سے زاہد نے یہ جھوٹ بولا کہ وہ ایک کاروبار شروع کرنے والا ہے جس کے لیے پچاس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ شوکت کے قتل کا شیو نندن نے اتنا ہی معاوضہ طلب کیا تھا۔ اس جھانسے میں آ کر کہ ان کا بیٹا زاہد اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا' والدین آبائی مکان فروخت کرنے پر راضی ہو گئے مکان ساٹھ ہزار میں بکا' مگر زاہد نے اپنے والدین کو یہی بتایا کہ پچاس ہزار ملے ہیں۔ ساحر شیو نندن کو اس نے بہ طور پیشگی تیس ہزار روپے ادا کر دیے' بقیہ بیس ہزار روپے بعد میں کام ہو جانے پر ادا کرنے تھے۔ یوں قتل کا معاوضہ کر کے بھی زاہد کے پاس عیش اڑانے کی خاطر دس ہزار روپے بچ رہتے۔ زاہد کا ارادہ یہ ہے کہ ثمینہ سے شادی کر کے وہ اسے اور اس کے بچوں کو ساتھ لے کر مغربی پاکستان فرار ہو جائے گا۔ ثمینہ کو وہ اس پر راضی کر چکا ہے۔ آج رات بارہ بجے ساحر شیو نندن بوڑھی گنگا کے کنارے شیطانی عمل شروع کرے گا۔ میں وقت اور جگہ کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر چکا ہوں۔"

"اس لیے کہ تم وہ شیطانی عمل پورا نہ ہونے دو۔" ہمزاد کے خاموش ہوتے ہی میں نے قیاس آرائی کی۔

"آپ کا خیال بالکل درست ہے۔" ہمزاد نے تصدیق کی، پھر کہا۔ "لیکن آپ کو بھی میری مدد کرنی پڑے گی۔"

"مجھے؟" میں نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

"یہ شیطانی عمل بہت خطرناک ہے، کسی نہ کسی کی جان لے کر ہی رہے گا۔ ساحر شیو نندن کی کوشش یہ ہوگی کہ ہر قیمت پر عمل پورا ہو۔ اگر کسی وجہ سے عمل پورا نہ ہو سکا تو خود شیو نندن زندہ نہیں بچ سکے گا۔ میں اس کے عمل میں مداخلت کروں گا تو وہ میری طرف متوجہ ہو جائے گا۔ اس طرح مجھے شیو نندن کے کھینچے ہوئے حصار میں داخل ہونے کا موقع نہیں ملے گا۔ اس کی ایک ہی تدبیر ہے کہ شیو نندن میرے بجائے آپ کی طرف متوجہ ہو جائے۔" ہمزاد یہ کہہ کر مجھے اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے لگا۔ اس منصوبے میں میری موجودگی بھی ضروری اور اہم تھی۔

میں نے ہمزاد کی باتیں پوری توجہ اور انہماک سے سنیں مجھے اس پر مسرت محسوس ہو رہی تھی کہ میں آج رات ایک بے گناہ شخص کی زندگی بچانے والا تھا۔

اب دوپہر ہونے والی تھی۔ میں نے اسی لیے ہمزاد سے کھانا منگوا کر اسے رخصت کی اجازت دے دی۔

کھانا کھا کر لیٹے ہوئے ابھی مجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ نیچے مکان کے صدر دروازے پر کسی نے دستک دی۔ اس وقت کون آ سکتا ہے؟ میں یہ سوچتے ہوئے بستر سے اٹھا۔ نیچے جانے سے پہلے میں نے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو حیرت ہوئی۔ دروازے پر دستک دینے والی نفیسہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایک اجنبی نوجوان بھی نظر آیا۔ نفیسہ کی آمد میرے لیے غیر متوقع ہی تھی۔ بہرحال مجھے دروازہ کھولنے کے لیے نیچے جانا ہی پڑا۔

"نیچے پہنچ کر میں نے دروازہ کھولا اور خوش اخلاقی کے ساتھ نفیسہ کو مخاطب کیا۔ "آؤ نفیسہ، اندر آجاؤ۔"

"یہ ایاز ہیں جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔" نفیسہ نے اپنے ساتھی نوجوان سے میرا تعارف کرایا۔ "اور ایاز، یہ..."

"مجھے شیخ کرامت کہتے ہیں۔" میں نے خود ہی اپنا تعارف کرا دیا۔

خوش لباس نوجوان ایاز نے میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور پھر گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ "شیخ صاحب! آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

"میں بھی خوش ہوا، مگر آپ دونوں اندر تو آئیں نا!" میں نے کہا۔

"شکریہ!" ایاز یہ کہہ کر نفیسہ کے ساتھ اندر آگیا۔

میں ان دونوں کو ساتھ لے نشست گاہ میں آیا اور انھیں صوفوں پر بٹھا دیا۔ میں ان کے مقابل والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"شیخ صاحب! نفیسہ نے مجھے آپ کے متعلق جو کچھ بتایا، اسے سن کر حیرت ہوئی۔ اسی سبب آپ سے ملاقات کا اشتیاق مجھے کشاں کشاں یہاں لے آیا ہماری مشرقی روایات میں کسی عورت اور مرد کے درمیان بے غرض دوستی کی کوئی روایت نہیں، لیکن آپ کے بارے میں مجھے نفیسہ سے یہی معلوم ہوا۔" ایاز نے گفتگو شروع کی۔ "نفیسہ نے مجھے بتایا کہ آپ کا ان سے محض دوستی کا رشتہ ہے۔ مزید یہ کہ آپ ہی کے مشورے پر نفیسہ نے پہلی مرتبہ مجھ سے کھل کر بات کی ہے۔ یہ جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ رشید کے ساتھ نفیسہ کی شادی کے خلاف ہیں۔ آپ اسے بے جوڑ شادی سمجھتے ہیں۔ وہ وجہ بھی معلوم ہو گئی کہ جس کی بنا پر نفیسہ کے والدین ان کی شادی مجبوراً رشید سے کرنے والے ہیں۔ شیخ صاحب! آپ ہی کی طرح اس تلخ واقعے کا ذمے دار میں بھی نفیسہ کو نہیں سمجھتا۔ نفیسہ میری نظر میں قطعی بے قصور و بے گناہ ہیں۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود میں اس لیے نفیسہ کو اپنانے پر آمادہ ہوں۔" ایاز یہ کہہ کر چند لمحے کو رکا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

"معاف کیجیے گا، میں ابھی آیا۔" میں یہ کہتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"کسی زحمت کی ضرورت نہیں شیخ صاحب!" ایاز بول اٹھا۔ "مجھے معلوم ہے کہ آپ تنہا رہتے ہیں، کوئی تکلف نہ کیجیے گا۔"

"اگر آپ چائے ہی پلانا چاہتے ہیں تو پھر ہم اس شرط پر چائے پئیں گے کہ

میں چائے بناؤں گی۔" نفیسہ بھی خاموش نہ رہی۔

"منظور ہے' چائے تمھی بنانا!" میں مسکرایا۔ "کچھ پھل وغیرہ تو لے آؤں میں۔ ایاز صاحب پہلی دفعہ میرے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔" میں یہ کہتا ہوا تیز قدمی کے ساتھ نشست گاہ سے نکل آیا۔ دراصل میں اس معاملے کو اسی وقت نمٹا دینا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ہمزاد کو طلب کرنا ضروری تھا۔ پھل لے کر آنا تو محض ایک بہانہ تھا۔ اوپری منزل پر پہنچتے ہی باورچی خانے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے ہمزاد کو طلب کر لیا۔ میں نے جلدی جلدی اسے بتا دیا کہ کب اور کیا کرنا ہے! چشم زدن میں ہمزاد نے مجھے ڈھیروں ڈھیر پھل لا کر دے دیے۔ میں نے پھلوں کو کئی پلیٹوں میں رکھا' پھر ان پلیٹوں کو ایک بڑی ٹرے میں سجا کر باورچی خانے سے نکلا۔ پھل اتنے تھے کہ مجھے خاصے پھل باورچی خانے میں چھوڑنے پڑے۔ ٹرے اٹھائے ہوئے میں نیچے جانے والے زینے تک پہنچا ہی تھا کہ نفیسہ اوپر آتی دکھائی دی۔

میں اسے آتے دیکھ کر رک گیا۔ اوپر آتے ہی نفیسہ کہنے لگی۔ "ایاز سے میں نے چائے بنا کر لانے کو کہا ہے' مگر اس بہانے دراصل مجھے آپ سے بات کرنی تھی۔"

"ہاں بولو' کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"باقی تمام باتیں تو ایاز نے مان لی ہیں جن کی مجھے توقع بھی نہیں تھی' لیکن اصل مسئلہ وہیں کا وہیں ہے۔" نفیسہ دھیمی اور اداس آواز میں بولی۔ "وہ میرے بوڑھے والدین کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہیں اور نہ انھیں یہ منظور ہے کہ میں نوکری کرتی رہوں۔ میں اسی لیے ایاز کو اپنے ساتھ لے کر آپ کے پاس آئی تھی کہ..."

"مجھے ایک سوال کا جواب دو نفیسہ! کیا تمھیں مجھ پر بھروسا ہے؟"

"آپ پر بھروسا نہ ہوتا تو ایاز کو یہاں لے کر کیوں آتی!"

"تو پھر فیصلہ مجھ پر چھوڑ دو! انشاء اللہ تم دونوں ہی کو میرے فیصلے سے مایوسی نہیں ہوگی۔" میں پر یقین آواز میں بولا۔

میری بات سن کر نفیسہ کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا اور اس نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ جو فیصلہ بھی کریں گے' مجھے منظور ہوگا۔"

"مجھے تم سے یہی توقع تھی۔" میں یہ کہہ کر مڑا۔ "وہ رہا ادھر باورچی خانہ' تم چائے بنا کر لے آؤ۔ میں نیچے چلتا ہوں۔" ہمزاد وہیں موجود تھا۔ نفیسہ کے آگے بڑھتے ہی میں نے اسے اشارہ کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر باورچی خانے میں چائے بنانے کے لیے دودھ وغیرہ نہ ہو تو وہ فراہم کر دے۔

میں نیچے نشست گاہ میں پہنچا تو ایاز مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "ارے شیخ صاحب! یہ آپ نے اتنا تکلف کیوں کیا!"

"مرد اور عورت میں دوستی کا چلن نہ سہی' مگر مہمان نوازی تو ہماری شرقی روایات میں شامل ہے۔" میں دھیرے سے ہنس دیا اور پھلوں کی ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ کر صوفے پہ بیٹھ گیا۔

"نفیسہ نے آپ کے متعلق جو کہا تھا' وہ سچ ثابت ہو رہا ہے۔ آپ واقعی پر خلوص اور بے غرض ہیں۔" ایاز نے کہا۔ "آپ کے اسی خلوص سے متاثر ہو کر میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے بہتر مشورہ دے سکتے ہیں۔ ایسے میں موقع بھی ہے' نفیسہ اوپر چائے بنانے گئی ہے۔"

"ہاں ہاں بلا جھجک جو کہنا ہے' کہہ دیں۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "ویسے مجھے اندازہ ہے کہ آپ کس مسئلے سے دوچار ہیں۔"

"آپ کو تو خبر ہوگی شیخ صاحب کہ ہمارے دفتروں کا ماحول کیسا ہے! ابھی ہم نے دل سے عورت کے حقوق کو تسلیم نہیں کیا۔ جو عورتیں مجبوراً" دفاتر میں کام کرتی ہیں' ان کے ساتھ مردوں کا رویہ عموماً" مناسب نہیں ہوتا۔ بعض افسران تو ایسی لڑکیوں کو مال غنیمت سمجھنے لگتے ہیں۔ ان حالات میں میری یہ خواہش ہے کہ مجھ سے شادی کے بعد نفیسہ نوکری چھوڑ دیں' لیکن وہ اس پر آمادہ نہیں ہیں۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"ایاز صاحب! پہلی بات تو میں آپ کو یہ بتا دوں کہ آپ کی اعلیٰ ظرفی اور معاملہ فہمی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ یقیناً" یہ آپ کی عظمت اور نفیسہ سے سچی

محبت کی دلیل ہے کہ نفیسہ کے ماضی سے پردہ اٹھنے کے باوجود اب بھی آپ اسے اپنانے پر آمادہ ہیں۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ "اصل مسئلہ نفیسہ کا نوکری کرنا یا چھوڑنا ہرگز نہیں ہے۔ ہرچند کہ اس وقت نفیسہ یہاں موجود نہیں' پھر بھی میں آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں' میرے کہنے پر وہ نوکری چھوڑ دے گی اور..."

"بس میں یہی چاہتا ہوں۔" ایاز بول اٹھا۔

"پہلے آپ میری پوری بات سن لیجیے ایاز صاحب!" میں نے کہا۔

"جی فرمایئے شیخ صاحب!"

"جہاں تک مجھے خبر ہے ایاز صاحب' آپ اس دنیا میں اکیلے ہیں۔ آپ کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں کیا آپ نفیسہ کے والدین کو اپنا نہیں سمجھ سکتے؟ اس میں آخر قباحت کیا ہے؟"

"کیوں نہیں! میں نے یہی سمجھ کر تو آج اور پہلے بھی نفیسہ سے یہ کہا تھا کہ ان کے تمام اخراجات اٹھانے پر آمادہ ہوں۔ اللہ کا شکر ہے' مجھے اتنی تنخواہ مل جاتی ہے کہ اپنی اور نفیسہ کی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ ساتھ میں ان کے والدین..."

"ایک منٹ۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر ایاز کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ "یہ بتایئے کہ عزت نفس کو بھی آپ کوئی اہمیت دیتے ہیں؟"

"میں آپ کے اس سوال کا مطلب سمجھا نہیں شیخ صاحب!"

"صرف پیسہ ہی سب کچھ نہیں' یہ آپ بھی جانتے ہیں۔" میں نرمی سے بولا۔ "اصل چیز خلوص و محبت اور کسی کو واقعی اپنا سمجھنا ہے۔ اگر آپ کے والدین حیات ہوتے تو یقیناً" آپ انھیں اپنے ساتھ ہی رکھتے' الگ نہیں۔ انھیں آپ الگ رکھ کر ان کے اخراجات نہ اٹھاتے۔ تو پھر آپ نفیسہ کے والدین سے ایسا سلوک..."

"دراصل میں گھر داماد بننا نہیں چاہتا۔" ایاز جھجکتے ہوئے بولا۔ اس نے میری بات پوری نہیں ہونے دی تھی۔

"تو پھر اس کی ایک اور دوسری صورت بھی ہے۔" میں نے یہ کہتے ہی

وہاں موجود ہمزاد کو اشارہ کیا تاکہ وہ ایاز کو اپنے اثر میں لے لے۔ ہمزاد نے دیر نہیں کی۔

"جی فرمایئے شیخ صاحب! اگر کوئی دوسری صورت ممکن ہے تو میں اسے قبول کرلوں گا۔" ایاز سراپا تسلیم و رضا نظر آنے لگا۔

"اسی وقت نشست گاہ کے باہر قدموں کی چاپ ابھری اور میں نے کہا۔ "غالباً" نفیسہ چائے بنا کر لے آئی ہے۔ اچھا ہے کہ بقیہ گفتگو اسی کے سامنے ہو جائے۔"

"جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں شیخ صاحب! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"ذرا ہی دیر میں نفیسہ چائے کی ٹرے اٹھائے نشست گاہ میں آگئی۔ میرے اصرار پر نفیسہ اور ایاز نے کچھ پھل کھائے' پھر چائے پینے لگے۔"

"سنو!" میں نے چائے کا گھونٹ لے کر نفیسہ کو مخاطب کیا۔ "اگر میں تم سے یہ کہوں کہ نوکری چھوڑ دو تو؟"

"میں چھوڑ دوں گی شیخ صاحب!" نفیسہ نے بلا جھجک جواب دیا۔

"آپ نے سن لیا ایاز صاحب کہ نفیسہ نوکری چھوڑنے پر تیار ہے؟"

"جی... جی ہاں شیخ صاحب! اب آپ مجھ سے جو کہیں گے' میں بھی اسے ماننے سے انکار نہیں کروں گا۔" ایاز کسی سحرزدہ شخص کی طرح بولا۔

نفیسہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ میں نے ایاز سے کہا۔ "آپ کو گھر داماد بننے پر اعتراض تھا نا! تو اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ آپ نفیسہ سے شادی کر کے اس کے والدین کو اپنے گھر لے جائیں۔ یہ تو ٹھیک ہے نا! اس طرح آپ کی ایک محرومی کا بھی ازالہ ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ نفیسہ کے والدین کی حیثیت بھی آپ کے لیے اپنے ہی والدین جیسی ہوگی۔"

"آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں شیخ صاحب! ایاز نے ہمزاد کے زیر اثر فوراً" میری بات مان لی۔ "تعجب ہے کہ اب تک اتنی سی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں تہ دل سے آپ کا ممنون ہوں کہ مجھے ایسا مشورہ دیا۔ نفیسہ کے والدین

کو میں اپنے ساتھ رکھنے پر راضی ہوں۔"

ایاز کے قریب ہی نفیسہ بھی میرے سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ یہ سن کر اس کا چہرہ گل و گلزار ہو گیا۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی بات بن جائے گی۔

"شیخ صاحب! آپ سے ایک درخواست اور کرنی ہے۔" ایاز نے میری طرف نگاہ اٹھائی۔ "جہاں آپ نے اتنا بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے' ایک مہربانی اور کر دیں۔"

"ہاں ہاں بولیں' میں جس قابل بھی ہوں انشاء اللہ آپ کی خدمت سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔" میں نے یقین دہانی کرائی۔

"آپ کو تو معلوم ہے کہ اس بھری دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ یہ کچھ مناسب نہیں ہو گا کہ میں خود نفیسہ کے والدین سے اس سلسلے میں بات کروں۔ میری خواہش ہے کہ آپ..."

"میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔" میں بول اٹھا۔ "میں یہ ذمے داری قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آج ہی بات پکی ہو جائے۔"

"آپ کی بڑی عنایت شیخ صاحب!" ایاز نے اظہار ممنونیت کیا' پھر اس کے دل میں جو اندیشہ تھا' وہ بھی نہیں چھپایا۔

"اس کی فکر نہ کریں۔ میں جانتا ہوں کہ نفیسہ کے خاندان والے اپنی برادری سے باہر رشتے نہیں کرتے' لیکن موجودہ حالات میں یہ ضروری نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات نہیں ٹالیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ترجیح اپنے عزیز و اقارب ہی کو دینی چاہیے' مگر جب اپنوں میں مناسب رشتہ نہ مل سکے تو برادری کے باہر بھی رشتہ کرنا کوئی برائی نہیں۔ ہر چند کہ اب تک میں کبھی نفیسہ کے گھر میں نہیں گیا' لیکن اس کار خیر کے لیے ضرور جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

اس وقت تک ہم چائے پی چکے تھے۔ میرے منع کرنے کے باوجود نفیسہ چائے کی خالی پیالیاں ٹرے میں رکھ کر ساتھ چلنے لگی۔ میرے ہاتھ میں پھلوں کی

ے تھی۔

جب نفیسہ کے ساتھ ہی میں اوپری منزل پر پہنچا اور ٹرے رکھ کر ورچی خانے سے نکلا تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے کہنے لگی۔ "آپ نے مجھ پر ڑا احسان کیا ہے کہ... کہ جسے میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی۔" اس کی ین آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا نفیسہ!" میں بولا۔ "یہ تو میرا فرض ا جو میں نے ادا کیا ہے۔"

"اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔" وہ یہ کہہ کر اپنی آنکھوں میں آئے ے آنسو دوپٹے کے آنچل سے پونچھنے لگی۔

میں اس کے ساتھ واپس نشست گاہ میں آیا اور ایاز سے ساتھ چلنے کو کہا' نفیسہ کو مخاطب کیا۔ "تم پہلے چلی جاؤ اور اپنے والدین کو ہماری آمد سے آگاہ دو۔"

"جی بہتر ہے۔" نفیسہ اٹھ کر چلی گئی۔

ہمزاد کو ابھی میں نے رخصت کی اجازت نہیں دی تھی کیوں کہ اس کی ورت پڑ سکتی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہی تھا۔ ایاز کو ساتھ لیے ہوئے میں اپنے گھر نکلا اور دروازہ بند کر دیا۔ سامنے والا دو منزلہ مکان نفیسہ کا تھا۔ گلی عبور کر کے اس کے دروازے پر پہنچ گئے۔

معاً مجھے ایک بات کا خیال آیا اور ایاز سے بولا۔ "میں ابھی آیا۔"

"کیا ہوا شیخ صاحب! آپ کہاں جا رہے ہیں؟" ایاز نے حیرت سے پوچھا۔

"گھر میں ایک چیز بھول آیا ہوں' وہ لانی ہے۔ آپ تھوڑی دیر یہیں رے رہیں۔ مجھے واپسی میں دیر نہیں ہو گی۔" میں یہ کہتے ہی واپسی کے لیے مڑ ۔

اپنے گھر کا دروازہ کھولتے ہی میں نے اندر قدم رکھا اور ہمزاد سے اپنی ش کا اظہار کر دیا۔

"آپ تو ایاز کے بزرگ ہونے کا پورا پورا حق ادا کر رہے ہیں۔" میرا

ہمزاد دھیرے سے ہنسا اور پھر غائب ہو گیا۔ چند لمحوں میں وہ لوٹ آیا اور چھوٹی سی ایک سرخ مخملی ڈبیا میری طرف بڑھا دی۔ "یہ لیجیے۔" میں نے اس سے ڈبیا لے لی اور اسے کھول کر دیکھا۔

ڈبیا میں سونے کی ایک قیمتی انگوٹھی تھی۔ انگوٹھی میں ہیرے کا نگ جگمگا رہا تھا۔ میں نے انگوٹھی دیکھ کر پسندیدگی کا اظہار کیا اور پھر اسے بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ پھر گھر سے نکل کے دروازہ بند کرنے اور دوبارہ ایاز تک پہنچنے میں مجھے دیر نہ لگی۔ وہ حیران پریشان سا کھڑا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ دروازہ ایک باریش بوڑھے نے کھولا۔ اس کے چہرے پر مجھے فکرمندی کے آثار نظر آئے۔

"تشریف لائیے جناب!" بوڑھے نے ہمیں اندر آنے کی دعوت دی اور ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ باریش بوڑھا مجھے نفیسہ کا باپ ہی لگا۔

ہم نچلی منزل ہی پر بوڑھے کے ساتھ ایک کمرے میں آ بیٹھے۔ کمرے میں چند کرسیاں خراب و خستہ حالت میں پڑی تھیں۔ ہم انھی پر بیٹھ گئے۔

"میرا نام شیخ کرامت ہے جناب!" میں نے بوڑھے سے پہلے اپنا تعارف کرایا۔ "میں آپ کے سامنے والے مکان ہی میں رہتا ہوں۔ یہ ایاز صاحب ہیں جو آپ کی صاحبزادی نفیسہ کے دفتر میں افسر ہیں۔ ہماری ... کے بارے میں یقیناً نفیسہ نے آپ کو بتا دیا ہو گا۔ آپ نفیسہ کے والد ہی ہیں نا!"

"جی ہاں' نفیسہ میری ہی بیٹی ہے۔" بوڑھے نے تصدیق کر دی۔ "میرا نام خیرالدین ہے۔ فرمائیے آپ حضرات نے کیسے زحمت کی؟"

کسی تمہید کے بغیر میں نے فوراً کہہ دیا۔ "ہم دراصل نفیسہ کے رشتے کی غرض سے حاضر خدمت ہوئے ہیں۔"

"مگر جناب' میں تو اس کا رشتہ طے کر چکا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے' مگر شاید رشتہ کرتے وقت آپ نے یہ نہیں سوچا کہ رشید کے ساتھ نفیسہ خوش نہیں رہ سکے گی۔ معاف کیجیے گا محترم' یہ رشتہ قطعی بے جوڑ ہے۔ کہاں آپ کی صاحبزادی اور کہاں وہ چیچک رو شخص رشید! میں نے یہ

...تے ہی ہمزاد کو اشارہ کیا۔

"یہ... یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں شیخ صاحب!" خیرالدین کی آواز ہمزاد ...ے زیر اثر خواب ناک سی ہو گئی۔ "مگر کوئی اور مناسب رشتہ بھی تو نہیں ملا۔"

"اب تو کوئی ایسی بات نہیں۔ ایاز صاحب آپ کے سامنے ہیں۔ ان کا بھی ...نیا میں کوئی نہیں۔ مجھ کو آپ ان کا بزرگ تصور کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ...پ اپنی بیگم صاحبہ کو بھی یہیں بلوا لیں تاکہ وہ بھی ایاز صاحب کو دیکھ لیں۔" میں ...ے مشورہ دیا۔

"آپ نے یہ بالکل ٹھیک کہا شیخ صاحب! میں انھیں بلا کر لاتا ہوں۔ جہاں ...ک میری مرضی اور پسند کا تعلق ہے' مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔ رشید سے صرف ...انی بات ہوئی تھی جو ختم بھی کی جا سکتی ہے۔ کوئی لین دین نہیں ہوا تھا۔" خیر ...دین نے بتایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"بہت بہت شکریہ خیرالدین صاحب!" میں نے کہا۔

"شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے کہ اتنا اچھا رشتہ لے کر آئے۔" خیر ...دین چلتے چلتے کہنے لگا۔

کچھ ہی دیر میں نفیسہ کی ماں بھی وہاں آ گئی اور ہمزاد نے اسے بھی اپنے ...میں لے لیا۔ ظاہر ہے کہ پھر وہی نتیجہ نکلا جس کی توقع تھی۔ نفیسہ کی ماں نے ...ایاز کو پسند کر لیا اور مجھ سے بولی۔ "مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں' لیکن ... ہم غریب لوگ ہیں' جہیز وغیرہ..."

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں جلدی سے بولا۔ "ایاز صاحب کو ...یسہ کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ اللہ کا دیا ان کے پاس بہت کچھ ہے۔ ان کی ...ے میں آپ دونوں کی خدمت میں ایک درخواست اور کرنا چاہتا ہوں۔ ...ے اب تک یہ ایک بڑی محرومی کا شکار رہے ہیں اور آپ دونوں اس محرومی ...ازالہ کر سکتے ہیں۔ نفیسہ کو اپنانے کے بعد ان کی یہ دلی تمنا ہے کہ آپ دونوں ...انھی کے ساتھ رہیں۔"

"یہ تو ان کی سعادت مندی ہے۔" خیرالدین نے کہا۔ "انشاء اللہ ہم

انھیں ان کے والدین کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیں گے۔ کیوں نفیسہ کی ماں؟"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔" نفیسہ کی ماں نے اپنے شوہر سے اتفاق کیا اور پھر ایک تجویز پیش کی۔ "جب ہمیں ایاز میاں کے ساتھ ہی رہنا ہے تو پھر اس مکان کی کیا ضرورت ہے! ہم یہ مکان اپنی خوشی سے ایاز میاں کے نام..."

"جی نہیں۔" ایاز پہلی مرتبہ بولا۔ "میری نظر میں یہ بھی ایک طرح کا جہیز ہے جسے قبول کرنے سے میں پہلے ہی انکار کر چکا ہوں۔"

اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے فوری طور پر اس کا اظہار کر دیا۔ "اگر آپ لوگ اس مکان کو کرائے پر اٹھا دیں تو کیا برا ہے! اس طرح آپ دونوں کو اپنے اخراجات اٹھانے کے لیے ایاز صاحب کا مرہون منت بھی نہیں ہونا پڑے گا۔ یہ میں اس لیے بھی عرض کر رہا ہوں کہ شادی کے بعد ایاز صاحب یہ نہیں چاہتے کہ آپ کی صاحبزادی بہ دستور نوکری کرتی رہے۔ ظاہر ہے کہ نفیسہ کے نوکری چھوڑنے پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"شادی کے بعد بیٹی پرائی ہو جاتی ہے۔ اسے وہی کرنا چاہیے جو اس کا شوہر کہے۔ اگر ایاز میاں اپنی بیوی سے نوکری نہیں کرانا چاہتے تو ہمیں اس پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے! یہ ان دونوں میاں بیوی کا معاملہ ہوگا جس میں ہماری مداخلت کسی طور پر مناسب نہیں۔" خیر الدین نے کہا اور پھر میری اس تجویز کو بھی سراہا کہ مکان کرائے پر اٹھا دیا جائے۔ اس طرح انھیں اپنے داماد کا محتاج نہ رہنا پڑتا اور ان کی عزت نفس بھی مجروح نہ ہوتی۔

"محترم! اب آپ نفیسہ کو بھی بلوا لیجیے تاکہ میں ایک ضروری رسم ادا کروں۔" میں نے خیر الدین کو مخاطب کیا، پھر اپنی جیب سے ڈبیا نکال لی۔

خیر الدین یقیناً سمجھ گیا کہ میرا ارادہ کیا ہے! اس نے اپنی بیوی کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ غالباً وہ دونوں بھی ایاز کے ہاتھ پر کچھ رکھ کے رشتہ پکا کرنا چاہتے تھے۔ ان دونوں کے جاتے ہی ایاز بول اٹھا۔ "شیخ صاحب! یہ کیسا ہے؟" اس کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔

"یہ انگوٹھی ہے جو میں آپ کا بزرگ ہونے کی حیثیت سے نفیسہ کو پہنانا چاہتا ہوں۔" میں نے یہ کہہ کر ڈبیا ایاز کو دے دی۔

"ایاز نے ڈبیا کھول کر ہیرے جڑی انگوٹھی دیکھی تو مزید حیران رہ گیا اور بولا۔ "لیکن یہ... یہ تو بہت قیمتی معلوم ہوتی ہے! آپ... آپ نے یہ زحمت..."

"اسے زحمت نہیں، اللہ کی رحمت کہتے ہیں۔" میں مسکرایا۔ "نفیسہ کا دوست ہونے کے ناتے کیا میں اسے آپ کی طرف سے یہ حقیر سا تحفہ بھی نہیں دے سکتا!"

"جو کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں شیخ صاحب، مجھے اس پر کسی خواب کا سا گمان ہو رہا ہے۔ اس خود غرض دنیا میں آپ جیسے لوگ بھی موجود ہیں، یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہو رہی ہے۔ نفیسہ نے آپ کے بارے میں مجھ سے جو کچھ کہا تھا، آپ اس سے کہیں زیادہ عظیم اور بلند ثابت ہوئے ہیں۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے ایاز کی آواز بھرا گئی۔

"ایاز صاحب! عظیم اور بلند ذات صرف خدائے بزرگ و برتر کی ذات ہے۔ میں تو اس کا صرف ایک عاجز بندہ ہوں۔"

"یہ بھی آپ کی بڑائی ہے شیخ صاحب کہ ایسا سمجھتے ہیں۔" ایاز نے یہ کہہ کر ڈبیا میری طرف بڑھا دی۔

ذرا ہی دیر میں خیر الدین اور اس کی بیوی، نفیسہ کو اپنے ساتھ لیے پہنچ گئے۔ نفیسہ کے چہرے پر حیاء کی سرخی دوڑ رہی تھی جس نے اس کے خداداد حسن میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ وہ شرمائی لجائی سی میرے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھی۔ میں نے ڈبیا کھول کر اس میں سے انگوٹھی نکالی اور نفیسہ کو مخاطب کیا۔ "ذرا اپنا سیدھا ہاتھ آگے بڑھاؤ!" نفیسہ نے نظر جھکائے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام کر میں نے ایک انگلی میں انگوٹھی پہنا دی اور خیر الدین کی طرف دیکھ کر کہا۔ "رشتہ مبارک ہو محترم!" خیر الدین حیرت سے اس قیمتی انگوٹھی کو دیکھ رہا تھا جو میں نے نفیسہ کو پہنائی تھی۔ یہی حال اس کی بیوی کا تھا۔

"آپ کو... بھی... شیخ صاحب، مبارک ہو۔" خیر الدین چونک کر بولا۔

"پھر رسم کے طور پر خیر الدین کی بیوی نے ایک رومال اور ایک سو ایک روپے ایاز کے ہاتھ پر رکھ دیے۔"

"محترم! میری گزارش ہے کہ یہ شادی جتنی جلد ہو جائے بہتر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں بھی شرکت کر سکوں۔ دراصل مجھے جلد از جلد چاٹگام واپس جانا ہے۔"

میری زبان سے یہ سنتے ہی نفیسہ تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اسے کمرے سے نکلنے میں دیر نہیں لگی۔

"اگر ایسا ہے تو پھر مجبوری ہے شیخ صاحب!" خیر الدین نے کہا' پھر معنی خیز نظریں اپنی بیوی کی طرف اٹھائیں۔ "میں سمجھتا ہوں کہ اگر شیخ صاحب شادی میں شریک نہ ہوئے تو ہماری خوشی ادھوری رہ جائے گی۔ ہمیں ان کی خواہش کا احترام کرنا پڑے گا اور شادی کی تاریخ بھی آج ہی..."

"میں آتی ہوں ابھی!" خیر الدّین کی بیوی اپنے شوہر کی بات کا مطلب سمجھ کر جلدی سے بول اٹھی۔ پھر وہ کمرے سے نکل گئی۔ پھر اسے واپسی میں زیادہ دیر نہ ہوئی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "تین دن بعد کوئی بھی تاریخ رکھ لیں۔"

چوتھے ہی دن اتوار تھا۔ اس زمانے میں بھی اتوار ہی کو چھٹی ہوتی تھی۔ اسی خیال سے میرے مشورے پر شادی کے لیے اتوار کا دن طے کر دیا گیا۔ پھر خیر الدین نے ہمارا منہ میٹھا کرائے بغیر نہ اٹھنے دیا۔ پڑوس کے ایک لڑکے کو بھیج کر اس نے مٹھائی منگوائی تھی۔

اس موقع پر میں نے ایک بات محسوس کی کہ خیر الدّین اور اس کی بیوی خوش ہونے کے ساتھ ساتھ کسی قدر فکر مند بھی ہیں۔ میں اس کی وجہ سمجھ گیا۔

"محترم! میں ایک بات کی اور وضاحت کر دینا چاہتا ہوں تاکہ آپ کے ذہن میں اگر کسی طرح کا اندیشہ ہے تو اسے جھٹک دیں۔" میں نے کہا۔ "یقیناً آپ کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ اَیاز صاحب اور نفیسہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ نفیسہ نے اسی سبب اپنے ماضی کے بارے میں اَیاز صاحب سے کچھ نہیں چھپایا۔ اَیاز صاحب اس کے باوجود نفیسہ کو اپنی شریک حیات بنانے پر راضی ہیں۔

ان کی نظر میں جو تلخ واقعہ پیش آیا' اس میں نفیسہ کا کوئی قصور نہیں۔ نفیسہ کو ی اسی لیے قطعی بے گناہ سمجھتے ہیں۔"

"شیخ صاحب! آپ نے یہ وضاحت کر کے میرے سینے کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اَیاز میاں کی یہ بڑائی ہے کہ... کہ وہ..." خیر الدین کی آواز شدت جذبات سے بھرا گی۔ اور وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اس کی بیوی کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر رہے تھے' خوشی کے آنسو!

"اچھا محترم' اب ہمیں اجازت دیجئے!" میں یہ کہتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

اَیاز نے بھی میری تقلید کی۔ خیر الدّین ہمیں دروازے تک چھوڑنے آیا۔ میں نے اَیاز کی طرف نظر اٹھائی تو یوں لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ یہی سوچ کر میں اسے اپنے ساتھ نشست گاہ میں لے آیا اور میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔

"جہاں تک میرے علم میں ہے شیخ صاحب' رشید کوئی شریف آدمی نہیں ہے۔ جب اسے اس رشتے کا پتا چلے گا تو وہ یقیناً" خاموش نہیں بیٹھے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ کمینگی پر نہ اتر آئے! آپ نے اسے سلسلے میں بھی کچھ سوچا ہے؟" اَیاز نے اپنا حال دل مجھ سے کہہ دیا۔

"رشید کو آپ سے زیادہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں' میں اسے کوئی غلط قدم نہیں اٹھانے دوں گا!" میں نے ایاز کو تسلی دی۔

"اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔" اَیاز نے اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔ "مجھے امید نہیں تھی شیخ صاحب کہ تمام معاملات اس خوش اسلوبی سے طے ہو جائیں گے۔ جب آج نفیسہ مجھ سے دفتر میں آکر ملی تھیں تو مجھے گمان بھی نہ تھا کہ میری منزل اتنی قریب آچکی ہے۔ نفیسہ تو دفتر سے چھٹی پر تھیں' آپ سے ملاقات کی خاطر میں نے بھی چھٹی لے لی۔ بہرحال میری اس کامیابی کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ اب آپ نے رشید کی طرف سے بھی مجھے مطمئن کر دیا ہے اس لیے کوئی خدشہ نہیں رہا۔"

"رشید کو جب اس رشتے کا علم ہو گا تو وہ سب سے پہلے آپ ہی کو نفیسہ کی طرف سے ورغلانے کی کوشش کرے گا۔ اس کے پاس ایک ہی ترپ کا پتا ہے کہ

وہ آپ کو نفیسہ کے ماضی سے آگاہ کر دے۔ ہم اس کا تدارک پہلے ہی کر چکے ہیں۔ میں نے اسی لیے نفیسہ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ آپ کو خود ہی سب کچھ بتا دے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں آپ رشید کی باتوں میں نہیں آئیں گے۔ ممکن ہے کہ آپ کی طرف سے مایوس ہو کر وہ کمینہ کوئی اور قدم اٹھائے، لیکن میں بے خبر نہیں رہوں گا۔ اس کی کوئی چال میں کارگر نہیں ہونے دوں گا۔"

میری دوبارہ یقین دہانی پر ایاز پوری طرح مطمئن ہو گیا۔ اگر ایاز مجھ سے اپنے خدشے کا اظہار نہ بھی کرتا تو میں، رشید کی طرف سے غافل نہ رہتا۔ رشید تو خود مجھ پر علاقے کے دو غنڈوں سے حملہ کرا چکا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ ناکام رہا۔ پھر بھلا میں اسے کس طرح نظر انداز کر دیتا!

یہ بھی اسی روز کا ذکر ہے کہ جب میں مغرب کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو نیچے دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں نے اوپر ہی کھڑکی میں سے دیکھ لیا کہ دستک کس نے دی ہے! وہ نفیسہ تھی۔ میں سمجھا کہ اس کے والدین کو شادی پر راضی کرنے کے لیے وہ میرا شکریہ ادا کرنے آئی ہو گی۔ نیچے جا کر میں نے جیسے ہی دروازہ کھولا، نفیسہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرا قیاس غلط ثابت ہوا میں یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ وہ انتہائی بدحواس اور گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"آؤ، اندر آ جاؤ نفیسہ!" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"ج... جی۔" وہ ہکلائی اور پھر اندر قدم رکھا۔

میرے ساتھ ہی وہ اوپر کمرے میں چلی آئی تو میں بولا۔ "بیٹھ جاؤ! اور یہ بتاؤ کہ تم اس قدر گھبرائی ہوئی..."

"وہ... وہ آیا تھا، رشید!" نفیسہ میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

"تو اس میں اتنے گھبرانے کی کیا بات ہے؟" میرا لہجہ تسلی دینے والا تھا۔ "خود کو سنبھالو اور سکون کے ساتھ بتاؤ کہ کیا ہوا ہے؟"

"ابا جی نے اسے حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا، اسی پر وہ سخت برہم ہو گیا اور کہنے لگا کہ کسی قیمت پر ایاز سے میری شادی نہیں ہونے دے گا۔" نفیسہ بتانے

لگی۔ "وہ کہہ رہا تھا کہ مجھ پر صرف اس کا حق ہے۔ اس نے جب یہ دھمکی دی کہ وہ ایاز کو میرے داغدار ماضی کے متعلق سب کچھ بتا دے گا تو ابا جی کو بھی غصہ آ گیا۔ انہوں نے جواب میں رشید کو بتا دی کہ ایاز کو میرے تلخ ماضی کا علم ہے، اس کے باوجود وہ مجھے اپنانے پر آمادہ ہے۔ اس پر رشید کہنے لگا کہ میرے پاس دوسرے بھی راستے ہیں۔ میں اس وقت اندر کمرے میں تھی۔ بس اچانک ہی وہ کمرے میں آ گیا اور مجھ سے بولا، میں تمہیں اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ تم رشید کے سوا کسی اور کی ہو سکو۔ میں تمہارے حسین چہرے پر تیزاب پھینک دوں گا۔ رشید کے یہ الفاظ کمرے کے باہر موجود ابا جی نے بھی سن لیے اور وہ برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے رشید کو گھر سے نکل جانے کے لیے کہا۔ رشید اپنے آپے میں نہیں تھا۔ اس نے ابا جی کے ساتھ بھی بدتمیزی کی اور یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ ابا جی کو بھی دیکھ لے گا۔ میں ابا جی امی کو بتا چکی تھی کہ مجھے کل ملازمت سے استعفیٰ دینے دفتر جانا ہے۔ ابا جی اور امی، دونوں ہی اب مجھے دفتر جانے بلکہ گھر سے نکلنے تک کو منع کر رہے ہیں۔ آپ کے پاس بھی انہوں نے مجھے بڑی مشکل سے آنے دیا ہے۔"

"ہوں! تو یہ بات ہے جس کی وجہ سے تم اور تمہارے والدین گھبرا گئے ہیں!" میں پوری بات سن کر بولا۔

"اب آپ ہی بتائیے شیخ صاحب، کیا کیا جائے؟ فرض کریں شادی ہونے تک میں گھر میں قید بھی ہو جاؤں تو رشید کا خطرہ تو ہمیشہ سر پر منڈلاتا رہے گا۔ وہ کسی بھی وقت مجھ سے انتقام لے سکتا ہے۔ وہ کمینہ تو آپ پر حملہ کرا چکا ہے۔" نفیسہ نے مجھ سے مشورہ طلب کیا۔

"نفیسہ! کل تم دفتر ضرور جاؤ گی!" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تمہارے ساتھ میں چلوں گا، مگر اس سے پہلے... ٹھہرو میں تمہارے گھر چلتا ہوں، یہ بات وہیں کرنے کی ہے تاکہ تم کل میرے ساتھ اپنے دفتر جا سکو۔ آؤ چلو!"

پھر نفیسہ کو ساتھ لے میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ نفیسہ ہی کی طرح اس کے والدین بھی بے حد فکرمند تھے۔ میں نے ان کی ڈھارس بندھائی۔

"یقین کیجیے، رشید آپ لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ضرورت بس اس بتا

کی ہے کہ آپ ہمت سے کام لیں۔ اس کمینے کی دھمکی میں آنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے یہ کہہ کر وہ ساری بات خیر الدین کو بتا دی جو میرے ذہن میں تھی۔

پولیس کے ذکر پر وہ بوڑھا اور گھبرا گیا' مگر اسے میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی بات ماننے پر آمادہ کر ہی لیا۔ اسی وقت خیر الدین اور نفیسہ کو ساتھ لے کر میں علاقے کے تھانے کی طرف چل دیا۔ میں نے اس دوران میں ایک موقع سے فائدہ اٹھا کر ہمزاد کو بھی بلا لیا اور اسے ضروری ہدایات دے دیں۔ اس کے لیے میں نے اپنے گھر سے کپڑے بدل کر آنے کا بہانہ کیا تھا۔ ہمزاد کو طلب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ پولیس کے معاملے میں مجھے خاصے تلخ تجربات ہو چکے تھے۔

یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ تھانے میں اس وقت ایس ایچ او موجود تھا۔ میں سیدھا اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"ارے ارے! کون ہو تم جو اس طرح منہ اٹھائے میرے کمرے میں گھسے آ رہے ہو!" ایس ایچ او نے مجھے پولیس والوں کے روایتی لہجے میں ڈانٹ پلائی۔ "اردلی کہاں مر گیا؟ اس نے تمھیں اندر کیسے گھسنے دیا؟"

"میرا نام شیخ کرامت ہے۔" میں نے یہ کہتے ہی ہمزاد کو اشارہ کر دیا۔ میرے ساتھ ہی نفیسہ اور خیر الدین بھی تھے۔

اشارہ ملتے ہی میرے ہمزاد نے ایس ایچ او کو اپنے اثر میں لے لیا۔ دوسرے ہی لمحے ایس ایچ او کا رویہ بدل گیا۔ اس نے مجھے یوں مخاطب کیا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ "معاف کیجیے گا شیخ صاحب' میں آپ کو پہچان نہیں سکا تھا۔ آپ تشریف رکھیے! ہم یہاں آپ ہی جیسے معزز حضرات کی خدمت کے لیے تو بیٹھے ہیں۔"

میز کے سامنے جو کرسیاں پڑی تھیں' ان پر میں نے اپنے ساتھ خیر الدین اور نفیسہ کو بھی بٹھا لیا۔ ایس ایچ او کے بدلے ہوئے رویے پر وہ دونوں ہی حیران نظر آ رہے تھے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ میرے ہمزاد کا کمال ہے۔ پھر میں نے تھانے میں اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا۔

"آپ کو اس سلسلے میں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں شیخ صاحب! میں ابھی تمام بندوبست کیے دیتا ہوں۔ منشی کو میں یہیں اپنے کمرے میں بلوائے لیتا ہوں' آپ رپورٹ لکھوا دیں۔ اس پر میں ابھی ایکشن لیتا ہوں اور اس شخص رشید کو اٹھواتا ہوں جس نے دھمکی..."

"نہیں جناب!" میں نے انکار کر دیا۔ "میرا مقصد یہ ہے کہ اسے کل صبح رنگے ہاتھوں گرفتار کیا جائے۔"

"جو آپ کا حکم شیخ صاحب!" ایس ایچ او نے فرماں برداری کا اظہار کیا۔

پھر خیر الدین کی طرف سے رشید کے خلاف رپورٹ درج کرا دی گئی۔ اسی کے ساتھ ایس ایچ او نے ایک سب انسپکٹر' ایک اے ایس آئی اور دو سپاہیوں کو طلب کر لیا۔ اس نے ان چاروں کو حکم دیا کہ وہ کل صبح سادہ لباس میں خیر الدین کے گھر کی نگرانی کریں۔ جب نفیسہ میرے ساتھ اپنے دفتر جانے کے لیے نکلے تو وہ خاموشی سے ہمارا تعاقب جاری رکھیں۔ رشید کی نشان دہی مجھے یا نفیسہ کو کرنی تھی۔ ہمارے اشارے پر سادہ لباس پولیس والے اسے گرفتار کر لیتے۔

"یہ خیال رکھنا کہ بی بی جی یا شیخ صاحب کو وہ غنڈا کوئی نقصان نہ پہنچا سکے!" ایس ایچ او نے اپنے ماتحتوں کو تاکید کی۔ "مجرم کو ہر حال میں پکڑنا ہے!"

"آپ کے حکم کی تعمیل ہو گی سر!" سب انسپکٹر نے اپنے افسر کو یقین دہانی کرائی۔

"اچھا اب اجازت دیں جناب!" میں اٹھتے ہوئے بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے شیخ صاحب! آپ جیسی محترم ہستیاں روز روز کب تشریف لاتی ہیں! اس خادم کو کچھ خدمت کا موقع تو دیں۔ چائے پیے بغیر..."

"نہیں' اس زحمت کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا' پھر نفیسہ اور خیر الدین کو ساتھ لیے ایس ایچ او کے کمرے سے نکل آیا۔ ہمزاد کو میں نے رخصت ہونے کا اشارہ کر دیا۔ واپسی میں خیر الدین مجھ سے کہنے لگا۔ "شیخ صاحب! مجھے خبر نہیں تھی کہ پولیس والے بھی آپ کی اتنی عزت کرتے ہیں۔ اگر پہلے یہ بات پتا ہوتی تو میں تھانے جانے سے منع نہ کرتا۔"

"سب اللہ کی مہربانی اور اس کا کرم ہے محترم! وہ جسے چاہے عزت دے' جسے چاہے ذلت دے۔" میں نے کہا۔ اب ہم تھانے کی حدود سے نکل آئے تھے۔

"پہلے تو ایس ایچ او پہچانا ہی نہیں تھا آپ کو۔" کھانے کا وقت ہو رہا ہے شیخ صاحب! آج ہمارے ہی ساتھ کھانا کھا لیجیے۔"

"میں نے اس بوڑھے کی پر خلوص پیشکش قبول کر لی۔ اپنے پن کے اظہار کی غرض سے وہ مجھے گھر کی اوپری منزل پر لے آیا۔ نفیسہ کی ماں فکر مند تھی۔ ایک وہی کیا ہر غریب اور شریف آدمی' پولیس سے ڈرتا ہے۔ خیرالدین نے اسے بتا دیا کہ تھانے میں میری موجودگی کی وجہ سے کتنی پذیرائی ہوئی! پھر اس کے چہرے سے بھی اطمینان جھلکنے لگا۔

"نفیسہ کی ماں! اس خوشی میں اب تم گرم گرم روٹیاں ڈالتی جاؤ اور ہم کھاتے جائیں۔ شیخ صاحب آج ہمارے ہی گھر کھانا کھائیں گے۔" خیرالدین چہکا۔

"تم اگر پہلے سے بتا دیتے تو میں گوشت پکا لیتی۔ پہلی بار تو شیخ صاحب ہمارے یہاں کھانا کھا رہے ہیں' دال روٹی کیا اچھی لگے گی!" وہ اپنے شوہر سے بولی۔

"محبت سے اگر دال روٹی بھی کھلائی جائے تو مرغ مسلم سے کم نہیں۔" میں نے کہا۔

اس عرصے میں نفیسہ نے باورچی خانے کے باہر چٹائی بچھا دی۔ میں اور خیرالدین ہاتھ دھو کر چٹائی پر بیٹھ گئے۔ نفیسہ کی ماں روٹیاں ڈالنے باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہیں سے اس نے گویا ہانک لگائی۔ "نفیسہ بیٹی! تم بھی جگ میں پانی رکھ کر اپنے ابا جی کے ساتھ ہی کھانا کھا لو۔"

ماش کی دال مجھے یوں بھی پسند تھی' پھر گرم گرم روٹیوں پر گھی بھی لگا ہوا تھا۔ کھانے میں لطف آ گیا۔ میں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

چلتے وقت نفیسہ نے مجھ سے پوچھا کہ کل صبح اسے کس وقت میرے ساتھ اپنے دفتر چلنا ہے؟ اس کا دفتر جناح ایونیو میں تھا۔

میں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "جلدی کی کوئی ضرورت نہیں'

آرام سے دس گیارہ بجے تک چلیں گے۔ میں خود آ جاؤں گا یہیں' تیار ہو کر۔"

نفیسہ نے اقرار میں سر ہلا دیا اور میں اس کے گھر سے چلا آیا۔ دانستہ میں نے نفیسہ کو اپنے ساتھ لے جانے میں جلدی نہیں کی تھی۔ اس کا سبب آج رات ہی پیش آنے والا واقعہ تھا۔ نصف شب کے بعد مجھے ہمزاد کے ساتھ بنگالی ہندو ساحر شیو نندن سے نمٹنا تھا۔ وہ ثمینہ کے شوہر شوکت کو موت کے گھاٹ اتارنے کی غرض سے شیطانی عمل شروع کر دیتا۔ اسے ہر قیمت پر اس عمل سے روکنا تھا۔

ہندو ساحر سے معرکہ آرائی میں کتنا وقت لگ جاتا' ابھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس کے بعد مجھے سونا بھی تھا۔ ظاہر ہے' صبح جلد میری آنکھ نہ کھلتی۔ یہی سوچ کر میں نے نفیسہ کو گیارہ بجے تک کا وقت دیا تھا۔ ساحر شیو نندن سے نمٹنے کے لیے ہمزاد نے مجھے جو ہدایات دی تھیں' میں بھولا نہیں تھا۔

ثمینہ اور نفیسہ کے معاملے میں پوری طرح الجھ کر وقتی طور پر میں اپنے پراسرار طاقتور دشمنوں کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ گرو گوبند اپنے ایک خاص چیلے کی موت کے بعد فوری طور پر پھر حملہ آور ہو گا۔ میں اسی لیے مطمئن تھا۔ مجھے اب کہیں آنا جانا تو تھا نہیں' سو بستر پر آرام کرنے لیٹ گیا۔

ابھی مجھے لیٹے چند لمحے گزرے ہوں گے کہ بستر میں سرسراہٹ سی محسوس کر کے میں چونک اٹھا۔ میرے اعصاب کسی خطرے کے احساس سے تن گئے۔ معاً" مجھے یوں لگا کہ میرے سینے پر کوئی شے رینگ رہی ہے۔ پھر میں نے سانپ کی پھنکار سنی۔ جیسے ہی میری نظر اپنے سینے پر پڑی' بے اختیار میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ایک کالا ناگ میرے سینے پر کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ مجھے وہ منظر یاد آ گیا کہ جب شمبھو اسی طرح سانپ کی جون اپنا کر سریتا کے سینے پر چڑھا ہوا اس کے رخساروں اور ہونٹوں کو ڈس رہا تھا۔ شمبھو نے اس طرح سریتا کو شدید اذیت پہنچائی تھی۔ سریتا کا چہرہ زہر کے اثر سے نیلا پڑ گیا تھا۔ یقیناً" شمبھو آج وہی موت کا اذیت ناک کھیل میرے ساتھ بھی کھیل رہا تھا۔ وہ سانپ کے جسم میں پھن کاڑھے بار بار جھومتے ہوئے اس طرح جھکتا جیسے اب مجھے ڈسنے والا ہے۔

وہ لمحات میرے لیے اس قدر ہول ناک تھے کہ وقتی طور پر میری قوت گویائی سلب ہو گئی۔ میری نظریں سانپ کے پھن پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے ڈسنے سے قبل شمبھو مجھ کو انتہائی وحشت میں مبتلا کر کے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ معاً اس نے پھر پھنکار ماری اور میرے جسم میں خوف کی شدید لہر دوڑ گئی۔

"ہم... ہمزاد!" میں بے ساختہ چیخ اٹھا۔

یہی وہ لمحہ تھا کہ جب سانپ کا پھن تیزی سے مجھے ڈس لینے کو جھکا تھا۔ اسی لمحے کے شاید ہزارویں حصے میں مجھے ہمزاد نظر آیا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سانپ کی گردن پکڑ کر اسے اٹھالیا اور کمرے کی دیوار پر دے مارا۔

ایک انسانی چیخ میری سماعت سے ٹکرائی۔ پھر میری آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ مجھے شمبھو انسانی جسم میں الٹتا نظر آیا۔ اس کا بھیانک چہرہ مزید بھیانک دکھائی دیا۔ اس کا سبب شمبھو کے سر سے بہنے والا خون تھا جو اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ ہمزاد اس پر حملہ کرتا' شمبھو کے گرد چمکیلا دودھیا حصار قائم ہو گیا۔ اسی حصار میں جیسے شمبھو کا جسم غائب ہونے لگا۔ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں وہ کوئی شیطانی عمل پڑھنے میں مصروف تھا۔ چند ہی لمحے بعد چمکیلا غبار گویا رقص کرتا ہوا فضا میں اٹھا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

پیش آنے والے پراسرار ہول ناک واقعے کا اثر اب تک میرے ذہن پر تھا۔ مجھے اعتراف تھا کہ اسی سبب میرے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

ہمزاد نے قریب آ کر مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ میرے لیے یہ بڑا عجیب سا تجربہ تھا۔ میں جیسے خود اپنی آغوش میں تھا۔ اس سے یہ ہوا کہ فوری طور پر میری حالت سنبھل گئی۔ ہمزاد الگ ہٹ گیا۔ اب میری قوت گویائی بحال ہو چکی تھی۔

"کیا تم میری طرف سے غافل ہو گئے تھے۔؟" میں نے ہمزاد سے دریافت کیا۔

"نہیں۔" ہمزاد نے جواب دیا۔ "مجھے بروقت پتا چل گیا تھا کہ شمبھو

سانپ کی جون اپنا کر آپ تک پہنچ چکا ہے اور..."

"پھر تم نے دیر کیوں لگا دی؟" میں بول اٹھا۔

"میں اس کی واپسی کا راستہ مسدود کر رہا تھا۔ مجھے علم تھا کہ اگر آپ نے خطرہ محسوس کیا تو مجھ کو طلب کر لیں گے۔ میں چاہتا تھا کہ گرو گوبند کے خاص چیلے کی طرح شمبھو کو بھی گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دوں۔ ابھی میں اس مکان کے گرد پورا حصار نہیں کھینچ سکا تھا کہ آپ نے مجھے طلب کر لیا۔ شمبھو اس لیے فرار ہو گیا۔"

"اگر تمہیں طلب کرنے میں مجھ سے ایک لمحے کی بھی مزید تاخیر ہو جاتی تو شاید شمبھو مجھے ڈس لیتا۔ پھر میرا بھی وہی حشر ہوتا جو سریتا کا ہوا۔"

"مجھے اندازہ ہے اور... اور اب اپنی غلطی کا بھی احساس ہو رہا ہے۔ مجھے پہلے آپ کو بچانے کی فکر کرنی چاہیے تھی۔" ہمزاد نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

"تم تحفظ کی خاطر اس مکان کے گرد حصار کیوں نہیں کھینچ دیتے!"

"میں نے اس لیے ایسا نہیں کیا تھا کہ یہاں آپ کے علاوہ دوسرے لوگ بھی آتے جاتے ہیں' لیکن اب حصار کھینچنا ہی پڑے گا۔ اس کے علاوہ خود مجھے بھی آپ کی حفاظت کے لیے یہیں رہنا پڑے گا کیوں کہ دشمن دوبارہ بھی حملہ کر سکتا ہے۔"

"اے شیخ کرامت کے ہمزاد! تو نے ٹھیک کہا۔" معاً ایک جانی پہچانی آواز سے کمرا گونج اٹھا۔ یہ آواز گرو گوبند کی تھی۔ "تو نے میرے خاص چیلے کیلاش کو مار ڈالا اور اب شمبھو کی بھی دوبارہ زخمی کر دیا۔ سو اب تو میرے انتقام سے نہیں بچ سکے گا اور نہ شیخ کرامت کی زندگی کو بچا پائے گا۔ بس کچھ دن کی بات ہے۔ پھر نہ تیرا کھینچا ہوا حصار مجھے روک سکے گا' نہ تیری کوئی قوت کام آئے گی۔ آج ہی رات میں 'کالی مائی کا چالیسا شروع کر رہا ہوں۔"

میں نے دانستہ خوفزدہ آواز میں گرو گوبند سے پوچھا۔ "تو... تو اس کا مطلب یہ ہوا گرو جی کہ... کہ اب ہم... ہماری موت میں صرف چالیس دن باقی ہیں؟"

"ڈر گیا شیخ کرامت!" گرو گوبند کی ہنسی سنائی دی' پھر اس نے بتایا۔ "ہاں تیری اور تیرے ہمزاد کی موت میں اتنے ہی دن ہیں۔ اپنی شکتی (طاقت) سے مجھے اب یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ تیرا ہمزاد صرف تیرے ہی کام آ سکتا ہے۔ سو اب میں اس دھوکے میں بھی نہیں رہا۔ میں تجھے مار دوں گا تو تیرے ہی ساتھ تیرا ہمزاد بھی مر جائے گا۔ تو اب نہ تو جی سکے گا' نہ تیرا ہمزاد! شیخ کرامت! تو بہت دن جی لیا اور اب تیرا کھیل ختم ہونے والا ہے۔ میری شکتی دیکھ کہ تجھ سے سینکڑوں میل دور ہونے کے باوجود تجھے میری آواز سنائی دے رہی ہے۔ جی لے اور چالیس دن تک جی لے! پھر تو تیری موت یقینی ہے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی گرو گوبند کی آواز آنا بند ہو گئی۔

"اگر اس وقت حصار کھنچا ہوتا تو گرو گوبند کی آواز سنائی نہ دیتی۔" ہمزاد نے بتایا۔

"اور یہ اچھا ہی ہوا۔ اس طرح ہمیں گرو گوبند کے آئندہ عزائم کا پتا چل گیا۔" میں بولا۔ "اس نے آج رات سے چالیس دن کا شیطانی عمل شروع کیا ہے اور میں اس سے پہلے ہی اپنا وظیفہ پورا کر چکا ہوں گا۔"

"آپ نے بڑی چالاکی سے اس کے شیطانی عمل کی مدت معلوم کر لی۔ اب ہمیں صرف شمبھو کی طرف سے خطرہ ہے جس کا تدارک ممکن ہے۔" ہمزاد نے کہا اور پھر مجھ سے اجازت لے کر حصار کھینچنے کے لیے چلا گیا۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ اب ہمزاد کو طلب کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ خود بتا چکا تھا کہ اب میرے ہی پاس رہے گا۔

ہمزاد نے جو حصار کھینچا تھا' اس سے مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ وہ حصار دوسروں کے لیے تھا۔ اسی رات مجھے اس کا عملی تجربہ بھی ہو گیا۔

نصف شب سے پہلے ہی ہمزاد مجھے اس مکان سے نکال کر لے گیا۔ حصار اس نے قائم رہنے دیا تھا۔ میں اپنے ہوش نہ کھو بیٹھوں' ہمزاد اسی وجہ سے مجھے اٹھائے دھیمی رفتار میں محو پرواز تھا۔ صدر گھاٹ کی آبادی سے آگے ہمزاد نے مجھے بوڑھی گنگا کے کنارے ایک جگہ زمین پر اتار دیا۔

اس جگہ دور دور تک سناٹے کی حکمرانی تھی۔ دور تک پھیلی ہوئی چاندنی بھی عجیب سی لگ رہی تھی۔ اسی چاندنی میں خاصے فاصلے پر مجھے کسی جٹا دھاری سادھو کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ دریا کے کنارے پیر پر پیر چڑھائے آسن مارے کسی مجسمے کی طرح بیٹھا تھا۔ اس کے جسم میں ذرا سی بھی حرکت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں اس کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ ہمزاد نے مجھے یہی ہدایت دی تھی۔

"اب میں جا رہا ہوں۔" ہمزاد نے مجھے مخاطب کیا۔ "یہ رکھ لیجیے!"

میں نے ہمزاد سے مٹھی بھر کنکریاں لے لیں۔ ہمزاد غائب ہو گیا اور میں بہ دستور آگے بڑھتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ نظر آنے والا وہ ہیولا ہندو ساحر شیونندن ہی کا ہو سکتا ہے۔ شیونندن سے سات قدم کے فاصلے پر مجھے رک جانا تھا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اب وہ ساحر مجھے واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ شاید وہ اپنا شیطانی عمل شروع کر چکا تھا۔ اس کا جسم اکڑا ہوا سا اور آنکھیں بند تھیں' شانوں پر لمبے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے' جسم پر ڈھیلا ڈھالا گیروا لباس تھا۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ سامنے ہی تھوڑے فاصلے پر ایک انسانی کھوپڑی رکھی تھی۔

اپنے ہمزاد کی ہدایت کے مطابق میں نے "یا قہار" پڑھ کر ایک کنکری پر دم کیا۔ بقیہ کنکریاں میرے بائیں ہاتھ میں تھیں۔ مجھے اب اس کھوپڑی کا نشانہ لینا تھا۔ شرط یہ تھی کہ نشانہ خطا نہ ہو۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا اس لیے مجھے اپنی کامیابی کی امید تھی۔ کھوپڑی کا نشانہ لے کر میں نے پہلی کنکری ماری۔ میرا خیال تھا کہ اس انسانی کھوپڑی پر کنکری لگنے سے ہلکی سی آواز ہو گی' مگر ایسا نہیں ہوا۔ کنکری جیسے ہی کھوپڑی سے ٹکرائی زبردست دھماکا ہوا جس کی وجہ سے خود میں بھی اچھل پڑا۔ اسی کے ساتھ ساحر شیونندن نے بھی آنکھیں کھول دیں' مگر ہونٹ پھر بھی حرکت کرتے رہے۔ اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں میری طرف اٹھائیں۔ معلوم نہیں ان آنکھوں میں کیا سحر تھا کہ میرا جسم میں خوف کی لہر سی

دوڑ گئی۔ میں نے فوراً اس کی طرف سے نگاہ پھیر لی۔

تھوڑے توقف سے مجھے پھر کھوپڑی کو نشانہ بنانا تھا۔ میں نے دوبارہ ایک کنکری پر دم کیا اور ہر خطرے اور خوف کو ذہن سے جھٹک کر کھوپڑی پر کنکری کھینچ ماری۔ اس مرتبہ بھی میرا نشانہ خطا نہیں ہوا۔ فضا میں دوسرا دھماکا سنائی دیا، مگر اب کے میں نہیں اچھلا کیوں کہ مجھے پہلے ہی سے دھماکے کی توقع تھی۔

وقفے وقفے سے میں کنکریوں پر دم کر کے کھوپڑی کو نشانہ بناتا رہا۔ میں نے اس عرصے میں ہندو ساحر کی طرف دیکھنے سے دانستہ گریز کیا تھا۔ میں کنکریاں گن بھی رہا تھا۔ مجھے ہمزاد بتا چکا تھا کہ ساتویں کنکری مارتے ہی کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آسکتا ہے، لیکن اس سے میں نہ ڈروں۔ جو بھی پراسرار واقعہ رونما ہوتا، اس سے مجھے کوئی نقصان نہ ہوتا۔ میں نے ہمزاد سے پوچھا بھی تھا کہ اس پراسرار واقعے کی نوعیت کیا ہو گی؟ ہمزاد اس سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ ہمزاد کے لیے بھی اس نوع کا یہ پہلا یہ واقعہ تھا۔

ساتویں کنکری مارتے ہیں کھوپڑی کو میں نے دھماکا ہونے کے بعد بلند ہوتے دیکھا۔ کھوپڑی میں آنکھوں کی جگہ جو گڑھے تھے، ان سے شعلے سے لپکے۔ پھر وہ کھوپڑی، ساحر کی طرف فضا میں تیرتی ہوئی آگے بڑھی اور اس کے گرد چکرانے لگی۔ میں حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ساحر کے چہرے پر شدید خوف کے آثار دکھائی دیے۔

اچانک کھوپڑی سے نکلتے ہوئے شعلوں کی زبانیں لمبی ہو گئیں اور ہندو ساحر ان شعلوں کی لپیٹ میں آگیا۔ اس کے لباس میں آگ لگ گئی۔ وہ شعلوں میں گھرا ہوا تھا، پھر بھی نہ وہ اپنی جگہ سے اٹھا، نہ شیطانی عمل پڑھنا ترک کیا، مگر کب! آخر اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں اور وہ اٹھ کر دریا کی جانب دوڑا۔ کھوپڑی نے گویا اس کا راستہ روک لیا۔ وہ کھوپڑی سے نکلتے ہوئے شعلوں کی زد سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا، لیکن ناکام رہا۔ اس کوشش میں وہ

اوندھے منہ زمین پر گرا۔ اب اس کے بڑے بڑے بالوں اور داڑھی میں بھی آگ لگ چکی تھی۔ وہ زمین پر لوٹتے ہوئے چیخنے لگا۔ کھوپڑی اب بھی اس کے اوپر گردش کر رہی تھی اور شعلے اس کے جسم کو چاٹ رہے تھے۔ مجھے گوشت جلنے کی واضح بو محسوس ہوئی۔ آخر ساحر کی چیخیں دم توڑ گئیں۔ اس کا جلتا ہوا جسم ساکت ہو گیا۔ اب بھی اس کا جسم کسی سوکھی لکڑی کی طرح جل رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجھے ساحر کے جسم کی جگہ راکھ کا ڈھیر نظر آیا۔ پھر کھوپڑی فضا میں تیرتی ہوئی دریا میں جا گری۔

معاً میں نے اپنے قریب ہمزاد کو دیکھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کھیل ختم ہو گیا، اب چلیے! مبارک ہو کہ آپ کامیاب رہے اور مجھے کچھ بھی نہیں کرنا پڑا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مجھے حصار میں داخل ہونے اور اس پر حملہ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ صرف آپ ہی کے عمل نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔" ہمزاد نے وضاحت کی۔ "مجھے خود بھی پہلے سے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ ممکن ہے، وہ اپنا شیطانی عمل پڑھنا جاری رکھتا تو شاید زندہ بچ جاتا، لیکن شدید تکلیف و اذیت کے سبب وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس کا عمل خود اسی کے لیے موت کا باعث بن گیا۔ جب آپ نے کھوپڑی پر ساتویں کنکری ماری تو چند لمحوں کو اس کی توجہ بٹ گئی۔ وہ عمل پڑھتے پڑھتے رک گیا۔ یہی چند لمحے اس کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے۔ کھوپڑی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے دوبارہ عمل شروع کیا، لیکن اب تیر، کمان سے نکل چکا تھا۔ شعلوں نے اسے گھیر لیا جو خود اسی کے شیطانی عمل کا نتیجہ تھے۔ پھر جو کچھ ہوا آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی لیا۔ ایسے میں مجھے مزید مداخلت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔"

"ایسا تھا تو پھر تمہیں واقعی حصار میں داخل ہو کر کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔" میں نے بھی اس کے خیال سے اتفاق کیا۔

پھر ہمزاد مجھے وہاں سے محمد پور لے آیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہمزاد کی مدد کے بغیر میں نے کوئی کارنامہ انجام دیا تھا۔ مجھے اس پر خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

ہندو ساحر شیو نندن سے نمٹنے اور اسے اس کے انجام تک پہنچانے میں بہ مشکل ایک گھنٹا لگا ہو گا۔ اس وقت رات کا ایک بجا تھا جب میں سونے کے لیے اپنے بستر پر دراز ہوا۔ احتیاطاً میں نے یہ ذمے داری ہمزاد پر ڈال دی کہ وہ صبح ساڑھے نو بجے مجھے جگا دے۔

اس رات کو میں اتنا بے خبر سویا کہ دوسرے دن ہمزاد کے جگانے ہی پر اٹھا۔ نہا دھو کر میں نے کپڑے بدلے اور فجر کی قضا نماز پڑھی۔ میرے حکم پر ہمزاد ناشتہ لے آیا۔ گھر سے نکلتے وقت ہمزاد کو طلب کر کے میں نے ساتھ رہنے کی تاکید کر دی۔

"پولیس والوں سے بھول چوک ہو سکتی ہے اس لیے تم ساتھ رہو۔" میں نے ہمزاد سے کہا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ رشید مجھے یا نفیسہ کو کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائے!"

"بہتر ہے۔" ہمزاد بولا اور پھر میرے ساتھ ساتھ ہی گھر سے نکلا۔

میں جب نفیسہ کے گھر پہنچا تو وہ مجھے تیار ملی۔ میں اسے ساتھ لے گھر سے نکل کر گلی میں آ گیا۔ اسی عرصے میں مجھے اردگرد وہ سادہ لباس پولیس والے نظر آ گئے جنہیں میں گزشتہ روز دیکھ چکا تھا۔ ان میں سے دو ہمارے آگے اور دو پیچھے چل رہے تھے۔ بہ ظاہر یہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ عام راہ گیر ہیں۔

گلی عبور کر کے ہم چھوٹی سی ایک سڑک پر آ گئے۔ اسی سڑک سے گزر کر ہمیں مین روڈ تک پہنچنا تھا جہاں سے کوئی خالی ٹیکسی مل سکتی تھی۔ سڑک کی دونوں جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درخت لگے ہوئے تھے۔ میں نے محسوس کر لیا کہ نفیسہ کچھ گھبرائی ہوئی ہے۔

اس سے پہلے کہ میں نفیسہ کو دلاسا دیتا' ہمزاد کی سرگوشی سنائی دی۔

"رشید یہیں ایک درخت کی آڑ میں چھپا ہوا ہے' دائیں جانب چوتھے پیڑ کی آڑ ں! اس کے ہاتھ میں تیزاب کی بوتل ہے۔ اس کے علاوہ رشید کی جیب میں یک ریوالور بھی ہے۔"

بے اختیار میری زبان پر یہ سوال آ گیا۔ "رشید کو کس طرح معلوم ہو گیا کہ نفیسہ میرے ساتھ آج اپنے دفتر جانے والی ہے؟" اس وقت میں یہ ول ہی گیا کہ نفیسہ میرے ساتھ ہے' مگر مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو یا اور میں نے یہی سوال نفیسہ سے کر دیا۔

نفیسہ چونک کر بولی۔ "مجھے... مجھے کیا معلوم! مگر... مگر آپ کو کیسے چلا کہ..." پھر مزید نفیسہ نے کیا کہا' میں نہیں سن سکا۔ میں نے ہمزاد کی رف متوجہ تھا۔

"رشید کو رنگے ہاتھوں پکڑوانے کے لیے میں نے اسے یہ اطلاع دی ی۔" ہمزاد کی جوابی سرگوشی ابھری۔ "اس وقت آپ سو رہے تھے۔ میں نے ں کے ذہن میں یہ بات ڈالی تھی۔ رشید اسے اپنی ہی سوچ کا نتیجہ سمجھا ہو ۔"

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا شیخ صاحب! نفیسہ نے آگے ہتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔"

"یہ میرا محض اندازہ ہے کہ رشید کو میرے ساتھ تمہارے گھر سے نے کی خبر ہو گئی ہے۔" میں نے بات بنا دی۔

"پھر... پھر تو وہ یہیں کہیں آس پاس موجود ہو گا۔" نفیسہ گھبرا گئی۔ "ب کیا ہو گا شیخ صاحب؟ یہ تو بہت برا ہوا۔"

"تم یہ کیوں بھول گئیں نفیسہ کہ پولیس ہماری نگرانی کر رہی ہے!" ں نے اسے دلاسا دیا۔ "وہ اسی طرح تو پکڑا جائے گا۔"

"لیکن وہ پکڑے جانے سے پہلے اگر... اگر میرے... میرے اوپر اب پھینکنے میں کامیاب ہو گیا تو؟" نفیسہ یہ کہتے ہوئے مزید بدحواس ہو

گئی۔

"فکر نہ کرو، میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔ ایسا نہیں ہوگا۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

ہمزاد نے جس درخت کی نشان دہی کی تھی، وہ اب زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے اسے اردگرد نظر دوڑائی۔ مجھے معلوم تھا کہ پولیس والے خطرناک مواقع پر اپنے ماتحتوں کو آگے رکھتے ہیں۔ ایسا ہی اس وقت تھا۔ دونوں سپاہی سادہ لباس میں ہمارے آگے آگے چل رہے تھے۔ سب انسپکٹر، اے ایس آئی کے ساتھ ہمارے پیچھے آرہا تھا۔ میں نے نفیسہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے رکنے کا اشارہ کیا اور پھر پلٹ کر سب انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ سر کا اشارہ ملتے ہی وہ لپک کر قریب آگیا۔

"جی جناب! کیا مجرم کہیں نظر آگیا؟" سب انسپکٹر نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "ابھی ایک پیڑ کی آڑ سے اس نے جھانک کر دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے ایک بوتل بھی نظر آئی تھی جس میں یقیناً" تیزاب ہوگا۔" میں نے یہ کہہ کر اس درخت کی نشان دہی کر دی جس کی آڑ میں رشید چھپا ہوا تھا۔

"پھر آپ دونوں یہیں رک جائیں۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

"آپ دونوں کا اب مزید آگے جانا خطرے سے خالی نہیں۔" سب انسپکٹر نے یہ کہتے ہی اپنی قمیص کا لمبا دامن اٹھا کر ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا، پھر اے ایس آئی کو ساتھ لیے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

میں اور نفیسہ دور کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھنے لگے۔

"شیخ صاحب! معاً" نفیسہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "آپ نے رشید کو کب دیکھ لیا؟ مجھے تو وہ نظر نہیں آیا۔"

"بس مجھے لمحے بھر کو اس وقت رشید کی ایک جھلک نظر آئی تھی جب تم میری طرف متوجہ تھیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب تم اپنے اوپر تیزاب

نے کے خدشے کا اظہار کر رہی تھیں۔ تمہارے حواس قابو میں نہیں تھے۔" ں نے نفیسہ کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا۔ "ابھی تم خود اپنی آنکھوں سے ے گرفتار ہوتے دیکھ لوگی۔"

دونوں سپاہی جو آگے جا رہے تھے، انھوں نے مڑ کر ہمیں دیکھا تو رک ے۔ پھر ان کی نگاہ سب انسپکٹر اور اے ایس آئی پر پڑی تو انھوں نے بھی والور نکال لیے۔ یقیناً" انھیں بھی خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ سپاہی بالکل ں درخت کے سامنے رکے تھے جس کے پیچھے رشید سمٹا سمٹایا کھڑا تھا۔

"خبردار! بھاگنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ گولی مار دوں گا!" دور سے ب انسپکٹر کی تیز اور بلند آواز سنائی دی۔ وہ نشان زدہ درخت کی قریب گیا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے رشید کو گرفتار کر لیا گیا۔ سب انسپکٹر کے حکم ے ایس آئی نے اسے ہتھکڑی پہنا دی۔ تیزاب کی بوتل ایک سپاہی نے قبضے لے لی۔ تلاشی لیے جانے پر ریوالور بھی اس کی ایک جیب سے برآمد ہو گیا۔

ہم گزشتہ رات ہی اس کے خلاف رپورٹ درج کرا چکے تھے اس لیے ں پولیس والوں کے ساتھ تھانے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب یہ پولیس رد سر تھا۔

"رشید کے پاس بغیر لائسنس کا ریوالور ہے۔ آپ چاہیں تو پولیس کو ں سے بھی آگاہ کر دیں۔" ہمزاد نے سرگوشی میں مجھے بتایا۔ اس کی آواز ے سوا کسی اور کے لیے سننا ممکن نہیں تھا۔ مجھے ہمزاد کا مشورہ پسند آیا۔

اس وقت تک نفیسہ کو ساتھ لیے ہوئے میں بھی پولیس والوں تک چکا تھا۔ سب انسپکٹر سے میں نے صرف اتنا کہا۔ "اس شخص پر آپ غیر نی طور پر اسلحہ اپنے پاس رکھنے کا کیس بھی بنا سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ں کے پاس جو ریوالور برآمد ہوا ہے، وہ بغیر لائسنس کا ہے۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں جناب! اس پر تو ہم دفعہ تین سو دو، یعنی قتل اور آپ کی رپورٹ کو مدِنظر رکھ کر دیگر اتنی دفعات لگائیں گے کہ ساری

زندگی جیل میں سڑتا رہے گا۔ بس ایک مرتبہ کوئی ہمارے ہتھے چڑھ جائے' پھر تو ہم اس کی ہینگ نکال دیتے ہیں۔ یہ ہے کس کھیت کی مولی!" سب انسپکٹر اکڑ کر بولا۔

رشید کا سر اس طرح جھکا ہوا تھا جیسے جوتے پڑے ہوں۔ پولیس والے اسے لے گئے۔

"اب کیا ارادہ ہے نفیسہ؟" میں نے معلوم کیا۔ "دفتر چلنا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے میری توقع کے مطابق جواب دیا۔ "اب تو رشید کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل ہی گیا ہے۔ میں کل دفتر جا کر استعفیٰ دے دوں گی۔"

"اپنے اباجی اور امی کو بھی تو تمہیں یہ خوش خبری سنانے کی بے چینی ہو گی۔"

"جی ہاں' یہ بات بھی ہے۔" نفیسہ نے اقرار کیا' پھر واپسی کے لیے مڑتے ہوئے بولی۔ "آپ بھی میرے ساتھ پہلے گھر چلیں گے۔"

"تم کہتی ہو تو چلو!" میں نے اس کی بات مان لی۔

خلاف توقع ہمیں جلد واپس آتے دیکھ کر خیرالدین فکر مند نظر آنے لگا اور گھر میں گھستے ہی پوچھا۔ "کیا ہوا شیخ صاحب؟ اتنی جلدی کیسے..."

"منہ میٹھا کروائیں تو پھر کچھ بتاؤں گا۔" میں اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔

"کیوں نہیں! کل جو مٹھائی منگوائی تھی' بچی رکھی ہے۔ اگر کہیں تو اور منگوا لوں!"

"نہیں بس وہی کافی ہے' اس کے ساتھ چائے بھی پیوں گا۔" میں بے تکلفی سے بولا۔

اوپری منزل پر پہنچ کر جب میں نے رشید کی گرفتاری کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا تو خیرالدین کا چہرہ کھل اٹھا۔ نفیسہ کی ماں بھی خوش ہو گئی۔

نفیسہ نے خود میرے لیے چائے بنائی۔ ایسی خوشی میں نے اس سے

پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ایک لڑکی کی زندگی تباہ ہونے سے بچ گئی تھی۔ اب مجھے ایک اور خاندان کو تباہی سے بچانا تھا۔ جائز باتوں میں طلاق اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ ثمینہ اور شوکت کے درمیان کشاکش اسی مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ ثمینہ' اس کا شوہر شوکت جسے میں نے ایک یقینی موت سے بچا لیا تھا اور ثمینہ کا نوجوان عاشق زاہد' تینوں ہی اپنی اپنی جگہ غلطی پر تھے۔ زاہد اور ثمینہ کا عشق چڑھتے دریا کی کسی سرکش لہر کے مانند تھا۔ مجھے اس کے انجام کی خبر تھی۔ جب جذبات کا چڑھتا دھارا وصل سے ہمکنار ہو جاتا ہے تو چند ہی روز میں دونوں کے سر سے عشق کا بھوت اتر جاتا۔ پھر صرف پچھتاوے رہ جاتے۔ زاہد کو یہ ملال ہوتا کہ اس نے دوسرے کی اترن کیوں پہن لی؟ ثمینہ اس پر رنجیدہ ہوتی کہ زاہد کے عشق میں پہلے جیسی گرم جوشی کیوں نہیں رہی؟ اس نے خواہ مخواہ اپنا گھر کیوں برباد کیا؟ نوبت ایک دن پھر طلاق پر پہنچی۔ اُدھر شوکت اپنے کیے پر نادم ہوتا کہ اس نے اپنی بیوی کی قدر کیوں نہیں کی؟ معصوم بچّے اپنے والدین کی غلط کاریوں کا نتیجہ بھگتنے پر مجبور ہوتے۔

اپنے گھر واپس آتے ہی میں نے اسی لیے ہمزاد کو طلب کر لیا اور اسے ضروری احکام دے کے روانہ کر دیا۔

ہمزاد کے جاتے ہی میں نے اپنی چشم تصوّر سے کام لیا۔ ثمینہ کا چہرہ دوسرے کو لمحے میرے صفحۂ ذہن پر ابھر آیا۔ اسے میں نے اپنے ہمزاد کے زیر اثر بڑبڑاتے دیکھا۔ "یہ میں کیا کر رہی ہوں؟... کیا خبر میں ہمیشہ کے لیے اپنے بچوں سے بچھڑ جاؤں؟ مجھے فوری طور پر طلاق حاصل کرنے کا مقدمہ واپس لے لینا چاہیے۔ اگر طلاق ہو گئی تو... تو شاید پھر... پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔ آج... آج ہی مجھے کچہری جانا ہے۔" یہ کہتے ہی وہ کھڑی ہو گئی۔

ابھی وقت تھا کہ وہ کچہری جا کر اپنے شوہر شوکت پر دائر کیا ہوا مقدمہ واپس لے سکتی تھی۔ اسی سبب وہ اپنے کمرے سے نکلی اور چھوٹے بھائی کو آواز دی۔ ثمینہ سے عمر میں وہ پانچ سال کے قریب چھوٹا ہو گا۔ جواب میں اس

کی آواز آئی۔ "جی باجی! آیا ابھی۔"

ثمینہ کی ماں نے اس سے پوچھا۔ "کیا ہوا بیٹی؟ کہیں جا رہی ہو؟"

"ہاں امّی!" ثمینہ نے جواب دیا۔ "فہد کو ساتھ لے کر میں کچہری جا..."

"مگر آج تو مقدمے کی تاریخ نہیں۔" ثمینہ کی ماں بول اٹھی۔

"مجھے معلوم ہے امّی!... لیکن میں... میں اپنے بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"یہی تو ہم تمہیں سمجھاتے تھے... مگر خیر' دیر ہی سے سہی تمہاری سمجھ میں تو یہ بات آگئی۔"

"امّی! میں مقدمہ واپس لے رہی ہوں۔" ثمینہ نے بتایا۔

"اور زاہد کا کیا ہو گا؟ پھر... پھر یہ کہ کیا شوکت تمہیں قبول کرلے گا بیٹی؟"

"میں ان سے معافی مانگ لوں گی امّی! رہا زاہد تو وہ میرے بچّوں سے زیادہ نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے ثمینہ کے لہجے میں اعتماد تھا۔

پھر ذرا ہی دیر میں ثمینہ اپنے بھائی کے ساتھ کچہری روانہ ہو گئی۔ ہمزاد اپنا کام کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ مجھے علم تھا کہ اب وہ کہاں جائے گا! سو میں نے اس مرتبہ زاہد کا تصوّر کیا۔ وہ بھی مجھے اپنے ہمزاد کے زیرِ اثر بڑبڑاتا ہوا سنائی دیا۔ "زندگی بھر کے لیے ایک ایسی عورت کو میں اپنے گلے کا ہار کیوں بنا لوں کہ جس نے خود اپنے شوہر سے وفا نہیں کی؟ کیا وہ میری وفادار رہ سکتی ہے؟ پھر... پھر اب اس کے پاس رکھا بھی کیا ہے؟... میں تو اس کے ساتھ شادی کرنے سے پہلے ہی اپنی تمام تر تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کر چکا ہوں' وہ بھی ایک بار نہیں کتنی ہی مرتبہ!... اسے میں اپنی آغوش کی زینت بنا چکا ہوں تو مجھے اب اور کیا چاہیے؟... ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ مجھ پر بے وفائی کا الزام لگائے گی... تو الزام لگایا کرے' لیکن میں... میں اب اس سے شادی نہیں کر سکتا' ہرگز

نہیں!"

ہمزاد نے ثمینہ کے نوجوان عاشق کا دل بھی اس کی طرف سے پھیر دیا۔ مجھے آج سے پہلے یہ پتا نہیں تھا کہ ثمینہ اپنے شوہر کی امانت میں خیانت بھی کر چکی ہے۔ میرے نزدیک اس نے نہ صرف یہ حماقت کی تھی بلکہ ایک بڑا گناہ بھی کیا تھا۔ اس گناہ کا کفارہ وہ کیسے ادا کرتی' یہ میرا نہیں اس کا معاملہ تھا۔

اب میرے ہمزاد نے ثمینہ کے شوہر شوکت کا رخ کیا۔ اس روز اپنی طبیعت کی ناسازی کے سبب شوکت اپنے دفتر نہیں گیا تھا۔ رات کو اسے بخار آ گیا جو صبح تک رہا۔ بخار اب اتر چکا تھا۔ اس بات کا علم مجھے شوکت کی ماں اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو سے ہوا۔ میں اپنی چشمِ تصوّر سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ابھی ابھی اس نے تھرمامیٹر سے نکال کر اپنی ماں کو دیا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے شوکت بیٹے کہ بخار اب اتر گیا ہے ورنہ رات کو تو ایک سو دو تھا۔" شوکت کی ماں نے اظہارِ اطمینان کیا۔

معاً" شوکت اٹھ کر بیٹھ گیا اور میرے ہمزاد کے زیرِ اثر اپنی ماں سے کہنے لگا۔ "امی! کبھی میں نے ثمینہ کی قدر نہیں کی اور اب مجھے اس پر ملال ہو رہا ہے۔"

"مگر اب کیا ہو سکتا ہے بیٹے؟ اس نے تو تم سے طلاق حاصل کرنے کے لیے عدالت میں مقدمہ..."

"اب بھی کچھ نہیں بگڑا امی!" شوکت پرعزم لہجے میں بول اٹھا۔ "مجھے یقین ہے کہ اگر میری خاطر نہیں تو اپنے بچوں کے لیے ثمینہ مقدمہ واپس لے سکتی ہے۔ میں... میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج ہی اس سے ملوں گا۔ وہ یقیناً" مان جائے گی امی!... اگر... اگر میں اس پر ہاتھ نہ اٹھاتا تو وہ کبھی گھر چھوڑ کر نہ جاتی۔ جو کچھ بھی ہوا' اس کا ذمّے دار میں ہوں۔ کبھی... میں نے کبھی اسے خوش نہیں رکھا۔ اب وہ نہیں تو... تو مجھے اپنی زندگی ادھوری لگ رہی ہے۔"

"ہاں بیٹے! ہر شے کی اصل قدر و قیمت کا اسی وقت اندازہ ہوتا ہے

جب وہ پاس نہیں رہتی۔ میں نے تو تمہیں پہلے بھی کئی دفعہ سمجھایا تھا کہ دلہن سے اپنے رویے کی معافی مانگ کر اسے گھر واپس لے آؤ، مگر تم نے میری بات نہیں مانی۔ میں بوڑھی عورت آخر کب تک گھر کا کام کاج سنبھال سکتی ہوں!"

"آپ ٹھیک کہتی تھیں امیّ! غلطی میری ہی تھی اور میں ہی اب اس کا ازالہ کروں گا۔ آج ہی دوپہر کے بعد میں، ثمینہ سے ملنے جاؤں گا!"

میں نے یہ سنتے ہی آنکھیں کھول دیں۔ ہمزاد نے اپنا کام کر دیا تھا۔ ایک گھر اجڑنے سے بچ گیا تھا۔

اسی روز دوپہر کے بعد میں نے اپنی تصوّر کی قوت آزما کر تمام تر کوششوں کا نتیجہ بھی دیکھ لیا۔ شوکت اور ثمینہ ایک دوسرے سے معافی مانگ رہے تھے۔ ان دونوں ہی کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ پھر شوکت نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی بیوی سے کہا۔ "میں... میں یہ چاہتا ہوں ثمینہ کہ تم مقدمہ واپس لے لو!"

ثمینہ نے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔ "مقدمہ تو میں آج واپس لے چکی ہوں۔"

شوکت نے غیر یقینی سی نظروں سے ثمینہ کی طرف دیکھا، پھر اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ "یقین کرو ثمینہ، اب میں کبھی تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔"

"تم میرے بچّوں کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لائے؟" ثمینہ نے سوال کیا۔

"مجھے کیا خبر تھی کہ... تم اتنی جلدی اور... اور خود ہی سب کچھ مان جاؤ گی!... اچھا اب چلنے کی تیاری کرو! میں اسی وقت تمھیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

"میں... میں تو خود اپنے بچّوں کو گلے لگانے کے لیے بے چین ہوں۔" ثمینہ بولی۔

"صرف بچّوں کو؟" شوکت کے لہجے میں شرارت تھی۔

"تم بھی بچّوں سے کب کم ہو!" ثمینہ نے اٹھلا کر کہا اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر کچھ ہی دیر میں ثمینہ کو میں نے اس کے شوہر شوکت کے ساتھ جاتے دیکھا تو جیسے میرے سینے سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا۔

میری پوری زندگی کے تجربات کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں روحانی مسرّت سے بڑھ کر کوئی اور شے نہیں۔ یہ روحانی مسرّت صرف کارِ خیر سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ثمینہ کو دوبارہ اس کے گھر میں بسا کر مجھے واقعی ناقابلِ بیان روحانی مسرّت حاصل ہوئی تھی۔

نفیسہ کی شادی میں بس اب ایک دن درمیان میں رہ گیا تھا۔ اگلے ہی روز ایاز مجھے خود شادی میں شرکت کی دعوت دینے آیا۔ خیر الدّین اس سے پہلے ہی مجھے مدعو کر چکا تھا۔ دونوں کا اصرار یہ تھا کہ میں ان کی طرف سے اس شادی میں شرکت کروں۔

"پڑوسی ہونے کا بھی تو کچھ حق ہے نا!" میں نے ایاز سے کہا۔ "اس کے علاوہ آپ کو یہ بھی خبر ہے کہ نفیسہ میری دوست ہے۔ میں اسی کی طرف سے شریک ہوں گا۔"

"آپ ٹھیک فرماتے ہیں شیخ صاحب!" ایاز مان گیا۔

اتوار کے دن دوپہر سے کچھ پہلے ایاز اپنے احباب اور دور کے کچھ عزیزوں کے ساتھ برات لے کر آگیا۔ گلی میں شامیانہ لگا تھا جس میں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں خیر الدّین کے قریبی عزیز پہلے جمع ہو چکے تھے۔ ہم سبھی نے برات کا استقبال کیا۔ دونوں جانب سے بہ مشکل تیس چالیس آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوں گے۔

نکاح کے فوراً بعد کھانا کھلا دیا گیا اور شام چار بجے تک نفیسہ رخصت ہو گئی۔ اب مجھے ڈھاکا شہر میں مزید رکنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

میں نے آیندہ روز ہی چاٹگام جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی دن ہمزاد نے مالک مکان سے بھی میرے ایما پر بات کر لی کہ کل اسے مکان کی چابی مل جائے گی۔

میرے ہمزاد نے ایک مسہری کے سوا گھر کا تمام سازو سامان رات ہی کو چاٹگام پہنچا دیا۔ صبح ہوتے ہی ہمزاد مجھے ناشتہ کرا کے مسہری بھی میرے چاٹگام والے گھر میں پہنچا آیا۔ اس وقت ساڑھے نو بج رہے تھے کہ جب گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ غنیمت یہ ہوا کہ ہمزاد حصار اٹھا چکا تھا ورنہ دستک دینے والوں پر جانے کیا گزرتی! میں نے نیچے جا کر دروازہ کھولا تو پتا چلا کون لوگ آئے ہیں! نفیسہ اور ایاز کے ساتھ خیر الدین اور اس کی بیوی بھی تھی۔ گلی میں مجھے ایک وین کھڑی نظر آئی جس میں سامان لدا ہوا تھا۔

"ہم نے سوچا کہ جانے سے پہلے آخری بار مل لیں۔" خیر الدین نے مجھے مخاطب کیا۔ "نفیسہ بٹی اور ایاز میاں ہمیشہ کے لیے ہمیں اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں۔"

"میں بھی بس اب جانے ہی والا تھا' سامان تو گیا۔ آپ لوگ اچھے وقت پر آئے۔ آئیے' اندر آ جائیے' مگر کھڑے کھڑے ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ بٹھانے کو..."

"کوئی بات نہیں شیخ صاحب! یہ بھی بہت ہے۔" ایاز بول اٹھا۔ "ہمیں بھی جلدی ہے۔ باتیں تو یہاں بھی کھڑے کھڑے کی جا سکتی ہیں۔"

میری نگاہ نفیسہ پر پڑی تو وہ مجھے کسی تازہ کھلے ہوئے گلاب کی طرح معلوم ہوئی۔ ایک ہی رات میں جیسے وہ بدل سی گئی تھی۔ شب وصال کے بعد اس کے جمال کی دوشیزگی کچھ اور بھی نکھر آئی تھی۔ پھر ایاز اور خیر الدین مجھ سے گلے ملے۔ نفیسہ نے بھی مجھے رخصتی سلام کیا۔

"اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔" میں نے شفقت سے نفیسہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"آمین!" خیر الدین بولا۔

ذرا سی دیر میں وہ لوگ رخصت ہو گئے۔ وین کے آگے ہی ایک ٹیکسی کھڑی تھی جس میں وہ لوگ بیٹھ گئے اور میں نے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔

"چٹخنی اور کنڈلی اندر سے نہ لگائیں۔" ہمزاد نے مجھ سے کہا۔ "مجھے باہر سے تالا ڈال کر مالک مکان کو چابی دینے کے لیے جانا ہے۔ آپ اوپر چلیں' میں ابھی آیا۔"

ہمزاد کو واپسی میں دیر نہ لگی۔ اسے کیوں کہ میرے ساتھ تیز رفتاری سے سفر کرنا تھا اس لیے مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ڈھاکا سے چاٹگام اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔ مجھے اتنے دن بعد دیکھ کر میرے وفادار ملازم ارشاد علی کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔

دوپہر کو کھانا کھا کر جب میں لیٹنے والا تھا تو مجھے معاً قلمی نسخے کا خیال آ گیا جس میں وہ وظیفہ درج تھا جس پر آج ہی رات سے عمل کرنا تھا۔ امتحان اور آزمائش کا وقت آ چکا تھا۔ مجھے اپنی مطالعہ گاہ کی طرف بڑھتے ہوئے وہ دن یاد آنے لگے جب ہمزاد کا عمل کیا تھا۔

قلمی نسخہ اپنی جگہ موجود تھا۔ اس کی میں نے جلد بندی کرائی تھی۔ پھر بھی اوراق بہت بوسیدہ تھے۔ میں اسے احتیاط سے نکال کر لے آیا۔

اپنی خواب گاہ میں واپس آ کر میں نے قلمی نسخے کی ورق گردانی شروع کر دی۔ جلد ہی میں نے مطلوبہ وظیفہ تلاش کر لیا۔ وظیفے کے ساتھ ہی فارسی زبان میں جو عبارت درج تھی' میں اسے پڑھنے لگا۔ اس وظیفے کی مدت انیس دن ہی تھی۔ یہ بات مجھے ہمزاد بھی بتا چکا تھا۔ اس وظیفے کی کچھ شرائط تو ایسی تھیں جن پر میں پہلے ہی سے عمل پیرا تھا' یعنی نماز اور پاک صاف رہنا! ہمزاد کے عمل کی خاطر مجھے گھر سے باہر بھی نکلنا پڑتا تھا' مگر اس وظیفے میں ایسی کوئی شرط نہیں تھی۔ یہ وظیفہ روز عشاء کی نماز کے بعد سے نصف شب تک پڑھا جانا تھا۔ زوال کا وقت شروع ہونے سے پہلے ختم کر دینا تھا۔ اس کے لیے نہ کسی چراغ کی ضرورت تھی' نہ کمرے میں اندھیرے کی۔ عشاء کی نماز پڑھ کر مجھے جانماز

ہی پر بیٹھے رہنا تھا۔ ہاں اس کے لیے حصار کھینچ کر بیٹھنا لازمی تھا۔ وظیفہ پڑھتے ہوئے مجھے کسی قیمت پر حصار سے نہیں نکلنا تھا' نہ وظیفہ پڑھ کر صبح ہونے سے قبل کوئی بات کرنی تھی۔ عمل کر کے مجھے سو جانا تھا۔

ہمزاد کا عمل کرتے ہوئے میں جس طرح فریب نظر اور فریب سماعت کا شکار ہوا تھا' یہی صورت حال اس وظیفے کے دوران میں بھی مجھے پیش آ سکتی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے پہلے ہی سے تھا کہ شیطانی قوتیں میرے عمل میں ضرور رکاوٹیں ڈالیں گی۔ میں اسی لیے زیادہ نہ گھبرایا۔

عبارت کے آخری حصے میں لکھا تھا' جو یہ وظیفہ پورا کرے گا اللہ تعالیٰ اسے حیرت انگیز پُراسرار قوتوں سے نواز دے گا۔ پھر کوئی بڑی سے بڑی شیطانی طاقت اسے زیر نہیں کر سکے گی۔ اس کے برعکس عامل باطل طاقتوں کو شکست دینے کا اہل ہو جائے گا۔

اس وظیفے کے متعلق تمام تفصیلات پڑھ کر میں نے مشورے کی غرض سے ہمزاد کو طلب کر لیا۔

" تمہارا کیا خیال ہے' آج ہی رات وظیفہ شروع کر دیا جائے؟" میں نے ہمزاد کو مخاطب کیا۔

"جی ہاں' اب مزید دیر نہیں کرنی چاہیے۔ آپ کو خبر ہی ہے کہ گرو گوبند پہلے ہی اپنا شیطانی عمل شروع کر چکا ہے۔" ہمزاد نے مشورہ دیا۔

"عمل کے دوران میں تو ظاہر ہے میں تمہیں طلب نہیں کروں گا اور نہ تم میری کوئی مدد کر سکو گے' لیکن دن کے وقت تو ایسی کوئی پابندی نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بہتر یہی ہے کہ انیس دن تک آپ کسی اشد ضرورت کے بغیر دن کے وقت بھی مجھے طلب نہ کریں۔" ہمزاد نے بتایا۔

"ٹھیک ہے' میری پوری کوشش یہی ہو گی' کوئی مجبوری آ پڑی تو الگ بات ہے۔" میں نے یقین دہانی کرائی۔ پھر ہمزاد کو رخصت کی اجازت دے

دی۔

شرائط کے مطابق جس جگہ بیٹھ کر عمل کیا جاتا تھا' وہاں عامل کا تنہا رہنا ضروری تھا۔ خاص طور پر عمل کے دوران میں کسی کو بھی وہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے اسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ارشاد علی کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

"سنو ارشاد علی!" میں نے اس سے کہا۔ "آج ہی رات میں ایک وظیفہ شروع کرنے والا ہوں۔"

"پھر... پھر جناب؟" ارشاد علی کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔

"ہاں کیوں' تم کس لیے ڈر گئے؟"

"جناب! پہلے جب آپ نے وظیفہ پڑھا تھا تو روز ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جاتی تھی۔ اب پھر کہیں ایسا ہی نہ ہو!" ارشاد علی نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"تمہیں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم تو صرف وہ باتیں توجہ سے سنو جو میں کرنے والا ہوں۔" میں پرسکون آواز میں بولا۔ "پہلی بات تو یہ سن لو کہ عشاء کے بعد سے صبح ہونے تک کسی صورت میں تمہیں میرے کمرے کے اندر قدم نہیں رکھنا! سمجھ گئے؟"

"جی ہاں جناب!" ارشاد علی نے اقرار میں سر ہلایا۔ "بالکل سمجھ گیا۔"

"ممکن ہے' میرے کمرے سے رات کے وقت تمہیں بھیانک آوازیں آتی سنائی دیں۔ اس کے باوجود تمہیں اندر نہیں آنا!" میں نے تاکید کی۔

"ایسا ہی ہو گا جناب! میں آپ کے حکم پر عمل کروں گا۔"

"انیس دن تک تم میرے لیے گوشت وغیرہ نہیں پکاؤ گے۔ میرا گزارا صرف معمولی اور سادہ غذا پر ہو گا۔ میں صرف دالیں اور سبزیاں کھاؤں گا۔" میں نے اپنے ملازم کو وظیفے کی ایک اور شرط سے آگاہ کیا۔ "صبح ناشتے میں بھی انڈا وغیرہ مجھے نہ دینا! اگر تم پر کوئی پابندی نہیں۔ تم جو چاہو کھا سکتے ہو۔"

ارشاد علی کہنے لگا۔ "جناب! میں دو دو ہانڈیاں پکا کے کیا کروں گا۔ جو آپ کھائیں گے' میں بھی کھا لیا کروں گا۔"

"تمہاری مرضی! میری طرف سے تم کھانے پینے میں آزاد ہو۔" میں بولا۔

پھر میرے کہنے پر ارشاد علی چلا گیا۔ عصر کا وقت ہو رہا تھا' میں اسی لیے وضو کرنے اپنے کمرے سے نکل آیا۔

اسی روز مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد میں نے پھر قلمی نسخہ نکالا اور عربی کی وہ عبارت یاد کرنے لگا جو مجھے وظیفے کے دوران میں پڑھنی تھی۔ وہ چند قرآنی آیات ہی تھیں جنہیں حفظ کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہی آیات مجھے دہراتے رہنا تھا۔ ہمزاد کے عمل کی طرح یہ وظیفہ بھی رحمانی ہی تھا۔

عمل کا وقت شروع ہونے سے پہلے ہی میں ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر میں نے دروزاہ بھیڑ لیا۔ وظیفے کی شرائط میں یہ شرط بھی شامل تھی کہ جہاں وظیفہ پڑھا جائے' دروازہ مقفل نہ ہو' نہ چٹخنی یا کنڈی لگائی جائے۔ یہی حکم کمرے میں موجود کھڑکیوں کے لیے تھا۔ دروازہ اور کھڑکیاں صرف بھیڑی جا سکتی تھیں۔ اسی خیال سے میں نے نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہونے سے پہلے ان کھڑکیوں کی چٹخنیاں کھول دیں جو بند تھیں۔ عشاء کی نماز پڑھ کر مجھے حصار کھینچنا تھا اور پھر اس حصار سے نصف شب تک نہیں نکلنا تھا۔ حصار کھینچتے ہوئے مجھے جو الفاظ ادا کرنے تھے' وہ بھی قلمی نسخے میں درج تھے۔ وہ بھی میں نے یاد کر لیے تھے۔ آخر عشاء کا وقت ہو گیا اور میں جانماز بچھا کر نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔

نماز پڑھ کر میں نے اپنے گرد حصار کھینچا اور وظیفہ شروع کر دیا۔ وظیفہ پڑھتے ہوئے مجھے ابھی آدھا گھنٹا گزرا تھا کہ میں نے خود اپنی ہی چیخیں سنیں۔ پھر گویا میں اپنی مدد کے لیے پکارنے لگا۔ ذرا دیر کو مجھے خیال آیا' کہیں

میرے ہمزاد پر تو کوئی افتاد نہیں پڑ گئی؟ میری ہی آواز میں بھلا کون اور مدد کے لئے پکار سکتا تھا! اس کی آواز میرے سوا کسی اور کے لیے سن لینا ممکن بھی نہیں تھا جب تک کہ وہ خود ہی یہ نہ چاہتا۔ چیخیں اور تیز آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ معاً" مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اسی طرف دوڑتا چلا آ رہا ہو۔ یہ سب فریب ساعت ہے اور کچھ نہیں۔ میں نے سوچا اور ہر خوف کو اپنے ذہن سے جھٹک کر بہ دستور وظیفہ پڑھنے میں مصروف رہا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں میرے کمرے کے باہر تک آ کر رک گئیں۔ پھر ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے دھیرے سے کمرے کا دروازہ کھولا ہے۔ وظیفہ پڑھتے ہوئے کسی بھی طرف دیکھنے کی پابندی نہیں تھی۔ میں نے اس رعایت سے فائدہ اٹھایا۔ کمرے کا دروازہ دائیں جانب تھا۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ وہ محض میرا فریب ساعت نہیں تھا۔ کمرے کا دروازہ واقعی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔

دروازے میں مجھے ایک کریہہ صورت شخص کھڑا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ معاً" وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے ریوالور کی نال میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ سیاہ رو اور سیاہ لباس وہ شخص قدم قدم میری طرف بڑھنے لگا۔

یہ میری نظر کا دھوکا ہو سکتا ہے۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے اس شخص کی طرف سے نگاہ پھیر لی۔

"ارے واہ! یہ تو بڑا دلیر معلوم ہوتا ہے۔" ایک بھاری آواز کمرے میں گونجی۔ "اسے تو کوئی پروا نہیں میری!" وہ شخص جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ "اس کے علاوہ گھر میں ایک ہی آدمی تھا جسے میں نے باندھ کر ڈال دیا ہے۔ شاید وہ اس کا ملازم ہو گا۔ یہ مجھے دیکھ چکا ہے اور پولیس کو بھی میرا پتا بتا سکتا ہے۔ کیا کروں؟... یہاں تو رات گزارنا مشکل ہی لگتی ہے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے کہ میں اس کو بھی باندھ کر ڈال دوں' منہ میں کپڑا ٹھونس

دوں گا تاکہ یہ چیخ چلا نہ سکے ورنہ پولیس ادھر متوجہ ہو جائے گی اور پھر..."
ابھی اس شخص کی بات ادھوری تھی کہ کمرا ایک تیز چیخ سے گونج اٹھا۔

بے اختیار میری نگاہ اس طرف اٹھ گئی۔ مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر وہ شخص زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ پھر میں نے اس کے جسم کو ساکت ہوتے دیکھا۔ اگر واقعی وہ کوئی فریب نظر نہیں تھا تو اس کی ایک ہی وجہ ممکن تھی۔ وہ شخص یقیناً" حصار کی زد میں آگیا تھا۔ یا تو یہ بے ہوش ہو گیا ہے یا پھر... میں اس سے زیادہ کچھ اور نہ سوچ سکا۔ ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ نیچے سے دروازہ پیٹے جانے کی آوازیں آنے لگیں۔

"دروازہ کھول دو! پولیس تمہیں حکم دیتی ہے کہ دیر نہ کرو ورنہ دروازہ توڑ دیا جائے گا!" کسی کی تیز آواز دور سے سنائی دی۔

ظاہر ہے کہ میں سنی ان سنی کر گیا۔ مجھے نہ تو وظیفہ ترک کرنا تھا' نہ اپنے کھینچے ہوئے حصار سے باہر نکلنا تھا۔ دو مرتبہ مزید بلند آواز میں دروازہ کھولنے کے لیے گویا حکم دیا گیا' پھر زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔

"ہم دروازہ توڑ رہے ہیں!" آخری مرتبہ گویا مجھے بتایا گیا۔

حقیقت میں اگر وہ میری سماعت کا فریب نہیں تھا تو بھی میں نیچے جا کر گھر کا دروازہ کھولنے سے قاصر تھا۔

مجھے یاد آیا کہ جب میں ہمزاد کا عمل کر رہا تھا تو پولیس والوں نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی۔ اب پھر پہلی ہی رات سے یہ تماشا شروع ہو گیا تھا۔ دروازہ توڑے جانے کی آوازیں آتی رہیں' مگر میں اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اگر پولیس والے چاہتے تو گھر کی دیوار پھاند کر بھی اندر آ سکتے تھے کیوں کہ دیواریں بہت زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ کوئی ایک پولیس والا دیوار پر کسی طرح چڑھ کر صحن میں کود جاتا اور دروازہ کھول دیتا' لیکن انھیں تو جیسے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانا تھا۔

ذرا ہی دیر میں بہت زور کی آواز آئی جیسے گھر کا دروازہ ٹوٹ کر گرا ہو۔ پھر میں نے بہت سے قدموں کی چاپ سنی۔

"سر! نیچے تو کوئی معلوم نہیں ہوتا۔" کسی پولیس والے کی آواز نیچے سے آئی۔ میں سمجھ گیا کہ پولیس والے میرے گھر میں داخل ہو چکے ہیں۔

"اوپری منزل پر روشنی دکھائی دے رہی ہے سر!" ایک اور نئی آواز سنائی دی۔

"تو پھر اوپر ہی چلو! کہیں اوپر جانے کے لیے زینہ ضرور ہو گا۔"

"لیکن سر' وہ... وہ ڈاکو مسلح ہے۔ اگر..."

"تو کیا تمہارے پاس ہتھیار نہیں ہیں!... ڈرنے کی کیا بات ہے! آؤ میرے ساتھ!" حکم دیا گیا۔

سب کچھ سننے کے باوجود میں نے وظیفہ پڑھنا نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ پولیس والے اوپری منزل پر آگئے اور پھر میرے کمرے میں بھی گھس آئے کیوں کہ وہیں روشنی تھی۔ میں سر جھکائے اپنے عمل میں مصروف رہا۔ معاً" کوئی پولیس والا چیخا۔ "سر! وہ... وہ ادھر..."

میں نے دیکھ لیا ہے۔ زیادہ قابل بننے کی ضرورت نہیں! یہ وہی مفرور مجرم لگتا ہے' لیکن یہ تو شاید بے ہوش پڑا ہے۔" وہ شاید کوئی پولیس افسر تھا۔

تجسس کے تحت میری نظر اس طرف اٹھ گئی۔ وردی سے وہ کوئی پولیس افسر ہی لگا۔ اس کے ساتھ کمرے میں تقریباً" دس بارہ پولیس والے اور تھے۔ ان سبھی کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ اچانک ایک پولیس والے نے اپنے افسر کی توجہ میری طرف مبذول کرائی۔

"ارے ہاں' اسے تو میں بھول ہی گیا۔" پولیس افسر نے چونک کر کہا' پھر براہ راست مجھے مخاطب کیا۔ "اے! یہ کیا قصہ ہے؟ تم جاگ رہے تھے تو دروازہ کیوں نہیں کھولا؟ اور اب بھی چپ سادھے بیٹھے ہو! بو یہ کیسے بے ہوش ہو گیا؟"

جواباً" میں خاموش ہی رہا اور اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

"اے بولتا کیوں نہیں؟" پولیس افسر اپنی روایتی بدتمیزی پر اتر آیا۔ "کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں تیری کھال بھی اُدھیڑ سکتا ہوں!"

اس عرصے میں دو پولیس والے سیاہ لباس غافل شخص کے قریب پہنچ گئے۔ ریوالور قریب ہی پڑا تھا۔

"سر!... سر! یہ تو مر گیا۔" ایک پولیس والا تقریباً چیخ اٹھا۔

"کیا بکتے ہو؟" پولیس افسر پلٹ کر دہاڑا۔ پھر وہ خود ہی لپک کر فرش پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے شخص کے قریب پہنچ گیا۔ میری نگاہ اسی طرف تھی۔ پولیس افسر نے نبض دیکھی، پھر ناک پر ہاتھ رکھا اور اچھل پڑا۔ "یہ... یہ تو واقعی زندہ نہیں، لیکن اسے کس نے قتل کیا؟"

"سر! یہاں اس شخص کے سوا اور کون ہے جس نے آپ کا حکم سن کر بھی زبان نہیں کھولی۔ یہی شخص اسے قتل کر سکتا ہے۔" ایک پولیس والے نے فوراً میرے اوپر قتل کا الزام لگا دیا، پھر بولا۔ "مقتول کو شاید گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔"

"یہ تو اس کا باپ بھی بولے گا۔ اسے شاید معلوم نہیں کہ میرے سامنے تو مُردے بھی بولنے لگتے ہیں۔" پولیس افسر کسی درندے کی طرح غرّایا۔ "یہ کوئی چھوٹا موٹا معاملہ نہیں، قتل کا کیس ہے۔ گرفتار کر لو اسے!"

کوئی پولیس والا اگر اپنے افسر کے حکم کی تعمیل میں مجھے گرفتار کرنے کے لیے آگے بڑھتا تو اس کا بھیانک نتیجہ نکلتا۔ میں اب سمجھ چکا تھا کہ یہ سب کچھ فریب نظر یا فریب سماعت نہیں۔ میں نے اسی لیے اپنا وظیفہ جاری رکھتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے کسی کو بھی اپنے قریب آنے سے منع کیا۔

"اچھا تو تجھے گرفتار نہ کریں، یوں ہی چھوڑ دیں! واہ بے واہ! بہت چالاکی دکھا رہا ہے!" پولیس انسپکٹر منہ بگاڑ کر بولا۔

پھر میں نے ہاتھ کے اشاروں سے یہ سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ پولیس والوں کو میرے قریب نہیں آنا چاہیے، لیکن اپنے مقصد میں ناکام رہا۔

اہر ہے کہ اس کا نتیجہ ان دونوں پولیس والوں کے حق میں بہت ہولناک ابت ہوا جو اپنے افسر کے حکم پر مجھے گرفتار کرنے آگے بڑھے۔ میرے قریب نچنے سے پہلے ہی وہ حصار کی زد میں آگئے۔ ان کے منہ سے بڑی بھیانک چیخیں لیں اور پھر چند لمحے تڑپ کر وہ بھی ساکت ہو گئے۔

ذرا دیر کو کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی کو ولیس افسر کی گھبرائی ہوئی آواز ہی نے توڑا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ... کہ یہ کوئی الا وظیفہ پڑھ رہا ہے۔ اسی... اسی کی وجہ سے مفرور مجرم قادر بھی مارا گیا ر... اور وہ سپاہی بھی زندہ نہ بچ سکے جو اسے گرفتار کرنے آگے بڑھے تھے۔ یں... ہمیں اب یہاں نہیں رکنا چاہیے ورنہ کیا خبر کس نئی مصیبت میں گرفتار و جائیں! لا... لاشیں اٹھاؤ، جلدی کرو!"

عتاً اسی وقت سیاہ پوش کے جسم کو حرکت ہوئی اور وہ کراہنے لگا۔ یہ ر خود میرے لیے بھی انتہائی حیرت انگیز تھا کہ ایک مردہ کس طرح زندہ ہو سکتا ہے! کمرے میں موجود پولیس والے بھی یہ دیکھ کر حیران پریشان سے نظر آنے گے۔ سیاہ پوش پولیس اب کراہتے ہوئے اٹھ رہا تھا۔

"خبردار!" پولیس افسر زور سے بولا۔ "بھاگنے کی کوشش نہ کرنا!... پکڑ اسے!" پولیس افسر نے آخری الفاظ اپنے ماتحت مسلح سپاہیوں کی طرف دیکھ کر ا کہے۔ سیاہ پوش مفرور مجرم قادر کو گرفتار کر لیا گیا۔

"سر! کیا خبر کچھ... کچھ دیر میں ہمارے ساتھی بھی اسی طرح زندہ ہو ائیں!" ایک سپاہی نے پرامید لہجے میں اپنے افسر کو مخاطب کیا۔

"ہو سکتا ہے۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو ورنہ افسرانِ بالا کے سامنے واب طلبی مشکل ہو جائے گی۔ ویسے بھی یہ علاقہ ہمارے تھانے کی حدود میں یں آتا۔" پولیس افسر نے کہا۔ "ہم تو اس خبیث قادر کا تعاقب کرتے ہوئے اں تک آگئے تھے۔" وہ یہ کہتے ہی جانے کیوں چونک اٹھا اور پھر تعجب سے جے میں قادر سے پوچھا۔ "تم بتاؤ کیسے مر گئے تھے؟"

"مر... مر گیا تھا!" قادر حیرت سے بولا۔ "میں... میں تو اس شخص کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اسے بھی اس کے ملازم کی طرح باندھ کر ڈال دوں۔ میرا مقصد یہ تھا کہ کہیں اس شخص کی چیخ پکار تم لوگوں کو ادھر متوجہ نہ کر دے! اس کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک میرے جسم کو شدید جھٹکا لگا جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ میں دور جا گرا۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں کیا ہوا! جب ہوش آیا تو... تو مجھے گرفتار کر لیا گیا۔"

"یہاں اس عامل کے علاوہ اور کون کون ہے؟" پولیس افسر نے قادر سے سوال کیا۔ "میرا مطلب عورتوں' بوڑھوں اور بچوں..."

"کوئی بھی نہیں جناب!" قادر بتانے لگا۔ "یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک کمرے میں صرف اس شخص کا ایک ملازم مجھے ملا۔ اس کے متعلق میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔"

پولیس افسر اپنے ساتھ قادر اور دو سپاہیوں کو لے کر کمرے سے نکل گیا۔ میں نے سوچا' یہ اچھا ہوا' بے چارہ ارشاد علی مصیبت سے بچ جائے گا۔ ذرا دیر میں پولیس انسپکٹر' ارشاد علی کو بھی میرے ہی کمرے میں لے آیا اور اس سے میرے بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگا۔ ارشاد علی نے میرا نام بتا دیا اور شدید! اصرار پر یہ بھی قبول کر لیا کہ میں کوئی وظیفہ پڑھ رہا ہوں۔ اس دوران میں مجھے اپنے اس سوال کا جواب بھی مل چکا تھا کہ قادر دوبارہ کس طرح زندہ ہو گیا؟ میرے نزدیک اس کی ایک ہی وجہ ممکن تھی کہ اسے سکتہ ہو گیا تھا' وہ مرا نہیں ہو گا۔ ابھی پولیس انسپکٹر نے بے حس و حرکت پڑے ہوئے سپاہیوں کو اٹھانے کا حکم دیا تھا کہ ان کا سکتہ بھی ٹوٹ گیا۔

"میں نے کہا تھا نا سر کہ... کہ یہ دونوں بھی زندہ ہو جائیں گے۔ دیکھ لیں کہ..."

سپاہی کا جملہ ابھی پورا نہیں ہو سکا تھا کہ کمرے میں کسی سانپ کی پھنکار گونجی۔ پھر میں نے حصار کے باہر ایک بڑے سیاہ ناگ کو پھن کاڑھے

لہراتے دیکھا اور اسے پہچان گیا۔ بدلی ہوئی جون میں وہ شمبھو کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

"بھاگو!" پولیس انسپکٹر نے سپاہیوں کو حکم دیا اور پھر سب سے پہلے وہی کمرے کے دروازے کی طرف بھاگا۔

سپاہی' قادر اور میرا ملازم ارشاد علی بھی گویا سر پر پیر رکھ کر بھاگ اٹھے۔ جاتے جاتے ارشاد علی نے یہ عقل مندی کی کہ کمرے کا دروازہ بھیڑ گیا۔

"شیخ کرامت! میں تیرا عمل پورا نہیں ہونے دوں گا۔" معاً شمبھو نے سانپ کی جون بدل لی اور خود ظاہر ہو گیا۔ اس کا بدہیئت مجھ سے کچھ فاصلے پر موجود تھا۔ "چاند کی دیوی نے مجھے بڑی شکتی دان کی ہے اور اب میں تجھے اپنی شکتی کا چمتکار (معجزہ) دکھاتا ہوں!" شمبھو یہ کہہ کر زور سے ہنسا۔ اسی کے ساتھ شمبھو کے گرد چمکیلا حصار قائم ہو گیا۔ پھر اس کی سرخ آنکھوں سے مجھے دو شعلے لپکتے دکھائی دیے۔ وہ شعلے جب میرے کھینچے ہوئے حصار سے ٹکرائے تو زور دار کڑاکے کی آواز آئی۔ یوں جیسے بجلی کے ننگے تار آپس میں ٹکرا گئے ہوں۔ تیز روشنی میں میری پلکیں جھپک گئیں۔ شمبھو کسی درندے کی طرح غرایا۔ "اچھا تو اس طرح نہیں مانے گا تو!" وہ یہ کہتے ہی پلٹا۔ شعلے پھر اس کی آنکھوں سے نکلے اور میرے کمرے میں آگ لگ گئی۔ میرا بستر' مسہری' پردے' غرض کہ کمرے میں موجود ہر شے جلنے لگی۔

اچانک شمبھو میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ آگ کے شعلے بڑھتے ہوئے حصار تک پہنچ گئے۔ ان کی حدت سے میرا سارا جسم پسینے میں بھیگ گیا اور دھوئیں سے میرا دم گھٹنے لگا۔ پھر بھی میں وظیفہ پڑھتا رہا۔ معلوم نہیں کس نے فائر بریگیڈ والوں کو خبر کر دی۔ میں نے گھنٹیاں بجنے کی آوازیں سنیں۔

آگ بجھانے والے عملے نے جلد ہی بھڑکتے شعلوں پر قابو پا لیا ورنہ شاید میرا پورا گھر جل کر خاک ہو جاتا اور شاید ارد گرد کے مکانات بھی آگ کی لپیٹ میں آ جاتے۔ فائر بریگیڈ والے آگ بجھا کر حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے

کیوں کہ میرا کمرا پانی کے سبب گویا سیلاب کا نمونہ پیش کر رہا تھا' لیکن پانی کا ایک قطرہ بھی حصار کے اندر داخل نہیں ہوا تھا۔ میں بہ دستور وظیفہ پڑھنے میں مصروف تھا۔

"یہ... یہ کوئی اللہ والے بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔" بنگلہ زبان میں کسی نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ "ورنہ ہرگز نہ بچتے اور جل کر مر گئے ہوتے۔"

"دیکھتے نہیں کہ جہاں وہ بیٹھے ہیں' وہاں تک پانی بھی نہیں پہنچ رہا بلکہ دائرے کی صورت میں چاروں طرف رکا ہوا ہے۔" کوئی اور بولا۔

"ہمیں ان کی عبادت میں خلل نہیں ڈالنا چاہیے۔ آؤ چلو!" کسی نے کہا۔

پھر وہ سب چلے گئے۔ اب وظیفے کا وقت ختم ہونے میں صرف چند منٹ باقی رہ گئے۔ میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور جیسے ہی زوال کا وقت ہوا وظیفہ پڑھنا چھوڑ دیا۔ میں نے اٹھتے ہوئے خواب گاہ پر ایک نظر ڈالی۔ اس کا دروازہ تک سلامت نہیں رہا تھا۔ معاً" مجھے قلمی نسخے کا خیال آیا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ قلمی نسخے کو میں نے اپنے بستر پر تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا۔ اب وہاں بستر تھا' نہ تکیہ اور نہ مسہری۔ سب کچھ جل کر خاک ہو گیا تھا۔ اس پر مجھے بہت رنج ہوا۔ کاش میں اسے اپنی مطالعہ گاہ میں واپس رکھ آیا ہوتا۔ وہ قلمی نسخہ میرے لیے انمول تھا۔ اسی کی وجہ سے میری زندگی بدل گئی تھی' مگر اب کیا ہو سکتا تھا! صبر کے سوا چارہ بھی کیا تھا! وظیفے کی ایک شرط کے مطابق مجھے صبح ہونے تک کسی سے بات نہیں کرنی تھی۔

"اب میرے لیے یہ مسئلہ تھا کہ کہاں سوؤں؟ میں نے جانماز لپیٹی اور پھر اپنے گرد قائم حصار کو اٹھانے کے لیے مخصوص الفاظ کا ورد کیا۔ حصار اٹھتے ہی چاروں طرف رکا ہوا پانی بہہ کر وہاں تک بھی آ گیا جہاں چند لمحے پہلے جانماز پر بیٹھا ہوا میں وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ میں پائنچے اٹھائے وہاں سے نکل آیا اور سوچا'

اب تو صبح ہونے ہی پر کچھ تدارک ممکن ہے۔"

"میرے کمرے کے قریب ہی ایک اور کمرا تھا۔ میں اس میں داخل ہونے کے لیے دروازہ کھول رہا تھا کہ میرا ملازم سامنے سے لپکتا ہوا قریب آ گیا۔"

"جناب! اب کیا ہوگا؟... یہ تو بہت بڑا نقصان ہو گیا۔ گھر کا صدر دروازہ بھی ٹوٹا پڑا ہے۔ کوئی چور ڈاکو گھر میں گھس آیا تو کیا ہوگا؟"

ارشاد علی کی بات سن کر میں کچھ نہیں بولا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا۔ اشارے ہی سے میں نے اسے جانے کا حکم دیا۔ وہ حیران حیران سا لوٹ گیا۔ میں کمرے کا دروازہ کھول کر اندر پہنچا اور لائٹ جلا دی۔ اس کمرے میں دو مسہریاں موجود تھیں۔ پلٹ کر میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور اسی وقت کمرا ایک بھیانک قہقہے سے گونج اٹھا۔ چند ہی قدم کے فاصلے پر مجھے شیطان صورت شمبھو کھڑا ہوا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے آہنی ترشول بھی دکھائی دیا۔ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وظیفے کی مدت ختم ہونے پر بھی وہ خبیث میری جان کا دشمن بنا رہے گا۔

"شیخ کرامت! آج تیری زندگی کی آخری رات ہے۔" شمبھو ہنستے ہوئے مجھ سے بولا۔ "میں یہ ترشول تیرے سینے میں اتار دوں گا!"

مجھے شدید ترین خطرے کا احساس ہوا اور میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ شمبھو اپنی دھمکی پر عمل کر سکتا تھا۔ اسے ایسا کرنے سے بھلا کون روک سکتا ہے؟ یہ سوچتے ہوئے معاً" مجھے اپنے ہمزاد کا خیال آیا۔ عمل کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ اب ہمزاد کو طلب کرنا میرے لیے ممکن تھا' مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ شمبھو جیسے ہی ترشول تان کر میری طرف جھپٹا' میرا ہمزاد طلب کیے بغیر ہی حاضر ہو گیا۔ اس نے شمبھو کے ہاتھ سے ترشول چھین لیا۔ شمبھو نے فوراً" اس کے حملے سے بچنے کی خاطر جون بدل لی۔

"آج تو بچ کر نہیں جا سکے گا شمبھو! میں تیرا ترشول چھین چکا ہوں۔ تو

خود بھی اچھی طرح اس کا مطلب جانتا ہے۔" ہمزاد نے شبھو کو مخاطب کیا جو اب ایک سانپ کی ہیئت اختیار کر چکا تھا۔ "اب تو اپنے گرد چمکیلا حصار قائم نہیں کر سکتا اور نہ اس گھر کی حدود سے نکل کر فرار ہو سکتا ہے۔"

اسی لمحے سانپ پھنکار مارتا ہوا تیزی سے ایک طرف رینگنے لگا۔ ہمزاد نے لپک کر اسی کے آہنی ترشول سے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اسی کے ساتھ شبھو کا انسانی جسم ظاہر ہو گیا۔ اس کی گردن ایک طرف کٹی پڑی تھی اور جسم کے بقیہ حصے بھی کٹے ہوئے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ فرش پر خون بہہ رہا تھا۔

"میں اس کی لاش ٹھکانے لگا کر آتا ہوں۔" ہمزاد نے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "مبارک ہو آپ کو کہ ایک دشمن آج مارا گیا۔"

میرے ذہن میں متعدد سوال تھے، مگر فی الحال چپ ہی رہا۔ ہمزاد نے شبھو کی لاش کے ٹکڑے سمیٹے اور غائب ہو گیا۔ چند ہی لمحے میں واپس آ کر اس نے خون آلود فرش بھی صاف کر دیا تو میں نے پہلا سوال کیا۔ "تم طلب کیے بغیر کس طرح آ گئے؟"

"اس لیے کہ شبھو آپ کو قتل کر دیتا تو میں بھی زندہ نہ بچتا۔" ہمزاد نے جواب دیا۔ "میں آپ ہی کا تو عکس لطیف ہوں۔ وظیفہ پہلے ہی آپ ختم کر چکے تھے۔"

"اب تم آ ہی گئے ہو تو کچھ کام اور کر جاؤ۔ میری خواب گاہ کو صاف کر کے دوبارہ اصلی حالت میں لے آؤ۔ اس کے علاوہ گھر کا دروازہ جو ٹوٹ چکا ہے، اسے بھی..."

"میں سمجھ گیا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، لیکن ایک بات شاید بھول گئے۔ آج صبح سے پہلے آپ کو کسی سے بھی کلام نہیں کرنا تھا۔" ہمزاد بول اٹھا۔

"پھر... پھر اب کیا ہو گا؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"صرف یہ ہو گا کہ کل رات سے آپ کو دوبارہ عمل شروع کرنا پڑے

گا اور..." ہمزاد کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"اور کیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"آپ سے ایک بھیانک غلطی ہو چکی ہے۔" ہمزاد نے بتایا۔ "ہر غلطی کی سزا انسان کو بھگتنی ہی پڑتی ہے۔ کسی صورت میں آپ کو صبح ہونے سے پہلے بولنا نہیں چاہیے تھا۔ وظیفہ پورا ہونے سے پہلے میں آپ کو نہیں بتا سکتا کہ وہ سزا کیا ہے!"

پھر میرے اصرار کے باوجود ہمزاد نے سزا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں نے البتہ ایک بات ضرور محسوس کی کہ وہ انتہائی ملول تھا۔ اس کا سبب بھی وہ بیان نہ کر سکا۔ مجبوراً میں خاموش ہو گیا۔ ہمزاد نے میرے حکم کی تعمیل میں دیر نہ کی اور میں واپس اپنی خواب گاہ میں آ گیا۔ میرے لیے یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں تھی کہ خواب گاہ پہلے ہی کی طرح نظر آ رہی تھی کیوں کہ میں ہمزاد کی حیرت انگیز قوتوں سے واقف تھا۔

"آج رات جو کچھ ہوا، اس میں ایک خوشگوار پہلو بھی ہے۔" ہمزاد نے کہا۔ "شبھو کی موت کے بعد اب آپ کے عمل میں مداخلت کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ صرف فریب نظر اور سماعت کے دھوکے میں آپ نہیں آ سکتے، یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں۔"

"اور گرد گوبند؟ کیا وہ اس عرصے میں خاموش بیٹھا رہے گا؟ کیا وہ مجھ پر وار نہیں کرے گا؟" میں نے معلوم کیا۔

"وہ چالیس دن کے لیے اپنا شیطانی عمل پورا کرنے کی غرض سے حصار کھینچ کر بیٹھ چکا ہے۔ اس دوران میں وہ اپنے مندر کی حدود سے نہیں نکل سکتا۔" ہمزاد بولا۔

○

میں یہ سن کر مطمئن ہو گیا۔ ہمزاد کو بھی میں نے رخصت کی اجازت دے دی، لیکن ایک بے کلی سی رہی۔ اس کی وجہ نامعلوم سزا کا خوف ہی تھا۔ مجھے اس رات بڑی مشکل سے نیند آئی۔ دوسرے دن صبح ارشاد علی نے جب

سب کچھ جوں کے توں دیکھا تو حیران پریشان سا میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"مجھے معلوم ہے ارشاد علی کہ تم کس بات پر حیرت زدہ ہو! گذشتہ رات جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ! میں نے تمہیں جو ہدایات دیں ہیں، بس انھی پر عمل کرو!" میں نے کہا۔

"بہتر... بہت بہتر ہے جناب!" ارشاد علی یہ کہہ کر میرے لیے ناشتہ لانے چلا گیا۔

میرے ہمزاد نے جو کچھ کہا تھا، قطعی درست نکلا۔ عمل کے دوران میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں آئی۔ فریب نظر اور فریب سماعت کے سوا کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا اور میں نے عمل پورا کر لیا۔ انیس دن گزر چکے تھے اور وہ بیسواں دن تھا جب ہمزاد مجھے چاٹگام سے کلکتے لے گیا۔ میں اب ہگلی کے کنارے اس قدیم مندر کے سامنے کھڑا تھا جہاں میرا دشمن گرو گوبند موجود تھا۔ ہمزاد نے مجھ سے کہا تھا کہ جب تک گرو گوبند اپنے انجام کو نہیں پہنچ جاتا، وہ مجھے متوقع سزا کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکے گا۔

"آپ کو اب تنہا اس مندر میں داخل ہونا ہے۔ گرو گوبند کا اب کوئی شیطانی حملہ آپ پر کارگر نہیں ہو گا۔" ہمزاد بولا۔

"اسے ختم کرنے کے لیے مجھے کیا تدبیر آزمانا ہو گی؟" میں نے دریافت کیا۔

"آپ کو وہ آیات تو یاد ہی ہوں گی جو عمل کے دوران میں پڑھی تھیں! جیسے ہی گرو گوبند آپ کے مقابل آئے، اس پر یہی آیات کو پڑھ کر دم کر دیں۔ اسے ختم ہونے میں انشاء اللہ دیر نہیں لگے گی۔" ہمزاد مجھے بتانے لگا۔

"آپ ہی کی طرح عرصہ دراز سے گرو گوبند بھی غیر فطری طور پر زندہ ہے۔ اس کے جسم کی طبعی عمر کبھی کی ختم ہو چکی ہے۔ اب وہ صرف اپنی پُراسرار شیطانی قوتوں کے بل پر زندہ ہے۔ قرآنی آیات پڑھتے ہی اس کی تمام قوتیں سلب ہو جائیں گی اور وہ اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔ آپ خود آنکھوں سے دیکھ لیں

گے کہ اس کا انجام کتنا بھیانک ہو گا! اب اللہ کا نام لے کر مندر میں داخل ہو جائیے۔ میں واپسی میں آپ کو یہیں ملوں گا۔"

یہ سنتے ہی میں سامنے ہی نظر آنے والے اجاڑ سے مندر میں داخل ہو گیا۔ مندر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جیسے ہی میں نے اندر قدم رکھا، ایک دم زور زور سے گھنٹے بجنے کی آوازیں ہر طرف سے سنائی دینے لگیں۔ پھر ایک آشنا قہقہہ میری سماعت سے ٹکرایا۔

"شیخ کرامت! آخر تجھے تیری موت یہاں تک کھینچ ہی لائی۔" گرو گوبند کی آواز تو میری سماعت سے ٹکرائی مگر وہ خود نظر نہیں آیا۔ "پھر بھی تو میرا مہمان ہے۔ تجھے موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے میں تیرے سواگت (استقبال) کے لیے اپنی حسین ترین داسیوں کی بھیج رہا ہوں۔ یہ تیری ہر خواہش پوری کرنے کی پابند ہیں کہ ان کو میں نے یہی حکم دیا ہے۔ آج آدھی رات تک میں تجھے جینے کی مہلت دیتا ہوں، جی بھر کر عیش اڑا لے۔ جب یہ مہلت ختم ہو جائے گی تو میں، کالی مائی کے چرنوں میں تیرے کٹے ہوئے سر کی بھینٹ چڑھا دوں گا۔ تیرے خون سے میں، کالی مائی کی مورتی کو غسل دوں گا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی زبردست چھناکا ہوا۔

وہ اجاڑ سی جگہ ایک دم جیسے جنّت نظیر بن گئی۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ تھے، خوشبو ہی خوشبو تھی۔ دوسرا چھناکا ہوا تو جیسے میرے ہوش گم ہو گئے۔ اتنا سارا حسن زندگی بھر میں نے کسی ایک جگہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ گرو گوبند کی داسیاں تھیں جنھوں نے مجھے اپنے حلقے میں لے رکھا تھا۔ باریک لباس ان کے حسین ترین جسموں پر گویا تہمت ہی تھا۔ روشنی جیسے ان کے جسموں سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ سبھی مجسم خوشبو تھیں۔

میں نے یہ جاننے کے لیے کہ وہ محض نظر کا دھوکا تو نہیں، ایک داسی کو کھینچ کر اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ وہ جیتی جاگتی حقیقت تھی۔ جام سے توبہ شکن تھا اور میری توبہ جام شکن! میرا چہرہ اس کے حسین لبوں پر

جھکتا چلا گیا۔ عارض و لب کی حلاوت نے میرے جسم میں لہو کی گردش تیز کر دی۔ وہ خود سپردگی کی انتہائی منزلوں پر تھی۔ خود فراموشی اور بے خودی کے شاید وہ چند ہی لمحے تھے۔ میں دیار لذت میں پہلا قدم رکھنے والا تھا کہ جیسے کسی انجانی پُراسرار قوت نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ میں جیسے ہوش میں آگیا۔ مجھے اب یہ احساس ہو چکا تھا کہ میرا دشمن میرے ساتھ کیا خطرناک کھیل کھیلنے والا تھا۔ وہ یقیناً مجھے ناپاک کر کے کلام الٰہی کو پڑھنے سے روکنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ناپاک ہونے کی صورت میں ان آیات کا اثر ختم ہو جاتا جو مجھے اپنے دشمن کو اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے پڑھنا تھیں۔ گرو گوبند کا یہ خطرناک وار بیکار گیا۔ اس کا سبب انیس دن کا وہی عمل تھا جو میں نے پورا کر لیا تھا۔

لاحول پڑھ کر میں نے اس حسین داسی کو اٹھا کر دور پھینک دیا اور اٹھ کر کھڑا ہوا۔ زمین پر گرتے ہی وہ داسی چیخ اٹھی، پھر بقیہ داسیاں بھی جیسے گھبرا کر بھاگنے لگیں۔ چند ہی لمحوں میں سارا منظر بدل گیا۔ اب میں وہاں اکیلا تھا اور وہ جگہ مجھے دوبارہ اجاڑ نظر آنے لگی تھی۔

اچانک سامنے سے گرو گوبند آتا دکھائی دیا اور اس نے مجھے مخاطب ہوا۔

"شیخ کرامت! میرے پہلے وار سے تو بچ گیا، لیکن اب ناگ دیوتا تجھے زندہ نہیں چھوڑے گا!" وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے ایک سیاہ ناگ اس کی کلائی سے لپٹا ہوا نظر آیا۔ اس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھا اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

اس کے ہاتھ سے لپٹا ہوا سانپ جیسے اڑتا ہوا میری طرف آیا، مگر مجھ تک نہ پہنچ سکا۔ وہ آدھا فاصلہ طے کرتے ہی "دھپ" سے زمین پر گرا اور تڑپ کر ساکت ہو گیا۔ گرو گوبند نے حیرت سے سانپ کی طرف دیکھا۔ پھر مجھے اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ وہ ایک دم پلٹ کر بھاگا۔ کسی انجانی طاقت نے مجھے اس کے تعاقب میں جانے پر اکسایا اور میں

بھی دوڑنے لگا۔ مندر اندر سے نیم تاریک تھا، پھر بھی مجھے کچھ فاصلے پر گرو گوبند بھاگتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک تنگ سی جگہ جا کر وہ راستہ ختم ہو گیا۔ سامنے یہ ایک چبوترے پر کالی مائی کی بڑی سی بھیانک مورتی رکھی تھی۔ گرو گوبند اسی مورتی کے سامنے سجدہ ریز تھا۔ میرے قدم اس کے عقب میں رکے تو وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس وقت تک آیات پڑھنا شروع کر چکا تھا۔ میں نے اپنے دشمن کو بھی کچھ پڑھتے دیکھا، مگر پروا نہیں کی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا کوئی شیطانی حربہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ وہ بالکل میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے آیات پڑھتے ہی اس پر دم کر دیا۔ معاً اس کے منہ سے بڑی بھیانک چیخ نکلی۔ اس کے بعد میری آنکھوں نے بڑا ہول منظر دیکھا۔ گرو گوبند کے جسم کا گوشت جیسے پانی کی طرح بہہ کر اس کے قدموں میں ڈھیر ہونے لگا۔ ذرا سی دیر میں صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچا میرے سامنے کھڑا تھا۔ ہڈیوں کے کڑکڑانے اور جوڑ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ڈھانچا بھی ٹوٹ کر کسی کھلونے کی طرح بکھر گیا۔ گرو گوبند اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

میں اپنے دشمن کو ختم کر کے پلٹ رہا تھا کہ جانے کدھر سے گرو گوبند کی حسین داسیاں نکل کر میرے راستے میں آگئیں۔

"ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلو کہ تم نے ہمیں اس راکشش (شیطان) سے آزادی دلائی ہے۔" داسیوں نے مجھ سے التجا کی۔

"اس کی ایک شرط ہے کہ تمہیں مسلمان ہونا پڑے گا۔" میں بولا۔

"اور تم میں سے صرف چار کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" میری آنکھوں میں جیسے کوئی خواب جاگ اٹھا۔

"ہم سب تمہاری خاطر مسلمان ہونے کو تیار ہیں۔" انھوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

میرے لیے ان چاند کے ٹکڑوں میں سے چار کا انتخاب کرنا ایک کڑی آزمائش تھا۔ پھر بھی میں نے کسی نہ کسی طرح یہ مرحلہ طے کر ہی لیا۔

"کیا تم ہمیں اپنی کنیزیں بنا کر بھی ساتھ نہیں رکھ سکتے؟" بقیہ داسیاں بولیں۔

"شرط یہی ہے کہ تمہیں ہندو دھرم چھوڑ کر اسلام کو اپنانا پڑے گا۔"

انھوں نے میری یہ شرط مان لی۔ میں نے انھیں کلمہ پڑھا کے دائرہ اسلام میں داخل کر لیا۔ ان کے جسموں پر موجود لباس ستر پوشی کا متحمل نہیں تھا۔ سو وہ میرے حکم پر مندر ہی کی حدود میں موجود اپنی کوٹھریوں تک جا کے لباس تبدیل کر آئیں۔ ان کی کل تعداد سات تھی۔ چار کو میں نے اپنے عقد میں لینے کا فیصلہ کر چکا تھا' بقیہ تین خود ہی کنیزیں بن کر میری ہر خدمت پر آمادہ تھیں۔ میں انھیں ساتھ لیے مندر سے نکل آیا تو ہمزاد نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

"ہم سب کو چاٹگام لے چلو!" میں نے ہمزاد کو حکم دیا۔

اس کے لیے ہمزاد نے ہمیں ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔ پھر ہمیں اسی وقت ہوش آیا کہ جب چاٹگام پہنچ چکے تھے۔ میرے ایما پر ہمزاد نے اسی روز ایک بڑی کوٹھی خرید لی۔ میں ان سبھی کے ساتھ نئی کوٹھی میں منتقل ہو گیا۔ ارشاد علی بھی میرے ساتھ تھا۔ یہ نئی کوٹھی بہترین سامان و آرائش سے مزین تھی۔ یہ وہی کوٹھی ہے شمیم نوید' جہاں تم اس وقت بھی بیٹھے ہو اور میں بستر مرگ پر پڑا ہوں۔ ہاں تو سنو! ان چاروں کو اپنے عقد میں لینے سے پہلے میں نے پوچھا کہ وہ کب اور کس طرح گرو گوبند تک پہنچیں تو ایک نیا عقدہ کھلا۔ ان سب کو بچپن ہی میں گرو گوبند نے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے اغوا کیا تھا اور پرورش کی تھی۔ میرے لیے یہ بات بھی حیران کن ہی تھی کہ گرو گوبند ان کے فطری تقاضے پورے کرنے کا اہل نہیں تھا۔ وہ ساتوں اب تک کنواری تھیں۔ گرو گوبند کا معاملہ صرف لذت دید کی حد تک تھا۔ اسے ان داسیوں کا معمولی لمس بھی پگھلا دیتا تھا۔ اپنے ماضی کے متعلق ان میں سے کسی کو بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ ناآسودگی کی وجہ سے اور فطری تقاضے پورے نہ ہونے کے سبب

وہ گرو گوبند سے انتہائی نفرت کرتی تھیں۔

حسن کے اس خزانے کو پا کر جیسے میں بھول ہی گیا۔ ان میں سے چار کے ساتھ میں نے نکاح پڑھوالیا۔ اور پھر جیسے رنگ و نشاط میں ڈوب گیا۔ جن تین داسیوں کو میں نے کنیزوں کی حیثیت سے قبول کیا تھا' ان کے حقوق بھی ادا کیے۔ یوں وہ بھی ناآسودہ نہ رہیں اور خوش ہو گئیں۔

ابھی تک مجھے یہ ہوش نہیں آیا تھا کہ ہمزاد سے اس غلطی کی سزا کے بارے میں پوچھ سکتا جو مجھ سے عمل پڑھنے کی پہلی ہی رات سرزد ہو چکی تھی۔ اس واقعے کو اب پانچ سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا کہ ایک روز ہمزاد ہی نے مجھے متوقع سزا کی یاد دلائی کرائی۔ میں ان پانچ برسوں کے دوران میں سات بیٹوں کا باپ بن چکا تھا۔

"اب آپ کے اس جسم کی طبعی عمر پوری ہونے میں صرف آٹھ دن باقی رہ گئے ہیں۔" ہمزاد نے انتہائی افسردہ آواز میں مجھے یہ خبر دی۔

"تو کیا پھر مجھے یہ جسم تبدیل کرنا پڑے گا؟" میں نے فکر مند ہو کر سوال کیا۔

"نہیں' اب آپ یہ جسم نہیں بدل سکتے۔ اس غلطی کی یہی سزا ہے جو آپ سے پانچ سال پہلے عمل پڑھتے ہوئے سرزد..."

"نہیں!" میں تقریباً چیخ اٹھا' مگر چیخنے سے حقیقتیں نہیں بدلتیں۔

"خود میرا وجود بھی تو آپ ہی کے ساتھ فنا ہو جائے گا کہ میں آپ کا ہمزاد ہوں۔" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

جو پیدا ہوا ہے اسے ایک دن ناپید ہونا ہے شمیم نوید! ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے' میں نے اب اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ حکم الٰہی سے بھلا کسے انکار کی مجال ہے! آج میری زندگی کا آخری دن ہے۔ اب سورج غروب ہونے میں تھوڑی ہی دیر رہ گئی ہے! اپنی چاروں چہیتی بیویوں' کنیزوں اور ساتوں بیٹوں کے لیے میں اتنی دولت چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ میری اولاد کی

پشتوں تک خوش حال زندگی گزار سکتی ہے۔

شیم نوید! میں مرتے ہوئے افسردہ نہیں ہوں۔ جو خواب کبھی میں نے دیکھا تھا' مجھے اس کی تعبیر اپنی اولاد کی شکل میں مل چکی ہے۔ میں نے خود کو آنے والی نسلوں میں محفوظ کر دیا۔ اب تم جاؤ شیم نوید! میری پراسرار سرگذشت ختم ہو گئی ہے۔ میں اب اپنی چاروں بیویوں اور کنیزوں کو بھی اس حقیقت سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ اس فانی دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں۔ خدا حافظ شیم نوید!

ہمیشہ کے لیے خدا حافظ!

ختم شد